دائرۃ المعارف

یعنی

جنوری ۱۹۵۷ء تا جون ۱۹۵۷ء

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

مطبع معارف پریس اعظم گڈھ

فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۷۹

جنوری ۱۹۵۷ء تا جون ۱۹۵۷ء

(بہ ترتیب حروفِ تہجی)

شمار	اسمائے گرامی	صفحہ	شمار	اسمائے گرامی	صفحہ
۱	مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ	۲۳، ۳۰۹، ۲۵۳، ۴۲۲	۶	جناب مولانا عبد الحلیم صاحب چشتی فاضل دیوبند	۳۲۵ - ۳۴۳
۲	جناب شبیر احمد خاں غوری ایم اے ایل ایل بی، بی ٹی، آیج	۲۰۲، ۲۹۶، ۴۲۳	۷	جناب عطاء الرحمن صاحب عطا کاکوی پروفیسر سینٹ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پٹنہ	۱۴۲
۳	سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب ایم اے علیگ.	۱۶۵، ۲۴۵	۸	جناب حافظ غلام مرتضیٰ صاحب ایم اے لکچرار عربی و فارسی الٰہ آباد یونیورسٹی	۲۰۹
۴	جناب مرزا صفدر علی ایم اے لکچرار ورنگل کالج. جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن	۴۵۹	۹	جناب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب ایم اے ایل ایل بی پی ایچ ڈی صدر شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی،	۱۱۳
۵	جناب مولوی ضیاء احمد صاحب بدایونی ایم اے ریڈر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی	۱۰۰	۱۰	جناب شیخ فرید صاحب لکچرار ارنسن کالج جبل پور	۱۳۱

شمار	اسمائے گرامی	صفحہ	شمار	اسمائے گرامی	صفحہ
۱۱	جناب گوپی چند صاحب نارنگ ایم اے،	۳۰۳	۱۴	شاہ معین الدین احمد ندوی	۵۱۲، ۶۶ ۸۲، ۱۵۶ ۱۶۷، ۲۳۶ ۲۴۴، ۳۱۶ ۳۲۲، ۳۹۶ ۴۲۲، ۴۶۶
۱۲	جناب مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دارالمصنفین	۴۴۳، ۴۰۵			
۱۳	جناب مرزا محمد یوسف صاحب استاذ مدرسہ عالیہ رامپور،	۵۹	۱۵	ڈاکٹر نذیر احمد صاحب لکھنؤ یونیورسٹی	۳۶، ۸۵ ۲۲۱، ۲۸۹ ۳۶۶

شعراء

شمار	اسمائے گرامی	صفحہ	شمار	اسمائے گرامی	صفحہ
۱	جناب سید اختر علی تلہری	۳۱۶	۲	جناب مولانا حکیم سید مصلح الدین صاحب اعظمی،	۶۲

فہرست مضامین معارف

جلد ۹،

جنوری ۱۹۵۷ء تا جون ۱۹۵۸ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شمار	مضمون	صفحہ	شمار	مضمون	صفحہ
	شذرات	۲-۱۸۲		خدمات کا تفصیلی جائزہ،	
		۱۹۲-۲۴۲			
		۲۴۴-۳۲۲	۷	دیوانِ حافظ میں الحاق	۳۲، ۵۸
		۳۲۲			۲۲
	مقالات		۸	عمادی غزنوی یا عمادی شہریاری	۱۰۳
۱	ابن المقفع کی کتاب منطق ارسطاطالیس	۳۰۶	۹	کیا متفقہ اسلامی احکام کو بھی	۳۴۳، ۵۸
	تراجم			اجتہاد کے ذریعہ بدلا جاسکتا ہے	
۲	اسلامی تصوف کا نظری اور	۳۰۳	۱۰	معدن المعانی	۱۴۲
	عملی پہلو		۱۱	منوچہری دامغانی	۱۸۰
۳	اقبال کا پیغامِ عمل	۴۵۹	۱۲	مولانا عبدالسلام ندوی	۵
۴	امام اشعری اور مستشرقین	۵۹	۱۳	مولانا مناظر احسن گیلانی	[illegible]
۵	ایران کے کتب خانے	۲۸۹، ۳۶۶	۱۴	ہندوستانی زبان کا ایک قدیم	۱۳
۶	مولانا خرم علی بلہوری اور ان کے علمی	۳۲۵، ۴۴۴		مرثیہ	

صفحہ	مضمون	شمار	صفحہ	مضمون	شمار
۳۱۶	تدریسی اشارے		۲۶۲، ۳۶۶، ۴۲۳	یونانی منطق کے قدیم تراجم	۱۵
	مطبوعات جدیدہ			**آثار علمیہ**	
۷۷، ۱۵۶، ۲۳۷، ۳۱۸، ۳۹۷، ۴۷۴			۴۵، ۲۳۱، ۳۸۵، ۳۹۲، ۴۶۲	مکاتیب مولانا سید سلیمان ندوی	
				ادبیات	
			۷۰	تاریخ وفات حسرت آیات مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم	

مجلس ادارت

(۱) جناب مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی

(۲) جناب ڈاکٹر عبد الستار صاحب صدیقی

(۳) شاہ معین الدین احمد ندوی

(۴) سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے

تاریخ دعوت و عزیمت

نی عالم اسلام کی اصلاحی و تجدیدی کوششو
تاریخی جائزہ، نامور مصلحین اور ممتاز اصحاب
عوت و عزیمت کا مفصل تذکرہ، ان کے علمی و
لی کارناموں کی روداد، اور انکے اثرات و نتائج
تذکرہ، اسمیں پہلے مصنف کے قلم سے پیش لفظ ہے
کے بعد مقدمہ، جسمیں اصلاح و تجدید کی ضرورت اور
تاریخ اسلام میں انکا تسلسل دکھایا گیا ہے پھر اصل
کتاب شروع ہوتی ہے جو مولانا جلال الدین رومی کی
اصلاحی و تجدیدی کوششوں کی تفصیل پر جا کر
ختم ہوتی ہے، قیمت : ۶ سے/

مرتبہ مولانا ابو الحسن علی ندوی

مآل و مشیت

اس میں حیات انسانی کے دو بنیادی تصورات :
مآل و مشیت کی فلسفیانہ تحلیل کیگئی ہے، یہ ۱۹۵۵ء کی
کی بہترین کتاب ہے جسپر اسکے لائق مصنف جناب خواجہ
ظفر حسین خاں صاحب کو حکومت ہند کیطرف سے
پانچہزار کا انعام ملا ہے، یہ تو موضوع کے اعتبار سے
خالص فلسفیانہ اور بہت خشک ہے لیکن مصنف کے
انشاء پردازانہ اسلوب تحریر نے اسکو بہت دلچسپ
دلآویز بنا دیا ہے، ان ہی کے قلم سے فرانس کے مشہور انقلابی
روسو کے ایک مقالہ کا اردو ترجمہ اسی اسلوب و طرز انشاء میں
ادارہ کیطرف سے اس سے پہلے شائع ہو چکا ہے،

قیمت عہ/

جلد ۷۷ ماہ جمادی الثانی ۱۳۷۵ھ مطابق جنوری ۱۹۵۶ء نمبر ۱

مضامین

شذرات — شاہ معین الدین احمد ندوی — [illegible]

مقالات

مولانا عبد السلام ندوی — شاہ معین الدین احمد ندوی — [illegible]

دیوان حافظ میں الحاق — ڈاکٹر نذیر احمد صاحب لکھنؤ یونیورسٹی — [illegible]

امام غزالی اور مستشرقین — جناب مرزا محمد یوسف صاحب ... — [illegible]

ادبیات

تاریخ وفات حضرت مولانا عبد السلام ندوی — جناب مولانا حکیم سید ... — [illegible]

مطبوعات جدیدہ — [illegible]

تابعین

علم و عمل اور مذہب اخلاق میں صحابہ کرام کے سچے جانشین اور ان کے تربیت یافتہ تابعین تھے، اس لیے سیر الصحابہ کی تکمیل کے بعد اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ مرقع مرتب کیا گیا، جس میں ۵۰ اکابر تابعین کے سوانح، ان کے علمی، مذہبی، اخلاقی اور عملی مجاہدات اور کارنامے دکھائے ہیں، اس کا پہلا اڈیشن عرصہ ہوا ختم ہو گیا تھا، اب یہ دوسرا اڈیشن تیار کرایا گیا ہے۔

مرتبہ: شاہ معین الدین احمد ندوی۔

منیجر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

ہندوستان اور پاکستان میں ایک دوسرے کی کتابوں کی طباعت واشاعت کے بارہ میں مؤثر پابندی نہ ہونے سے دونوں ملکوں کے مصنفین اور تصنیفی و اشاعتی اداروں کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے، جس ملک کے تاجر کا دل چاہتا ہے دوسرے ملک کی کتابیں چھاپ لیتا ہے اور انکے مالک کچھ نہیں کرسکتے، چنانچہ اب سے چند سال پہلے لاہور کے ایک تاجر نے دار المصنفین کی سیرۃ النبی کا پہلا حصہ چھاپ لیا تھا، مگر پنجاب کے باحمیت اخبارات نے اسکو ایسا آڑے ہاتھوں لیا اور بعض اعلیٰ حکام نے بھی دباؤ ڈالا کہ سیرت کے مطبوعہ نسخے تو دار المصنفین کو مل گئے لیکن اسکی طباعت کے مصارف اسکو اور اکرنے پڑے اور ان نسخوں کو پاکستان ہی میں خسارہ سے فروخت کرنا پڑا جس سے اسکو مالی نقصان پہنچا، اب لاہور کے مکتبہ مصطفائی نے یہی حرکت کی ہے، اور سیرت کا پہلا حصہ چھاپ لیا ہے، یہ بدیانت مکتبہ مولانا ابوالکلام کا تذکرہ بھی چھاپ چکا ہے،

ہندوستان کی تقسیم کے بعد سے یہاں کے اسلامی ادارے جن مالی مشکلات میں مبتلا ہیں اور جسطرح انکی زندگی بسر ہو رہی ہے اس سے پاکستان کے لوگ خوب واقف ہیں، ایسی حالت میں اگر وہ انکی مدد نہیں کرسکتے تھے تو انکا کم سے کم یہ فرض تو تھا کہ وہ انکو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرتے، لیکن وہاں کے خود غرض تاجروں کو اسمیں بھی باک نہیں اور تھوڑے فائدے کیلیے انکی کتابیں چھاپ لیتے ہیں، ہم کو توقع ہے کہ پاکستان خصوصاً لاہور کے اخبارات نے جسطرح پہلے اپنی اسلامی حمیت کا ثبوت دیا تھا، اس مرتبہ بھی دینگے اور اس بدیانت ادارہ کو ایسا سبق دینگے کہ پھر کسی کو ایسی جرأت نہ ہو، اور اسکو سیرت کے مطبوعہ نسخے واپس کرنے پر مجبور کریں گے، ممکن ہے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہو کہ سیرت نبوی کا پہلا حصہ جو علامہ شبلی کی تصنیف ہے، دار المصنفین کی ملکیت نہیں ہے، اسلیے اسکو چھاپنے میں کوئی مضائقہ نہیں، تو یہ غلط فہمی دور ہوجانا چاہیے، اولاً علامہ شبلی

کی تمام تصانیف خواہ وہ قانونی حیثیت سے وار المصنفین کی ملک ہوں لیکن اخلاقی حیثیت سے وہی انکا وارث ہے دوسرے سیرۃ النبی کا پہلا حصہ تو علامہ شبلی کی وفات کے بعد دارالمصنفین نے شائع کیا تھا، اور وہ اسی کے نام رجسٹرڈ ہے اسلیے وہ قانونی حیثیت سے بھی اسی کی ملک ہے، اور اسکی اشاعت کا کسی کو حق نہیں ہے

دارالمصنفین کی آمدنی کا بڑا ذریعہ کتابوں کی تجارت ہے، اسکے علاوہ پاکستان کے قیام سے پہلے اسکو حیدرآباد اور بھوپال کی ریاستوں سے بھی مدد ملتی تھی، مگر وہ عرصہ ہوا بند ہو گئی، اب اس کی آمدنی کا ذریعہ صرف تجارت رہ گیا ہے، اسکی کتابوں کی زیادہ مانگ پاکستان میں ہے مگر دونوں ملکوں کے درمیان مالی لین دین کی دشواریوں کیوجہ سے متفرق خریدار کتابیں منگا نہیں سکتے، اور پرمٹ سسٹم کیوجہ سے وہاں کے تاجروں کو بھی پہلے کے مقابلہ میں بہت محدود تعداد میں کتابیں منگانے کی اجازت ملتی ہے جس سے دارالمصنفین کی آمدنی بہت گھٹ گئی ہے اور کئی سال سے وہ سخت مالی مشکلات میں مبتلا ہے، اگر حکومت ہند نے ساٹھ ہزار کی وقتی مدد نہ کر دی ہوتی تو اسکا چلنا دشوار ہو جاتا، اب اگر پاکستان کے تاجر اسکا رہا سہا ذریعہ آمدنی بھی چھین لینا چاہتے ہیں تو اسکی زندگی کی کیا صورت ہوگی، کیا پاکستان چاہتا ہے کہ ہندوستان میں جو اسلامی ادارے باحال تباہ باقی رہ گئے ہیں وہ بالکل ہی ختم ہو جائیں، اگر ایسا نہیں ہے تو اسکو اسکا تدارک کرنا چاہیے اور یہ تنہا دارالمصنفین یا اسلامی اداروں کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کے مصنفین اور ادارے اس مصیبت میں مبتلا ہیں، اسلیے دونوں حکومتوں کا فرض ہے کہ وہ کوئی ایسا قانون بنائیں جس سے ایک ملک کی کتابیں دوسرے میں نہ چھپ سکیں، ہمکو توقع ہے کہ پاکستان کی حکومت اور اخبارات دونوں ہماری اس درخواست پر توجہ کرینگے، جن اخبارات نے خود دارالمصنفین کی ہمدردی میں پیش قدمی کی ہے، ادارہ ان سب کا شکر گذار ہے،

ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد ایک ایسا ادارہ تھا جس کا مقصد اردو اور ہندی دونوں زبانوں کی خدمت اور ترقی تھا، گو اب ملک کے حالات اور حکومت کی پالیسی کے اثر سے اسکے کاموں کی نوعیت بدل گئی تھی اور اردو کا کام بہت کم ہو گیا تھا پھر بھی کچھ نہ کچھ ہوتا تھا مگر ہمارے صوبہ کی حکومت کو یہ بھی گوارا نہیں، چنانچہ وہ اکیڈمی کے دستور

کی بعض دفعات میں ترمیم کرانا چاہتی ہی، ان میں دو ترمیموں کا اثر اردو پر خاص طور سے پڑیگا، ایک یہ کہ اسکا نام ہندوستانی اکیڈمی کے بجائے اترپردیش اکیڈمی کر دیا جائے، دوسرا اسکا مقصد ہندی اور اردو کے بجائے سرکاری زبان ہندی اور ان زبانوں کی خدمت قرار دیا جائے جو ہندی سے متوسل ہیں (اصل انگریزی لفظ Dependent ہی)، اگر چہ کہنے کیلئے یہ کہا جائیگا کہ ہندی کے متوسلین میں اردو بھی شامل ہے، لیکن اس تبدیلی کا جو اصل مقصد و منشا ہی اسکو ہر شخص سمجھ سکتا ہی، یہ بلا شبہہ صحیح ہی کہ اردو ہندی ہی سے نکلی ہی، لیکن اسکی حیثیت ایک مستقل زبان کی ہی جو ہندی سے زیادہ ترقی یافتہ ہے، اس لیے ہندی سے پیدا شدہ دوسری بولیوں کی طرح اس کو ہندی کا ضمیمہ بنانا صحیح نہیں ہی، اسی طرح ہندستانی کے لفظ سے اردو کی بو آتی تھی، اس لیے اس کا بدلنا بھی ضروری تھا،

اکیڈمی کو صوبہ کی حکومت سے امداد ملتی ہے اور اس کا دارو مدار بڑی حد تک اسی امداد پر ہی، اسلیے وہ ان تجویزوں کے ماننے پر مجبور ہی، لیکن اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو بھی آجکل اردو کے بارہ میں جو ذہنیت ہو رہی ہی اس میں اس قسم کی تجویز عین جذبات کے مطابق تھی، اردو کے ممبروں کی تعداد ہی کتنی ہی، پھر انکی آواز ہی کیا، اسلیے یہ تجویزیں گذشتہ ۱۰ دسمبر کے جلسہ میں منظور ہو گئیں، اس طرح اکیڈمی میں اردو کا جو نام باقی تھا وہ بھی مٹ گیا، آیندہ ۱۰ جنوری کو پھر اسکی مخصوص میٹنگ ہو رہی ہی، دیکھیں اس میں کیا فیصلہ ہوتا ہے،

رسالہ صبح صادق اس سے پہلے قرآن نمبر نکال چکا ہی، اب اس نے حدیث نمبر نکالا ہی، اسمیں احادیث نبوی کے مختلف پہلوؤں پر مشاہیر اہل علم و قلم کے مفید مضامین جمع کر دیے گئے ہیں، جس سے احادیث نبوی کی دینی حیثیت اور کتب احادیث خصوصاً صحاح ستہ کی اہمیت ظاہر ہو جاتی ہی اور حدیث کے متعلق اسکے منکرین کی پھیلائی ہوئی بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں، مگر ایک نمبر میں منکرین حدیث کے جواب کے سلسلہ کے تمام مضامین کا جمع کرنا ممکن نہ تھا، اسلیے بعض اہم مضامین چھوٹ گئے ہیں، اگر صبح صادق اس نمبر کا ایک ضمیمہ نکالکر ان مضامین کو بھی شائع کرے تو ایک مزید خدمت ہوگی، مگر یہ نمبر بھی بہت مفید ہی اور جن لوگوں کو حدیث نبوی سے ذوق ہی یا انکو اسکے متعلق کچھ شکوک و شبہات ہیں ان کو اس نمبر کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے، دفتر صبح صادق مکارم نگر لکھنؤ سے ملیگا،

مقالات

مولانا عبد السلام ندوی

از شاہ معین الدین احمد ندوی

دار العلوم ندوۃ العلماء نے اپنے دور کمال میں جو نامور فرزند پیدا کیے ان میں ایک مولانا عبد السلام ندوی بھی تھے، وہ اعظم گڈھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں علاء الدین پٹی میں سنہ ۱۳۰۱ھ میں پیدا ہوئے، ان کے والد متوسط درجہ کے زمیندار تھے، مگر کاشتکاری بڑے پیمانہ پر کرتے تھے، نیل کی تجارت بھی تھی، اسلیے ان کا شمار گاؤں کے خوش حال لوگوں میں تھا، مولانا عبد السلام کی تعلیم گھر کے مکتب میں ہوئی، فارسی کی ابتدائی کتابیں مکتب ہی میں ایک معلم سید امداد علی سے پڑھیں اور اسکی تکمیل اپنے خسر مولوی عبد اللہ صاحب سے کی۔

فارسی کی تکمیل کے بعد عربی کی تعلیم کیلیے کانپور گئے اور اسکی ابتدائی تعلیم کانپور اور اسکے بعد آگرہ کی جامع مسجد کے مدرسہ میں حاصل کی، اس زمانہ میں مشرقی اضلاع میں مدرسہ چشمۂ رحمت غازیپور کا بڑا شہرہ تھا، یہاں مولانا کے ایک عزیز مولانا شبلی[1] مدرس تھے، اسلیے وہ آگرہ سے غازیپور چلے آئے، اور متوسطات تک کی تعلیم چشمۂ رحمت میں پائی، پھر سنہ ۱۹۰۶ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے اور سنہ ۱۹۱۰ء میں یہاں سے فراغت حاصل کی اور یہیں ادب کے مدرس مقرر ہو گئے۔

ان میں شعر و ادب اور لکھنے پڑھنے کا ذوق ابتدا سے تھا، چنانچہ مولانا شبلی کی جوہر شناس نگاہ نے

---

[1] ان مولانا شبلی کا وطن جیراجپور ضلع اعظم گڈھ تھا، یہ بھی دار العلوم ندوۃ العلماء میں مدرس ہو گئے تھے، اور اسکے فقیہ اول اور مفتی تھے، راقم الحروف نے بھی ان سے ہدایہ پڑھی ہے، ابھی چند سال ہوئے کہ ان کا انتقال ہوا، رحمہ اللہ تعالیٰ۔

اسی زمانہ میں ان کی صلاحیتوں کا اندازہ کر لیا تھا، اور جن لوگوں کو انھوں نے تالیف و تصنیف کی تربیت دی تھی، ان میں ایک مولانا عبدالسلام بھی تھے، اور ان کے بارہ میں یہ پیشین گوئی کی تھی کہ آگے چل کر وہ ایک اچھے مصنف ہوں گے، یہ پیشین گوئی بالکل صحیح ثابت ہوئی، انھوں نے پہلا مضمون ندوہ میں داخلے کے بعد ہی ۱۹۰۶ء میں تناسخ پر لکھا تھا، مولانا شبلی کو یہ مضمون اسقدر پسند آیا کہ اس کو اصلاح بغیر اپنے نوٹ کے ساتھ الندوہ میں شائع کیا، اور مولانا کو پانچ روپے انعام دیے، اسی مضمون سے مولانا کی علمی و ادبی زندگی کا آغاز ہوا، اور اس کے بعد برابر ان کے مضامین الندوہ میں نکلتے رہے، اور وہ پہلے اس کے سب اڈیٹر پھر اڈیٹر مقرر ہوئے، اس کے بعد جب مولانا شبلی نے سیرۃ النبیؐ کی تالیف کا کام شروع کیا تو مولانا عبدالسلام کو اپنا لٹریری اسٹنٹ بنایا، اسی زمانہ میں مولانا ابوالکلام بھی مولانا شبلی کے زیر تربیت تھے، وہ بھی الندوہ کے اڈیٹر رہ چکے تھے اور ان کا اور مولانا عبدالسلام کا ساتھ رہ چکا تھا، چنانچہ ۱۹۱۲ء میں جب انھوں نے کلکتہ سے اپنا مشہور اخبار الہلال نکالا تو مولانا عبدالسلام صاحب کو بھی بلا لیا اور وہ ڈیڑھ دو سال تک الہلال میں کام کرتے رہے، ۱۹۱۴ء میں الہلال کو بنگال گورنمنٹ نے بند کر دیا، اسی سنہ میں ۱۸ نومبر کو مولانا شبلی کا بھی انتقال ہو گیا،

مولانا شبلی کے پیش نظر جو مذہبی اور علمی کام تھے اور جن کو وہ اپنی زندگی میں پورا نہ کر سکے تھے، ان کی تکمیل کے لیے دارالمصنفین کا خاکہ بنا کر اپنے شاگرد رشید مولانا سید سلیمان ندوی کو ان کی تکمیل کی وصیت کر گئے تھے، چنانچہ مولانا شبلی کی وفات کے بعد ہی دسمبر ۱۹۱۴ء میں جب انھوں نے دارالمصنفین قائم کیا، تو مولانا عبدالسلام صاحب کو کلکتہ سے اعظم گڈھ بلا لیا، اس وقت سے لیکر وفات تک وہ برابر دارالمصنفین سے وابستہ رہے اور مرکر اس سے جدا ہوئے۔

مولانا شبلی کی طرح مولانا سید سلیمان ندوی کی شخصیت بھی بڑی جامع و ہمہ گیر تھی، انھوں نے

صرف مولانا شبلی کے ناتمام کاموں کو پورا کیا بلکہ حالات و ضروریات کے مطابق دار المصنفین کے کاموں کا دائرہ اتنا وسیع کر دیا کہ وہ مولانا شبلی کے تخیل سے بہت آگے بڑھ گیا، اور اس کی شہرت عالمگیر ہوگئی،
دار المصنفین کے کاموں میں مولانا عبد السلام صاحب ندوی، مولانا سید سلیمان ندوی کے دست راست تھے، مگر

ہر گلے را رنگ و بوے دیگر است

مولانا سید سلیمان ندوی کی شخصیت بڑی جامع تھی، ان کے افکار و خیالات نہایت بلند اور ان کے کاموں کا دائرہ بڑا وسیع تھا، اور مولانا عبد السلام صاحب طبعاً نہایت خاموش، گوشہ نشین، قانع اور شہرت و نام و نمود سے بالکل بے نیاز تھے، ان میں ایجاد و اختراع، حوصلہ مندی اور قیادت کا مادہ مطلق نہ تھا لیکن تصنیفی قابلیت اور زور قلم میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے، اس لیے انھوں نے اپنا دائرۂ عمل تالیف و تصنیف ہی تک محدود رکھا، اور نہایت خاموشی کے ساتھ عمر بھر اس کام کو انجام دیتے رہے، اور اس میں وہ دار المصنفین کے رکن اعظم تھے جس پر ان کے مضامین اور تصانیف شاہد ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی کی بعض اہم کتابوں مثلاً سیرۃ النبیؐ اور حیات شبلی کی تالیف میں ان کا بھی حصہ ہے جس کی تصریح ان کتابوں کے مقدمہ میں موجود ہے،

ادب و انشا میں وہ نہایت ممتاز تھے، اور علامہ شبلی کی یہ وراثت ان کے حصہ میں زیادہ آئی تھی، چمنستان ادب میں ان کا قلم بڑا سبک خرام تھا، ذہن بڑا اخاذ پایا تھا، سرسری مطالعہ سے کتابوں کا جوہر کھینچ لیتے تھے، اور عربی کی ہر اہم اور نئی کتاب سے وہ اپنے کام کی کچھ نہ کچھ باتیں ضرور نکال لیتے تھے اور اس پر ایک مضمون تیار کر دیتے تھے، چنانچہ ان کے بیشتر مضامین کسی نہ کسی کتاب کے مطالعہ کا نتیجہ ہیں، بلکہ کبھی کبھی وہ ان سے مستقل تصنیف کا خاکہ تیار کر لیتے تھے، چنانچہ سیرۃ عمر بن عبد العزیز کی تالیف میں انھوں نے اگرچہ بہت سی کتابوں سے مدد لی ہے لیکن اس کا ابتدائی

اسی زمانہ میں ان کی صلاحیتوں کا اندازہ کر لیا تھا، اور جن لوگوں کو انھوں نے تالیف و تصنیف کی تربیت دی تھی، ان میں ایک مولانا عبد السلام بھی تھے، اور ان کے بارہ میں یہ پیشین گوئی کی تھی کہ آگے چل کر وہ ایک اچھے مصنف ہوں گے، یہ پیشین گوئی بالکل صحیح ثابت ہوئی، انھوں نے پہلا مضمون ندوہ میں داخلہ کے بعد ہی ۱۹۰۶ء میں تناسخ پر لکھا تھا، مولانا شبلی کو یہ مضمون اسقدر پسند آیا کہ اس کو اصلاح بغیر اپنے نوٹ کے ساتھ الندوہ میں شائع کیا، اور مولانا کو پانچ روپئے انعام دیے، اسی مضمون سے مولانا کی علمی و ادبی زندگی کا آغاز ہوا، اور اس کے بعد برابر ان کے مضامین الندوہ میں نکلتے رہے، اور وہ پہلے اس کے سب اڈیٹر پھر اڈیٹر مقرر ہوئے، اس کے بعد جب مولانا شبلی نے سیرۃ النبیؐ کی تالیف کا کام شروع کیا تو مولانا عبد السلام کو اپنا لٹریری اسٹنٹ بنایا، اسی زمانہ میں مولانا ابو الکلام بھی مولانا شبلی کے زیر تربیت تھے، وہ بھی الندوہ کے اڈیٹر رہ چکے تھے اور ان کا اور مولانا عبد السلام کا ساتھ رہ چکا تھا، چنانچہ ۱۹۱۲ء میں جب انھوں نے کلکتہ سے اپنا مشہور اخبار الہلال نکالا تو مولانا عبد السلام صاحب کو بھی بلا لیا اور وہ ڈیڑھ دو سال تک الہلال میں کام کرتے رہے، ۱۹۱۴ء میں الہلال کو بنگال گورنمنٹ نے بند کر دیا، اسی سنہ میں ۱۸ر نومبر کو مولانا شبلی کا بھی انتقال ہو گیا،

مولانا شبلی کے پیش نظر جو مذہبی اور علمی کام تھے اور جن کو وہ اپنی زندگی میں پورا نہ کر سکے تھے، ان کی تکمیل کے لیے دار المصنفین کا خاکہ بنا کر اپنے شاگرد رشید مولانا سید سلیمان ندوی کو ان کی تکمیل کی وصیت کر گئے تھے، چنانچہ مولانا شبلی کی وفات کے بعد ہی دسمبر ۱۹۱۴ء میں جب انھوں نے دار المصنفین قائم کیا، تو مولانا عبد السلام صاحب کو کلکتہ سے اعظم گڈھ بلا لیا، اس وقت سے لیکر وفات تک وہ برابر دار المصنفین سے وابستہ رہے اور مر کر اس سے جدا ہوئے۔

مولانا شبلی کی طرح مولانا سید سلیمان ندوی کی شخصیت بھی بڑی جامع و ہمہ گیر تھی، انھوں نے

حضرت مولانا شبلی کے ناتمام کاموں کو پورا کیا بلکہ حالات و ضروریات کے مطابق دارالمصنفین کے کاموں کا دائرہ اتنا وسیع کر دیا کہ وہ مولانا شبلی کے تخیل سے بہت آگے بڑھ گیا، اور اس کی شہرت عالمگیر ہو گئی۔ دارالمصنفین کے کاموں میں مولانا عبد السلام صاحب ندوی، مولانا سید سلیمان ندوی کے دست راست تھے، مگر

ہر گلے را رنگ و بوے دیگر است

مولانا سید سلیمان ندوی کی شخصیت بڑی جامع تھی، ان کے افکار و خیالات نہایت بلند اور ان کے کاموں کا دائرہ بڑا وسیع تھا، اور مولانا عبد السلام صاحب طبعاً نہایت خاموش، گوشہ نشین اور شہرت و نام و نمود سے بالکل بے نیاز تھے، ان میں ایجاد و اختراع، خودمندی اور قیادت کا مادہ مطلق نہ تھا، لیکن تصنیفی قابلیت اور زور قلم میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے، اس لیے انھوں نے اپنا دائرۂ عمل تالیف و تصنیف ہی تک محدود رکھا، اور نہایت خاموشی کے ساتھ عمر بھر اس کام کو انجام دیتے رہے، اور اس میں وہ دارالمصنفین کے رکن اعظم تھے جس پر ان کے مضامین اور تصانیف شاہد ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی کی بعض اہم کتابوں مثلاً سیرۃ النبیؐ اور حیات شبلی کی تالیف میں ان کا بھی حصہ ہے جس کی تصریح ان کتابوں کے مقدمہ میں موجود ہے،

ادب و انشا میں وہ نہایت ممتاز تھے، اور علامہ شبلی کی یہ وراثت ان کے حصہ میں زیادہ آئی تھی، چمنستان ادب میں ان کا قلم بڑا سبک خرام تھا، ذہن بڑا اخاذ پایا تھا، سرسری مطالعہ سے کتابوں کا جوہر کھینچ لیتے تھے، اور عربی کی ہر اہم اور نئی کتاب سے وہ اپنے کام کی کچھ نہ کچھ باتیں ضرور نکال لیتے تھے اور اس پر ایک مضمون تیار کر دیتے تھے، چنانچہ ان کے بیشتر مضامین کسی نہ کسی کتاب کے مطالعہ کا نتیجہ ہیں، بلکہ کبھی کبھی وہ ان سے مستقل تصنیف کا خاکہ تیار کر لیتے تھے، چنانچہ سیرۃ عمر بن عبد العزیز کی تالیف میں انھوں نے اگرچہ بہت سی کتابوں سے مدد لی ہے، لیکن اس کا ابتدائی

خاکہ سیرۃ العمرین ابن جوزی سے ان کے ذہن میں آیا تھا، اسی میں رنگ بھر کر عمر بن عبد العزیز رضی کی سیرت کا مرقع تیار کیا، اسی طریقہ پر ان کا ایک رسالہ القضا فی الاسلام ابن جوزی کی الطرق الحکمیہ سے ماخوذ ہے، ان کو فطری لگاؤ شعر و ادب سے تھا لیکن مذہبیات سے لیکر شعر و ادب تک ہر موضوع پر لکھنے کی یکساں قدرت تھی، چنانچہ ان کے مضامین میں جس قدر تنوع ہے، وہ مشکل سے کسی دوسرے اہل قلم کے مضامین میں نکل سکتا ہے، ایک زمانہ میں معارف کا کوئی نمبر مشکل ہی سے ان کے مضمون سے خالی ہوتا تھا، اگر ان سب کو جمع کیا جائے تو کئی جلدوں میں آئیں گے اور تنوع و رنگا رنگی کا نہایت دلکش نمونہ نظر آئے گا، لیکن طبیعت شاعرانہ اور تخیل پرست تھی، اسلیے محنت و مشقت سے گھبراتے اور لکھنے کیلیے ایسے ہلکے پھلکے موضوع کا انتخاب کرتے تھے جس میں زیادہ کد و کاوش کی ضرورت نہ ہو، مگر اس کمی کو وہ ادبی حسن و لطافت سے پورا کر دیتے تھے، قلم اتنا پختہ اور منجھا ہوا تھا کہ قلم برداشتہ لکھتے تھے، اور لکھنے کے بعد مسودہ پر نظر ثانی اور حک و اصلاح کی ضرورت بہت کم پیش آتی تھی،

محنت کے زیادہ عادی نہ تھے، صرف دن میں تین چار گھنٹے کام کرتے تھے، مگر اس معمول میں فرق نہ آتا تھا، اور اس انہماک سے لکھتے کہ کوئی ہنگامہ اور شور و غل ان کے کام میں خلل انداز نہ ہو سکتا تھا۔ اس پابندی کا یہ نتیجہ ہے کہ سہولت پسندی کے باوجود ان کے کام کی مقدار سب سے زیادہ ہوتی تھی، انھوں نے مختلف موضوعوں پر سیکڑوں مضامین، اور ہزاروں صفحات لکھے، ان کی مستقل تصانیف کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے، اہم تصانیف حسب ذیل ہیں:

اسوۂ صحابہؓ، دو جلد۔ مسلمانوں کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابۂ کرام کی زندگی اسوۂ عمل ہے، اس لیے دار المصنفین میں سیرۃ النبی کے ساتھ ہی سیر الصحابہ کی تالیف کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا تھا، جو ۱۲ جلدوں میں ہے، اس کے مختلف حصے مختلف رفقاء نے لکھے ہیں، ان میں اسوۂ صحابہ دو جلدوں میں اور اسوۂ صحابیات مولانا عبد السلام صاحب کی تالیف ہیں پہلی جلد میں

عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق و معاشرت وغیرہ کے متعلق صحابۂ کرام کے موثر و سبق آموز واقعات اور دوسری جلد میں ان کے مذہبی، سیاسی اور علمی کارناموں کو اس انداز سے تحریر کیا ہے جس سے زندگی کے ہر شعبہ میں اسلامی تعلیمات کا عملی مرقع سامنے آجاتا ہے، اور مسلمانوں کو زندگی کے مختلف پہلوؤں میں ہدایت و رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔

سیر الصحابیات۔ اسلام نے نہ صرف مردوں بلکہ عورتوں میں بھی عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا تھا، اور جس طرح مسلمان مردوں کے لیے صحابۂ کرام کی زندگی اسوۂ حسنہ ہے اسی طرح عورتوں کے لیے صحابیات کی زندگی نمونہ ہے۔ اس لیے سیر الصحابیات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات، بنات طاہرات اور عام صحابیات کے اخلاق و معاشرت وغیرہ کے متعلق موثر واقعات جمع کیے گئے ہیں، جو مسلمان خواتین کے لیے شمع ہدایت کا کام دیتے ہیں۔

سیرۃ عمر بن عبد العزیزؒ۔ خلفائے راشدین کے بعد اسلامی خلافت نے دنیاوی بادشاہت کی شکل اختیار کر لی تھی، اور اس میں وہ تمام خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں جو دنیاوی بادشاہتوں کا خاصہ ہیں، جب عنان حکومت حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے ہاتھوں میں آئی تو انھوں نے ہر طرح کے خطرات برداشت کر کے بڑی جرأت و دلیری سے اس حکومت کو خلافت کے قالب میں بدل کر ایک مرتبہ پھر صدیقی اور فاروقی عہد کی یاد تازہ کر دی، عمر بن عبد العزیز نے تخت شاہی پر بیٹھ کر جیسی فقیرانہ زندگی بسر اور جیسی عادلانہ حکومت کی اس کی مثال خلافت راشدہ کے علاوہ اور کسی دور میں نہیں مل سکتی، اور اس حیثیت سے ان کی زندگی نہ صرف مسلمان بادشاہوں بلکہ تمام دنیا کے فرمانرواؤں کیلئے نمونہ ہے، سیرۃ عمر بن عبد العزیزؒ میں اس موثر طریقہ سے ان واقعات کی تفصیل تحریر کی گئی ہے جس سے مسلمانوں کے ایمان میں تازگی اور غیر مسلموں کے دلوں میں اسلام کی عظمت کا نقش قائم ہوتا ہے۔

تاریخ اخلاق اسلامی۔ دوسری قوموں کے اخلاق کی تعمیر و تشکیل اور اس کے تغیرات میں مختلف عوامل و اسباب کو بڑا دخل ہوتا ہے، لیکن مسلمانوں کا ضابطۂ اخلاق کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہے جس میں کوئی بنیادی تغیر نہیں ہو سکتا، مگر طبعی اسباب کی بنا پر مسلمانوں کے مختلف طبقوں کے اخلاق میں بھی تغیر ہوتے رہے ہیں، مولانا لیکی کی تاریخ اخلاق یورپ کے طرز پر مسلمانوں کے اخلاق کی تاریخ لکھنا چاہتے تھے، مگر اس کی ایک ہی جلد مرتب کر سکے، اس میں پہلے بعثت نبوی کے قبل عربوں کے اخلاق کی تصویر دکھائی گئی ہے، پھر اسلام نے اس میں جو انقلاب پیدا کیا اور عہد نبوت میں جس طرح اسلامی اخلاق کی تعمیر و تشکیل عمل میں آئی اس کی تفصیل ہے،

امام رازی۔ مسلمان فلاسفہ اور متکلمین میں امام فخر الدین رازی کا درجہ نہایت ممتاز ہے، دینی علوم میں بھی ان کو امامت کا درجہ حاصل تھا اور وہ اپنے دور کے نامور فلسفی اور متکلم بھی تھے، امام غزالی کے بعد وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے فلسفہ اور علم کلام کے مسائل پر تنقیدی نگاہ ڈالی، اور انکو جامعیت اور وضاحت کے ساتھ پیش کیا، اس لیے امام غزالی اور مولانا روم کی طرح ان پر بھی اردو میں ایک مستقل کتاب کی ضرورت تھی، اسی ضرورت کے پیش نظر اس کتاب کی تالیف عمل میں آئی، اس میں ان کے مفصل حالات، اور ان کی تصانیف پر تبصرہ اور ان کے فلسفہ، علم کلام اور نظریات و خیالات کی توضیح و تشریح اور ان پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے،

حکمائے اسلام دو جلدیں۔ فلسفہ کی تمام شاخوں طبیعیات، الٰہیات، منطق اور ریاضی وغیرہ میں مسلمان حکماء و فلاسفہ کے بڑے کارنامے ہیں، یونان کا فلسفہ ان ہی کے دم سے زندہ رہا، وہ قدیم اور جدید فلسفہ کی درمیانی کڑی تھے، اگر انھوں نے قدیم فلسفہ کو زندہ نہ رکھا ہوتا تو آج نئے فلسفہ کا وجود نہ ہوتا، اور نہ بعض دوسرے علوم پیدا ہوئے ہوتے، مسلمان محض یونانی فلسفہ کے مقلد نہ تھے، بلکہ اس کے ناقد بھی تھے، انھوں نے اس کی تہذیب و اصلاح کی اور فلسفہ میں نئے

نظریات پیدا کیے۔ ان فلاسفہ کے متعلق ایک عام شہرت یہ بھی ہے کہ وہ ملحد و بے دین تھے جو علی الا
صحیح نہیں ہے۔ بہت سے اکابر فلاسفہ نے فلسفہ کے ملحدانہ نظریات کی تنقید و تردید کی، اس سے
کی تائید کا کام لیا، مابعد الطبیعی مسائل کو فلسفہ سے ثابت کیا، اور عقلیات و نقلیات میں تطبیق
اس لیے اردو میں مسلمان فلاسفہ کے حالات اور ان کے فلسفیانہ اور متکلمانہ کارناموں کو پیش کرنے کی
بھی ضرورت تھی۔ اس اہم کام کو بھی مولانا کے آزمودہ کار قلم نے انجام دیا، اور دو ضخیم جلدوں میں مسلمان
فلاسفہ کے حالات لکھے۔ اس میں تاریخ اسلام کے پہلے نامور فلسفی یعقوب کندی سے لیکر مولانا فضل
خیرآبادی تک ہر دور کے اکابر فلاسفہ مثلاً محمد بن موسیٰ خوارزمی، فارابی، زکریا رازی، ابن مسکو
ابن ہیثم، بعض فین اخوان الصفا، شیخ الرئیس بو علی سینا، ابو ریحان بیرونی، امام غزالی، ابو البرکات بغ
عمر خیام، ابن باجہ، ابن طفیل، شیخ الاشراق، ابن رشد، امام رازی، نصیر الدین طوسی، قطب الد
شیرازی، قطب الدین رازی، سعد الدین تفتازانی، سید شریف جرجانی، جلال الدین دوانی، آ
میر باقر داماد، خاندان فرنگی محل و خیرآباد اور ہندوستان کے دوسرے نامور حکما۔ کل ۷۰ فلا
کے حالات ہیں اور ان کے علمی خدمات و فلسفیانہ نظریات کی تفصیل بیان کی ہے۔ کتاب کے شروع
میں ایک مقدمہ ہے جس میں حکمائے قدیم کے فلسفیانہ مذاہب، فلسفہ اشراق، مسلمانوں میں یو
فلسفہ کی اشاعت کی تاریخ اور ان کے قدیم مرکزوں کا حال لکھا ہے جس سے مسلمانوں میں فلسفہ
کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے، اردو میں اس موضوع پر یہ پہلی جامع کتاب ہے۔

شعر الہند دو جلد۔ اردو میں شعراء کے قدیم طرز کے بہت سے تذکرے ہیں لیکن وہ موجودہ
نقطۂ نظر سے ناقص اور سپاٹ ہیں، ان سے شعرا کے ضروری حالات اور ان کے کلام کی خصوصیات
بھی پوری طور سے معلوم نہیں ہوتیں، ان میں نہ ادوار کی تقسیم ہے نہ شاعری کے عہد بعہد
تغیرات اور اس کے اسباب پر بحث ہے، نہ شعرا کے کلام پر تفصیلی رائے ہے جس سے ان کی خصوصیات

کا اندازہ ہو سکے، نہ اصناف شاعری پر بحث و تبصرہ ہے، بس صرف شاعروں کا مختصر حال اور انکے
کلام کے متعلق ایک دو فقرے ہوتے ہیں، جن سے ان کی خصوصیات کا پورا اندازہ نہیں ہوتا،
اس حیثیت سے سب سے پہلے مولانا محمد حسین آزاد نے اردو شاعری کو آبحیات پلایا، اور جدید نقطہ نظر سے
آبحیات لکھی جس سے ایک حد تک یہ کمی پوری ہوگئی، آبحیات ادبی حیثیت سے غیر فانی ہے، جب تک
اردو زبان زندہ ہے، آبحیات زندہ رہے گی لیکن وہ نقش اول ہے، اس لیے اس میں بھی وہ
جامعیت نہیں ہے، جو اردو شاعری کی تاریخ کے لیے ضروری ہے، اسکی حیثیت ایک تاریخی و تنقیدی
تذکرہ کی ضرور ہے مگر اس میں اصناف شاعری کی تاریخ اور اس پر ریویو نہیں ہے بعض اور
خامیاں بھی ہیں، نواب امداد امام اثر کی کاشف الحقائق میں صرف اصناف شاعری پر نقد و تبصرہ ہے،
اس لیے وہ بھی جامع نہیں ہے، مولانا عبد السلام کو شعر و ادب سے فطری لگاؤ تھا، اور اس پر انکی نظر بڑی
وسیع تھی، چنانچہ انھوں نے مولانا شبلی کی شعر العجم کے طرز پر شعر الہند لکھی، اسکی پہلی جلد میں اردو شاعری کی
ابتدا سے لیکر فانی، حسرت، اصغر، شاد عظیم آبادی، عزیز لکھنوی، اکبر، اقبال، جوش یعنی جدید دور
تک کے شعرا کا تذکرہ ہے، اور ان کے مختلف دور قائم کرکے ہر دور کے شعرا کے الگ الگ حالات
اس دور اور اسکے شعرا کی خصوصیات، عہد بعہد کے تغیرات اور اسکے اسباب کی پوری تفصیل ہے، اس حصہ
کے شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں اردو شعرا کے قدیم تذکروں کی فہرست، ان کی کیفیت تحریر
کی گئی ہے۔ دوسرے حصہ میں اصناف شاعری یعنی غزل، ریختی، واسوخت، قصیدہ، مرثیہ،
مثنوی، ڈراما، اور مذہبی، صوفیانہ، اخلاقی اور فلسفیانہ شاعری پر تاریخی اور ادبی حیثیت سے مفصل
ریویو کیا گیا ہے جس سے اس کی پوری سرگذشت سامنے آجاتی ہے، آخر میں شعر کے اجزا اور اسکے
محسنات لکھے گئے ہیں، اور اردو شاعری میں ہندوستانی اثرات دکھائے گئے ہیں، اس حصہ کے
شروع میں اردو میں تنقید کی تاریخ پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس طرح آب حیات کے بعد

شعر الہند اردو شعرا کا پہلا جامع تذکرہ ہے، جس سے اردو شاعری کے تمام رخ سامنے آجاتے ہیں اب تو اس کے ایک ایک پہلو پر مستقل کتابیں لکھی جا چکی ہیں، مگر جب شعر الہند تالیف ہوئی اس وقت اردو میں آب حیات اور کاشف الحقائق کے علاوہ اور کوئی نمونہ سامنے نہ تھا،

اقبال کامل ۔ اقبال اور ان کے کلام کے متعلق اتنا لکھا جا چکا ہے کہ مشکل ہی سے اس کا کوئی پہلو تشنہ ہوگا، مگر اس کا سلسلہ ابتک جاری ہے، اور لکھنے والوں کو عجیب و غریب نئے نئے پہلو تلاش کرنا پڑتے ہیں، مگر اس کے باوجود کوئی ایسی جامع کتاب نہ تھی جو اقبالیات کے ہر پہلو پر حاوی ہو، اقبال کامل کی تالیف کا مقصد یہ تھا کہ ابتک اقبال پر جو کچھ لکھا جا چکا ہے، اس کو نقد و تبصرہ کے ساتھ مرتب طریقہ سے ایک جگہ جمع کر دیا جائے، چنانچہ اس میں اقبال کے سوانح، انکی مذہبیت، اخلاق و سیرت اور تصانیف پر تبصرہ اور ان تصانیف کا بھی ذکر ہے جن کی تالیف انکے پیش نظر تھی، مگر اس کو پورا نہ کر سکے، اس کے بعد ان کی شاعری کی تاریخی سرگذشت اور اسکے مختلف دور قائم کر کے ہر دور کے کلام پر الگ الگ تبصرہ کیا گیا ہے، پھر اسی طریقہ سے فارسی شاعری پر ریویو ہے، اس کے بعد ان کے کلام کے ادبی محاسن دکھائے گئے ہیں، اور اس کی شہرت و مقبولیت اور مختلف زبانوں میں اس کے تراجم کا ذکر ہے، اس سلسلہ میں انکی ادبی و لسانی فروگذاشتیں بھی دکھائی گئی ہیں، پھر ان کے فلسفۂ خودی پر تفصیلی بحث ہے، اور اس کے اجزاء و عناصر پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور فلسفۂ بیخودی کا اجمالی تعارف ہے، پھر نظریۂ ملت، تعلیم، سیاسیات، صنعت، فنون لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ کے بارہ میں ان کے خیالات پیش کیے گئے ہیں، آخر میں نعتیہ کلام پر ریویو ہے، اس طرح یہ کتاب اقبالیات کے ہر پہلو پر حاوی ہے، اور جن معلومات کے لیے ہزاروں صفحات کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہے، وہ اقبال کامل میں ایک جگہ مل جاتی ہیں۔

ان مستقل تصانیف کے علاوہ مولانا نے عربی کی متعدد اہم کتابوں کے ترجمے کیے مثلاً

تاریخ فقہ اسلامی۔ اردو میں فقہ اسلامی کی کوئی تاریخ نہیں تھی، اس لیے دارالمصنفین کے پیش نظر اس کی تالیف بھی تھی، مگر اسی زمانہ میں مصر کے ایک فاضل محمد خضری کی کتاب التشریع الاسلامی شائع ہوگئی جس سے دارالمصنفین کے پیش نظر کتاب کا مقصد پورا ہو جاتا تھا، اس لیے مولانا نے اس کو اردو کے قالب میں ڈھال دیا، یہ فقہ اسلامی کی مفصل تاریخ ہے جس میں ہر دور کے فقہ و فقہا کے حالات، ان کے مذاہب، ان کی خصوصیات اور ان کے علل و اسباب وغیرہ ہر پہلو کو تفصیل کے ساتھ دکھایا گیا ہے، اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک اسلامی علوم کی ترقی کا دور رہا فقہ اسلامی بھی ترقی کرتی رہی، اس کے بعد اس پر بھی زوال طاری ہوگیا۔

ابن خلدون۔ مصر کے نامور فاضل ڈاکٹر طہ حسین نے ابن خلدون اور اس کے فلسفہ پر یک کتاب فرنچ میں لکھی تھی، مصر میں اس کا عربی ترجمہ ہوا، یہ کتاب اسی عربی ترجمہ کا ترجمہ ہے، ابن خلدون نہ صرف مسلمانوں بلکہ دنیا کے مورخین میں فلسفۂ اجتماعیات کا پہلا عالم ہے جس نے عمرانی مسائل پر سب سے پہلا فلسفیانہ نگاہ ڈالی، اور اس کو علمی طور سے مرتب کیا، چنانچہ اس کا مقدمہ اس کے زمانہ تصنیف تک کے انسانی علوم و خیالات پر سب سے پہلا تبصرہ، تاریخی واقعات کو سائنس بنانے کی سب سے پہلی کوشش اور اقتصادیات و اجتماعیات پر فن کی حیثیت سے پہلی نگاہ ہے، اس حیثیت سے یہ مقدمہ موجودہ دور کے بہت سے علوم و مسائل کا گویا سنگ بنیاد ہے۔ طہ حسین کی کتاب میں ابن خلدون کے مختصر حالات اور اس کے سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی و عمرانی نظریوں پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے،

انقلاب الامم۔ یہ کتاب مشہور فرانسیسی عالم و مفکر گسٹاولی بان کی کتاب کے عربی ترجمہ کا ترجمہ ہے، اس میں ان نفسی اصول اور اخلاقی قوانین کی تشریح کی گئی ہے، جن سے قوموں کی ترقی اور ان کا تنزل وابستہ ہوتا ہے، یعنی جس طرح افراد میں ایک مخصوص روح ہوتی ہے جس کے مطابق اس کے تمام افعال صادر ہوتے ہیں، اسی طریقہ سے قوموں میں بھی مخصوص اخلاق و عادات ہوتے ہیں

جن پر ان کی ترقی و تنزل کا مدار ہوتا ہے، اس کتاب میں قوموں کے ان ہی اخلاق و عادات اور اس کے مظاہر و نتائج کو دکھایا گیا ہے،

ان اہم تصانیف و تراجم کے علاوہ چند اور چھوٹی چھوٹی کتابیں ہیں مثلاً

القضا فی الاسلام - یعنی اسلام کا نظام عدالت، اس کتاب میں شہادت اور فصل مقدمات کے اسلامی قوانین و اصول تحریر کیے گئے ہیں اور ان کی تشریح کی گئی ہے۔ اسکا خاکہ مولانا کے ذہن میں ابن جوزی کی کتاب الطرق الحکمیہ سے آیا تھا، اگرچہ اس کتاب میں حدیث و فقہ کی دوسری کتابوں سے بھی مدد لی گئی ہے، مگر زیادہ تر الطرق الحکمیہ سے ماخوذ ہے

فقرائے اسلام - علامہ شہاب الدین احمد بن علی دلجی نے ان علماء کے حالات پر جنھوں نے علمی کمالات کے باوجود فقر و فاقہ کی زندگی بسر کی ہے، ایک کتاب الفلاکۃ والمفلوکون لکھی ہے، فقرائے اسلام حذف و اضافہ کے ساتھ اسی کی تلخیص ہے، یہ کتاب صوفی پبلشنگ کمپنی پنڈی بہاء الدین نے شائع کی تھی،

ابن یمین - عرصہ ہوا ابن یمین اور اس کے کلام پر ایک کتاب فارسی میں ایک کتاب شائع ہوئی تھی، مولانا نے اردو میں اس کی تلخیص کی تھی، یہ کتاب بھی پنجاب کے کسی ناشر نے شائع کی تھی، اور اس وقت ہمارے سامنے نہیں ہے۔

مولانا کی دلچسپی کسی خاص فن تک محدود نہ تھی، اس لیے ان کا کوئی موضوع بھی متعین نہ تھا، شعر و ادب سے ضرور ان کو فطری لگاؤ تھا، مگر ان کے قلم کی جولانیاں اس دائرے میں محدود نہ تھیں، اور وہ ہر موضوع پر ہر وقت لکھنے کے لیے تیار رہتے تھے، اور جس طرف چاہتے تھے قلم کی باگ موڑ دیتے تھے، اسی لیے جو تنوع اور رنگا رنگی ان کے مضامین میں ہے مشکل سے کسی دوسرے اہل قلم کے مضامین میں نظر آسکتی ہے، ان کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ اگر ان کی پوری فہرست نقل

تو کئی صفحوں میں آئیگی، اسلیے مختصر فہرست لکھی جاتی ہے جس سے ان مضامین کے تنوع کا اندازہ ہوگا،

مسجد نبوی، جنگ اور اخلاق، خلفاے عباسیہ اور فریضۂ اشاعت اسلام، تربیت و تعلیم،
اسلامی یتیم خانے، تحریفات یہود، مثنوی خواب وخیال، کیا انسان کی اجتماعی زندگی ترقی کر رہی ہے،
فلسفہ لیبان، اسلام اور نصرانیت کی کشمکش، مشرقی کتب خانے، عیسائی مذہب کی تمدنی ناکامیاں،
مذہب عقلیات، اسلام کی تمدنی کامیابیاں، قرآن مجید اور شاعری، دین حنیف، خوش قسمت
حافظ اور بدقسمت خیام، طلاق عیسائی مذہب میں، اشرف علی خاں فغاں، وحدۃ الوجود اور
اکابر اسلام، اسلام اور عیسائیت، شیخ مصحفی کا تذکرہ، فن تراجم و طبقات، تحریم سود کے ملل و
اسباب، مسلمانوں کے تنزل کی داستان، مہندسین اسلام، عقیقہ اور اس کے مصالح، امام غزالی
اور فلسفۂ اخلاق، سوشلزم کی مختلف حیثیتیں اور اس کی اشاعت کے اسباب، القضا فی الاسلام،
شیریں وفرہاد، معتزلہ اپنی اصلی شکل میں، اسلام اور مغربی لباس و تمدن، اسلامی اقتدار کا اثر
یورپ کی معیشت پر، فلسفۂ جمال اور اس کا اثر تصوف پر، خصائص القرآن، ایک قدیم دکھنی شعر
اندلس کے عربی آثار، فرانسیسی شاعری اور اس پر عربی ادب کے اثرات، اسلام اور تکمیل اخلاق،
اسلامی فن تعمیر، رہبانیت اور اسلام، کلیات حسن دہلوی، تصوف کی اجمالی تاریخ، تصوف کا
اثر علوم وفنون پر، صوفیانہ نظام اخلاق، مولانا کاتبی، موفق الدین عبد اللطیف بغدادی، فلسفہ
اشراق اور اسلام، اقبال اور فلسفہ خودی، اسلامی طب کی مختصر تاریخ، اقبال کے اخلاقی تصورات
اسلامی ہند کے تمدنی کارنامے، عربی نظم ونثر کی تاریخ، معجزۂ قرآن کی نوعیت، فلسفۃ البلاغۃ،
اردو شاعری میں انقلاب کیونکر پیدا ہوا، دلی اور لکھنؤ کی شاعری اور ایک کا دوسرے پر اثر،

مولانا طبعاً خاموش، گوشہ نشین اور نام ونمود سے بے نیاز تھے، اور اس کے جو مواقع بھی انکو ملتے تھے، اس سے بھی فائدہ نہ اٹھاتے تھے، اور پروپیگنڈے کے فن سے تو بالکل ہی ناواقف تھے،

اس لیے پبلک اسٹیج سے ہمیشہ الگ رہے، اور ان کا دائرۂ عمل دار المصنفین کے اندر تالیف و تصنیف تک محدود رہا، حتی کہ خالص علمی اجتماعات میں بھی تقریر یا مقالہ خوانی یا صدارت کی نوبت شاید ہی کبھی آتی ہو، ایک دو مرتبہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے جلسہ میں البتہ شرکت کی تھی، اور اردو شعر کے ایک اچھے انتخاب کی ضرورت" کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا، جو اسی زمانہ میں معارف میں شائع ہوگیا تھا، اور ایک مرتبہ عرصہ ہوا، کانپور کے کسی ادبی اجتماع میں شعبۂ نثر کی صدارت کی تھی اور اس کے لیے خطبۂ صدارت بھی لکھا تھا، یہ خطبہ بھی معارف میں چھپا تھا، اس جلسہ میں ہم لوگوں نے بڑے اہتمام سے مولانا کو روانہ کیا تھا، وہ منظر آج تک آنکھوں کے سامنے ہے، مگر وہ سفر سے اس قدر گھبراتے تھے کہ اس کے بعد غالباً کسی علمی جلسہ کے لیے سفر نہیں کیا، اس لیے ایسے علمی مقالات اور خطبۂ صدارت کی تعداد جو کسی علمی اجتماع میں پڑھے گئے ہوں دو چار سے زیادہ نہیں ہے، البتہ مقامی مشاعروں کی صدارت بڑے شوق سے کرتے تھے، اور اس کے لیے قریب کے اضلاع کا کبھی کبھی سفر بھی کرتے تھے،

ایک زمانہ میں کبھی کبھی تقریر بھی کرتے تھے، اور اگر اصرار کیا جاتا تھا تو وعظ بھی کہہ دیتے تھے، مگر جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا، جذب کی وجہ سے ان کے خیالات میں توازن نہ تھا، اس لیے تقریر یا وعظ کے حدود و قیود کی پابندی سے بری رہتے تھے، اس لیے وہ خود بھی اس سے بچتے تھے اور روکے بھی جاتے تھے، وہ طبعاً خاموش تھے، مگر بعض خاص موضوعوں پر بڑی دلچسپ اور شاعرانہ گفتگو کرتے تھے، جو سننے کے لائق ہوتی تھی،

مولانا کا اصلی موضوع شعر و ادب تھا، اس سے ان کو فطری مناسبت تھی، اور اردو، فارسی شعر و ادب خصوصاً اردو شاعری سے بڑی دلچسپی تھی، اتفاق سے شروع سے ان کو ماحول بھی ایسا ملا جس سے اس ذوق کے نشو و نما میں اور مدد ملی، ان کے بہنوئی مولوی محبوب الرحمٰن صاحب مرحوم

بی۔ اے۔ ایل ایل بی جن کے ساتھ مولانا عرصہ تک رہے، شاعر تھے، اور کلیم تخلص کرتے تھے، مولانا اپنی طالب علمی کے زمانہ میں ان ہی کے ساتھ کانپور اور آگرہ گئے تھے، یہ وہ زمانہ تھا جب گھر گھر شعرو شاعری کا چرچا تھا، اور آگرہ اس کا بڑا مرکز تھا، چنانچہ محبوب الرحمن صاحب اور ان کے ساتھ مولانا بھی یہاں کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے، ان صحبتوں نے مولانا کے ذوق شعری کو بھی ابھارا، اور کبھی کبھی وہ غزلیں کہہ کر مشاعروں میں پڑھنے لگے، اس کے بعد کانپور کی تعلیم کے زمانہ میں ان کو مولانا عبد الاحد شمشاد مرحوم فرنگی محلی کی، جو جنتہ رحمت میں مدرس اعلیٰ اور اپنے زمانہ کے اساتذہ میں تھے، شاعرانہ صحبت میسر آئی، ان کی صحبت اور حوصلہ افزائی سے مولانا کے ذوق سخن کے لیے مہمیز کا کام کیا، اور وہ باقاعدہ شاعری کرنے اور مولانا عبد الاحد سے اصلاح لینے لگے، ان کی فارسی استعداد شروع سے پختہ اور فارسی اور اردو کے اساتذہ کے کلام پر پوری نظر تھی، اس لیے ابتدائی مشق سخن میں اس زمانہ کے مذاق کے اچھے اشعار نکلنے لگے، جس کی داد اس دور کے اساتذہ نے دی، مثلاً

میں مرگیا ہوں یہ کس غربت تین کیلیے		کہ لائیں چادر گل بلبلیں کفن کیلیے

بدگمانی سے انھیں میری نظر وہ سمجھے		چمکے ذرے بھی اگر روزن دیوار کے پاس

کانپور کے بعد وہ اردو شاعری کے اصل مرکز لکھنؤ پہنچ گئے، یہاں کے درو دیوار سے شاعری برستی تھی، پرانے اساتذہ کی متعدد یادگاریں باقی تھیں، لکھنؤ کی فضا امیر مینائی اور جلال لکھنوی کی زمزمہ سنجیوں سے گونج رہی تھی، خود مولانا شبلی کی صحبت میں بھی شعر و ادب کا چرچا رہتا تھا، اس ماحول نے مولانا کو پورا شاعر بنا دیا۔

اس زمانہ میں لکھنؤ میں میر ضامن علی جلال کا طوطی بولتا تھا، اور ان کا رنگ بہت مقبول تھا، اس لیے مولانا بھی اس سے متاثر ہوئے، اور اصلاح کے لیے جلال کی جانب رجوع کیا، لیکن

مولانا ہی کے بیان کے مطابق وہ نذرانہ لیے بغیر اصلاح نہیں دیتے تھے جس کا تحمل طالب علمی کے زمانہ میں مولانا کے لیے دشوار تھا، اس لیے یہ تعلق قائم نہ ہو سکا، مگر اس سے جلالؔ کے ساتھ ان کی عقیدت میں کوئی فرق نہ آیا اور وہ ہر دور میں یکساں قائم رہی۔

اقبال سہیل مرحوم اور مرزا احسان احمد صاحب کے ذوق سخن کی وجہ سے اعظم گڈھ میں بھی شعر و شاعری کا مذاق تھا، جگرؔ و اصغرؔ اکثر آتے رہتے تھے، اور دار المصنفین و مرزا صاحب کے یہاں شعر و شاعری کی محفلیں جمتی تھیں، مشاعرے بھی ہوتے تھے، اس لیے مولانا عبدالسلام کو یہاں بھی شاعرانہ ماحول ملا، وہ ان صحبتوں اور مشاعروں میں برابر شریک ہوتے تھے، اور اکثر غزلیں بھی پڑھتے تھے، اور ان کا یہ ذوق آخر عمر تک قائم رہا، چنانچہ آخری غزل انھوں نے وفات سے ایک ہفتہ پہلے کہی تھی،

فن شاعری پر مولانا کی نظر بڑی گہری اور استادانہ تھی جس کا ثبوت ان کی کتاب شعر الہند ہے، وہ قدیم طرز سخن کے دلدادہ اور خود بھی اس کے پابند تھے، دور جدید کی بعض عجیب بلکہ بد عنوانیوں کو سخت ناپسند کرتے تھے، اور اس کو شاعری نہیں سمجھتے تھے، اس پر انھوں نے ایک تنقیدی مضمون بھی لکھا تھا جس میں دور جدید کے بہت سے شعرا کی غلطیاں دکھائی تھیں، اس کی اشاعت سے ایک ادبی ہنگامہ برپا ہو جانے کا خطرہ تھا اس لیے شائع نہیں کیا گیا، اور اس کا مسودہ ابتک محفوظ ہے، فن کے قواعد کی پابندی اور زبان کی صحت و صفائی کو بڑی اہمیت دیتے تھے، اور اس حیثیت سے وہ لکھنو کی شاعری کو دلی کی شاعری پر ترجیح دیتے تھے، ان کو لکھنو کا اصلاح شدہ رنگ بہت پسند تھا، اس لیے جلالؔ کو آخری دور کا سب سے بڑا شاعر مانتے تھے، اور خود بھی اسی رنگ میں کہتے تھے، مگر کبھی کبھی داغؔ و امیرؔ کے رنگ کے شوخ اشعار بھی قلم سے نکل جاتے تھے،

مگر اس ذوق کے باوجود شاعری ان کا مستقل مشغلہ نہ تھا، بلکہ کبھی کبھی تفنناً یا اعظم گڈھ کے

شاعروں پر کہتے تھے، چنانچہ ان کی اکثر غزلیں اسی کی یادگار ہیں، اسی لیے ان کے ذوق شعری کے مقابلہ میں ان کے کلام کی مقدار بہت کم ہے، مگر جس قدر بھی ہے پرانے طرز کا استادانہ ہے، اس پر تفصیلی تبصرہ کے لیے مستقل مضمون کی ضرورت ہے، اس لیے بغیر کسی تبصرہ کے مختلف رنگ کے اشعار نقل کیے جاتے ہیں جس سے ان کے رنگِ سخن کا اندازہ ہو جائے گا۔

ان کے مجموعۂ کلام کی اشاعت کی نوبت نہ آئے گی، اس لیے کچھ زیادہ اشعار نقل کر دیے جاتے ہیں کہ اسی ذریعہ کم سے کم ایک مختصر انتخاب محفوظ ہو جائے۔

نشہ میں ہیں کبھی تو کبھی ہیں خمار میں — اچھی گذر رہی ہے ترے انتظار میں

گذرے گا روزِ حشر بھی اب انتظار میں — شامل ہو یہ بھی وعدۂ فردائے یار میں

چپ چاپ بھی نہ بیٹھ سکے بزمِ یار میں — مجبوریاں بھی غیر کے تھیں اختیار میں

تارے بھی جھلملا کے بہ حسرت ہوئے غروب — کیا کیا بجھے چراغ شبِ انتظار میں

توڑے سبو کو خاک کہ اب محتسب کو بھی — خود لطف آ رہا ہے شکستِ خمار میں

اے چشمِ شوق جلوۂ محبوب کے سوا — کیا کیا نہ دیکھنا ہے تجھے انتظار میں

لاکھوں قفس ہیں لائیگی کس کس میں بوئے گل — چڑھنے لگے گی سانس صبا کی بہار میں

چہرے تک ان کے مست گئی بےخبر گئی — جب جب گئی نگاہ بنوعِ دگر گئی

دشوار ہو گئے ہیں اشارے بھی ضعف میں — اس کام سے بھی اب تو ہماری نظر گئی

سامانِ غم بھی ہجر کی شب منتشر ہوا — تڑپے تو آنسوؤں کی لڑی بھی بکھر گئی

گو جس کی جستجو تھی وہ یوسف نہیں ملا — لیکن مری نگاہ سے دنیا گذر گئی

یوسف کو سستے دام زلیخا نے لے لیا — تقدیر تھی کہ حسن کی قیمت ٹھہر گئی

غبارِ معصیت کی اس طرح کی شست و شو برسوں — مئے صافی سے اے زاہد کیا میں نے وضو برسوں

زبان بے زبانی ہم سے بڑھ کر کون سمجھے گا
تری تصویر سے فرقت میں کی ہے گفتگو برسوں

نگاہِ شوق کی خودداد اس کے عکس سے لی ہے
اک آئینہ کو رکھکر ہم نے اسکے روبرو برسوں

نہ پیاس اپنی بجھے گی بادۂ کوثر سے جنت میں
رہے گی روح میری کشتۂ جام و سبو برسوں

جہاں دیکھتے ہیں جدھر دیکھتے ہیں
فقط اک فریبِ نظر دیکھتے ہیں

یہ صیاد کو کیوں پسند آئے اتنا
مرے ہم نوا میرے پر دیکھتے ہیں

اشارہ جو پائیں تو تم کو بھی دیکھیں
ابھی تو تمھاری نظر دیکھتے ہیں

نظر باز بنکر شمیم اس گلی میں
تماشائے اہلِ نظر دیکھتے ہیں

یوں آشیاں کو دیکھ رہے ہیں قفس سے ہم
گویا یہ کوئی بھول ہے فصلِ بہار کا

مستی میں کھینچ لیتے ہیں رندانِ مے پرست
دامن پکڑ کے رحمتِ پروردگار کا

لاکھوں مصیبتیں ہیں مگر پھر بھی روزِ حشر
محبوب ہے کہ دن ہے ترے انتظار کا

اے بیخودی بھٹک کے چلے آئے خلد میں
ہم راستہ ہی بھول گئے کوئے یار کا

سب کچھ اسے ملے جو یہ ہو جائے ناامید
بس آسرا ہے یہ ترے امیدوار کا

حریم دل سے یا عرشِ بریں سے
تمھیں ہم ڈھونڈھ لائینگے کہیں سے

ہوا مرنے پہ آغازِ محبت
شروع ہوتا ہے یہ قصہ یہیں سے

بجھے دل کا چراغ اے شمعِ رو آج
جلا دے اپنے روئے آتشیں سے

جو اس کی جستجو میں گھر سے نکلے
تو خود کھوئے گئے دنیا و دیں سے

مری تقدیر ایسی چاندنی میں
جو چمکے گی تو تم سے مہ جبیں سے

صدا اس بام تک اب بھی نہ پہنچی
پکار آئے اسے عرشِ بریں سے

فلک سے پہلے ہی کوچے میں انکے
نپٹ لینا پڑا ہم کو زمیں سے

چھپے چوری جو کچھ کرتا ہے زاہد　　　کھلا راز اس کا اک پردہ نشیں سے
تری انگڑائیاں کہتی ہیں مجھ سے　　　تجھے کچھ ملنے والا ہے کہیں سے

نشہ آتا ہے تو پھر وعظ بھی کہہ لیتے ہیں　　　پی کے ہم اور بھی ہشیار ہوئے جاتے ہیں
تیغ کی ان کو پئے قتل ضرورت کیا ہو　　　خود ہی کھنچ کھنچ کے وہ تلوار ہوئے جاتے ہیں
مست آنکھوں کے اشارے مجھے دیتے ہیں یہ طنز　　　بے پئے آپ تو سرشار ہوئے جاتے ہیں
ترے پہلو میں تو بیٹھے ہیں مگر غیر کے ساتھ　　　ہو کے آسان وہ دشوار ہوئے جاتے ہیں
مثل منصور جنھیں حق نے کیا ہے حق گو　　　اور بے باک سر دار ہوئے جاتے ہیں

جنھیں تیرے ہاروں میں گوندھا گیا ہے　　　بھلا کب ہیں وہ پھول مرجھانے والے
تم اپنا انھیں کشتۂ ناز کہہ دو　　　ابھی جی اٹھیں گے یہ مرجانے والے
متاعِ دل و جاں کریں نذر پہلے　　　کچھ اپنا بھی کھوئیں انھیں پانے والے

لیں گے او چک کے بادۂ کوثر کا جام بھی　　　پہنچا جو ہاتھ دامنِ ابرِ بہار تک
رند و پیر اب جام یہ تم تک کے ہاتھ میں　　　مٹ مٹ گئے ہیں اسکے تو نقش و نگار تک
اللہ رے غرور پہنتے نہیں کبھی　　　گردن جھکا کے آپ تو پھولوں کا ہار تک

رندوں میں یوں ہی بخشش پیرِ مغاں رہے　　　ہو لاکھ قحط پھر بھی یہ دریا رواں رہے
رخصت ہوں وہ تو نالۂ مسلسل رواں رہے　　　یوسف کے ساتھ ساتھ لگا کارواں رہے
بجلی بھی اس کے ڈر سے گرے گی نہ باغباں　　　ہاں ہاں تری نظر میں مرا آشیاں رہے

مرے دل سے آخر وہ باہر کہاں ہیں　　　رقیب اپنے، اپنے ہی وہم و گماں ہیں
پڑیں بھی تو کیا مجھ پہ شرمائی نظریں　　　نہ یہ جانفزا ہیں نہ یہ جاں ستاں ہیں
چھٹے گا وہ کوچہ تو آوارگی سے　　　مری رہنما میری گمراہیاں ہیں

پی کے چلّو میں تو میخانے کو ہم اٹھتے نہیں لے نہ لیں ساقی سے جبتک جام جم اٹھتے نہیں

رہنما اس حد سے آگے تو ہی خود اے شوق ہو تھک گئے ہیں خضر اب تک قدم اٹھتے نہیں

راہ بے پایاں تھی وہ گرم رفتاری شمیم قرب منزل نے تھکایا اب قدم اٹھتے نہیں

کردے بیخود سنگھا کے زلف کی بو چھین لے آج مجھکو تو مجھ سے

یاد اس چشم مست کی آئی چھین لو ساغر و سبو مجھ سے

ہیں اشارے یہ موجِ مے کے شمیم کرلو بھی آج تم وضو مجھ سے

ہر ایک خار ہے رنگین خون بلبل سے خزاں کے آنے پہ بھی یہ بہار باقی ہے

بکھر کے زلف نے رخ پر بڑھائی ظلمت اور وہ رات ہے کہ ابھی شب انتظار باقی ہے

ہر ایک پر مرے اڑتے ہیں برگ گل کیطرح خزاں میں بھی یہ نشاط بہار باقی ہے

محو ہے گلگشت میں وہ گل عذار اکی برس کیا بہار باغ ہے ہر باغ بہار کی برس

ساغرِ گل دے رہا ہے جام جم ہر ہاتھ میں ہر نصیبہ بے نوا ہے شہریار کی برس

کسے خبر ہے کہ در پردہ نیتِ زاہد شریک صحبت رندان بادہ خوار بھی ہو

جنون عشق میں ہو پختگی اگر تو شمیم خزاں میں بھی ہو وہی رنگ جو بہار میں ہے

چلو جنت میں شغل ساغر و پیمانہ ہو جائے جگہ پر لطف ہے اک صحبت رندانہ ہو جائے

ذرا تو ہاتھ تو رکھ دے کسی کے روئے روشن پر مرا ذمہ جو اے زاہد یہ بیضا نہ ہو جائے

کیا عقد ثریا مری نظروں میں سمائے یہ تو ہے بس اک اترا ہوا ہار تمھارا

دیوانو! یہ عزت تمھیں بخشی ہے جنوں نے وابستۂ دامن ہے ہر اک خار تمھارا

خزاں دیدہ جو کچھ تنکے تھے آشیانہ میں انھیں کو برگِ گل سمجھے انھیں کو بال و پر جانا

کڑی ہے دھوپ محشر کی ٹھہر اے واعظ ناداں ہمارے ساتھ زیر سایۂ دامانِ تر جانا

ان کے علمی و ادبی کمالات اور کارناموں کی تفصیل کے بعد ان کی سیرت اور عادات و خصائل کی مرقع نگاری بھی ضروری ہے، اس کے بغیر انکی پوری تصویر سامنے نہ آئے گی، اور ان کی خصوصیات کا صحیح اندازہ نہ ہوگا، گو حسن و جمال کی طرح ان کی اداؤں کی مصوری بہت دشوار ہے، تاہم اس کا اجمالی خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے،

وہ ایک علمی مجذوب اور اپنی خصوصیات میں یگانہ تھے، ان میں بعض ایسی خوبیاں تھیں جو اس زمانہ میں ناپید ہیں، یا کم از کم ان کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں، وہ نہایت نیک سیرت بے نفس اور مرنجان مرنج انسان تھے، ان کی ذات سے کبھی کسی کو ادنیٰ تکلیف بھی نہیں پہنچی، ان میں ایذا رسانی کا مادہ ہی نہ تھا حقوق العباد سے ان کا دامن اتنا پاک تھا کہ کسی کا ادنیٰ حق بھی ان کے ذمہ نہ تھا، اور ان کے رفقاء و متوسلین میں مشکل ہی سے کوئی ایسا شخص ہوگا جن کے ذمہ ان کا کوئی حق نہ ہو، معاملات کے اس قدر صاف تھے کہ کسی کا ایک حبہ بھی باقی نہ رکھتے تھے، بازار کے معمولی حساب کتاب کے سوا ان کو کسی سے قرض لینے کی ضرورت ہی نہ پیش آتی تھی، تنخواہ ملنے کے بعد سب سے پہلے حساب چکاتے تھے، جب تک پورا حساب صاف نہ ہو جاتا ان کو چین نہ آتا حتی کہ اگر دھوبی اور مہتر وغیرہ وقت پر نہ پہنچتے تو گھر جاکر ان کی تنخواہ دے آتے، مگر جس مستعدی سے اپنا قرض ادا کرتے تھے، اسی مستعدی سے دوسروں سے بھی وصول کرتے تھے، اور وقتاً فوقتاً یاد دلاتے رہتے تھے، کبھی کبھی بھرے مجمع میں یاددہانی کر دیتے اور تنخواہ ملنے کے ساتھ ہی وصول کر لیتے، ہم میں سے ہر شخص ان کا مقروض رہتا تھا اس کیلیے ان کو بڑی زحمت اٹھانا پڑتی تھی، ہر وقت چالیس پچاس کی رقم پاس رکھتے تھے اور یہ پوری رقم جیب ہی میں رہتی تھی، اس کے لیے کئی جیبوں کی واسکٹ پہنتے تھے اور اس کی حیثیت صرّاف کی دوکان تھی جس میں نوٹ سے لیکر ہر قسم کی ریزگاری ہوتی تھی، وہ قرض، خواہ چند پیسوں کا ہی ہو، بڑی ناگواری سے دیتے تھے، لیکن انکار بھی ان کے بس میں نہ تھا،

جس کو جس قدر ضرورت ہوتی تھی کسی نہ کسی طرح ان سے وصول ہی کر لیتا تھا، ان میں مقابلہ
اور مدافعت کی مطلق طاقت نہ تھی کسی معاملہ میں خواہ ان کے مزاج کے کتنا ہی خلاف ہو بھی
لیے انکار پر قائم رہنا دشوار تھا، ان کی اس کمزوری سے ہر شخص فائدہ اٹھاتا تھا، چھوٹے چھوٹے
بچے چمٹ جاتے تھے اور بغیر پیسہ لیے نہ چھوڑتے تھے، دارالمصنفین میں جو مشترک مہمان بھی آتا تھا
یا اکل و شرب کی جو اجتماعی تقریب بھی ہوتی اس کی زد زیادہ تر مولانا ہی پر پڑتی اور سب کی حیثیت
"گیسٹ داں" کی ہوتی تھی یعنی جس پر صرف ہوتا تھا اس کو پتہ بھی نہ چلنے پاتا تھا، اس قسم کے
جبری ٹیکس اکثر مولانا کو ادا کرنے پڑتے تھے، مولانا مسعود علی صاحب نے اس کا نام جزیہ رکھا تھا۔

بڑے قانع و بے نیاز تھے حصول دنیا کی کبھی کوشش نہیں کی، اور ایک قلیل معاوضہ پر
پوری زندگی گذار دی، دارالمصنفین میں تنہا وہی ایسے شخص تھے جس نے اس قلیل تنخواہ کے علاوہ
جو ان کو ملتی تھی، دارالمصنفین کے ذریعہ اس کے اندر یا باہر کوئی فائدہ نہیں اٹھایا، یہی حال شہرت
سے بے نیازی کا تھا، اس سے وہ دور بھاگتے تھے، مصنفین اور اہل قلم کے طبقہ میں ان کی جیسی بے نیازی
کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے، بے نیازی کی آخری حد یہ ہے کہ ان کو اپنے کمالات تک کا احساس
نہ تھا، اور وہ اپنے ان کارناموں کو بھی کوئی اہمیت نہ دیتے تھے جن کی ایک دنیا معترف ہے، اس کا
ذکر تک پسند نہ کرتے تھے، میں ان سے اکثر کہا کرتا تھا کہ تمام مصنفین و اہل قلم کسی نہ کسی بہانہ سے اپنے
حالات اور کارنامے لکھ جاتے ہیں، آپ بھی لکھوا دیجئے، تاکہ آپ کے بعد ہم لوگوں کو اس کے لکھنے میں
کوئی دقت نہ ہو، وہ ہمیشہ بڑی بے پروائی سے جواب دیتے، میرے حالات ہی کیا ہیں، اور مرنے
کے بعد ان کے لکھنے سے کیا حاصل، ان سطور کی تحریر کے وقت اس سوال و جواب کی پوری تصویر
آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے، مگر یہ حسن اتفاق ہے کہ نشاط و مسرت کے آخری دور میں جس کی
تفصیل آئندہ معلوم ہوگی، ایک ہونہار نوجوان کبیر احمد جائسی نے جن کو لکھنے پڑھنے کا ذوق ہے،

ان کے حالات وشاعری پر ایک مضمون لکھکر ان کو دکھلایا، یہ مضمون ان کو کیا پسند آتا، انھوں نے
ان کی حوصلہ افزائی کے لیے ایک مستقل مضمون ہی ان کی طرف سے لکھ دیا جو دسمبر کے آجکل میں
شائع ہوا ہے، یہ مضمون مولانا ہی کا ہے اور اس حیثیت سے بہت اہم ہے کہ خود مولانا کے قلم سے
ان کے حالات ہیں۔

سیاست اور ریا و نفاق کے نام سے ناآشنا تھے، ان کا ظاہر و باطن بالکل ایک تھا، جو دل میں
تھا وہی زبان پر، ان کی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب تھی جس کو ہر شخص پڑھ سکتا تھا، وہ ایسی باتوں
کے چھپانے پر بھی قادر نہ تھے جس کے اظہار کی جرأت بہت کم لوگ کر سکتے ہیں، ان کی اس سادگی
اور صاف گوئی کی انتہا یہ تھی کہ اگر کسی مسئلہ یا کسی شخص کے متعلق ان کی رائے پوچھی جاتی تو ان کی
جو رائے ہوتی بلا تکلف وہی ظاہر کرتے خواہ اس کا اظہار خلاف مصلحت ہی کیوں نہ ہوتا، اس
صاف گوئی کے بدولت کبھی کبھی بڑی مشکل میں پھنس جاتے تھے، اس لیے کہ لوگ لطف و دلچسپی
کے لیے اشخاص کے متعلق ان کی موجودگی میں سوال کر دیتے تھے، اسوقت بھی مولانا وہی رائے
دیتے جو ان کے دل میں ہوتی، مگر کسی معاملہ کے متعلق ان کی کوئی مستقل رائے نہ ہوتی تھی، بلکہ
وقتی تاثرات کے مطابق بدلتی رہتی تھی، بڑے متحمل مزاج تھے، ناگوار سے ناگوار باتیں سنکر پی جاتے
تھے اور چہرہ پر شکن تک نہ پڑتی تھی، غصہ ان کو بہت کم آتا تھا، جب کسی سے بہت زیادہ برہم
ہوتے تو اس کو بیہودہ یا خبیث کہتے تھے، اور چونکہ ان کو ہر شخص چھیڑتا تھا اس لیے اس لقب سے
بہت کم لوگ بچے تھے، خودی اور خود نمائی کا ان میں شائبہ بھی نہ تھا، ہر چھوٹے بڑے اور ادنیٰ و
اعلیٰ سے ان کا برتاؤ یکساں تھا، ادنیٰ ملازمین تک ان سے بے تکلف تھے، اور ان سے فائدہ اٹھاتے
تھے، وہ کسی سے اپنے احترام کے متوقع نہ ہوتے تھے، اور نہ اس کا ان پر کوئی اثر پڑتا تھا، وہ اصلی احترام
یہی سمجھتے تھے کہ ان سے کوئی ناگوار بات نہ کیجائے، ان کے احترام اور مدارات کے لیے کسی بڑے

اہتمام کی ضرورت نہ تھی، خوش اخلاقی سے ملنا، ایک پیالی چائے پلادینا یا ایک پان کھلادینا بہت کافی تھا، خود بھی وہ دوسروں کی اسی قسم کی مدارات کے قائل تھے، ان کی زندگی اس قدر سادہ تھی کہ ناگزیر ضروریات زندگی کے علاوہ نمایش اور تعیش کا کوئی سامان کبھی نہیں رکھا، ان کی ساری کائنات دو کبس چند جوڑے کپڑے، ایک بستر اور ایک پلنگ سے زیادہ نہ تھی جس کو ان کی وفات ہی کے دن شام کو ان کے ورثہ ایک یکہ پر ساتھ لیتے گئے، وہ وقت ایسا تھا کہ یہ منظر دیکھ کر بہتوں کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے، لیکن حقیقت شناس نگاہیں کہہ رہی ہیں کہ

سبک سار مردم سبک تر روند

ان کی بعض خصوصیات ایسی ہیں جن کا دکھانا بڑا نازک کام ہے، مگر اس کے بغیر انکی اہم خصوصیات کا ایک بڑا دلکش رخ سامنے نہ آئے گا، مگر انکو ایک خاص پس منظر میں دیکھنا ضروری ہے، ورنہ اس کا پورا لطف نہ حاصل ہوگا، اور نہ انکے متعلق صحیح رائے قائم ہوگی، ان کو مراق کا پرانا مرض تھا، اور کبھی کبھی اس کے دورے بھی پڑتے تھے، اس لیے ان پر ہمیشہ جذب کی سی کیفیت طاری رہتی تھی، وہ کھوئے کھوئے سے رہتے تھے، اور ان کے خیالات اور اعمال میں توازن باقی نہ رہ گیا تھا، خصوصاً دورے کے زمانہ میں ان کو اپنے اوپر بالکل قابو نہ رہ جاتا تھا، اور وہ رُفع القلم عن ثلث کے حکم میں آجاتے تھے،

یوں تو کم و بیش ہمیشہ ان پر مراق کا اثر رہتا تھا، مگر کبھی کبھی اس کے دورے بھی پڑتے تھے، یہ دورے دو قسم کے ہوتے تھے، جن کو رجائی اور قنوطی کہہ سکتے ہیں، ان دوروں میں ان کو اپنے اُوپر مطلق قابو نہ رہ جاتا تھا، رجائی دورے میں سراپا جوش و خروش، زندگی و حرکت اور نشاط و مسرت بن جاتے تھے، ان کے ہر موے بدن سے زندگی اور مسرت کے چشمے ابلتے تھے، ہر چیز میں انکو مسرت ہی مسرت اور حسن ہی حسن نظر آتا تھا، ان کے لیے ہر جلوہ جنت نگاہ اور ہر نغمہ فردوس گوش

بن جاتا تھا، اور وہ رسوم و قیود سے بے پروا اپنے حال میں مست و سرشار رہتے تھے، ہر وقت حرکت میں رہتے، بازار کے کئی کئی چکر لگاتے، دار المصنفین کے احاطہ میں ہر وقت چلتے رہتے، رات بھر ٹہل ٹہل کر اشعار پڑھتے، خصوصاً چاندنی راتوں میں پوری رات جاگتے تھے، اکثر زیر لب باتیں کرتے رہتے، طبیعت میں بڑی جودت پیدا اور قوت گویائی بڑھ جاتی تھی، اور علمی و مذہبی مسائل میں مجتہدانہ شان پیدا ہو جاتی، بات بات میں مباحثہ کے لیے تیار ہو جاتے اور انکی افتاد طبع کے خلاف نقلی بھی پیدا ہو جاتی، کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے، گفتگو بھی بڑی شاعرانہ کرتے قلم میں بڑا زور پیدا ہو جاتا تھا، مگر کوئی متوازن تحریر نہ لکھ سکتے تھے، نقد وازدواج پر ان کا جو مضمون رسالہ ثقافت لاہور نے بڑے فخر و مباہات سے شائع کیا ہے، وہ اسی دورے کی یادگار ہے، طبیعت میں فیاضی بھی آجاتی تھی، دو دو چار چار آنے کی چھوٹی چھوٹی چیزیں خرید کر لوگوں کو تحفے میں دیتے، لباس میں بھی اہتمام پیدا ہو جاتا تھا، خضاب لگاتے، بھڑکیلے کپڑے پہنتے، غرض اس دورے میں سراپا زندگی، سراپا نشاط، اور سراپا باغ و بہار بن جاتے تھے، اس دورے میں سید صاحب مرحوم ان کو دیکھکر فرمایا کرتے تھے

ع ان دنوں جوش جنوں ہے مرے دیوانے کو

اس کے مقابلہ میں دوسرا قنوطی دورہ ہوتا تھا، اس میں دل و دماغ پر غمناک خیالات کا ہجوم ہو جاتا تھا، ہر چیز میں یاس و ناامیدی نظر آتی تھی، ہر وقت افسردہ اور غمگین رہتے تھے، حال و مستقبل سب تاریک نظر آتا، ماضی پر بڑا تاسف پیدا ہو جاتا، مستقبل بالکل تاریک نظر آتا، ہر وقت اپنی اور اہل و عیال کی تباہی کے وہم سے پریشان رہتے تھے، لکھنا پڑھنا بالکل چھوٹ جاتا، رات دن پلنگ پر بالکل خاموش پڑے رہتے اور جب بولتے تو اپنی پریشانیوں اور مستقبل کے خطرات کا رونا روتے، اور اپنی داستان سنا کر ہر شخص سے ہمدردی کے طالب ہوتے۔

ان دونوں دوروں میں ان کو اپنی کسی چیز پر قابو نہ رہ جاتا تھا، اور ان کے رفیقوں کو ان کا سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا، اس مرض کا اثر ان کی پوری زندگی پر تھا،

طبعاً بڑے سادہ مزاج بلکہ بھولے تھے، جو لوگ ان کی تصانیف کے ذریعہ ان کو جانتے تھے وہ ان سے ملنے کے بعد اس کا یقین ہی نہیں کر سکتے تھے کہ وہ ان کتابوں کے مصنف ہو سکتے ہیں۔ ان کے خیالات اور عمل کی دنیا بڑی محدود تھی، اس کے باہر وہ بہت کم قدم نکالتے تھے۔ ذاتی معاملات کے علاوہ ان کو دنیا کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہ تھی، نہ ان پر کبھی غور کرتے تھے اور نہ اس کا اثر لیتے تھے، سیاست سے ان کو کوئی لگاؤ نہ تھا، دنیا کے اہم امور و مسائل پر غور و فکر تو بڑی چیز ہے، وہ موٹے موٹے اور عامۃ الورود معاملات و مسائل کے سوا جن پر آجکل ہر صحبت میں گفتگو ہوتی ہے، دنیا کے حالات سے بالکل بے خبر تھے حتیٰ کہ دنیا کے جغرافیہ میں وہ صرف ان بڑے ملکوں اور بڑی حکومتوں کے سوا جن کو ایک عامی بھی جانتا ہے، چھوٹے چھوٹے ملکوں اور حکومتوں سے بھی واقف نہ تھے، مختلف چیزوں کے متعلق ایسے ایسے سوالات کرتے تھے، جنکو سنکر ہنسی آتی اور پرانے بھولے بھالے بزرگوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی، لیکن جب لکھنے بیٹھتے تو قلم سے موتی ٹپکتے تھے،

اخبار وہ محض بیکاری کے مشغلہ کے طور پر دیکھتے تھے، اور زیادہ تر "سنسنی خیز" پڑھتے تھے، چنانچہ پورا اخبار پڑھ جاتے تھے اور اہم سیاسی خبروں تک سے ناواقف رہتے تھے جب کسی دوسرے کی زبان سے کوئی اہم خبر سنتے تو دوبارہ اخبار کی تلاش ہوتی، سیاسی معاملات پر وہ شہر کی ایک مشہور شخصیت حاجی عبد الغفور خستہ سے جو بالکل ان پڑھ لیکن دارالمصنفین کے بڑے حاضر باش اور دنیا بھر کی خبریں لاتے رہتے ہیں، گفتگو اور تبادلہ خیالات کرتے تھے، اسوقت ان دونوں ماہروں کی گفتگو سننے کے لائق ہوتی تھی،

ان میں بعض متضاد اوصاف تھے، بعض چیزوں میں بڑے قدامت پرست اور بعض میں جدت پسند تھے۔ جدید تمدن کی اکثر چیزوں کو بہت پسند کرتے تھے اور اس پر حیرت کرتے تھے، لیکن ہندوستان کے اس دور کے کسی آدمی کی بڑائی کے قائل نہ تھے۔ ان کے نزدیک بڑائی سرسید، محسن الملک، وقار الملک، مولانا شبلی، آغا خاں، تلک، گوکھلے، سریندر ناتھ بنرجی اور گاندھی جی اور ان کے معاصرین پر ختم ہو گئی تھی، یہی رائے علما کے طبقہ اور علم کے متعلق بھی تھی، علم ان کے نزدیک پرانے یا زیادہ سے زیادہ ان کے دور کے علما پر ختم ہو گیا تھا، اور اب کوئی علمی کام کرنے کے لیے باقی نہ رہ گیا تھا، بعض پرانے طرز کے علماء کے متعلق بڑی دلچسپ اور ظریفانہ رائیں رکھتے تھے، اور ان پر بڑی دلچسپ تنقید کرتے تھے مگر اکابر میں حضرت مولانا اشرف علی کے بہت قائل تھے

مگر اسی کے ساتھ دوسرا پہلو یہ تھا کہ ہر بڑے اور صاحب وجاہت آدمی کو خواہ رئیس ہو، بڑا عہدہ دار ہو، لیڈر ہو بڑی ہیبت کی نظر سے دیکھتے تھے، جب تک وہ خود ملنے میں پیشقدمی نہ کرتا تھا، اس کے قریب جانے کی ہمت نہ کرتے، بلکہ دور سے بچوں کی طرح جھانکتے، امرا و رؤسا کے عیش و تنعم اور شان و شوکت کے واقعات بڑے شوق، دلچسپی اور حیرت کے ساتھ سنتے تھے، اور کبھی کبھی خود نواب علی حسن خاں، منشی احتشام علی، حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم کی امارت کے واقعات بیان کیا کرتے تھے جن کو سنکر ہنسی آتی تھی، نواب رامپور اور نظام حیدر آباد کے واقعات سنکر تو ان پر ایسی مسرت آمیز حیرت طاری ہوتی تھی، کہ معلوم ہوتا تھا الف لیلہ کی کسی محفل میں پہنچ گئے ہیں، انگریزی تمدن اور انگریزی حکومت کی شان و شوکت کی بنا پر انگریزوں کے بڑے مداح تھے، اور حکمرانی انگریزوں پر ختم سمجھتے، ان کے نزدیک ہندوستان و پاکستان کسی میں بھی حکومت کی اہلیت نہ تھی، ان کے ذہن میں آزادی اور غلامی کا اس کے علاوہ کوئی مفہوم نہ تھا کہ جس حکومت میں حسن انتظام شان و شوکت، امن و امان اور خوشحالی ہو،

وہی اصلی حکومت ہے ورنہ حکومت نہیں پنچایت ہے، طبعاً بڑے کمزور تھے، خطرات کے قریب نہ جاتے تھے، مگر بے خطر اور پُر امن ہنگاموں سے بڑی دلچسپی تھی، چنانچہ میلوں میں بڑے شوق سے شریک ہوتے تھے، اور اس دن گھر کے بجائے میلہ ہی کی چٹپٹی چیزیں کھاتے تھے اور کبھی کبھی ہم لوگوں کے لیے بھی خرید لاتے تھے۔

ان پر اکثر خود فراموشی طاری رہتی تھی، اس لیے سوسائٹی کے ظاہری آداب و رسوم کے پابند نہ تھے، کبھی جب موڈ میں ہوتے تو سارے آداب برتتے، نہایت عمدہ باتیں کرتے، ملنے والا سمجھتا کہ وہ واقعی مشہور مصنف مولانا عبدالسلام صاحب سے مل رہا ہے، اور کبھی دماغ بالکل غیر حاضر رہتا، مخاطب کرنے پر بھی 'اوں' کے علاوہ کوئی جواب نہ دیتے، باتیں کرتے کرتے بالکل غائب ہو جاتے، یا ایسی باتیں کرتے کہ سننے والا حیرت سے منہ تکنے لگتا یا دفعۃً اٹھکر چل دیتے، ان کے اس جذب کی بنا پر سید صاحب ان کو "بت بے پیر" فرمایا کرتے تھے اور اگر کوئی ان کو زیادہ چھیڑتا تو فرماتے

لوگ پتھر سے نہ ماریں مرے دیوانے کو

مولانا عبدالغنی صاحب پھولپوری ان کو مجذوب کہتے تھے، اور ان کے بھولے پن سے بڑا لطف لیتے تھے، ان کی سادگی، بھولے پن اور خود فراموشی کے بڑے دلچسپ واقعات ہیں مگر ان کی تفصیل تطویل کا باعث ہوگی، اس لیے ان کو قلم انداز کیا جاتا ہے۔

ان کے بعض خاص اصول و معمولات تھے، تین چار میل روزانہ شام کو ٹہلتے تھے، مگر کھلی فضا کے بجائے بازار اور آبادی میں ٹہلنا زیادہ پسند تھا اس معمول میں تنوطی دورے کے علاوہ کبھی فرق نہ آتا تھا، مگر اس کی تلافی رجائی دورے میں ہوتی تھی، اس میں ان کی سیر و تفریح بہت بڑھ جاتی، شام کے علاوہ صبح اور کبھی کبھی دوپہر کو بھی نکل جاتے تھے اور اس کے لیے بہانے

ڈھونڈھتے تھے، بازار کے سارے کام خود انجام دیتے تھے، اس میں ملازموں پر اعتماد نہ تھا، ذاتی ضروریات کی چیزیں خود خریدتے تھے، درزی کو کپڑا خود لیجا کر دیتے تھے، اور سلنے کے بعد خود ہی لاتے تھے، ڈاک خانہ میں خود روپیہ جمع کرتے تھے، اور خود ہی نکالتے تھے، حتیٰ کہ خط بھی اپنے ہاتھ سے چھوڑتے تھے۔

جاڑا ان کے لیے نہایت تکلیف دہ موسم تھا، اس سے بہت گھبراتے تھے، اور اس کے لیے بڑا اہتمام کرتے تھے، ہر سال نئی جڑاول بنواتے تھے، دن بھر اوڑھے لپیٹے رہتے تھے، اس کے باوجود ان کی سردی نجاتی تھی، گرمی بہت پسند تھی، اس موسم میں بہت بشاش رہتے تھے، کتنی ہی شدید گرمی ہو، اس کی شکایت نہ کرتے تھے، اور نہ ٹھنڈک کا کوئی انتظام کرتے تھے، حتیٰ کہ پنکھا تک استعمال نہ کرتے تھے، لو کے تھپیڑے ان کے لیے نسیم سحر سے زیادہ خوشگوار تھے، گرمیوں میں بھی رات کو رضائی اوڑھتے تھے، کپڑا معمولی قیمت کا بھڑکدار پسند تھا، گرمیوں میں بڑے بوٹوں کی چکن یا شوخ پھولدار کپڑے کی شیروانی پہنتے تھے، اور جاڑے میں کشمیرے یا چھینٹ کی، استعمال کرتے تھے، مگر قمیص ہمیشہ موٹی پہنتے تھے، بنین کرتہ پسند نہ تھا، جاڑوں میں اونی چادر سر سے لپیٹے رہتے تھے، جس میں منہ بھی چھپ جاتا تھا، رضائی بھڑکیلی شوخ رنگ کی ہوتی تھی، جاڑوں میں پائجامہ اونی استعمال کرتے تھے اور ایک ہی پائجامے میں پورا جاڑا گذار دیتے تھے، جو کثرت استعمال سے کبھی کبھی اسقدر گھس جاتا تھا کہ صرف تانا بانا رہ جاتا تھا، اکثر ایسے پھولدار اور شوخ رنگ کے کپڑے بنواتے کہ اس زمانہ کے بچے بھی اس کو استعمال کرنا پسند نہیں کرتے، اگر کوئی شخص ٹوکتا تو جواب دیتے تم بدمذاق ہو کپڑا وہی ہے جو دوسروں کی نگاہ میں آئے۔

کھانے پینے میں چٹپٹی چیزیں زیادہ مرغوب تھیں، بازار کے کباب اور چاٹ بہت پسند کرتے تھے، اور کبھی کبھی اس قسم کی چیزیں بازار جاکر کھاتے تھے، چائے عمر بھر استعمال کی مگر اس کے عادی مطلق نہ ہوئے، اگر وقت پر ان کو چائے نہ ملتی تو ان کو کوئی تلاش نہ ہوتی، پانی ہر موسم میں

ٹھنڈا پسند تھا، جاڑوں میں بھی باسی پانی پیتے تھے، پھلوں میں امرود بڑے شوق سے کھاتے تھے۔

مراق اور ریاح باسوری کی شکایت کے سوا ان کی عام صحت بہت اچھی تھی، بہت کم بیمار پڑتے تھے، اور بیماری بھی بہت معمولی ہوتی تھی، بیماری میں علاج کے قائل نہ تھے، معمولی نزلہ زکام کو تو وہ خاطر میں بھی نہ لاتے تھے، اور نہ کوئی پرہیز کرتے تھے، اس عمر میں بھی معدہ صحیح اور غذا اچھی تھی، اور کھانے پینے میں کوئی احتیاط نہ کرتے تھے، چار پانچ میل آسانی سے چل لیتے تھے، مگر مراق کے دورے کے زمانہ میں ان پر بیماری اور موت کا بڑا ہراس طاری ہو جاتا تھا، اس زمانہ میں وہ موہومہ خطرات کے مقابلہ اور بیماری و موت کے لیے روپیہ جمع کرتے تھے، میں کہا کرتا تھا کہ آخر موت کے لیے اتنے انتظامات کی کیا ضرورت ہے، کیا اس کے لیے بھی دھوم دھام کی ضرورت ہوگی، جواب دیتے کہ اگر میں بے کار ہو گیا تو کیا ہوگا، یہ عجیب اتفاق ہے کہ اگر موت اس وقت آئی جب ان پر زندگی ہی زندگی برستی تھی، اور ان کے علاج میں ایک حبہ بھی صرف ہونے کی نوبت نہ آئی، انتقال کے کئی مہینے پیشتر سے ان پر نشاط کا دورہ تھا، ہر وقت شاداں و فرحاں رہتے تھے۔ ان کی وفات سے کچھ پہلے اعظم گڈھ میں بڑی طوفانی بارش ہوئی تھی، اس میں وہ گھومنے نکل جاتے تھے، اگر ٹوکا جاتا تو جواب دیتے کہ اس موسم سے لطف اٹھانے کا یہی طریقہ ہے، سفر سے بہت گھبراتے تھے، مگر اس دورے میں سفر کا شوق بھی پیدا ہو گیا، اور اپنے پرانے رفیق مولانا ابوالکلام سے ملنے کے لیے دلی جانے والے تھے، راستہ میں لکھنؤ اور دلی ٹھہرنے کا بھی ارادہ تھا، اس کے لیے کئی مہینے سے بڑی تیاریاں کر رہے تھے، ہر جگہ کے لیے نئے شیروانی اور جوتے کے الگ الگ جوڑے بنوائے تھے معلوم ہوتا تھا کہ لندن کے سفر کی تیاریاں ہیں، خط لکھ کر مولانا ابوالکلام سے سفر کی تاریخ بھی طے کر چکے تھے، کہ عین اس حالت میں سفر آخرت پیش آگیا، اور یہ حادثہ ایسا ناگہانی ہوا کہ اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا، بالکل اچھے خاصے تھے، کسی قسم کی کوئی شکایت نہ تھی، ۳۰ر اکتوبر ۵۶ء کو سارے معمولات

پورے کیے، حتیٰ کہ سہ پہر کو شہر گھومنے گئے، رات کا کھانا کھا کر اچھے بھلے سونے کے لیے لیٹے، ہو بجے شب کو استنجے کے لیے اٹھے، غسلخانہ سے پانی لیا، غسلخانہ سے نکلتے ہی قلب کا دورہ پڑ گیا، لوٹا ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا، میں قریب ہی سویا ہوا تھا، مجھے آواز دی، میں اٹھا تو وہ زمین پر بیٹھے ہوئے تھے، میں نے پوچھا خیریت ہے، کیسا مزاج ہے، فرمایا میرے پاؤں جواب دے رہے ہیں اور تنفس ہو رہا ہے، میں نے پکڑ کر تخت پر جو قریب ہی بچھا ہوا تھا بٹھایا، کہا مجھ سے بیٹھا نہیں جاتا لٹا دو، میں نے برآمدہ سے لیجا کر اپنے کمرہ میں پلنگ پر لٹا دیا، مجھے صورت حال کی نزاکت کا مطلق اندازہ نہ ہوا، میں سمجھا کہ جس طرح کبھی کبھی چکر آجاتا تھا، آگیا ہوگا، تھوڑی دیر میں طبیعت سنبھل جائے گی، مگر ان کا وقت پورا ہو چکا تھا، پلنگ پر لٹاتے ہی دو چار لمبی سانسیں لیں اور ختم ہو گئے، دارالمصنفین کے احاطہ کے لوگ بھی اس وقت پہنچے جب وہ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔

اپنی نیکی، بے نفسی اور سادگی اور بے تکلفی کی وجہ سے ہر طبقہ میں یکساں مقبول تھے، لوگ انکی عزت ہی نہیں، ان سے محبت کرتے تھے، اس لیے ان کی موت کا عوام و خواص دونوں یکساں متاثر ہوئے بلکہ غربا، اور عوام زیادہ متاثر تھے، عموماً بڑے لوگوں کا غم بڑے طبقہ تک محدود رہتا ہے، اور وہ بھی حقیقی سے زیادہ رسمی ہوتا ہے، غربا، اور عوام کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی، موت درحقیقت وہی ہے جس پر غریب اور دردمند طبقہ کی آنکھیں اشکبار ہو جائیں، اس اعتبار سے مولانا کی موت بڑے آدمیوں کی موت سے بڑھ کر تھی، ان کی موت پر غریبوں کی آنکھیں اشکبار تھیں، ان کی وفات پر بہت سے تعزیتی خطوط آئے، مگر سب سے زیادہ موثر تعزیت ادنیٰ طبقہ کے ایک غریب شخص کی تھی، اس نے کہا "مولوی صاحب بڑے بھلے مانس رہیں، اب بنگلوا (دارالمصنفین) کھالی ہوے گوا"۔ اس کا یہ تاثر بالکل صحیح تھا، اس لیے کہ اب واقعی دارالمصنفین میں اس طبقہ سے انسانیت اور ہمدردی کا برتاؤ کرنے والا کوئی نہ رہ گیا تھا، ان کی یہ مقبولیت انشاءاللہ عالم آخرت میں ان کی مقبولیت

کا ذریعہ ہوگی،

ان میں بعض اوصاف ایسے تھے کہ اس زمانہ میں ناپید ہیں، آجکل کتنے تسبیح و مصلیٰ والے ایسے ہیں جن کا دامن حقوق العباد سے پاک و معاملات میں صاف ہو اور جن سے کسی انسان کو ایذا نہ پہنچی ہو، مولانا عبد السلام صاحب کا دامن ان تمام معاملات میں معصوم بچوں کی طرح بے داغ تھا، انکے ذمہ کسی کا ادنیٰ حق بھی نہ تھا، بلکہ اپنی حق تلفی پر بھی وہ خاموش رہتے تھے، ان کی ذات سے کسی کو ادنیٰ تکلیف بھی نہیں پہنچی، یہ معمولی بات نہیں ہے، اس زمانہ میں اس کی مثالیں کم ملیں گی انکے مضامین اور ان کی مذہبی کتابوں سے بہتیرے مسلمانوں کو ہدایت حاصل ہوئی اسلئے انشاء اللہ ان کے یہ نیک عمل رائیگاں نہ جائیں گے، باقی بشری کمزوریوں سے کوئی انسان بھی مستثنیٰ نہیں ہے، اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ہے، امید ہے کہ وہ ان الحسنات یذھبن السیات کے اصول پر ان کی نیکیوں کے طفیل میں ان کی کمزوریوں سے درگذر فرمائے گا،

وہ اگرچہ ضعف پیری کی وجہ سے کئی سال سے کام کے لائق نہ رہ گئے تھے مگر انکی موجودگی ہی سے ایک علمی وزن تھا، اور علمی مشکلات میں ان سے بڑی مدد ملتی تھی، اب کوئی شخص ایسا نہیں رہ گیا جس پر اعتماد کیا جا سکے اور جس کی جانب رجوع کیا جا سکے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

حکمائے اسلام

(جلد دوم)

یہ سلسلہ حکمائے اسلام کی دوسری جلد ہے، اس میں ابن باجہ، ابن طفیل ابن رشد، امام رازی، مغلوں اور تاریوں کے عہد کے حکما، خاندان فرنگی محل، خاندان خیرآباد اور دوسرے خاندانوں کے حکما و فلاسفہ کے حالات ہیں اور انھوں نے فلسفہ و حکمت کے ذریعہ اسلام کی جو خدمات انجام دیں اسکی تفصیل ہے۔

مولفہ مولانا عبد السلام ندوی، قیمت ۲۲ روپے

مینیجر

دیوان حافظ میں الحاق

از جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب، لکھنؤ یونیورسٹی

دیوان حافظ میں الحاق یوں تو اگر زیادہ تفحص و تحقیق سے کام لیا جائے تو شاید ہی کوئی شاعر یا ادیب ایسا ملے گا جس کا کلام الحاق سے پاک ہو، لیکن حافظ کے کلام میں جتنا الحاق ہے اس کا حصر و انداز تقریباً محال ہے، علامہ مرزا محمد قزوینی[1] نے بالکل صحیح لکھا ہے:

> در دنیا، ہیچ دو نسخہ از دیوان حافظ با یکدیگر مطابقت ندارند نہ در متن اشعار یعنی در سوق عبارات و جمل و کلمات و نہ در عدۂ غزلیات یا ابیات ہر غزلی و بعبارۃ اخری نہ در کمیت اشعار و نہ در کیفیت آنہا، و این اختلاف نسخ در مورد دیوان خواجہ بخصوص فی الواقع بحدی است کہ شخص متتبع را کہ غرض او فقط مطالعہ و تمتع از اشعار خود خواجہ باشد نہ اشعار الحاقی دیگراں کہ بتدریج عدۂ زیادی از آنہا در دیوان خواجہ داخل شدہ یا اشعاری کہ گرچہ در اصل از خود خواجہ بودہ ولی بعدہا بمرور ایام در نتیجۂ تصرفات بے حد و شمار نساخ از صورت اصلی تغییر یافتہ و دگرگوں شدہ بکلی عاجز متحیر و سرگرداں میکند۔

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ خواجہ حافظ کے دیوان کے الحاق کی تین صورتیں ہیں:

(۱) خواجہ کے اشعار مرور ایام کے ساتھ محرف ہو گئے، کاتبوں کے لیے حافظ کے زمانے

---

[1] دیوان حافظ باہتمام مرزا محمد و دکتر قاسم غنی، مقدمہ ص "کو"۔ یہ دیوان ۸ نسخوں کی مدد سے ۱۳۲۰ شمسی میں کتاب فروشی زوار کی طرف سے شائع ہوا، دیوان ظاہری اور باطنی خوبیوں سے آراستہ اور قابل دید ہے۔

کے بعض کلمے اور اصطلاحیں ناقابل فہم ہو گئی تھیں جن کو انھوں نے مانوس لفظوں سے تبدیل کر دیا۔
حافظ کی شہرت ان کے زمانے میں جس قدر تھی، اس سے کہیں زیادہ زمانۂ مابعد میں ہوئی، اور
جوں جوں زمانہ گزرتا گیا یہ شہرت عالمگیر ہوتی گئی، اور عالم و جاہل، عارف و عامی، وضیع و شریف
ہر طبقہ میں ان کا کلام حد سے زیادہ مقبول ہوا، اس کے نتیجے میں ان کے دیوان کے بہ کثرت
نسخے طبع و مشتہر ہوئے، اس لیے قدیم زمانے سے لیکر اس وقت تک مستقلاً اس میں طرح طرح
کے تصرفات ہوتے رہے. شاعر کی زبان اور نساخ کی زبان میں فرق ہونے کی بنا پر کاتبوں نے
"تغیرات و تبدیلات"، "اصلاحات" و "تصحیحات" سے کام لیا، اور صرف کاتبوں اور نساخوں
سے یہ "عمل" میں نہیں آیا بلکہ مطالعہ کرنے والوں نے بھی حق مطالعہ ادا کیا، اپنی عقل و فہم کے
مطابق جو کلمے اور فقرے ان کی سمجھ میں نہیں آئے، ان کو تبدیل کر دیا، چنانچہ حافظ کے قدیم و
جدید نسخوں کے مقابلہ سے یہ بات پوری طرح ظاہر ہو جاتی ہے کہ قدیم نسخوں میں جو غیر مفہوم و
غیر مانوس کلمے پائے جاتے ہیں، وہ جدید نسخوں میں متداول و مفہوم کلموں سے تبدیل ہو گئے
ہیں، یہ عمل صرف دیوان حافظ تک محدود نہیں، بلکہ سارے متون قدیمہ میں ہوا، خصوصاً
جو متون جس قدر زیادہ مقبول اور ادبی شاہکار متصور ہوئے ہیں، ان میں بجا و بیجا اسی قدر
تصرفات ہوئے ہیں. حافظ کے دیوان سے اس کی بعض مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

نسخ قدیمہ میں ایک بیت اس طرح پائی جاتی ہے۔

خوش وقت بوریا و گدائی و خواب امن کاین عیش نیست درخور اورنگ خسروی

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "خوش وقت بوریا" غیر مفہوم یا غیر مانوس معلوم ہوا، اسلیے
اس کو "خوش فرش بوریا" سے تبدیل کر دیا، چنانچہ نسخ جدیدہ میں اس طرح ہے۔

---

[1] دیوان حافظ مصححہ مرزا محمد و دکتر قاسم غنی۔

خوش فرش بوریا و گدائی و خواب امن

اسی طرح قدیم نسخوں کی یہ بیت:

دانی کہ چنگ و عود چہ تقریر میکنند پنہاں خورید بادہ کہ تعزیر میکنند

جدید نسخوں میں اس طرح بدل گئی:

پنہاں خورید بادہ کہ تکفیر می کنند

اس لیے کہ تقریر کے مقابلہ میں تکفیر عام فہم ہے،

اسی طرح ان دو بیتوں میں:

خیز تا خرقۂ صوفی بخرابات بریم شطح و طامات بباز ار خرافات بریم

طامات و شطح در رہ آہنگ چنگ نہ تسبیح و طیلساں بمیٔ خوشگوار بخش

"شطح" کا لفظ عام فہم نہ تھا، اس لیے جدید نسخوں میں اسے "زرق" سے تبدیل کر دیا گیا ہے۔

یا اس بیت میں

یار دلدار من ار قلب بدینساں شکند ببرد زود بجانداری خود پادشہش

کلمہ "جانداری" پوری طرح سمجھ میں نہیں آیا، اس لیے ناسخوں نے اسے "سرداری" سے بدل دیا ہے۔

اس بیت میں

زہد رندان نو آموختہ راہی بہیست من کہ بدنام جہانم چہ صلاح اندیشم

قدیم نسخوں میں "بہ ہیست" ہے، چونکہ ناسخ کو "راہی بہیست" نامانوس معلوم ہوا اس لیے اس نے اسے "راہی بدنیست" سے بدل دیا،

اسی طرح کے تصرفات سے سارا دیوان بھرا پڑا ہے۔

(۲) دوسری تحریف یہ ہوتی ہے کہ کسی شاعر کی غیر معمولی شہرت اور اس کے دیوان کے

کثرت منتشر ہونے کی بنا پر اس میں دوسرے شاعروں کے کلام کے داخل ہونے کا موقع زیادہ ہوتا ہے، اس کی بہت سی صورتیں ہوتی ہیں، کبھی غیر معمولی شہرت کی بنا پر دوسروں کے اشعار اس کی طرف منسوب ہوجاتے ہیں، کبھی دو شاعروں کی ہم ردیف و قافیہ غزلیں ایک دوسرے کے دیوان میں شامل ہوجاتی ہیں، دیوان حافظ میں اس طرح کے الحاق کی مثالیں بھی کثرت[1] سے ملتی ہیں۔

حافظ کی ایک مشہور غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے:

رونق عہد شباب است دگر بستاں را ۔۔۔ میرسد مژدۂ گل بلبلِ خوش الحاں را

اسی زمین میں سعدی کی بھی غزل ہے، اس کا یہ شعر حافظ کی غزل میں شامل ہوگیا۔

ملک آزادگی کنج قناعت گنجیست ۔۔۔ کہ بشمشیر میسر نشود سلطاں را

یا سعدی کا یہ مشہور شعر

باز آکہ در فراقِ تو چشمِ امید وار ۔۔۔ چوں گوشِ روزہ دار بر اللہ اکبر است

حافظ کی اس غزل کے ساتھ ملحق ہے:

باغ مرا چہ حاجتِ سرو صنوبر است ۔۔۔ شمشاد خانہ پرور ما از کہ کمتر است

یا مثلاً سعدی کے دو مصرعے حافظ کی ان دو بیتوں میں پائے جاتے ہیں:

سر پیوند تو تنہا نہ دل حافظ راست ۔۔۔ کیست آنکس سر پیوند تو در خاطر نیست

گہ گذارتا زشارعِ میخانہ بگذریم ۔۔۔ کز بہر جرعۂ ہمہ محتاج ایں دریم

امکان اس کا بھی ہے کہ حافظ نے پہلی غزل کے مقطع میں اور دوسری غزل کے مطلع میں

---

[1] یہ مثالیں دیوان حافظ مرتبۂ خلخالی (دیباچہ ص کر۔کو۔کز) سے ماخوذ ہیں۔ خلخالی نے ۸۲۷ھ کے لکھے ہوئے نسخے سے مرتب کیا ہے، اور یہ سب سے قدیم نسخہ ہے جو ابھی تک دریافت ہوا ہے، اس نسخے کی اشاعت نے حافظ کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے میں بڑی سہولت پیدا کی ہے، یہ ۱۳۰۶ شمسی میں طہران سے شائع ہوا ہے۔

(پہلے مصرع) سعدی کے مصرعوں پر تضمین کی ہو۔ کیونکہ قدیم نسخوں[1] میں بھی وہ مصرع موجود ہیں۔

یا مثلاً یہ دونوں غزلیں جن کے حسب ذیل مطلعے و مقطعے حافظ کے قدیم دیوان میں تو نہیں لیکن جدید نسخوں میں پائے جاتے ہیں اور یہی غزلیں خواجو کے قدیم نسخے میں (خصوصاً وہ نسخہ جو ۷۲۹ھ کا لکھا ہوا ہے) پائی جاتی ہیں، اس لیے وہ خواجو ہی کی ملکیت قرار پائیں گی:

چو جام لعل تو نوشم کجا بماند ہوش چو چشم مست تو بینم مرا کہ دارد گوش

مرا چو خلوت سلطان عشق میدادند ندا زدند کہ خواجو خموش باش خموش

روز عیش و طرب ماہ صیام است امروز کام دل حاصل و ایام بکام است امروز

گو بگوئید کہ در دیر مغان خواجو را دست در گردن و لب بر لب جام است امروز

حسب ذیل تین غزلیں جنکے مطلعے و مقطعے درج ہیں حافظ کے قدیم نسخوں میں نہیں ہیں، اور سلمان ساوجی کے خطی نسخے میں جو نویں صدی ہجری کا ہے، موجود ہیں، اس لیے ان کو حافظ کے جدید دیوان میں الحاقی سمجھنا چاہیے،

ز باغ وصل تو جوید ریاض رضوان آب ز تاب ہجر تو دارد شرار دوزخ تاب

مرا بدر رخت شد یقین کہ جوہر لعل پدید میشود از آفتاب عالم تاب

زلفین سیہ خم بخم اندر زدہ باز وقت من شوریدہ بہم بر زدہ باز

شہباز غمت راست کبوتر دل سلمان دریاب کہ بر صید کبوتر زدہ باز

میکشم ہر نفس از دست فراقت فریاد آہ اگر نالۂ زارم نرساند بتو باد

در از آں کم نشنو و نالہ سوزم باری بیم آنست کہ سیلاب رود در بغداد

آقائے ملک الشعراء بہار[2] اس غزل کو بھی سلمان کی طرف منسوب کرتے تھے۔

---

[1] دیوان خ غزل نمبر ۲۹، ۳۱۹ [2] ملاحظہ ہو حاشیہ نسخہ خ ص ک [3] دیوان خ دیباچہ ص "ق" حاشیہ نمبر۲۔

گفتم کہ خطا کردی و تدبیر نہ این بود

حسب ذیل غزل عماد فقیہ کے دیوان مکتوبہ ۸۴۳ھ میں موجود ہے، اور حافظ کے قدیم نسخوں میں نہیں ہے، اس لیے اس کو حافظ کی ملکیت قرار نہیں دیا جا سکتا۔

تا سایۂ مبارکت افتاد بر سرم		دولت غلام من شد و اقبال چاکرم

یہ مشہور غزل جس کا یہ مصرع ہے

لطف باشد گر نپوشی از گدایاں روت را

حافظ شانہ تراش کی ہے، کیونکہ بقول "سودی"[1] اس کے سارے اشعار اسی طرح کے صنائع شعری کے حامل ہیں، اور حافظ کے قدیم نسخوں میں نہیں ہے، مگر جدید نسخوں میں ہے

حسب ذیل غزل بھی حافظ کی نہیں بلکہ ملک جہاں[2] خاتون کی ہے۔

غمش تا در دلم ماوا گرفتست		سرم چوں زلف او سودا گرفتست

ز دریای دو چشم گوہر اشک		جہاں در لؤلؤ لالا گرفتست

اسی طرح یہ مشہور غزل جو حافظ کے قدیم دیوان میں موجود نہیں، عبد المجید[3] کی ہے۔

اگر ز کوی تو بوی بمن رساند باد		بمژدہ جان جہاں را بباد خواہم داد

یہ غزل روح الامین کی طرف منسوب ہے[4]:-

---

[1] دیوان خ دیباچہ ص کو "حاشیہ نمبر ۳" [5] "سودی" ترکی کا بڑا زبردست عالم گزرا ہے جس نے فارسی و عربی میں بڑا نام پیدا کیا تھا، اس نے حافظ کے دیوان کی ایک بڑی مبسوط شرح لکھی تھی جو ۱۲۵۰ھ میں بولاق مصر سے شائع ہوئی، یہ شرح ۱۰۰۰ھ میں مکمل ہوئی تھی، سودی غالباً پہلا مصنف ہے جس نے دیوان حافظ میں دقت نظر توجہ کی ہے، مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، دیوان مرزا قزوینی دیباچہ ص قو۔ قز، [2] ۱۰ دیوان خ دیباچہ ص ؛ [3] ۱۱ اور دے بیاض ملوک آقائے نفیسی [4] ایضاً [5] ایضاً

گفتند خلایق کہ توئی یوسف ثانی　　چو نیک بدیدم بحقیقت بہ ازانی

حسب ذیل غزل امیر خسرو دہلوی کی ہے[1]:

بفراغ دل زمانی نظری بماہروئی　　بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ عمر ہای ہوئی

یہ مشہور بیت کمال خجندی کی طرف منسوب ہے:

جانب دلہا نگاہ دارکہ سلطاں　　ملک نگیرد اگر سپاہ ندارد

یہ مشہور ساقی نامہ خواجو کرمانی کا ہے:

بتا شیر صبح از طبقہای نور　　بگوش آیدم ہر دم از لفظ حور

ان مشکوک غزلیات و ابیات کے علاوہ بھی جس کو عام طور پر حافظ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، بہت سی غزلیں، قصیدے، ترکیب بند، ترجیع بند، حافظ کے دیوان کے قدیم ترین نسخوں میں نہیں پائے جاتے۔ اس بنا پر ان کی ملکیت بھی مجہول و مشتبہ قرار دیجائے گی۔

سید عبد الرحیم[2] خلخالی نے ابیات مشکوک کے سلسلے میں خاتمے میں لکھا ہے:

"بیش ازیں دریں موضوع اطالۂ کلام را سزاوار ندانستہ ابیاتی چند از اسانیہ غزل کہ از حیث وزن و قافیہ تا حدی از حیث مضمون نیز با یکدیگر موافق ہستند و بتوان گفت کہ اقتباس از یکدیگر کردہ یا توارد است شروع میکنم و اگر صاحبان ذوق و دانشمندان توجہ فرمایند تصدیق خواہند کرد کہ ہمیں توافق وزن و قافیہ در اشعار شعرا موجب ایں ہمہ اختلافات و اشتباہات شدہ کہ امروز تمیز و تشخیص را مشکل کردہ است۔"

اس کے بعد حافظ کی ۳۵ غزلوں کے مطلعے لکھے[3] ہیں اور ساتھ ہی سعدی، خواجو، عماد، رضی سمرقندی، سلمان، جلال، میر کرمانی، عبید زاکان، عبد المجید، سید عضد الدین، شمس الدین محمود،

---

[1] دیوان امیر خسرو کے ایک قدیمی قلمی نسخے میں یہ غزل مع تخلص کے شامل ہو (حاشیہ دیوان خ ص کز) [2] دیباچہ ص کز [3] ایضاً ص کح، کط، ل، لا، لب، لج، لد، لہ

شیخ جنید، جہاں ملک خاتون، ظہیر فاریابی، روح الامین، عراقی عتیق، شہاب الدین نزاری
افتخار، دامغانی، کی ہموزن وہم ردیف وقافیہ غزلوں کے مطلعے بھی درج کر دیئے ہیں[1]،

(۳) صفوی عہد میں جب مذہبی تعصب و تنگ نظری کا غلبہ ہوا تو شاہ اسمٰعیل صفوی
نے خواجہ حافظ کی قبر کی تخریب کا ارادہ کیا، اس وقت حافظ کے بعض بہی خواہوں نے حافظ
کے دیوان میں ایسی نظموں کا اضافہ کر دیا جس سے حافظ کا تشیع پوری طرح ثابت ہو جائے،
مرزا محمد قزوینی نے کئی جگہ اس[2] کی طرف اشارہ کیا ہے،

باوجود اینکہ این قصیدہ و این غزل از بہترین اشعار نیست مع ذالک برای نجات
اخروی خواجہ باید آرزو کرد کہ ہر دو از خواجہ باشد و الحاقی از بعضے ہوا خواہان خواجہ در عصر
صفویہ برای نجات دادن مقبرۂ او از تخریب متعصبین شیعہ نباشد۔

ایک دوسری[3] جگہ لکھتے ہیں:

"بدون شک الحاقی می باشد از متاخرین در عہد صفویہ بقصد اینکہ خواجہ را نظر
بعضے مصالح شیعہ قلمداد کنند"

یا ڈاکٹر محمد معین "حافظ شیریں سخن[4]" میں رقمطراز ہیں:

"وہمیں غزل بقول مولفان مجالس المومنین و زینۃ التواریخ و لطیفہ غیبیہ باعث
آں شد کہ شاہ اسمٰعیل قبر خواجہ را تخریب نماید"

اس مصلحتی الحاق کا یہ نتیجہ ہوا کہ متعدد غزلیں اور قصیدے حافظ کے دیوان میں ایسے شامل ہو

---

[1] مرزا محمد قزوینی نے دیباچہ میں بہت سی غلطیوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو دیوان خلخالی میں بھی موجود ہیں اور جو کاتبوں کی غفلت، سہو اور طغیان قلم کا نتیجہ ہیں، (ص مح، مسط۔ ن، تا، تب) [2] دیوان حافظ مرتبہ خلخالی کی تقریظ میں جو بیست مقالہ قزوینی ج ۲ ص ۱۰۱ تا ۱۰۲ میں مندرج ہے، یہ فقرے ص ۱۰۱ میں ہیں [3] مقدمۂ دیوان حافظ ص قز [4] ص ۳

جن میں ایک طرف تو حضرت علیؓ و اہل بیت اطہار سے غیر معمولی عقیدت تھی، تو دوسری طرف خلفاے راشدین پر سب ولعن، لیکن اس طرح کی کوئی نظم قدیم نسخوں میں نہیں پائی جاتی، ذیل میں ان الحاقی چیزوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے،

دیوان حافظ کے دیباچے میں نعت پیغمبر اس بیت پر ختم ہوتی ہے:

مستغرق درود و ثنا باد روح شان تا روز را فروغ بود و شمع را شعاع

اس کے بعد تمام مطبوعہ اور بعض جدید خطی نسخوں میں اس عبارت کا اضافہ ہے:۔

خصوصاً امام المشارق والمغارب جامع اصناف حقایق و معارف قائل کلمۂ "انا کلام اللہ الناطق" اسد اللہ الغالب علی ابن طالب۔

شہنشہی کہ سحرگاہ روز فطرت بود غرض وجود شریفش زخلقت انسان

مکرمی کہ ز لطف قدیم لم یزلی حدیث منقبتش گشتہ زیور قرآن

امیر ملک ولایت کہ شد ز مبداء حال برای مدحت او مستعد نطق زبان

لیکن قدیم نسخوں میں سے کسی ایک میں اس الحاق کا نام و نشان نہیں، جیسا کہ مرزا محمد نے تصریح کی ہے،[1] اور اس کے الحاقی ہونے کا فیصلہ کر دیا ہے،

ایک الحاقی قصیدے کے چند شعر ملاحظہ ہوں،

مقدریکہ ز آثار صنع کرد اظہار سپہر و مہر و مہ و سال و ماہ و لیل و نہار

---

[1] مقدمہ دیوان ص حز حاشیہ مرزا محمد لکھتے ہیں: در بعضی نسخ خطی جدید و در اغلب نسخ چاپی ... عبارت ذیل را علاوہ دارند .... ولی در ہیچیک از نسخ قدیم مانند چن و ہندی و ملک و نسخۂ آقای رشید یاسمی و نسخہ آقای وہبر خاقان و نسخۂ آقای تقوی شمارہ ۲ ہیچ وجہ من الوجوہ از جملہ مزبور اثری نیست و بدون شک الحاقی باشد الخ

جن میں ایک طرف تو حضرت علیؓ و اہل بیت اطہار سے غیر معمولی عقیدت تھی، تو دوسری طرف خلفائے راشدین پر سب ولعن، لیکن اس طرح کی کوئی نظم قدیم نسخوں میں نہیں پائی جاتی، ذیل میں ان الحاقی چیزوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے،

دیوان حافظ کے دیباچے میں نعت پیغمبر اس بیت پر ختم ہوتی ہے :

مستغرقِ درود و ثنا باد روحِ شاں ‎ ‎ تا روز را فروغ بود شمع را شعاع

اس کے بعد تمام مطبوعہ اور بعض جدید خطی نسخوں میں اس عبارت کا اضافہ ہے:-

خصوصاً امام المشارق والمغارب جامع اصناف حقایق و معارف قائل کلمۂ انا کلام اللہ الناطق" اسد اللہ الغالب علی ابن طالب ۔

شہنشہی کہ سحرگاہ روز فطرت بود ‎ ‎ غرض وجود شریفش ز خلقت انسان

کریمی کہ ز لطف قدیم لم یزلی ‎ ‎ حدیث منقبتش گشتہ زیور قرآن

امیر ملک ولایت کہ شد ز مبدا حال ‎ ‎ برای مدحت او مستعد نطق زبان

لیکن قدیم نسخوں میں سے کسی ایک میں اس الحاق کا نام ونشان نہیں، جیسا کہ مرزا محمد نے تصریح کی ہے[1]، اور اس کے الحاقی ہونے کا فیصلہ کر دیا ہے،

ایک الحاقی قصیدے کے چند شعر ملاحظہ ہوں؛

مقدریکہ ز آثار صنع کرد اظہار ‎ ‎ سپہر و مہر و مہ و سال و ماہ و لیل و نہار

---

[1] مقدمہ دیوان ص حز حاشیہ مرزا محمد لکھتے ہیں؛ در بعضی نسخ خطی جدید و در اغلب نسخ چاپی ... عبارت ذیل را علاوہ دارند ...... ولی در ہیچیک از نسخ قدیم مانند چن و ہندی و ملک و نسخہ آقای رشید یاسمی و نسخہ آقای دبیر خاقان و نسخۂ آقای تقوی شمارہ ۲ بہیچ وجہ من الوجوہ از جملہ مزبور اثری نیست و بدون شک الحاقی باشد الخ

بدوستی نبی و ولی اساس نہاد	جہان و ہرچہ در وہست خالق جبار
اگر نہ ذات نبی و ولی بدی مقصود	جہاں بکتم عدم رفتی بہیچو دل بار
نوشتہ بر در فردوس کاتبانِ قضا	نبی رسول ولی عہد حیدر کرار
امام جنی و انسی علی بود کہ علی	ز کلِ خلق فزون است از صغار و کبار
علی امام و علی امین و علی ایمان	علی امین و علی سرور و علی سردار
علی علیم و علی عالم و علی اعلم	علی حکیم و علی حاکم و علی گفتار
بحق دین محمد بخونِ پاک حسین	بحق دو دہ نیک مہاجر و انصار
زبہر آنکہ حسن ست و حسین محبت او	مجوی جہل بدین کار مومن دیندار
بدشمنان منشین حافظا تو لا کن	نجات خویش طلب کن بجان ہمت اتیار
حرام زادہ و بدفعل و شوم و بے بنیاد	بمدح شاہ جہان کے کند یکی گفتار
متابعت بمنافق چو میکنی بگذر	ز بد و گفتن نامش بخور استغفار

یہی وہ قصیدہ ہے جس کے الحاقی ہونے کا فیصلہ مرزا محمد[1] اور غنی[2] دونوں کر چکے ہیں۔
ڈاکٹر محمد معین کے قلم سے یہ فیصلہ[3] اس طرح ہوا ہے

این قصیدہ و بنیانش بسیار سست در نسخ قدیمہ موجود نیست و علاوہ در آخرش

دو بیت این ست...... از عارفی ہمچو حافظ بسیار بعید است کہ چنین سب و طعن را در اشعار

خود وارد کند۔

---

[1] مرزا محمد نے اس کو بہت سست اور رکیک کہا ہے، ان کی پوری عبارت قصیدہ کے ضمن میں نقل کیا گیا

[2] دیوان خ دیباچہ ص ی [3] حافظ شیرین سخن ص ۱۱۱ ۔ ۳۱۲، اسکے باوجود ڈاکٹر صاحب اس کو

حافظ کے قصائد میں شامل کرنے میں تامل نہیں کرتے (ایضاً ص ۴۸۶)

حسب ذیل غزل جو شاہ منصور کی مدح میں واقع ہے، اس کے آخر میں ایک بیت کا اضافہ[1]؛

جوزا سحر نہاد حمائل برابرم یعنی غلام شاہم و سوگند میخورم
حافظ زجاں محب رسول ست و آل او براین سخن گواست خداوند اکبرم

اس غزل میں حسب ذیل بیت سے غالباً کاتب کو سخت دھوکا ہوا، اور اس نے اس نظم کو حضرت علیؓ کی مدح میں سمجھ کر متذکرۂ بالا بیت کا الحاق کر دیا:

راہم مزن بوصف زلال خضر کہ من از جام شاہ جرعہ کش حوض کوثرم

حالانکہ اس بیت میں "شاہ" سے مراد شاہ منصور ہے، نہ کہ حضرت علیؓ، جیسا کہ مطلع میں "غلام شاہم" شاہ منصور ہی کے لیے آیا ہے، ڈاکٹر محمد معین[1] بھی اس راے سے متفق ہیں،

حسب ذیل پوری غزل الحاقی ہے، کسی قدیم نسخے میں نہیں، اگرچہ مرزا محمد جیسے شخص کو اس کے الحاقی ہونے پر افسوس ہے[2]،

ای دل غلام شاہ جہاں باش و شاد باش پیوستہ در حمایت لطف الہ باش

"یوسف گم گشتہ" والی غزل میں حسب ذیل بیت الحاقی ہے، کسی قدیم نسخے میں نہیں پائی جاتی ڈاکٹر محمد معین[3] بھی اس کو الحاقی بتاتے ہیں:

گر توئی از جان غلام شاہ مرداں غم مخور شمع جمع آفرینش شاہ قنبرست و بس

یہ بیت بھی الحاقی ہے، اس لیے کہ کسی قدیم نسخے میں موجود نہیں، علاوہ بریں حافظ کے مسلک صلح کل کے بالکل متضاد ہے:

بگو بسوز کہ مہدی دیں پناہ آمد کجاست صوفی دجال چشم ملحد شکل

---

[1] حافظ شیریں سخن ص ۳۱۲ [2] ان کا قول درج ہو چکا ہے، بیست مقالہ قزوینی ج ۲ ص ۱۰۱،

[3] حافظ شیریں سخن ص ۳۱۲

غرض ان مختلف وجوہ کی بنا پر حافظ کے کلام میں رطب و یابس بہت زیادہ موجود ہے، سید عبد الرحیم خلخالی کو ایک نسخہ ۸۲۷ھ کا لکھا ہوا یعنی وفات حافظ سے ۳۵ سال بعد کا مل گیا، انھوں نے اس کو شائع کرکے ثابت کر دیا ہے کہ حافظ کی غزلوں کی تعداد کسی صورت میں پانسو سے زیادہ نہیں، لیکن مختلف زمانوں میں ان میں کافی اضافہ ہوتا رہا، چنانچہ تہران[1] کے آخری مطبوعہ نسخوں میں غزلوں کی تعداد آٹھ سو سے زیادہ ہوگئی، مرزا محمد کا یہ قیاس بالکل صحیح ہو کر جو نسخہ جتنا ہی متقدم ہے، اس میں اسی اعتبار سے اشعار کی تعداد بھی کم ہے، جیساکہ فہرست ذیل سے صاف طور پر نمایاں ہے:

نسخہ	تعداد
نسخۂ خطی آقای خلخالی مورخہ ۸۲۷	۴۹۵ غزل
" جناب آقای مرآت بظاہر معاصر با نسخۂ اول	۴۸۵ "
" جناب آقای حاج محمد آقا نخجوانی اوائل قرن نہم	۴۹۳ "
" آقای اقبال آشتیانی قرن نہم	۴۸۷ "
" کتابخانۂ مجلس شورائے ملی مورخہ ۸۵۵ھ	۴۴۰ " قریب
" " " ۸۵۵ھ	۴۹۹ " "
" " " بخط محمد نور اواخر قرن نہم	۴۵۳ "
" آقای سید نصر اللہ تقوی بخط سلطان علی مشہدی ۹۰۵ھ	۴۶۸ "
" ہندی متعلق با آقای ڈاکٹر غنی	۴۸۸ "
" کتابخانۂ ملی جس کا ایک حصہ بہت قدیم ہے	۵۰۴ "
" " مدرسہ سپہ سالار بخط منعم الدین اوحدی ۹۱۷ھ	۵۱۷ "

۱؎ مقدمہ دیوان مرتبۂ قزوینی ص "لز" ۲؎ ایضاً ص "یح - لد"

نسخه / چاپ	سنه	غزل
نسخهٔ متعلق بکتاب خانهٔ ملی طهران قرن یازدہم		۵۴۸ غزل
" " بآقای رشید یاسمی ظاہراً قرن یازدہم		۵۶۱ "
" " حسین نخجوانی " اواخر "		۵۸۰ "
نسخه شرح سودی بر حافظ که در ۱۰۰۳ھ تالیف شده ۱۲۵۰ھ		۵۷۴ "
" چاپ سربی بولاق (مصر) بحروف نستعلیق	سنه ۱۲۵۶ھ	۵۷۳ "
" " طهران	سنه ۱۲۵۹ھ	۵۹۸ "
" " حکیم پسر وصال در بمبئی	سنه ۱۲۶۷ھ	۵۹۲ "
" " اولیا "	سنه ۱۲۶۸ھ	۵۸۲ "
" " تبریز "		۵۹۱ "
" " تہران	سنه ۱۲۷۵ھ	۵۸۸ "
" " بمبئی بخط مشکیں قلم	سنه ۱۳۰۸ھ	۵۸۶ "
" " تہران	سنه ۱۳۱۴ھ	۵۸۷ "
" " اسلامبول	سنه ۱۳۲۰ھ	۵۶۳ "
" " بمبئی بخط مرزا مہدی شیرازی	سنه ۱۳۲۱ھ	۵۸۵ "
" " بمبئی قدسی	سنه ۱۳۲۲ھ	۵۹۷ "
" " کریمی "		۵۸۴ "
" " لکھنو (کشوری)	سنه ۱۳۳۱ھ	۵۸۴ "
" " "	سنه ۱۳۳۴ھ	۵۸۸ "
" " خلخالی تہران	سنه ۱۳۰۶ شمسی	۵۸۹ " اصل معہ ملحقات

سید خلخالی نے آخر میں ۵۰ مشکوک غزلوں کو درج کر دیا ہے[1] جو قدیم ترین نسخے میں موجود نہیں۔ میں ان غزلوں کے مطلعے ذیل میں درج کرتا ہوں:

ا ما بدین نیم و تو دانی و دل غمخور ما ——— بخت بد تا بکجا می برد آبشخور ما

تا جمالت عاشقان را زد بوصل خود صلا ——— جان و دل افتاده اند از زلف و خالت در بلا

شب از مطرب که دل خوش باد وی را ——— شنیدم نالهٔ جانسوز نی را

ب آفتاب از روی او شد در حجاب ——— سایه را باشد حجاب از آفتاب

تعالی الله چه دولت دارم امشب ——— که آمد ناگهان دلدارم امشب

صبح دولت میدمد کو جام همچون آفتاب ——— فرصتی زین به کجا باشد بده جام شراب

ت اگر بلطف بخوانی مزید الطاف است ——— وگر بقهر برانی درون ما صاف است

برو ای زاهد و دعوت مکنم سوی بهشت ——— که خدا در ازل از بهر بهشتم نسرشت

دمی شد کاتش سودای او در جان ما است ——— زان تمنا که داریم در دل ویران ما است

هر آن خجسته نظر کز پی سعادت رفت ——— بکنج میکده و خانهٔ ارادت رفت

غمش تا در دلم ماوا گرفته است ——— سرم چون زلف او سودا گرفته است

دردا که یار در غم و دردم بماند و رفت ——— ما را چو دود بر سر آتش نشاند و رفت

نظیر پیر مغان موجب عیش و طرب است ——— دو غنهٔ میکده را آب هوای عجب است

دلم ملول گرفت از جهان هر چه بجز دوست ——— درون خاطر من کس نگنجد الا دوست

حدیث سرو که گوید به پیش قامت دوست ——— که سربلندی سرو سهی ز قامت اوست

امروز شاه انجمن دلبران یکیست ——— دلبر اگر هزار بود دلبر آن یکیست

ساقیم خضر است و می آب حیات ——— توبه از می چون کنم هیهات هات

---

[1] ص ۹ تا ۳۴ کے لطف باشد گر نپوشی از گدایان روی را ... : . تا بکام دل نبیند دیده ام روی ترا

مارا ز آرزوی تو پروای خواب نیست — بی روی دلفریب تو بودن صواب نیست

ردیف ث
الغیاث ای مایۂ جان الغیاث — کفر زلفت برد ایمان الغیاث

بازم هوای آن گل رعناست الغیاث — دایم دلم رمیده و شیداست الغیاث

ردیف ج
آتش اندر آب افسردست یا می در زجاج — یا درخشان در میان چشمۂ حیوان زجاج

ردیف ح
ببین هلال محرم بخواه ساغر راح — که ماه امن و امانست و سال صلح و صلاح

ردیف د
در هر هوا که جز برق اندر طلب نباشد — گر خرمنی بسوزد چندان عجب نباشد

مرا می دگر باره از دست برد — بمن باز بنمود می دستبرد

مژده ای دل که مسیحا نفسی می آید — که ز انفاس خوشش بوی کسی می آید

آنرا که جام صافی صهباش میدهند — میدان که در حریم حرم جاش میدهند

دل شوق لبت مدام دارد — یا رب ز لبت چه کام دارد

من و صلاح و سلامت کس این گمان نبرد — که کس برند خرابات ظن آن نبرد

صورت خوبت نگارا خویش بآئین بسته اند — گوییا نقش لبت از جان شیرین بسته اند

بوی مشک ختن از باد صبا می آید — این چه باد است کزو بوی شمای آید

تنم ز رنج فراوان دمی نیاساید — دلم ز اندوه بیحد همی بفرساید

گفتم که خطا کردی و تدبیر نه این بود — گفتا چه توان کرد که تقدیر چنین بود

ترک من چون جعد مشکین گرد کاکل بشکند — لاله را دل خون شود بازار سنبل بشکند

عشقت نه سرسریست که از سر بدر شود — مهرت نه عارضیست که جای دگر شود

اگر خدای کسی را به هر گناه بگیرد — زمین بناله درآید زمانه آه بگیرد

سر سودای تو اندر سر ما میگ.. — [illegible]

میزنم هر نفس از دست فراقت فریاد　　آه اگر نالهٔ زارم نرساند بتو باد

مرا بوصل تو گر زانکه دسترس باشد　　دگر ز طالع خویشم چه ملتمس باشد

هوس باد بهارم بسوی صحرا برد　　باد بوی تو بیاورد و قرار از ما برد

ز دل بر آمدم و کار بر نمی آید　　ز خود بدر شدم و یار در نمی آید

ساقی اندر قدحم بازیِ گلگون کرد　　در میِ کهنهٔ دیرینهٔ ما افیون کرد

اگر ز کوی تو بوئی بمن رساند باد　　بمژده جان جهان را بباد خواهم داد

دلم بجمالت صفائی ندارد　　چو بیگانه آشنائی ندارد

ردیف ر　دلا چند ریزی ز دیده شرم دار آخر　　تو نیز ای دیده خوابی کن مراد دلبر آر آخر

ساقیا مایهٔ شباب بیار　　یکدو ساغر شراب ناب بیار

سرو بالا بلند خوش رفتار　　دلبر نازنین گل رخسار

ردیف ز　خوش آن بشیوه کردنی بصد کرشمه و ناز　　کنی تو ناز بشوخی و من کشم بنیاز

براه میکده عشاق راست در تگ و تاز　　همان نیاز که حجاج را براه حجاز

صبا بمقدم گل راح روح بخشد باز　　کجاست بلبل خوشگو برآورد آواز

ردیف س　جانا ترا که گفت که احوال ما مپرس　　بیگانه گرد و قصهٔ هیچ آشنا مپرس

ردیف ش　بجد و جهد چو کاری نمیرود از پیش　　بکردگار رها کردهٔ مصالح خویش

بس خرابم ز غم یار خراباتی خویش　　میزند غمزهٔ او ناوک غم بر دل ریش

ای دل بغم شاه جهان باش شاد باش　　پیوسته در حمایت لطف اله باش

ردیف ص　نیست کس را ز کمند سر زلف تو خلاص　　میکشی عاشق مسکین و نترسی ز قصاص

از رقیبت دلم نیافت خلاص　　زانکه القاص لایحب القاص

ردیف ض حسنِ جمالِ تو جہاں جملہ گرفت طول و عرض — شمس فلک خجل شد از رخِ خوب ماہ ارض

بیا کہ بشنوم بوی جاں از آں عارض — کہ یافتم دل خود را نشاں از آں عارض

ر ط گرد غدار یار ما تا بنوشت دور خط — ماہ فلک ز روی او راست فتاد در غلط

ر ظ ز چشم بد رخ خوب ترا خدا حافظ — کہ کرد جملہ نکوئی بجای ما حافظ

ر ع بفر دولت گیتی فروز شاہ شجاع — کہ با کسم نبود بہر مال و جاہ نزاع

ر ق کس مباد چو من خستہ مبتلای فراق — کہ عمر من ہمہ بگذشت در بلای فراق

ر ل رہروان را عشق بس باشد دلیل — آب چشم اندر رہش کردم سبیل

ای بردہ دلم را تو بدین شکل و شمائل — پروای کست نیست جہانی بتو مائل

بسحر لعبت چشم تو ای خجستہ خصال — برمز خط تو ای آیت ہمایون فال

روز عید است و من امروز در آں تدبیرم — کہ دہم حاصل سی روزہ و ساغر گیرم

ر م در غم خویش چناں شیفتہ کردی بازم — کز خیال تو بخود نیز نمی پردازم

این چہ شوریست کہ در دور قمر می بینم — ہمہ آفاق پر از فتنہ و شر می بینم

الم یان للاحباب ان یترحموا — و للناقضین العہد ان یتندموا

ر ن دلبر جانان من بردہ دل و جان من — بردہ دل و جان من دلبر جانانِ من

دلم را شد سر زلف تو مسکن — بدینسانش فرو مگذار و مشکن

در بدخشاں لعل اگر از سنگ می آید برون — آب رکنی چون شکر از تنگ می آید برون

ہ ای ز فروغ رویت روشن چراغ دیدہ — مانند چشم مستت چشم جہاں ندیدہ

عید است و موسم گل ساقی بیار بادہ — ہنگام گل کہ دیدہ بی می قدح نہادہ

نصیب من چو خرابات کردہ است الہ — دریں میانہ بگو زاہدا مرا چہ گناہ

دیدی بفراغ دل زمانی نظری بماہروئی / بہ از آں کہ تاج شاہی ہمہ عمر ہای ہوئی

ای با غم تو ما را پیوند لایزالی / قد ضاع فی ہواکم عمری و لا ابالی

ای ز شرم عارضت گل غرق خوی / پر عرق پیش عقیقت جام می

ای باد نسیم یار داری / زاں نفحہ مشکبار داری

پدید آمد رسوم بیوفائی / نماند از کس نشان آشنائی

برو زاہد بامیدی کہ داری / کہ دارم ہمچو تو امیدواری

جاں فدای تو کہ ہم جانی و ہم جانانی / ہر کہ شد خاک درت رست ز سرگردانی

چوں در جہاں خوبی امروز کامگاری / شاید کہ عاشقاں را کامی ز لب برآری

ساقی اگرت ہواست با می / جز بادہ میار پیش ماشی

خوشتر از کوی خرابات نباشد جائی / کہ بپیرانہ سرم دست دہد ماوائی

نور خدا نمایدت آئینۂ مجردی / از در ما درآ اگر طالب عشق سرمدی

ان پوری غزلوں کے علاوہ متفرق ابیات جو موجودہ غزلوں میں شامل کر دیے گئے ہیں دیوان خلخالی کے صفحہ ۴۴ یا ۶۰ پر اس تفصیل سے مندرج ہیں ردیف ا: ۱۱ ابیت، ب: ۴ ت: ۸۵ بیت، د: ۱۰۵ ابیت، ر: ۴، ز: ۵، س: ۱، ش: ۸، ع: ۲، ف: ۱، ق ۱، ک: ۱، ل: ۱۱، م: ۶۰، ن: ۴، و: ۹، ہ: ۸، ی: ۵۰

علاوہ بریں حسب ذیل غزلیں بھی خلخالی کے نزدیک الحاقی ہیں "احتمال قوی میرفت کہ از حافظ نباشد" (ص ۸۰)

ہنگام نوبہار گل از بوستاں جدا / یارب مباد ہیچکس از دوستاں جدا

صبحدم بکشا و خماری در میخانہ را / غلغل آواز صراحی جان دہد مستانہ را

از من دل شدہ آں یار نمی پرسد ہیچ   خبر این دلِ بیمار نمی پرسد ہیچ

ای حشمت از خمارِ سیاہ وسفید وسرخ   زی دستت از نگارِ سیاہ وسفید وسرخ

مینویسم سخن از آتشِ دل بر کاغذ   جای آنست کہ گر شعلہ فتد بر کاغذ

ذرہ آں مہ ندارد مہربانی العیاذ   درمیاں آں مہ مہر فزوں زاں العیاذ (کذا)

نیستی گر عاشقی را عاشقی ہمراہ گیر   پای بر فرقِ خداوند کلاہ و جاہ گیر

مستم از بادۂ شبانہ ہنوز   ساقی ما نرفتہ خانہ ہنوز

قصائد | حافظ کے صرف ۵ مستند قصیدے ہیں، باقی سب الحاقی و مشتبہ ہیں، غیر مشتبہ نظموں کے مطلعے حسب ذیل ہیں:

شد عرصۂ زمین چو بساط ارم جواں   از پرتوِ سعادتِ شاہ جہانیاں

ز دلبری نتواں لاف زد بآسانی   ہزار نکتہ درین کار ہست تا دانی

جوزا سحر نہاد حمائل برابرم   یعنی غلام شاہم و سوگند میخورم

سپیدہ دم کہ صبا بوی لطف جاں گیرد   چمن ز لطفِ ہوا نکتہ بر جناں گیرد

ای در رخ تو پیدا انوارِ پادشاہی   در فکرت تو پنہاں صد حکمتِ الٰہی

ان میں دوسرے اور تیسرے مطلعے غزلیات کے ضمن میں آگئے، باقی تین مرزا محمد نے اپنے مرتبہ دیوان کے شروع[1] میں شامل کر دیے ہیں اور ان کے متعلق اس طرح[2] لکھا ہے:

"درخصوص قصائدِ خواجہ نیز از لحاظ عدۂ قصائد و عدد ابیات ہر قصیدہ اساس طبع خود را منحصراً ہمیں نسخۂ خط منعم الدین شیرازی کہ مابین نسخ موجودہ نزد من فعلاً قدیم ترین نسخہ ایست کہ دارای قصائد خواجہ است قرار دہیم و ہرچہ قصائد درایں نسخہ موجود است چاپ کنیم

[1] مقدمہ دیوان ص "قیو" تا "قلب"۔ ۱۷ صفحے [2] ایضاً ص "قید"

و ہرچہ در آن نیست بکلی از آن صرف نظر نمائیم چہ ظن بسیار قوی بلکہ تقریباً بنحو قطع و یقین عموم قصائد دیگری کہ در بعضی نسخ جدیدہ خطی و چاپی بنام خواجہ ثبت شدہ و در این نسخہ حاضرہ و ہمچنین در عموم نسخ قدیمہ دیگر اثری از آنہا نیست جمیعاً الحاقی است و ہیچکدام از آنہا بدون ہیچ شک و شبہہ از خواجہ نیست چہ علاوہ بر فقدان کلی آنہا در عموم نسخ قدیمہ ہم از حیث سبک و اسلوب و ہم از حیث مضامین و افکار و مشرب نیز ما بین آنہا و ما بین خواجہ بعد المشرقین است و مخصوصاً بعضی از آنہا فی الواقع سخیف ترین و رکیک ترین و سست ترین اشعاری است کہ ہرگز بمخیلۂ کسی خطور تواند کرد و حتی بشعرای درجۂ سوم و چہارم آنہا را نمی توان نسبت داد تا چہ رسد بزرگ ترین شاعر غزل سرای ایران ۔"

اس رکیک و سست قصیدہ سے مراد وہی قصیدہ الحاقی ہے جس کے چند اشعار ہم اوپر نقل کر چکے ہیں، اس کے علاوہ حسب ذیل[1] قصیدے بھی ان کی جانب منسوب ہیں

مرا دلیست پریشاں بدست غم پامال[2] چنانکہ ہیچ کسی نیست واقف احوال

خیر مقدم[3] مرحبا ای طائر میمون قدم شاد ماں کردی مرا نازم ترا سرتا قدم

مثنویات دیوان خلخالی اور دیوان قزوینی میں صرف ایک مثنوی حافظ کی طرف منسوب ہے، جس کا مطلع یہ ہے :

الا ای آہو وحشی کجائی مرا با تست بسیار آشنائی

صرف یہی مثنوی دیوان لکھنؤ میں بھی ہے لیکن ڈاکٹر محمد معین نے تین اور مثنویاں ان کی طرف

---

[1] ڈاکٹر معین نے حافظ کی طرف ۹ قصیدے منسوب کیے ہیں جن میں تین تو مرزا محمد والے نسخے والے ہیں (دو غزلوں میں شامل کر چکے ہیں) اور باقی تین وہی الحاقی قصیدے ہیں، اور تعجب یہ ہے کہ اس سست قصیدے کے متعلق نہایت سخت رائے کا اظہار بھی کر چکے ہیں، حافظ شیرین سخن ص ۳۰۵ - ۳۰۶، نیز ص ۱۱۳ [2] دیوان خلخالی ص ۴ (ملحقات) [3] دیوان چاپ لکھنؤ ۱۸۸۵ء ص ۲۵۴

منسوب کی ہیں، جن میں پہلی دو میں سعدی کی، اور تیسری میں نظامی کی پیروی کی ہے، یہ تینوں مثنویاں الحاقی ہیں[1]،

مثنوی کے علاوہ خلخالی اور قزوینی نے ایک ساقی نامہ ۶۹ بیت کا حافظ کی طرف منسوب کیا ہے، جو اس طرح شروع ہوتا ہے،

بیا ساقی آں مے کہ حال آورد   کرامت فزاید کمال آورد

حسین پژمان کے مرتبہ دیوان میں یہ ساقی نامہ دو شمارہ میں، چاپ قدسی میں ۶ حصے میں، چاپ بمبئی میں ۸ شمارہ میں آیا ہے[2]۔ چاپ لکھنؤ میں ساقی نامہ دو عنوان سے پایا جاتا ہے، مگر اس ساقی نامے کے بیشتر اشعار خواجو کرمانی کے ہیں[3]، اس لحاظ سے ساقی نامہ کے زیادہ اشعار الحاقی ہیں، چنانچہ خلخالی نے ۱۲۹ اشعار الحاقی قرار دیے ہیں[4]، مثنوی میں بھی ۱۳ شعر بعد[5] والے نسخوں میں زیادہ ہیں،

مقطعات | دیوان خلخالی میں ۲۹ قطعے غیر مشکوک ہیں، قزوینی نے ۵ غیر مشکوک قطعوں کا اور اضافہ کیا ہے، حسین پژمان والے نسخے میں ۴۴ قطعے[6] اصیل بتائے گئے ہیں، خلخالی نے ۱۵ مشکوک قطعوں کو درج کیا ہے، لکھنؤ کے مطبوعہ نسخے میں ۴۱ ہیں،

رباعیات | خلخالی کے مرتبہ دیوان میں ۴۲ غیر مشکوک رباعیاں ہیں، حسین پژمان نے ۴۴

---

[1] خلخالی ان تینوں کو مشتبہ قرار دیتے ہیں (ص ۷، ملحقات) نیز ا۔ک دیوان پژمان (ص ۳۰۶)

[2] دو بار کتابفروشی وچاپخانۂ بروخیم میں شائع ہوا۔ طبع دوم ۱۳۱۸ھ میرے پیش نظر ہے، ملاحظہ ہو ص ۳۰۹ جہاں "مشکوک ساقی نامہ" درج ہے [3] حافظ شیریں سخن ص ۳۰۰ [4] ملاحظہ ہو خلخالی ملحقات ص ۱ حاشیہ و نیز تذکرہ میخانہ (مطبوعہ) ص ۴، حاشیہ ۱، ہمیں ساقی نامہ بہ بعض تغیرات در دیوان حافظ (طبع لکھنؤ ۱۲۹۳ھ صفحہ ۲۴۳ ببعد) موجود است [5] ص ۲۴-۱۱ (ملحقات) [6] ایضاً ص ۱۷ [7] حافظ شیریں سخن ص ۲۸۰، دیوان ص ۲۵۲ تا ۲۰۰ پر مشتبہ قطعہ ملاحظہ ہوں)

رباعیاں بتائی ہیں، خلخالی نے مشکوک رباعیوں کی تعداد ۲۴ قرار دی ہے۔ مطبوعہ نسخے میں ۲۶ ہیں[1]
الحاقی رباعیوں کے پہلے مصرعے حسب ذیل ہیں:

(۱) زان بادۂ دیرینۂ دہقان پرورد
(۲) ای آنکہ نہند مہر و ماہ از تمکین
(۳) تا حکم قضائے آسمانی باشد
(۴) جانا چو شبی با تو بروز آوردم
(۵) تا کے بود این جور و جفا کردن تو
(۶) با مردم نیک و بد نمی باید بود
(۷) باز آی کہ جانم بجمالت نگرانست
(۸) ہجرت کہ بجان من درویش آمد
(۹) شیریں دہنان عہد بپایان نبرند
(۱۰) زلفین تو پیچ و خم و تاب از چہ گرفت
(۱۱) در راہِ طلب تو خارِ غمہا دارد
(۱۲) پروار دل از مادر دہر ای فرزند
(۱۳) مقبولِ دل خواص و مشہور عوام
(۱۴) آواز پر مرغ طرب میشنوم
(۱۵) در ہجرِ تو من ز شمع افزوں گریم
(۱۶) عیب است عظیم برکشیدن خود را
(۱۷) جانم بفدای آنکہ او اہل بود
(۱۸) سرتاسر آفاق نہادن سوزن
(۱۹) تا کار بکامِ دل مجروح بود
(۲۰) یاران چو ہم دست در آغوش کنید
(۲۱) امروز در این زمانۂ عہد شکن
(۲۲) ای دوست بکام دشمنانم کردی
(۲۳) از عاجزی و سلیمی و مسکینی
(۲۴) غافل منشیں ہرگز ز تیزی آہ
(۲۵) اشکم چو رخِ نگار من گلگوں شد
(۲۶) در غربت اگر کسے نماند ماہی
(۲۷) رب چو برآرندۂ حاجات توئی

ان کے علاوہ متعدد رباعیاں[2] جو لکھنؤ اڈیشن میں موجود ہیں، الحاقی ہیں۔

---

[1] مطبوعہ لکھنؤ (۱۸۸۳ء) میں خلخالی والی صرف ۲۰ رباعیاں موجود ہیں، باقی ۴۹ رباعیاں الحاقی ہیں۔
[2] حسین پژمان نے ص ۲۹۴ - ۲۹۵ پر ۱۲ مشکوک اور ص ۲۹۶ - ۳۰۳ پر ۲۲ رباعیات منسوب کی ہیں۔

ترکیب بند و ترجیع بند و مخمس | جدید خطی نسخوں اور تمام مطبوعہ نسخوں میں ایک مخمس[1]، ایک ترکیب بند اور ایک ترجیع بند دیا ہے، مگر خلخالی اور مرزا محمد قزوینی دونوں کے مرتب کیے ہوے دیوان میں سے ان میں سے کوئی موجود نہیں، خلخالی نے دیوان[2] کے آخر میں مشکوک ابیات کے ضمن میں ان تینوں کو درج کر دیا ہے۔ مخمس کا پہلا بند یہ ہے:

در عشق تو ای صنم چنانم کز ہستی خویش در گمانم
ہر چند کہ زار و ناتوانم گر دست دہد ہزار جانم
در پای مبارکت فشانم

ترکیب کے پہلے بند کا مطلع یہ ہے،

شاہی کہ پناہ ملک و دین است درخور دہ ہزار آفرین است

اور ترجیع کا بند اول یوں شروع ہوتا ہے،

ای دادہ بباد دوستداری این بود وفا و عہد یاری

بیت ترجیع

آن بہ کہ ز صبر رخ نتابم باشد کہ مراد دل بیابم (باقی)

---

[1] نیز ملاحظہ ہو دیوان مرتبۂ پژمان ص ۳۱۲، اسی دیوان کے ص ۳۰۴ بعد پر دو مسدس حافظ کی طرف منسوب ہیں۔ [2] ص ۷۰ تا ۷۹

امام اشعری اور مستشرقین

از جناب مرزا محمد یوسف صاحب استاد مدرسہ عالیہ رامپور

(۳)

(۲۸) کتاب الاستشہاد: جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ معتزلہ کے دلائل سے خدا کا علم، قدرت اور دوسری صفات ثابت ہوتی ہیں[1]۔

یہ ترجمہ گمراہ کن حد تک مبہم ہے، اصل میں ہے:

الفنا کتابا فی الاستشہاد ارینا	ہم نے اصول استشہاد کے باب میں ایک کتاب
فیہ کیف یلزم المعتزلۃ علی	تالیف کی جس میں ہم نے یہ دکھایا ہے کہ معتزلہ جو
مجتہم فی الاستشہاد بالشاھد	شاہد سے غائب پر استدلال استشہاد کیا کرتے ہیں
علی الغائب ان یثبتوا علم اللہ	انکے اس استدلال سے خود ان پر لازم ہو جاتا ہے
وقدرتہ وسائر صفاتہ[2]	کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم و قدرت اور دیگر صفات کا اثبات

یہ ہے اصول استشہاد کی حقیقت اور اسکی افادیت کے متعلق امام اشعری اور ان کے تبیین کا موقف

مگر مسٹر مکارتھی کے ترجمے سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام اشعری نے کوئی کتاب لکھی تھی، جسے ایک رنگین عنوان سے معنون کرنے کے لیے کتاب الاستشہاد کا نام دیا تھا، نیز معتزلہ جو دلائل دیتے تھے، اس سے خود صفات باری کا اثبات ہوتا ہے،

---

[1] معارف ص ۲۹۹ سطر ۹-۱۰ [2] تبیین ص ۱۳۱ سطر ۱۶-۱۹

لیکن یہ واقعہ نہیں ہے، بلکہ استشہاد دیگر منطقی اعمال کی طرح ایک خاص انداز استدلال کا نام تھا، جسے عموماً قیاس الغائب علی الشاہد کہتے تھے اور جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے لیے (جو حواس سے غائب ہے) جب کوئی حکم ثابت کرنا چاہتے تھے، تو اس کو ممکنات پر (جو مشہود ہیں) قیاس کیا کرتے تھے کہ چونکہ یہ حکم شاہد کے لیے ثابت ہے اسلیے غائب کے لیے بھی ثابت ہوگا، چنانچہ شرح المواقف میں ہے:

الطریق الثانی من ذینك الطریقین الضعیفین قیاس الغائب علی الشاهد وانما یسلکونه اذا حاولوا اثبات حکم لله سبحانه فیقیسونه علی الممکنات قیاساً فقهیاً ویطلقون اسم الغائب علیه تعالیٰ لکونه غائباً عن الحواس[1]	ان دو ضعیف طریقوں میں سے دوسرا طریقہ قیاس الغائب علی الشاہد ہے، اس طریقہ کو صرف اسوقت استعمال کرتے تھے جب اللہ تعالیٰ کے واسطے کوئی حکم ثابت کرنا چاہتے تھے تو اسے ممکنات پر بطور قیاس فقہی قیاس کرتے تھے، اور اللہ تعالیٰ پر "اسم غائب" کا اطلاق کرتے تھے کیونکہ وہ حواس سے غائب ہے،

اشاعرہ اس کی افادیت کلیہ کے منکر تھے، شرح المواقف میں ہے،

وهو ای هذا الاثبات بطریق الیقین مشکل جداً[2]	اور وہ یعنی اس بات کا یقینی طور پر ثابت کرنا بہت زیادہ مشکل ہے،

لیکن یہ انداز استدلال بعض غیر مسلم متکلمین کا عموماً اور معتزلہ کا خصوصاً معمول بہ تھا، اور وہ اکثر شاہد سے غائب پر استشہاد کے ذریعہ حجت قائم کیا کرتے تھے، اس لیے امام اشعری نے بطریق الزام ان پر حجت قائم کی کہ ان کے اس انداز استدلال[3] کی صحت کی صورت میں ان پر لازم آتا ہے کہ وہ علم و قدرت اور دیگر صفات باری کا بھی اثبات کریں، مثلاً ہم شاہد میں دیکھتے ہیں کہ انسان عالم بھی ہے

---

[1] و [2] شرح المواقف [3] مجمتع الاستشہاد بالشاہد علی الغائب،

متکلم بھی ہے، سمیع بھی ہے، بصیر بھی ہے، لہذا اگر غائب کو شاہد پر قیاس کیا جاسکتا ہے، تو ماننا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ علم قدرت اور دیگر صفات سے متصف ہے، (حالانکہ معتزلہ صفات باری کی نفی کرتے تھے)

یہ الزامی انداز استدلال اشاعرہ کا معمول بہ تھا چنانچہ قاضی ابوبکر الباقلانی اپنی کتاب التمہید (ص ۹۷، ۹۸) میں جب براہمہ نبوت کے محال ہونے کو قیاس الغائب علی الشاہد کے اصول پر ثابت کرنا چاہتے ہیں تو ان کی اس تعلیل فاسد کی تضعیف اسی الزامی انداز میں کرتے ہیں،

فان قالوا: الدلیل علی انه لایجوز	پس اگر براہمہ یہ کہیں کہ اس بات کی دلیل کہ اللہ تعالیٰ
ان یرسل الله رسولاً الی خلقه	کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی کو مخلوق کی جانب رسول
انا وجدنا الرسول فی الشاهد	بنا کر بھیجے یہ ہے کہ شاہد و معقول میں پیمبر بھیجنے والے
والمعقول فی جنس المرسل	کی جنس سے ہوتا ہے ...... تو ان سے
.... فیقال لهم	کہا جائیگا کہ تمھارے استدلال پر لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ
فیجب علی اعتلالکم هذا الا یکون	نہ مخلوق پر حجت قائم کرنے والا ہو نہ انھیں حکم دینے والا ہو
الله سبحانه محتجا علی الخلق	بوجہ اس اصول کے جو اس نے تمھارے قول کے مطابق
ولا آمرا لهم بما وضعه فیها	ان میں وضع کر دیا ہے کہ اچھے کام کرنا واجب اور
عندکم من وجوب فعل الحسن و	برے کا چھوڑنا فرض ہے ... کیونکہ
ترک القبیح .... لان	شاہد میں حجت قائم کرنے والا اور حکم دینے والا اسی جنس
المحتج الآمر فی الشاهد من جنس	سے ہوا کرتا ہے جس سے وہ شخص جسے حکم دیا جائے
المامور المحتج علیه	اور جس پر حجت قائم کی جائے.

اسی طرح اس سے ذرا قبل فرماتے ہیں؛

لے الفرق بین الفرق ص ۹۳

ویقال لهم ان بنیتم الامر علی	اور ان سے کہا جائیگا کہ اگر تم اپنے گمان کے مطابق مسئلہ
فهم ذلك فی الشاهد بزعمکم فیجب	کی بنیاد اس بات پر قائم کرتے ہو کہ شاہد میں یہ بات قبیح
ان تقضوا علی ان الفاعل للعالم	ہے تو تم پر واجب ہو کہ یہ بھی تسلیم کرو کہ فاعل عالم کسی
لا یفعله الا لاجتلاب منفعة	فائدے کے حصول یا کسی نقصان کے دور کرنے یا کسی ایسی
او دفع مضرة او داع دعاه الی	غرض کے لیے جس نے اسے اس کام پر آمادہ کیا ہو،
الفعل وبعثه علیه وانه تعالے	کوئی کام نہیں کرتا اور یہ کہ اللہ تعالیٰ جسم ہو، جیز رکھتا ہے،
جسم مولف ذو حیز وقبول للاعراض	اعراض کو قبول کرنے والا اور مخصوص مکان میں متمکن ہے
وفی مکان دون مکان، لانکم لم	کیونکہ شاہد میں تم کسی فاعل کا ان صفات کے متصف ہوئے
تعقلوا فاعلا فی الشاهد الا کذلك	بغیر تصور نہیں کر سکتے ۔

لیکن مسٹر مکارتھی کہتے ہیں "کتاب الاستشهاد" جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ معتزلہ کے دلائل سے خدا کا علم، قدرت اور دوسری صفات ثابت ہوتی ہیں۔"

معتزلہ کے دلائل بے شمار تھے، ان میں سے یہاں کون سے دلائل و انداز استدلال مراد ہیں مسٹر مکارتھی کے ترجمے سے اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا، حالانکہ تبیین ابن عساکر میں اس کی پوری وضاحت موجود ہے،

(۹۴) شئی پر ایک کتاب: اس میں اس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ اشیاء بہر حال اشیاء ہیں چاہے وہ معدوم ہوں[1] یہ ترجمہ مبہم ہی نہیں بلکہ یقیناً غلط ہے، اصل میں ہے:

والفنا کتابا فی باب شئی وان الاشیاء	اور ہم نے شئی (کے مباحث) پر ایک کتاب تالیف کی (بالخصوص
هی اشیاء وان عدمت رجعنا عنه	اس مسئلے میں) کہ اشیاء بہر حال اشیاء ہیں اگرچہ وہ معدوم ہوں،
ونقضناه فمن دفع الیه فلا یعولن علیه[2]	ہم نے اس کتاب سے (بعد میں) رجوع کر لیا اور اسکی تردید لکھی،
	پس کسی کو ہماری کتاب ملے تو اس پر ہرگز اعتماد نہ کرے،

---

[1] معارف صفحہ ۳۰۰ سطر ۶-۵ [2] تبیین ص ۱۳۳ سطر ۶-۵

یہ دو کتابیں ہیں، ایک امام اشعری کے زمانہ اعتزال کی اور دوسری اعتزال سے تائب ہونے کے بعد کی، پہلی کا نام ہے

"کتاب فی بابہ شیٔ وان الاشیاء وھی اشیاء وان عدمت"

اس کی تفصیل یہ ہے کہ فلاسفہ میں افلاطون امثال مجردہ (Ideas) کا قائل تھا، بعد کے حکما پر اس کا بڑا گہرا اثر پڑا، چنانچہ جب افلاطونی اور ارسطاطالیسی فلسفوں میں تطبیق کی کوشش کی گئی تو حکما ئے متاخرین نے اعیان وحقایق کے وجود اور ماہیت میں تفریق و انفکاک کا اصول تراشا کہ ممکنات کا وجود ان کی ماہیت پر زاید ہوتا ہے، لہذا ماہیت وجود سے خالی ہو سکتی ہے یعنی اعیان صفت وجود سے متصف ہوئے بغیر بھی اعیان بنے رہتے ہیں،

تیسری اور چوتھی صدی کے معتزلیوں نے بھی فلاسفہ سے اس "جواز تعری الماہیۃ عن الوجود" کے مسئلے کو اخذ کر کے یہ موقف اختیار کیا کہ معدوم ممکن نفی محض نہیں ہے، بلکہ من وجہٍ ثابت ہو۔ ان مفکرین معتزلہ میں ابوعلی الجبائی خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ اپنے عہد کا سید الطائفہ اور ایک مستقل مذہب "الجبائیہ" کا بانی تھا، اس کی بھی یہی رائے تھی، چنانچہ المحصل میں امام رازی نے "تفصیل قول الفلاسفہ والمعتزلہ فی المعدومات" کے عنوان کے تحت لکھا ہے:

زعم ابو یعقوب الشحام وابو علی	ابو یعقوب الشحام ابوعلی الجبائی اور (موخر الذکر کے)
الجبائی وابنہ ابو ھاشم......	بیٹے ابوہاشم کا گمان ہے کہ معدومات ممکنہ وجود میں
..... ان المعدومات الممکنۃ	داخل ہونے (موجود ہونے) سے پہلے
قبل دخولھا فی الوجود ذوات و	بھی ذوات اور اعیان اور حقایق
اعیان وحقایق[1]	ہوا کرتے ہیں،

[1] المحصل ص ۳۴

اسی الجبائی کے شاگرد رشید امام ابوالحسن الاشعری تھے، اس لیے وہ بھی اپنے زمانۂ اعتزال میں اس عہد کے معتزلی متکلمین کی طرح اسی مسلک کے قائل تھے، اور اسی لیے انھوں نے "کتاب فی اب شیئ و ان الاشیاء ہی اشیاء وان عدمت" کے نام سے وقت کے اس مروجہ مسئلے پر اپنے افکار کو قلمبند کیا، غرض یہ ایک کتاب ہے جو امام اشعری نے اپنے زمانہ اعتزال میں تصنیف کی تھی لیکن "ان الاشیاء ہی اشیاء وان عدمت" کا مسئلہ محض ایک دلچسپ حماقت ہی نہیں بلکہ اپنے اندر ایک خطرناک الحاد کو چھپائے ہوئے ہے، کیونکہ اگر اس مسئلے کو اس کی آخری حد تک سونچا جائے تو اس کا یہ ملحدانہ منطقی نتیجہ برآمد ہوتا ہے، جو بعض معتزلہ کا مسلک بھی تھا کہ "اس علم کے بعد کہ دنیا کا ایک پیدا کرنے والا ہے پھر بھی یہ شک باقی رہتا ہے کہ وہ صانع عالم موجود بھی ہے یا نہیں" امام رازی کہتے ہیں:

واتفقوا علی انه بعد العلم بان للعالم[۱]	اسپر معتزلہ کا اتفاق ہے کہ اس بات کے علم کے بعد بھی کہ
صانعاً عالماً قادراً حیاً حکیماً مرسلاً	عالم کا ایک صانع ہے جو عالم ہے قادر ہے حی (زندہ) ہے
للرسل یمکننا الشک فی انه هل هو	حکیم ہے اور رسولوں کو بھیجنے والا ہے، ہمارے لیے یہ
موجود اولا الا ان نعرف ذالک	شک کرنا ممکن ہے کہ آیا وہ موجود ہے یا نہیں، الا یہ
بالدلیل لانهم لما جوزوا اتصاف	ہم اس صانع عالم کے وجود کو کسی (خارجی) دلیل سے
المعدوم بالصفة لم یلزم من اتصاف	جان لیں، کیونکہ جب معتزلہ نے یہ جائز قرار دیا کہ معدوم
ذات الله تعالی بصفة العالمیة	(بھی) صفت سے متصف ہو سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے عالمیۃ
والقادریة کونه موجوداً	اور قادریۃ کی صفات سے متصف ہونے سے یہ لازم نہیں

[illegible]

اس لیے جب تیسری صدی کے اختتام پر امام اشعری اعتزال سے تائب ہوئے تو جہاں معتزلہ کی اور بدعات سے توبہ کی اس مسئلہ سے بھی رجوع کیا، اور اپنے مسلک قدیم کی تردید میں ایک مستقل کتاب لکھی، چنانچہ خود فرماتے ہیں:

---

[۱] المحصل ص ۳۰

رجعنا عنه ونقضناه[1] ہم نے اس کتاب سے رجوع کیا، اور اسکی تردید لکھی

اس رجوع کا نتیجہ اشاعرہ کا مذہب مختار ہے کہ وجود واجب اور ممکن دونوں میں عین ماہیت ہوا کرتا ہے، چنانچہ شرح المواقف میں ہے:

المقصد الثالث فی ان الوجود	مقصد سوم اس بحث میں کہ وجود نفس ماہیت ہے
نفس الماهية اوجزءها اوزائد	یا ماہیت کا جزء ہے یا ماہیت پر زائد (ماہیت سے علحدہ)
عليها...... فاما ان يكون نفس	ہے..... پس یا تو سب میں یعنی واجب اور ممکن
الماهية فی الكل ای الواجب	دونوں میں وجود نفس ماہیت ہوگا یا سب میں
والممكن جميعًا اوزائدًا عليها	واجب اور ممکن دونوں میں) ماہیت پر زائد ہوگا
فی الكل اويكون نفس الماهية فی	یا واجب میں نفس ماہیت ہوگا اور ممکن میں ماہیت
الواجب زائدًا عليها فی الممكن	پر زائد ہوگا.... پس اس مسئلے میں تین مذہب
.... فانحصرت المذاهب	ہو گئے، ان میں سے ایک شیخ ابی الحسن الاشعری
فی ثلثة احدها للشيخ ابی الحسن	اور معتزلہ میں سے ابی الحسین البصری کا مذہب ہے کہ
الاشعری وابی الحسين البصری	وجود واجب اور ممکن دونوں میں نفس حقیقت
من المعتزلة انه نفس الحقيقة	(عین ماہیت) ہوتا ہے........
فی الكل ای الواجب الممكنات كافة	....

غرض نقض (تردید) ایک مستقل کتاب ہے، اگر مسٹر میکارتھی نے امام اشعری کی کتابوں کی تعداد لکھتے وقت دونوں کتابوں کو ایک ہی کتاب محسوس کیا حالانکہ تبیین میں جو کچھ "العمد" سے نقل کیا گیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب نے دو مستقل کتابیں لکھی تھیں، پہلی "الا

[1] تبیین ص ۱۳۳، سطر ۹

الاشیاء ہی اشیاء وان عدمت" کی تائید میں اور دوسری اس کی تردید میں، لیکن جناب مستشرق کی ہمدانی نے دو کتابوں کو ایک کتاب بناکر خلط مبحث کر دیا" شئی پر ایک کتاب۔ اس میں اس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ اشیاء بہر حال اشیا ہیں، چاہے وہ معدوم ہوں"۔[1]

(۶۷) جبائی کے سوالوں کے جواب میں،

قارئین کرام کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ آخر وہ کیا سوالات تھے جو الجبائی نے کیے تھے، مسٹر مکارتھی نے ان سوالات کی نوعیت سے تعرض کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، حالانکہ تبیین کی روایت کے مطابق امام صاحب نے ان سوالات کی نوعیت بھی کھول کر بیان کردی ہے، اصل میں ہے:

والفنا کتابا اجبنا فیہ عن مسائل	ہم نے ایک کتاب تالیف کی جس میں الجبائی کے
الجبائی فی النظر والاستدلال	ان سوالات کا جواب دیا جو اس نے نظر و استدلال
وشرائطہ[2]	اور شرائط نظر کے سلسلے میں کیے تھے۔

غالباً مسٹر مکارتھی "نظر" اور "استدلال" کے مصداق سے کما حقہ واقف نہ تھے، اس لیے انھوں نے اس کو صاف اڑا دیا، حالانکہ نظر و شرائط نظر اور استدلال مفکرین اسلام کا خاص موضوع رہے ہیں، اور اصول و کلام کی تمام مستند کتابیں ان کی بحثوں سے معمور ہیں، مثال کے لیے شرح المواقف کو لیجئے، موقف اول کا مرصد خامس مسائل نظر کی، اور موقف سادس مسائل استدلال کی تبیین و توضیح اور بحث و تمحیص پر مشتمل ہے، اسی طرح قاضی بیضاوی کی طوالع الانوار کے مقدمہ میں ان مباحث کا ذکر کیا گیا ہے، اور اس کی فصل ثالث میں حجج (استدلال) کا اور فصل رابع میں خصوصیت سے احکام نظر کا ذکر ہے، اسی طرح ابن حاجب (المتوفی ۶۴۶ھ) نے مختصر منتہی الاصول کے مقدمہ میں مسائل نظر و استدلال کو ذکر کیا ہے[3] اس کے علاوہ اور بہت سی تحریروں میں اسکا ذکر ہے، اگر مسٹر مکارتھی نے اس

---

[1] معارف ص ۳۰۰ سطر ۱۸، [2] تبیین ص ۱۳۴ سطر ۱۱-۱۲، [3] مختصر المنتہی الاصول ص ۴-۲

کتاب کے موضوع کی اتنی توضیح بھی نہیں کی جتنی "تبیین کذب المفتری" کی ظاہر عبارت سے استفادہ ہوسکتی تھی،

(۹۹) کتاب فی الرد علی الفلاسفہ: اس میں تین مقالے ہیں: ابن قیس منادی کے رد میں، ہیولیٰ اور طبائع پر یقین رکھنے والوں کے رد میں اور ارسطو کے ان خیالات کے رد میں جو عالم اور افلاک سے متعلق ہیں،[۱]

یہ ترجمہ بھی گمراہ کن ہے، اگر قارئین کرام اس کا تبیین کذب المفتری کی اصل عبارت سے موازنہ فرمائینگے تو یہ چیز واضح ہوجائے گی، تبیین میں ہے:

والفنا کتابا فی الرد علی الفلاسفة یشتمل علی ثلاث مقالات ذکرنا فیہ نقض علی ابن القیس الدھری وتکلمنا فیہ علی القائلین بالھیولیٰ والطبائع ونقضنا فیہ علی ارسطاطالیس فی السماء والعالم۔ وبیّنا ما علیھم فی قولھم باضافة الحداث بالنجوم وتعلیق احکام السعادة والشقاوة بھا[۲]

اور ہم نے فلاسفہ کے رد میں ایک کتاب لکھی جو تین مقالوں پر مشتمل ہے، اس میں ہم نے ابن قیس دہری کے دلائل کا رد کیا ہے اور ان لوگوں پر جو ہیولیٰ کے قائل ہیں یا طبائع کے قائل ہیں (مادہ پرست یا میٹریلیسٹ) پر اعتراض کیے ہیں، اور ارسطو کی ان دلیلوں کی تردید کی ہے جو اس نے "کتاب السماء والعالم" میں بیان کی ہیں، اور یہ بیان کیا ہے کہ منجمین جو حوادث روزگار کے ستاروں کی جانب منسوب ہونے کے قائل ہیں اور جو نیک بختی اور بدبختی کے احکام کو ستاروں کی گردش سے متعلق سمجھتے ہیں ان پر

چند چیزیں قابل غور ہیں:

۱۔ مسٹر مکارتھی نے "الدہری" کا ترجمہ "منادی (غالباً مادی) کیا ہے، حالانکہ دہریہ اور مادہ پرستوں میں

---

[۱] معارف ص ۳۰۰ سطر ۱۹ صفر ۱۳۰۱ سطر ۳۰۱ [۲] تبیین ص ۱۳۴ سطر ۱۲-۱۴

بڑا فرق ہے،

۲- "ارسطو کے ان خیالات کے رد میں جو عالم اور افلاک سے متعلق ہیں"! کاش اگر مسٹر مکارتھی نے اسلامیات کا مطالعہ کیا ہوتا تو معلوم ہوتا کہ "السماء والعالم" ارسطو کی ایک کتاب کا نام ہے، جسے لاطینی زبان میں "De Coelo" اور اصل یونانی میں "περὶ οὐρανοῦ" کہتے ہیں، ابن الندیم "الفہرست" میں ارسطو کی کتب طبعیات کے ضمن میں کہتا ہے،

الکلام علی کتاب السماء والعالم:	کتاب السماء والعالم پر کلام: وہ چار
وھو اربع مقالات نقل ھذا	مقالات پر مشتمل ہے، اس کتاب کو ابن البطریق
الکتاب ابن البطریق واصلحہ	نے نقل کیا اور حنین نے اس ترجمہ کی
حنین ...... [1]	اصلاح کی

اسی عبارت کو قفطی نے بھی ارسطاطالیس کے ذکر میں دہرایا ہے:

"کتاب السماء والعالم والکلام علیہ وھو اربع مقالات نقل ھذا الکتاب ابن البطریق [2]

یہی نہیں بلکہ قفطی نے "الفہرست" کے علاوہ ایک دوسرے حوالے سے ارسطو کی جو فہرست دی ہے (جو ایک شخص مسمی بطلیموس کے مکتوب بنام غلس سے ماخوذ ہے) اس میں بھی اس کتاب کا ذکر ہے: کتابہ فی السماء والعالم اربع مقالات [3]۔ اسی کتاب السماء والعالم کی تلخیص دوسرے لوگوں کے علاوہ ابن رشد الاندلسی نے بھی کی ہے جسے دائرۃ المعارف حیدرآباد نے شائع کر دیا ہے، مگر تعجب ہے مسٹر مکارتھی ان سب حقائق سے ناآشنا ہیں اور بیدریغ یہ لفظی ترجمہ کر دیا ہے کہ "ان خیالات کے رد میں جو عالم اور افلاک سے متعلق ہیں"۔

۳- اس کتاب کے موضوع کا تیسرا جزء منجمین کا رد ہے جو اس بات کے قائل تھے کہ حوادث روزگار گردش نجوم کا نتیجہ ہیں اور نیک بختی کو ستاروں سے متعلق گردانتے تھے،

---

[1] الفہرست لابن الندیم ص ۳۵۰ [2] اخبار العلماء باخبار الحکماء ص ۳۰ [3] ایضاً ص ۴۳ سطر ۱۸

فی قولھم باضافۃ الاحداث	ان کے حوادث روزگار کو ستاروں کی طرف منسوب کرنے
بالنجوم و تعلیق احکام السعادۃ	اور نیک بختی و بدبختی کے احکام کو ان ستاروں سے متعلق
والشقاوۃ بھا	سمجھنے کے عقیدے کے باب میں

منجمین کی تردید متکلمین اسلام کا عام موضوع تھی، چنانچہ امام اشعری کے شاگرد قاضی ابوبکر الباقلانی نے "التمہید" میں مفصل طور پر منجمین کا رد کیا ہے، اس باب کا نام ہو باب الکلام علی المنجمین" امام اشعری نے بھی اس کتاب کے اس جزء میں ان ایرادات و اعتراضات کو بیان کیا ہو جو منجمین پر وارد ہو سکتے ہیں، لیکن مسٹر مکارتھی نے اس کا ترجمہ ترک کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی

(۷۹) ابوالہذیل کے رد میں حرکت کے سلسلے میں[1]

یہ ترجمہ اگر گمراہ کن نہیں تو حیران کن ضرور ہے، اس سے محض یہ معلوم ہوتا ہو کہ ابوالہذیل العلاف یا تو حرکت کے وجود خارجی کا قائل تھا، یا منکر اور امام اشعری نے اس کا رد کیا ہو، حالانکہ ایسا نہیں ہے؛ اس کی تفصیل یہ ہے:

متکلمین حدوثِ عالم کے قائل ہیں یعنی سلسلۂ حوادث کو ازل کی جانب کہیں نہ کہیں منقطع ہونا چاہیے، اور وہی بدوِ آفرینش و تخلیق کائنات ہے، ابوالہذیل العلاف بھی اس عقیدے کا سرگرم مبلغ تھا، ایک مجلس مناظرہ میں اس سے کہا گیا کہ تم لوگ اس بات کے قائل ہو کہ سلسلۂ حوادث ابد کی جہت میں لاالی نہایت چلا جاتا ہے، مثلاً سکان بہشت ابد الآباد تک نعیم جنت سے محظوظ ہوتے رہیں گے تو جس طرح سلسلۂ حوادث ابد کی جہت میں لاالی نہایت جا سکتا ہے، اسی طرح ازل کی جہت میں بھی لاالیٰ نہایت جا سکتا ہے، لہذا عالم کے لیے حدوث زمانی (Creation in Time) ضروری نہیں، یہ سنکر ابوالہذیل سٹ پٹا گیا، اور کہنے لگا نہیں،

---

[1] معارف ص ۱۰۳

جس طرح حوادث کے سلسلہ کا ازل میں ممتد الی لا نہایۃ ہونا، ناقابل تصور ہے، اسی طرح وہ ابد میں بھی لاالی نہایۃ نہیں جاسکتا، پس بہشتیوں اور دوزخیوں کی حرکات کہیں نہ کہیں منقطع ہو جائیں گی، اور ایک وقت ایسا آئے گا کہ جنتی کسی مزید نعمت جنت سے محظوظ ہو سکیں گے اور نہ دوزخی کسی مزید تکلیف دوزخ سے عذاب پا سکیں گے، چنانچہ شہرستانی نے لکھا ہے،

الخامسة قوله ان حركات اهل الخلدين تنقطع وانهم يصيرون الى سكون دائم جمودا .... وهذا قريب من مذهب جهم اذ حكم بفناء الجنة والنار وانما التزم ابو الهذيل هذا المذهب لانه لما الزم في مسئلة حدوث العالم ان الحوادث التي لا اول لها كالحوادث التي لا آخر لها اذ كل واحد لا يتناهى. قال انى لا اقول بحركات لا تتناهى آخرا كما لا اقول بحركات لا تتناهى اولا بل يصيرون الى سكون دائم۔[1]

پانچویں قابل اعتراض بات ابو الہذیل العلاف کا یہ قول کہ اہل جنت اور اہل دوزخ کی حرکات کبھی نہ کبھی منقطع ہو جائیں گی اور وہ دائمی سکون کی حالت میں جامد بن جائیں گی..... یہ قول جہم بن صفوان کے مذہب کے قریب تر ہے کیونکہ اس نے بھی جنت اور دوزخ کے فنا ہو جانے کا حکم لگایا تھا، ابو الہذیل کو اس مذہب کا اسطرح قائل ہونا پڑا کہ جب حدوث عالم کے مسئلے میں اسے یہ الزام دیا گیا کہ وہ حوادث جن کا آغاز نہ ہو ان حوادث کی طرح ہیں جنکا انجام نہ ہو، کیونکہ دونوں لا متناہی ہیں تو ابو الہذیل کہنے لگا کہ میں جسطرح ان حرکات کا قائل نہیں ہوں جو اپنے آغاز میں لا متناہی ہیں، اسیطرح ان حرکات کا بھی قائل نہیں ہوں جو اپنے انجام میں لا متناہی ہیں بلکہ وہ دائمی سکون جمود کی حالت میں منتہی ہو جائیں گی

یہ ابو الہذیل العلاف کا مذہب مشہور ہے، عامہ متکلمین نے اس کا رد کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ حوادث کا

[1] الملل والنحل للشہرستانی جلد اول صفحہ ۲۳

اور حوادث مستقبلہ میں بنیادی فرق ہے، اور ایک قیاس دوسرے پر قیاس مع الفارق ہے۔ اس موضوع پر امام ابوالحسن الاشعری نے ایک کتاب تصنیف کی تھی جس کا نام ابن فورک نے "کتاب الرد علی الحرکات علی ابی الہذیل" بتایا ہے۔ لیکن مسٹر مکارتھی نے کتاب کو ایک قسم کا فلسفہ طبیعیات کا مسئلہ بنا دیا ہے

(۸۳) کتاب فی متشابہ القرآن: اس میں اشعری نے ملاحدہ اور معتزلہ کو ایک ہی زمرے میں شمار کرکے ان کا رد کیا ہے، اور ابن الراوندی کی کتاب التاج کا بھی رد ہے[1]، اصل میں ہے:

وکتاب فی متشابہ القرآن جمع	کتاب فی متشابہ القرآن اس میں امام صاحب نے
فیہ بین المعتزلۃ والملحدین	معتزلہ اور ملحدین دونوں کو ایک گروہ محسوب
فیما یطعنون بہ فی متشابہ الحدیث[2]	کیا ہے کہ یہ دونوں احادیث متشابہ پر طعن کرتے تھے،
ونقض کتاب التاج علی ابن الراوندی[3]	اور نقض کتاب التاج ابن راوندی کے خلاف ہے

اس میں دو باتیں قابل غور ہیں: (۱) مسٹر مکارتھی کے ترجمے سے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ "امام اشعری نے ملاحدہ اور معتزلہ کو ایک ہی زمرے میں کیوں شمار کیا ہے؟ لیکن تبیین کذب المفتری کی تصریح سے اس کی وجہ معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ دونوں گروہ احادیث متشابہات پر طعن کیا کرتے تھے جن کا امام اشعری سے پہلے اور بعد میں بہت سے علمائے اسلام نے ان مطاعن کا جواب دیا ہے، امام اشعری سے پہلے ابن قتیبہ نے "تاویل مختلف الحدیث" اسی موضوع پر لکھی تھی، اور امام اشعری کے بعد امام ابن فورک نے "تاویل مشکل الحدیث" لکھی، بہرحال امام اشعری نے اپنی اس کتاب میں معتزلہ اور ملاحدہ کے ان مطاعن و اعتراضات کا جواب دیا ہے، جو وہ متشابہات قرآن و متشابہات حدیث پر وارد کیا کرتے تھے۔

۲۔ مسٹر مکارتھی نے لکھا ہے کہ اسی کتاب میں ابن الراوندی کی کتاب کا بھی رد ہے، حالانکہ یہ ایک مستقل کتاب ہے جس کا عنوان "نقض کتاب علی ابن الراوندی" ہے، اور کتاب متشابہ القرآن میں

[1] تبیین ص ۱۳۵، سطر ۱۹ [2] معارف ص ۱۰۱، ۳ سطر ۱۰۔۱۱ [3] تبیین ص ۱۳۵ سطر ۱۲۔۱۳

موضوع متشابہات احادیث پر اعتراضات کا جواب ہے "کتاب التاج" کا انضمام بالکل الٹا جوڑ ہے۔ کتاب التاج کا موضوع خود امام اشعری کے لفظوں میں قدم عالم کے عقیدے کی تائید ہے۔

کتاب التاج وھو الذی نصرفیہ القول بقدم العالم[1]	کتاب التاج اور وہ کتاب ہے جس میں (ابن الراوندی نے) عالم کے قدیم ہونے کے عقیدے کی حمایت کی ہے۔

لیکن اس سے ایک جانب امام اشعری کے علم کلام کی نوعیت کے بارہ میں غلط فہمی پیدا ہوتی ہے اور دوسری جانب ان کی کتابوں کی تعداد بھی کم ہو جاتی ہے، یہ دو کتابیں ہوتی ہیں، مگر مسٹر مکارتھی نے (۸۰) کے ضمن میں دونوں کو ایک محسوب کیا ہے،

(۸۹) ایک رسالہ عقائد پر، اس بارے میں کہ آیا "خلق" کا استعمال صحیح ہے[2]،

یہ ابہام انتہائی گمراہ کن ہے "عقائد" اور "خلق کا استعمال" میں کیا تعلق ہے، پھر اس فقرے کا کہ "خلق کا استعمال صحیح ہے" کیا مفہوم ہے؟ کس کی شان میں؛ خالق کی شان میں یا مخلوق کی شان میں؟

اصل میں ہے،

رسالۃ فی الایمان وھل یطلق علیہ اسم الخلق[3]	ایک رسالہ ایمان (اصطلاحی) کے باب میں کہ کیا اس کو مخلوق کہا جاسکتا ہے یا نہیں (ایمان پر خلق کا اطلاق ہوسکتا ہے یا نہیں)

یہ ایک معرکۃ الآرا مسئلہ ہے کہ ایمان مخلوق ہے، یا غیر مخلوق، چنانچہ مشائخ حنفیہ میں بھی اس باب میں سخت اختلاف ہے، علمائے سمرقند اس کے مخلوق ہونے کے قائل ہیں اور علمائے بخارا غیر مخلوق ہونے کے، بلکہ مؤخر الذکر میں سے بعض علماء مثلاً ابن الفضل، شیخ اسمٰعیل بن الحسین الزاہد، اور ائمۂ فرغانہ نے تو اتنا مبالغہ کیا ہے کہ جو خلق ایمان کا قائل ہوا، اس کے کفر کا فتوی دیدیا اور اس پر کلام باری کے مخلوق ہونے کے قائل ہونے کا الزام لگایا، علامہ ابن الہمام الحنفی (المتوفی ۸۶۱ھ) "المسایرۃ" میں لکھتے ہیں:

---

[1] تبیین ص ۱۲۹ سطر ۱۴ - ۱۵ [2] معارف ص ۳۰۱ سطر ۹ ص ۳۰۲ سطر ۱ [3] تبیین ص ۱۳۶ سطر ۸ - ۹

المسئلة الثانية لمشائخ الحنفية خلاف في ان الايمان مخلوق او غير مخلوق والاول عن اهل السمرقند والثاني من البخاريين بعد اتفاقهم على ان افعال العباد كلها مخلوقة لله تعالى وبالغ بعض مشائخ بخارى كابن الفضل والشيخ اسمٰعيل بن الحسين الزاهد وتبعهم ائمة فرغانة فكفروا من قال بخلق الايمان والزموا عليه خلق كلام الله تعالى[1]	دوسرا مسئلہ: مشائخ حنفیہ کا اس میں اختلاف ہے کہ ایمان مخلوق ہے یا غیر مخلوق، پہلا قول علمائے سمرقند سے اور دوسرا قول علمائے بخارا سے منقول ہے، بعد اس بات کے وہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ بندوں کے تمام افعال اللہ تعالیٰ کے خلق کیے ہوئے ہیں اور بعض مشائخ بخارا مثلاً ابن الفضل اور شیخ اسمٰعیل بن الحسین الزاہد نے اس باب میں بہت زیادہ مبالغہ کیا ہے اور ائمہ فرغانہ نے اس میں ان کا اتباع کیا اور اس شخص کی تکفیر کی جو خلق ایمان کا قائل ہو اور اس پر کلام باری کے مخلوق ہونے کے قائل ہونے کا الزام لگایا۔

غالباً قیام بغداد کے زمانہ میں جب امام اشعری کو متعصب حنابلہ کا مقابلہ درپیش تھا مسئلہ "خلق ایمان" سے ان کو سابقہ پڑا کیونکہ ان کے مشہور دشمن الاہوازی نے جو گروہ حشویہ سے تعلق رکھتا تھا مسئلہ "خلق ایمان" کے باب میں امام اشعری کے موقف کو ان کے مطاعن کی فہرست میں محسوب کیا ہے، اور اس اعتراض کو نقل کرتے ہوئے حافظ ابن عساکر نے لکھا ہے:

واما قوله في مسئلة الايمان فمن جنس ما تقدم منه في البهتان	اور اہوازی نے مسئلہ ایمان کے بارہ میں جو کچھ امام اشعری کی جانب منسوب کیا ہے وہ اس کی پچھلی بہتان تراشیوں کے مانند ہے،

اس لیے اس مسئلہ خاص میں امام اشعری نے زیر بحث رسالہ لکھا تھا، یہ رسالہ آج ناپید ہے لیکن حافظ ابن عساکر نے اس کا تفصیلی مطالعہ کیا تھا، چنانچہ فرماتے ہیں:

---

[1] المسایرہ ص ۱۹۱

وقد وقفت علی ھذہ المسئلة	اور میں امام ابی الحسن کی تصنیف کے ذریعہ
من تصنیف ابی الحسن فوجدت	اس مسئلے سے واقف ہوا اور اس کتاب میں
استدلاله فیھا یدل علی ھذا	ان کے انداز استدلال کو اس پسندیدہ
التفصیل الحسن[1]	تفصیل پر دلالت کرنے والا پایا

مسئلہ ایمان کے باب میں امام اشعری کا موقف بتصریح حافظ ابن عساکر حسب ذیل ہے،

وابو الحسن لایقول بقدم الایمان	امام ابو الحسن الاشعری علی الاطلاق ایمان کے قدیم
علی الاطلاق وانما یقول بقدم	ہونے کے قائل نہیں ہیں، بلکہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی
صفات العلیم الخلاق فمن اسمائه	صفات کے قدیم ہونے کے قائل ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ان
التی سمیٰ به نفسه "المومن"	اسماء میں سے جن سے اس نے اپنی ذات کو موسوم کیا ہے
قال سبحانه (الملك القدوس	"المومن" بھی ہے اللہ سبحانہ فرمایا ہے (الملک القدوس
السلام المومن المھیمن) فقیل انه	السلام المومن المھیمن) چنانچہ کہا گیا کہ (لفظ مومن)
مشتق من الایمان وقیل بل ھو	"ایمان" سے مشتق ہے اور یہ بھی کہا گیا کہ ایمان نہیں
ماخوذ من الامان فمن قال انه	بلکہ "امان" سے مشتق ہے پس جو شخص یہ کہتا ہے کہ لفظ
اشتق من الایمان فلانه صدق	مومن "ایمان" سے مشتق ہے تو اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ نے
نفسه فقال (ومن اصدق من	اپنی ذات کی تصدیق کی ہے اسے سچا بتایا ہے "ومن
الله قیلا) ومن قال انه ماخوذ	اصدق من اللہ قیلا" اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ وہ "امان"
من الامان فلانه امن اولیاءہ	سے ماخوذ ہے تو اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دوستوں کو
من ظلمه فلا یظلمھم فتیلا، فابو الحسن	اپنے ظلم سے بےخوف بنا دیا ہے "فلا یظلمھم فتیلا" یعنی

[1] تبیین ابن عساکر

نفی الخلق عن الایمان الذی ھو	امام ابوالحسن الاشعری نے اس ایمان سے "خلق"
صفۃ من صفات الرحمٰن فاما الایمان	کی نفی کی ہو جو اللہ تعالیٰ کی صفات میں ایک صفت
الذی ھو صفۃ الانسان محدثا	ہے، رہا وہ جو انسان کی صفت ہو تو اسکا قایل ہونا
وصفتہ قدیمۃ وھل یتصور	سراسر بہتان ہو اور یہ کیونکر ممکن ہو کہ انسان تو حادث ہوا
ذالک الا من مسخ بعد	اور اسکی صفت قدیم ہو۔ اور وہی شخص اس بات کا
الانسانیۃ بھیمیۃ۔"	تصور کرسکتا ہو جسکی انسانیت مسخ ہوکر بہیمیت بنگئی ہو

غرض زیر بحث رسالہ کا موضوع یہ ہو کہ ایمان پر کس صورت میں مخلوق ہونے کا اور کس صورت میں غیر مخلوق ہونے کا اطلاق ہوتا ہے، مگر جناب مستشرق کی معراج تحقیق یہ ہے کہ "ایک رسالہ عقائد پر اس بارے میں کہ آیا خلق کا استعمال صحیح ہے"۔

یہ ہے مشتے نمونہ از خروارے مستشرقین یورپ کی تحقیق انیق!!

لہ تبیین ص ۳۹۳-۳۹۴

ادبیات

تاریخ وفات حسرت آیات مولانا عبد السلام ندوی مرحوم

از

مولانا حکیم سید مصلح الدین صاحب

کیف شراب لذت شرب مدام رفت	ساقی نماند و مطرب رنگین کلام رفت
آہ و فغاں بگوش خواص و عوام رفت	شورے است در زمانہ کہ عبد السلام رفت
واحسرتا! مورخ عالی مقام رفت	افسوس! آں دبیر ادیب ہمام رفت
ضبط از جگر، قرار ز دل، دل زکام رفت	از ما چوں نام نامی عبد السلام رفت
جلوہ شناس صبح وادا دان شام رفت	شب تیرہ گشت وحیف کہ ماہ تمام رفت
صد حیف نکتہ دان علوم سلف نماند	واں کاتب حیات صحابہ کرام رفت
آں یادگار حضرت شبلی کجاست حیف!	دردا! ز دہر فن ادب را امام رفت

ثاقب ز مام صبر و سکونم ز دست رفت

عبد السلام آہ بدار السلام رفت

۱۳۷۶ھ

مطبوعات جدیدہ

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی از مولانا سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی تقطیع اوسط ضخامت ۳۱۶ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ

پتہ: اسلامی مکتبہ نمبر ۳۴۷، بی کلاس معظم پورہ، حیدر آباد، دکن۔

اس کتاب کے نام سے بظاہر دھوکا ہوتا ہے کہ عرف عام میں جس کو اسلامی تہذیب معاشرت کہا جاتا ہے اس کے اصول و مبادی پر ہوگی، لیکن درحقیقت وہ اسلامی ایمانیات یا اسلامی تصور حیات پر ہے، مصنف کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اسلامی تہذیب اور اسلامی تصور حیات دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں، بلکہ اسلامی تصور حیات ہی کا نام اسلامی تہذیب ہے، جس کی بنیاد ایمانیات پر ہے، پھر اسی نقطۂ نظر سے اس کے اجزاء و عناصر یعنی دنیا میں انسان کی حیثیت، اس کے فرائض، زندگی کے متعلق اس کا نصب العین، دنیا و آخرت کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر، انسانی زندگی میں ایمان کی اہمیت، ایمان کا اسلامی مفہوم، اللہ، اس کے ملائکہ، اس کے رسولوں، اس کی کتابوں اور یوم آخرت پر ایمان کی ضرورت و اہمیت، اس کی حکمتوں اور مصلحتوں اور انسانی زندگی پر اس کے اثرات و نتائج پر بڑی مفصل بحث کی گئی ہے، اور ان مسائل کے متعلق اسلامی اور دوسرے مذاہب کی تعلیمات کا موازنہ کرکے انسانی فلاح کے نقطۂ نظر سے اسلامی تعلیمات کی برتری دکھائی گئی ہے، جس سے یہ پوری طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ کائنات کی تخلیق کا ایک خاص مقصد ہے، انسان اسی مقصد کے حصول کے لیے پیدا کیا گیا ہے، اور اسلام انسانی

زندگی کے متعلق ایک خاص تصور رکھتا ہے، جو بعض پہلوؤں میں دوسرے مذا
کے باوجود اپنی جامعیت و خصوصیات میں ان سب سے الگ و ممتاز ہے، اور حیات
جملہ دنیاوی و اُخروی مسائل کا صحیح اور حکیمانہ حل اسی نے پیش کیا ہے، یہ اس کتا
خاکہ ہے، اس کے تفصیلی مباحث کا اندازہ کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، مگ
عام ہیں کہ ان پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، سیرۃ النبیؐ خطبات مدراس اور اس قسم
کتابوں میں جو سیرت اور اسلامی نظام پر لکھی گئی ہیں، یہ مباحث موجود ہیں، تا
کی دوسری تحریروں کی طرح ان کی ذہانت، نکتہ رسی اور متکلمانہ شان اس کتاب

گفتنی و ناگفتنی - از جناب شورش کاشمیری تقطیع بڑی ضخامت ۲۷۲ ص

کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد: للعہ پتہ: مطبوعات چٹان نمبر ۸ میکلوڈ

یہ کتاب جناب شورش کاشمیری کے کلام کا مجموعہ ہے، اگر الاسماء تنزل من ا
صحیح ہے تو مصنف اس کے پورے مصداق ہیں، وہ محض تخلص اور نام کے نہیں بلک
شورش ہیں، ان کی فطرت انقلابی ہے، ان کی طبیعت بے چین و بے قرار واقع
ان کی پوری زندگی شورش اور دعوت انقلاب میں بسر ہوئی، ہندوستان د
سے پہلے وہ جنگ آزادی کے شعلوں سے کھیلتے رہے، اور آزادی کے بعد ملک
و ترقی کے لیے ان کا قلم خوں فشاں رہتا ہے، وہ تنہا صحافی نہیں بلکہ خطیب و شاع
اس لحاظ سے وہ اس دور کے ظفر علی خاں کہلانے کے مستحق ہیں، ان کی شاعری
سیاسی و سماجی مسائل، مقامی سیاسیات، وقتی واقعات و حوادث ہیں، ان کے
جو خیالات اور جذبات پیدا ہوتے ہیں، ان کو وہ شعر کے قالب میں ڈھال دیتے
زور سخن اسی دائرے میں محدود نہیں ہے، بلکہ اس مجموعے میں اور بھی مختلف

نظمیں اور حسن و عشق کے ترانے بھی ہیں، ان کو شاعری پر پوری قدرت ہے، اس لیے جس موضوع پر لکھا ہے اس کا پورا حق ادا کیا ہے، اور پورا کلام شاعری کے ظاہری و معنوی محاسن سے آراستہ، الفاظ کے حسن کاری سے مرصع، خیالات کے اعتبار سے بلند، زندگی کی حرارت سے معمور، ملک ملت کے لیے بانگ درا، نوجوانوں کے لیے دعوت انقلاب، سماجی مسائل کا نسخہ اصلاح اور مواد فاسد کے لیے نشتر ہے، مگر خطابت ان کی فطرت میں ایسی رچی ہوئی ہے کہ کہیں کہیں شاعری پر غالب آگئی ہے، اور وہ گفتنی کے ساتھ ناگفتنی بھی کہہ گئے ہیں، کتاب کے شروع میں جناب جہر آذر مصنف کے قلم سے شاعری کی حقیقت، اس کے قدیم طرز، جدید رجحانات، مصنف کی شاعری کی تاریخ، اس کے محرکات خصوصیات، جدید شاعری نئے شعرا اور اس مجموعہ کی نظموں وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

انتخاب صحاح ستہ - مرتبہ جناب مولانا محمد سعید صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۴۹۰ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد صر، پتہ: سعید اینڈ سنز مطبع سعیدی، قرآن محل، مقابل مولوی مسافرخانہ، کراچی۔

اردو میں احادیث نبوی کے متعدد مجموعے موجود ہیں، انتخاب صحاح ایک نیا مفید اضافہ ہے، اس میں صحاح ستہ سے آٹھ سو منتخب حدیثیں جمع کی گئی ہیں، یہ حدیثیں عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق اور دوسری دینی امور و مسائل سے متعلق ہیں، ہر حدیث کے متن کے ساتھ اسکا ترجمہ اور بعض بعض حدیثوں کے مفہوم و منشا، اور ان سے متفرع مسائل کی تشریح بھی کر دی گئی ہے، جو لوگ عربی سے ناواقف ہیں اور حدیث کی کتابوں کا براہ راست مطالعہ نہیں کر سکتے، ان کے لیے یہ منتخب مجموعہ بہت مفید ہے، آجکل حدیثوں کے خلاف جو بدگمانی پھیلائی جا رہی ہے، اس کے لیے بھی ایسی حدیثوں کے مجموعوں کو جن کا تعلق عملی زندگی سے ہو، مرتب کر کے دلنشین تشریح کیساتھ شائع کرنے کی ضرورت ہے، گو یہ مجموعہ اس معیار پر پورا نہیں اترتا، لیکن نفس مطالعہ حدیث اور

دینی امور و مسائل سے واقفیت کے لیے کارآمد اور مفید ہے،

اقبال اور مُلّا - مولفہ جناب منشی عبد الرحمٰن صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۰ صفحات .

کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ ۔ پتہ: گوشہ ادب، چوک انارکلی، لاہور،

مذہبی پابندیوں سے آزادی کی وبا پاکستان میں برابر پھیلتی جاتی ہے، اور اس نے ایک مستقل تحریک کی شکل اختیار کرلی ہے، جس کے رہنما منکرین حدیث اور ان کے استاد اول مغرب زدہ طبقہ ہے، اور اس کے لیے "ملا ازم" کی اصطلاح گڑھی گئی ہے، اور ایک مستقل "اینٹی ملا فرنٹ" قائم ہوگیا ہے، جس کا مقصد علمائے کرام کی تحقیر و تفضیح اور مذہب کی غلط تعبیر ہے، اور یہ دیکھکر تعجب ہوتا ہے کہ اس میں بعض ایسی ہستیاں بھی شامل ہیں جو کلام اقبال کی بہترین شارح سمجھی جاتی ہیں، چنانچہ ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم صاحب نے "اقبال اور ملا" کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے، جو ہماری نظر سے نہیں گذرا، لیکن "اقبال اور مُلّا" میں اس کے جو اقتباسات نقل کیے گئے ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں ملا کے بارہ میں اقبال کے طنزیہ اشعار نقل کیے گئے ہیں اور اس کے حاشیہ میں علمائے کرام کو ہر قسم کے الزاموں اور طعن و طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے، اور یہ یقین کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ اس قسم کے سخیف خیالات ڈاکٹر صاحب کے جیسے سنجیدہ شخص کے قلم سے نکل سکتے ہیں، مگر تجدد کا ذوق جو بھی کرادے کم ہے، اس بحث میں اقبال کو گھسیٹنا ان پر ظلم ہے، بلاشبہہ انھوں نے ملا پر طنز کیا ہے، مگر اس سے انکی مراد وہ جامد کٹھ ملا اور ملائے مکتبی ہیں جو فکر و نظر کی صلاحیتوں سے محروم ہیں، اہل علم و حق علما سے نہ صرف اقبال عقیدت رکھتے تھے بلکہ ان سے استفادہ کرتے تھے جس پر ان کے مکاتیب شاہد ہیں، پھر اگر انھوں نے ملا پر طنز کیا ہے تو اس سے کہیں زیادہ تحقیر آمیز خیالات مغرب زدوں کے متعلق ظاہر کیے ہیں، امور میں وہ خود بڑے راسخ العقیدہ تھے جس پر انکا کلام اور انکی تحریریں شاہد ہیں، انکا تو مشن ہی مغرب زدہ اور مغربی تہذیب و تمدن کے خلاف جہاد اور مسلمانوں میں دینی روح پھونکنا تھا جس سے انکا پورا کلام معمور ہے، اقبال اور مُلّا میں اسی نقطۂ نظر سے اقبال اور ملا کے مندرجات اور منکرین حدیث کی خرافات کا مدلل جواب دیا

دینی امور و مسائل سے واقفیت کے لیے کارآمد اور مفید ہے۔

اقبال اور مسٹر - مولفہ جناب منشی عبد الرحمن صاحب، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۹۰ صفحات۔

کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ، پتہ: گوشۂ ادب، چوک انارکلی، لاہور۔

مذہبی پابندیوں سے آزادی کی وبا پاکستان میں برابر پھیلتی جاتی ہے، اور اس نے ایک مستقل تحریک کی شکل اختیار کر لی ہے، جس کے رہنما منکرین حدیث اور ان کے استاد اول مغرب زدہ طبقہ ہے، اور اس کے لیے "ملاازم" کی اصطلاح گڑھی گئی ہے، اور ایک مستقل "اینٹی ملا فرنٹ" قائم ہو گیا ہے، جس کا مقصد علمائے کرام کی تحقیر و تفضیح اور مذہب کی غلط تعبیر ہے، اور یہ دیکھکر تعجب ہوتا ہے کہ اس میں بعض ایسی ہستیاں بھی شامل ہیں جو کلام اقبال کی بہترین شارح سمجھی جاتی ہیں، چنانچہ ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم صاحب نے "اقبال اور ملا" کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے، جو ہماری نظر سے نہیں گذرا، لیکن "اقبال اور مسٹر" میں اس کے جو اقتباسات نقل کیے گئے ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں ملا کے بارہ میں اقبال کے طنزیہ اشعار نقل کیے گئے ہیں اور اس کے حاشیہ میں علمائے کرام کو ہر قسم کے الزاموں اور طعن و طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے، اور یہ یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس قسم کے سخیف خیالات ڈاکٹر صاحب کے جیسے سنجیدہ شخص کے قلم سے نکل سکتے ہیں، مگر تجدد کا ذوق جو بھی کرائے کم ہے، اس بحث میں اقبال کو گھسیٹنا ان پر ظلم ہے، بلاشبہ انھوں نے ملا پر طنز کیا ہے مگر اس سے انکی مراد وہ جامد کٹھ ملا اور ملائے مکتبی ہیں جو فکر و نظر کی صلاحیتوں سے محروم ہیں، اہل علم و صاحب نظر علماء سے نہ صرف اقبال عقیدت رکھتے تھے بلکہ ان سے استفادہ کرتے تھے جس پر ان کے مکاتیب شاہد ہیں، پھر اگر انھوں نے ملا پر طنز کیا ہے تو اس سے کہیں زیادہ تحقیر آمیز خیالات مغرب زدوں کے متعلق ظاہر کیے ہیں، دینی امور میں وہ خود بڑے راسخ العقیدہ تھے جس پر انکا کلام اور انکی تحریریں شاہد ہیں، انکا تو مشن ہی مغرب زدگی اور مغربی تہذیب و تمدن کے خلاف جہاد اور مسلمانوں میں دینی روح پھونکنا تھا جس سے انکا پورا کلام معمور ہے، اقبال اور مسٹر میں اسی نقطۂ نظر سے اقبال اور ملا کے مندرجات اور منکرین حدیث کی خرافات کا مدلل جواب دیا گیا ہے،

م

مکتبہ دار المصنفین

سلسلہ سیرۃ النبی

حصہ اول: ولادت سے فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات [illegible]

حصہ دوم: فتح مکہ کے بعد سے وفات تک، اخلاق و عادات کا مفصل بیان [illegible]

حصہ سوم: معجزہ کی حقیقت و قرآن مجید کی روشنی میں بحث و تبصرہ [illegible]

حصہ چہارم: تعلیمات نبوی کا پہلا حصہ، عقائد اسلام پر مفصل و حکیمانہ بحث [illegible]

حصہ پنجم: فرائض خمسہ پر سیر حاصل بحث [illegible]

حصہ ششم: اسلامی اخلاقی تعلیمات، اسلامی فضائل و آداب کی تفصیل [illegible]

(سلسلہ سیر الصحابہؓ)

خلفائے راشدینؓ: خلفائے راشدینؓ کے ذاتی حالات و فضائل [illegible]

مہاجرین جلد اول: حضرات عشرہ مبشرہ اور بقیہ صحابہؓ کے حالات و فضائل [illegible]

مہاجرین جلد دوم: فتح مکہ سے پہلے کے صحابہ کرام کے حالات [illegible]

سیر انصار اول: انصار کرام کے فضائل و کمالات [illegible]

" دوم: بقیہ انصار کرام کے حالات زندگی [illegible]

سیر الصحابہؓ جلد ششم: حضرت حسنؓ، امیر معاویہؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ کے مفصل حالات [illegible]

سیر الصحابہؓ جلد ہفتم: فتح مکہ کے بعد کے صحابہ کرام کے سوانح و حالات [illegible]

سیر الصحابیاتؓ: ازواج مطہرات، بنات طاہرات اور عام صحابیاتؓ کے حالات [illegible]

اسوۂ صحابہؓ اول: صحابہ کرام کے عقائد، عبادات و اخلاق کی تفصیل [illegible]

" دوم: صحابہ کرام کے سیاسی و انتظامی کارناموں کی تفصیل [illegible]

اسوۂ صحابیاتؓ: صحابیاتؓ کے مذہبی، اخلاقی اور علمی و عملی کارناموں کا مرقع [illegible]

اہل کتاب صحابہؓ و تابعینؒ: یہودی و نصرانی صحابہؓ کے حالات [illegible]

الفاروق: حضرت فاروق اعظمؓ کی لائف اور عراق و شام، مصر سے ایران کی فتح کے تفصیلی حالات [illegible]

سیرت عائشہؓ: حضرت عائشہؓ کے حالات زندگی [illegible]

سیرت عمر بن عبد العزیزؒ: عمر ثانی حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے سوانح حیات اور انکے مجددانہ کارنامے [illegible]

(سلسلہ تاریخ اسلام)

تاریخ اسلام حصہ اول: (عہد رسالتؐ، خلافت راشدہ) [illegible]

" دوم: بنی امیہ دمشق کی صد سالہ تاریخ [illegible]

" سوم: ابو العباس سفاح سے متقی للہ [illegible] تک خلافت عباسیہ کی تاریخ [illegible]

" چہارم: خلیفہ مستعصم باللہ تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی تاریخ اور عباسیوں کے تمدنی کارناموں کی تفصیل [illegible]

حکمائے اسلام

حصہ اول و دوم

یوں تو اردو میں مشاہیر حکمائے اسلام کے حالات میں الگ الگ متعدد کتابیں موجود ہیں، الغزالی، امام رازی، ابن رشد تو اسی دارہ کی کتابیں ہیں لیکن کوئی ایسی جامع کتاب نہیں تھی جس میں ان سب کے حالات یکجا کردیئے گئے ہوں۔ یہ کتاب اسی کمی کو پورا کرنے کیلیے لکھی گئی ہے جس میں ان کے حالات وسوانح کے ساتھ ان کی ہر قسم کی مذہبی، اخلاقی اور فلسفیانہ خدمات کو نمایاں کیا گیا ہے، اس کے دو حصے ہیں پہلے حصہ میں یعقوب کندی، ابونصر فارابی، محمد بن زکریا رازی، ابن مسکویہ، ابوریحان بیرونی، امام غزالی، ابوالبرکات بغدادی کے حالات اور ان کے فلسفیانہ مسائل کی تشریح ہے، اور دوسرے میں ابن باجہ، ابن طفیل، ابن رشد، امام رازی مغلوں اور تاتاریوں کے عہد کے حکما، حکمائے متاخرین خاندان فرنگی محل، خاندان خیرآباد اور مختلف خاندانوں کے حکما، مثلاً ملا نظام الدین، مولانا عبدالعلی بحرالعلوم، مولانا فضل حق خیرآبادی، ملا محمود جونپوری، ملا محب اللہ بہاری وغیرہ کے حالات اور انکے نظریات و خیالات کی تشریح، اور انھوں نے اپنے علم و فلسفہ سے اسلام کی جو عظیم الشان خدمات انجام دیں، ان کی تفصیل ہے، مولفہ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم، قیمت حصہ اول [illegible] دوم [illegible]

اقبال کامل

مشہور حکیم و فلسفی شاعر ڈاکٹر اقبال کے مفصل سوانح حیات، ان کے فلسفہ و شاعری پر تبصرہ اور انکی شاعری کے اہم موضوعوں یعنی فلسفہ خودی، فلسفہ بیخودی اور نظام اخلاق وغیرہ کی تشریح

مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم، قیمت: [illegible]

(طابع و ناشر صدیق احمد)

رجسٹرڈ نمبر ل ۵۲۰ فروری ۱۹۵۸ء

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

تاریخ دعوت و عزیمت

یعنی عالم اسلام کی اصلاحی و تجدیدی کوششوں کا تاریخی جائزہ، نامور مصلحین اور ممتاز اصحاب دعوت و عزیمت کا مفصل تعارف، ان کے علمی و عملی کارناموں کی روداد، اور انکے اثرات و نتائج کا تذکرہ، اسمیں پہلے مصنف کے قلم سے پیش لفظ ہے، اسکے بعد مقدمہ جسمیں اصلاح و تجدید کی ضرورت اور تاریخ اسلام میں انکا تسلسل دکھایا گیا ہے، پھر اصل کتاب شروع ہوتی ہے جو مولانا جلال الدین رومی کی اصلاحی و تجدیدی کوششوں کی تفصیل پر جاکر ختم ہوتی ہے، قیمت : ۶ روپے

مرتبہ مولانا ابوالحسن علی ندوی

مآل و مشیت

اس میں حیات انسانی کے دو بنیادی تصوروں : مآل و مشیت کی فلسفیانہ تحلیل کی گئی ہے، یہ ۱۹۵۵ء کی بہترین کتاب ہے جسپر اسکے لائق مصنف جناب جنرل ظفر حسین خاں صاحب کو حکومت ہند کیطرف سے پانچہزار کا انعام ملا ہے، یہ موضوع کے اعتبار سے خالص فلسفیانہ اور بہت خشک ہے لیکن مصنف کے انشاپردازانہ اسلوب تحریر نے اسکو بہت دلچسپ اور دلآویز بنا دیا ہے، ان ہی کے قلم سے فرانس کے مشہور انقلابی مدبر روسو کی ایک مقالہ کا اردو ترجمہ اسی اسلوب و طرز انشا میں ادارہ کیطرف سے اس سے پہلے شائع ہو چکا ہے،

قیمت عمر

جلد ۷۹ ماہ رجب المرجب ۱۳۷۶ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۵۷ء نمبر ۲

مضامین

شذرات — شاہ معین الدین احمد ندوی — ۸۲ - ۸۴

مقالات

دیوان حافظ میں الحاق — جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب لکھنؤ یونیورسٹی — ۸۵ - ۱۱۲

عمادی غزنوی یا عمادی شہریاری — جناب ڈاکٹر غلام مصطفٰے خانصاحب ایم اے ایل ایل بی، پی ایچ ڈی، صدر شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی، حیدرآباد سندھ — ۱۱۳ - ۱۳۰

ہندستانی زبان کا ایک قدیم مرثیہ — جناب شیخ فرید صاحب لکچرار رابرٹسن کالج جبلپور — ۱۳۱ - ۱۴۱

معدن المعانی — جناب عطاء الرحمٰن صاحب عطا کاکوی پروفیسر پٹنہ ریسرچ انسٹیٹیوٹ، پٹنہ — ۱۴۲ - ۱۴۴

آثار علمیہ

مکاتیب مولانا سید سلیمان ندویؒ بنام شاہ معین الدین احمد ندوی — ۱۴۵ - ۱۵۶

مطبوعات جدیدہ — " م " — ۱۵۷ - ۱۶۰

صدق جدید میں حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے کسی اہل قلم عقیدتمند نے انکی سوانحعمری کی تالیف کیجانب توجہ دلائی ہے، اور اس کے متعلق مفید مشورے بھی دیے ہیں، انکا یہ مخلصانہ جذبہ قابلِ قدر ہے، بعض بزرگوں نے بھی ادھر توجہ دلائی ہو، اور کبھی کبھی اسکے متعلق استفسارات بھی آتے رہتے ہیں، اسلیے مناسب معلوم ہوا کہ اس بارہ میں تھوڑی سی تفصیل عرض کر دیجائے، حضرت سید صاحبؒ کی وفات کے بعد ہی سے نہ صرف انکی سوانح عمری کی تالیف بلکہ ان کے مقالات و مکاتیب کی ترتیب و اشاعت بھی پیش نظر ہے، مگر مختلف اسباب کی بنا پر ابھی ان کاموں کو شروع نہیں کیا جا سکا، لیکن ابھی کچھ ایسا وقت بھی نہیں گذرا ہو کہ اس کو تاخیر کہا جا سکے، سوانحعمری اور مقالات کی ترتیب انشاء اللہ جلد ہی شروع کیجائیگی، اور امید ہو کہ مقالات کی پہلی جلد اسی سال مرتب ہو جائیگی، مکاتیب کی ترتیب سب سے آخر میں ہوگی، مگر شائقین کی تشفی کیلیے معارف میں انکی اشاعت کا سلسلہ اسی مہینہ سے شروع کر دیا گیا ہو جو انشاء اللہ قائم رہیگا،

حضرت سید صاحبؒ کی سوانحعمری کی تالیف بڑا اہم کام ہو، انکی ذات بڑی جامع وہمہ گیر تھی، ان کے کاموں کا دائرہ نہایت وسیع تھا، وہ ایک مستقل مکتب خیال کے بانی یا کم سے کم اسکو کمال تک پہنچانے والے تھے، اور اسلامی علوم و فنون کا کوئی شعبہ اور قوم و ملت کی زندگی کا کوئی گوشہ انکے کارناموں سے خالی نہیں ہے، اسلیے انکی سوانحعمری تنہا ایک ایسے شخص کے حالات نہیں بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں کی تقریباً نصف صدی کی پوری علمی و مذہبی اور قومی و ملی تاریخ ہوگی، اور ایسے اہم کام کے لیے کچھ وقت درکار ہے،

مضمون نگار نے جس اخلاص سے اس ضرورت کی طرف توجہ دلائی ہے اسکے لیے ہم انکے شکر گذار ہیں، مگر عام شایقین کا یہ حال ہو کہ جب تک سلیمان نمبر نہیں نکلا تھا، اسکے تقاضہ کے لیے خطوط کا تانتا بندھا رہتا تھا، اور معلوم ہوتا تھا کہ یہ نمبر نکلتے ہی ختم ہو جائیگا، مگر اسکو شائع ہوئے ڈیڑھ سال ہو چکا ہے اور کل پندرہ سو چھپا تھا، اور ابھی نصف کے قریب باقی ہے، اس میں معارف کے خریداروں کی خریداری بھی شامل ہے، اسی پر حیات سلیمانی کو بھی قیاس کرنا چاہیے، بلکہ اسکی اشاعت تک یہ جذبہ اور بھی سرد پڑ جائیگا، یہ صحیح ہو کہ سلیمان نمبر اور سوانحعمری کی حیثیت مختلف ہے، سلیمان نمبر حیاتِ سلیمانی کا محض ناتمام نقش یا اجمالی خاکہ ہے اور سوانحعمری کامل مرقع ہوگا، مگر اس سے شایقین کی طلب کی حقیقت بہرحال ظاہر ہو جاتی ہے۔

مضمون نگار نے اس سلسلہ میں جو مشورے دیے ہیں، ان سے انشاء اللہ پورا فائدہ اٹھایا جائیگا، اور اس کام کیلئے جن اصحاب علم کے نام انھوں نے پیش کیے ہیں، نہ صرف ان سے بلکہ اگر ضرورت ہوئی تو دوسرے اصحاب علم و قلم سے بھی مدد لیجائیگی، انکا یہ خیال بھی صحیح ہو کہ "سید صاحب جیسی شخصیتیں کسی خاص جماعت یا گروہ کی نہیں، بلکہ تمام اہل علم کی ملک ہوتی ہیں، اور انکی سوانحعمری کی تالیف کی اہلیت اور اس کا حق صرف ندوہ اور دار المصنفین والوں تک محدود نہیں ہے، بلکہ تمام اہل قلم کو اسکا حق ہے" ہم کو اس خیال سے پورا اتفاق ہے، اگر کوئی صاحب علم اس حق کو کام میں لانا چاہیں تو اسکے مجاز ہیں، بلکہ اگر وہ دار المصنفین سے مدد چاہیں گے تو انکو ہر ممکن مدد دیجائیگی، سچی عقیدت و محبت میں رقابت کے بجائے اخوت اور باہمی معاونت ہوتی ہے، ماشاء اللہ خود مضمون نگار میں اسکی پوری اہلیت موجود ہے جس پر ان کا مضمون شاہد ہے، باقی دار المصنفین کو تو بہرحال یہ کام انجام دینا ہے، دوسروں کیلئے تو یہ فرض کفایہ ہے، مگر دار المصنفین کے لیے فرض عین ہے،

ہمارے صوبہ کی حکومت ہندستانی اکیڈمی الہ آباد کے دستور میں جو ترمیم کرانا چاہتی ہے اسکا تذکرہ گذشتہ

جینہ کے شذرات میں ہو چکا ہے۔ اس ترمیم سے اردو کا نام بھی اکیڈمی سے مٹ جاتا، یہ مسرت کا مقام ہے کہ بعض ہندو ممبروں کی شرافت اور رواداری سے ۲۸ جنوری کے جلسہ میں جو تجویز منظور ہوئی اس میں اردو باقی رکھی گئی ہے، اور اب اکیڈمی کا مقصد ہندی کے ساتھ اردو، اودھی، گھدری اور بھوجپوری وغیرہ کی خدمت اور ترقی بھی قرار پایا ہے، گو اس ترمیم کے بعد اکیڈمی میں اردو کی پہلی پوزیشن باقی نہ رہے گی تاہم موجودہ حالات میں یہ بھی غنیمت ہے، اس سے کم سے کم اردو کا نام باقی رہ جائیگا، ممکن ہے اسکا کچھ کام بھی ہو،

ہندی تو اس صوبہ کی حکومت کی سرکاری زبان ہو ہی چکی ہے، اسکی ترقی کیلئے اسکے سارے ذرائع وقف ہیں، اس کے علاوہ خود اس صوبہ میں ہندی کے کئی ادارے موجود ہیں، اسلیے اگر ایک ادارے میں ہندی کے پائیں میں اردو کی جگہ بھی باقی رکھی جائے تو اس میں کیا حرج ہے، ایک ایسے ادارے سے جسکے ممتاز بانیوں میں سر سپرو بھی تھے، اردو کو نکالنا انکی ایک عزیز یادگار کو مٹانا اور زبان کے مسئلہ میں اسکو حکومت کی پالیسی پر چلنے کے لیے مجبور کرنا اکیڈمی کے علمی وقار کے خلاف ہے،

مولانا عبدالباری صاحب ندوی نے حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تجدیدات کی ترتیب و اشاعت کا جو مفید سلسلہ لکھا ہے، اس سے دینی حلقہ واقف ہے، اس سے انکا مقصد مالی منفعت نہیں بلکہ خالص دینی خدمت ہے، چنانچہ انھوں نے اس کی آمدنی اس کی طباعت و اشاعت کے لیے وقف کر دی ہے، اور اب انھوں نے اس سلسلہ کی چاروں کتابوں یعنی جامع المجددین، یا تجدید دین کامل، تجدید تصوف، تجدید تعلیم و تبلیغ اور تجدید معاشیات کو فروخت اور آیندہ طبع و اشاعت کے لیے مکتبہ دار المصنفین کے حوالہ کر دیا ہے، اور اب وہ آیندہ یہیں سے ملیں گی،

مقالات

دیوان حافظ میں الحاق

از جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب لکھنؤ یونیورسٹی

(۲)

حافظ کا مذہب | ادھر چند دنوں سے ایران میں ہر شاعر و ادیب کے مذہبی معتقدات کے معلوم کرنے کا خیال بڑی شدت پکڑ رہا ہے، جس کا نتیجہ ہے کہ سوانح عمری کے ضمن میں ایک باب عموماً مصنف کے مذہب سے متعلق ہوتا ہے، اگرچہ حافظ کے سلسلہ میں بہت کام ہو رہا ہے، پھر بھی ان کی عظمت کے اعتبار سے بہت کم ہے، تاہم قابل ذکر ضرور ہے، اس لیے حافظ کے مذہب سے بھی ان کو کافی دلچسپی ہے اور وہاں کی اکثریت کا یہی خیال ہے کہ حافظ کا مذہب تشیع تھا، چنانچہ ایک بار میں حبیب یغمائی (شاعر معروف و مدیر مجلہ یغما) کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ نوروز کی تعطیلات میں شیراز سے واپس آئے تھے، اور وہاں کے تاثرات تازہ تھے، فرمانے لگے سعدی کا جو مقام ہے اس کے اعتبار سے انکی قدر اہل شیراز خصوصاً اور اہل ایران عموماً نہیں کرتے، اس کے برعکس حافظ کے ساتھ غیر معمولی عقیدت رکھتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ حافظ کے تشیع میں کسی قسم کا شبہہ نہیں، اور سعدی شیعہ ثابت نہیں ہو سکتے، موصوف چونکہ سعدی کے بڑے مداح ہیں، اس لیے اہل شیراز کے اس رویہ سے نالاں تھے،

میرے پیش نظر اس وقت جتنی کتابیں ہیں، ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سب سے پہلے سید عبدالرحیم خلخالی نے حافظ کے دیوان کے غائر مطالعے کے بعد حافظ کے مذہب کے متعلق مختصر مگر سچی بات لکھی تھی،[له]

در موضوع عقیدۂ مذہب خواجہ بسط مقال را احتیاجی نیست زیرا کسانیکہ دیوان خواجہ را مطالعہ کردہ و با بیانات او آشنائی دارند میدانند کہ ایں استاد صریح البیان در قرن ہشتم ہجری کہ تعصبات جاہلانہ در شدت غلیان ، ناوکرشمہ ہای منبری عوام فریبی در اوج کمال، و خانقاہ و صومعہ پر از خرقہ پوشان و معرفت فروشاں بود" زدیم بصفت رنداں وہرچہ باداباد" گفتہ بدون آنکہ از تکفیر و تفسیق پروائی کند افکار عقاید خود را . . مصور و مجسم کردہ در معرض نمایش عمومی گذاشت . . . جنگ و جدلہای مذہبی را افسانہ و پیروان آں را از درک حقائق بیگانہ دانستہ پردۂ خرافات و موہومات را دریدہ کہ رشتۂ ابر کنہ و سبحہ و سجادۂ تزویر را بدور افگندہ و در مقابل ریاکاراں و ارباب تزویر ایستادہ با صراحت لہجہ "نقدہا را بود آیا کہ عیاری گیرند"

. . . . ایں وصف چون و چرا یا تطویل کلام در عقیدہ خواجہ جز عوض خود بیاد دادن و زحمت خوانندہ را فراہم آوردن نتیجۂ دیگری نخواہد داد . . . . ولی تحقیق اینکہ خواجہ ظاہراً در چہ مذہب تولد یافتہ و پیرو کدام یک از مذاہب اسلامی بودہ است نگارندہ را تحقیقاً چیزی معلوم نشد ، اگر قصیدۂ معروف :

مقدری کہ ز آثار صنع کرد اظہار ۔۔۔ سپہر و مہر و مہ و سال و ماہ و لیل و نہار

و ہم چنیں غزل مشہور

ای دل غلام شاہ جہاں باش شاہ باش ۔۔۔ پیوستہ در حمایت لطف الہ باش

بالتمام از خواجہ باشد در تشیع او تردیدی نخواہد بود "

له مقدمہ دیوان ص "یو"

ظاہر ہے کہ جب خواجہ حافظ نے ہر جگہ اپنے کو مذہبی تنگ نظری سے بالاتر رکھا ہے تو انکے معتقدات کی تلاش ضروری نہیں، ہاں اگر کسی طرح اس کی تحقیق ہو جائے تو غیر مناسب بھی نہیں، قول بالا میں یہ سقم ضرور باقی رہ جاتا ہے کہ جب یہ دونوں نظمیں کسی قدیم نسخے میں نہیں اور ساتھ ہی نہایت سست و مبتذل، حافظ کے کلام سے متفاوت اور ان کے معتقدات کے خلاف بھی ہیں، تو پھر صریح طور پر اس بات کا اظہار کر دینا چاہیے کہ ان الحاقی چیزوں سے حافظ کو شیعہ ثابت کرنے کی کوشش غیر مستحسن ہے۔

اس کے بعد مشہور محقق مرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی نے خلخالی کے مرتب کیے ہوئے دیوان کی تقریظ کے ضمن میں ۱۳۲۶ھ میں چند جملے حافظ کے مذہب سے متعلق لکھے تھے، یہ مقالہ بعد میں مبست مقالہ قزوینی کی جلد دوم کے ساتھ کتابی صورت میں آگیا۔ وہ لکھتے ہیں[۱]:

یک کلمہ نیز راجع بمذہب خواجہ اشارہ کردہ مقالہ را ختم میکنم چنانچہ ناشر فاضل در صفحہ "یو" از دیباچہ مرقوم داشتہ اند اگر......... تردیدی نخواہد بود وباوجود اینکہ این قصیدہ و این غزل از بہترین اشعار نیست معذلک برای نجات اخروی خواجہ باید آرزو کرد کہ ہر دو از خواجہ باشد والحاقی...... نباشد۔ در ہر صورت کسی کہ مشربش این بودہ کہ

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ چون ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

البتہ مستبعد است کہ بمذہب دون مذہبی تقیدی داشتہ یا نسبت بتشیع یا تسنن تعصبی می ورزیدہ است وعلی ای حال بغیر دو قصیدہ و غزل مشکوک مذکور ما دلیلی بر تشیع و تسنن

---

[۱] ج ۲ ص ۱۰۰-۱۰۱ ڈاکٹر قاسم غنی نے تاریخ عصر حافظ میں (ص ۱۷۵-۱۷۹) حافظ کے مذہب کے سلسلے میں بعینہ یہی عبارت نقل کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اس سلسلے میں انھیں بھی کوئی مستحکم ثبوت بہم نہیں پہنچ سکے ہیں، ان کی کتاب "حافظ شیریں سخن" کے بعد چھپی ہے (۱۳۶۱ھ)

شخص حافظ بطور یقین در دست نداریم ولی در خصوص مذہب رسمی اہالی فارس در عصر خواجہ دلیل قطعی در دست داریم کہ مذہب سنت و جماعت بودہ است و آں عبارت است از مسکوکات سلاطین حاکمہ آں عصر در فارس یعنی آل مظفر کہ امروز باقی است و در روی آنہا صریحاً اسامی خلفاء اربعہ منقوش است۔"

اس ضمن میں ایک بات یہ عرض کرنے کی ہے کہ یہاں جس قصیدے اور غزل کو انھوں نے "بہترین اشعار سنت" کہا ہے، اور صرف "مشکوک" قرار دیا ہے، اس کے متعلق دوسری جگہ اسطرح کے خیالات کا اظہار کیا ہے[۵]

"بلکہ تقریباً بنحو قطع و یقین ..... الحاقی است ...... بدون ہیچ شک و شبہہ از خواجہ نیست چہ علاوہ بر فقدان ..... در عموم نسخ قدیمہ ہم از حیثیت سبک و اسلوب وہم از حیث مضامین و افکار و مشرب نیز ..... بعد المشرقین است و مخصوصاً بعضی ... فی الواقع سخیف ترین و رکیک ترین وسست ترین اشعاری است کہ ہرگز بجملۂ کسی خطور تواند کرد الخ"

دوسری بات یہ کہ جب "بنحو یقین و قطع" ان کا الحاقی ہونا ثابت کر چکے ہیں تو پھر نجات اخروی کی امید میں اس کے الحاقی ہونے کی آرزو غیر ضروری ہے۔

ڈاکٹر محمد معین نے "حافظ شیریں سخن" میں اس موضوع پر بڑی گہری اور تنقیدی نظر ڈالی ہے اور ان تمام قرائن کی تفصیل بیان کر دی ہے، جن سے ان کو شیعہ یا سنی سمجھا جا سکتا ہے، پھر اس پر خود تبصرہ کیا ہے، مثلاً ان کے تشیع کے حسب ذیل قراین درج کیے ہیں:

۱۔ حافظ کا ایک قصیدہ ہے:

---

[۵] مقدمہ دیوان حافظ مصححۂ قزوینی و غنی، ص قید۔ یہ پوری عبارت اس سے قبل نقل ہو چکی ہے، دیکھئے ص ۲۰۵-۲۰۹

مقدری کہ ز آثار صنع کرد اظہار	سپہر و مہر و مہ و سال و ماہ و لیل و نہار

اس کے ضمن میں ۳ بیت میں نبی اور ولی کی مشترک توصیف ہے۔ ۳ بیت حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ کے لیے مخصوص ہیں، آخر میں کہتے ہیں،

بدشمناں منشیں حافظ تولا کن	نجات خویش طلب کن بجان ہشت و چہار

"ہشت و چہار" سے مراد بارہ امام ہیں۔

۲- غزل ذیل بھی حافظ کی منظومہ ہے،

ایدل غلام شاہ جہاں باش شاہ باش	پیوستہ در حمایت لطف الہ باش
چوں احمدم شفیع بود روز رستخیز	گو ایں تن بلاکش من پرگناہ باش
آنراکہ دوستی علی نیست کافرست	گو زاہد زمانہ و گو شیخ راہ باش
امروز زندہ ام بولاے تو یا علی	فردا بروح پاک امامان گواہ باش
قبر امام ہشتم سلطان دیں رضا	از جاں ببوس بر در آں بارگاہ باش
حافظ طریق بندگی شاہ پیشہ کن	وانگاہ در طریق چو مردان راہ باش

یہ غزل حافظ کے مزار پر کندہ ہے،

۳- یہ غزل بھی حافظ ہی کی ہے:

طالع اگر مدد دہد دامنش آورم بکف	گر بکشم زہی طرب ور بکشد زہی شرف
حافظ اگر قدم زنی در رہ خاندان بصدق	بدرقۂ رہت شود ہمت شحنۂ النجف[1]

"شحنۂ النجف" سے مقصود حضرت علیؓ کی ذات ہے اور خاندان سے مراد "اہل بیت نبی" ہے۔

۴- یہ بیت بھی حافظ کی منظومہ ہے:

---

[1] پژمان و قزوینی و خلخالی: شحنۂ نجف

شمع جمع آفرینش شاہ مردانست وبس	گر توئی از جان غلام شاہ مرداں غم مخور

"شاہ مرداں" سے مراد حضرت علیؓ ہیں،

۵۔ حافظ کی ایک رباعی یہ ہے:

مردی ز کنندہ در خیبر پرس	اسرار کرم ز خواجۂ قنبر پرس
گر تشنۂ فیض حق بصدقی حافظ	سر چشمۂ آں ز "ساقی کوثر" پرس

"ساقی کوثر" سے حضرت علیؓ ہی کی ذات مقصود ہے،

۶۔ ایک رباعی کا دوسرا شعر یہ ہے:

تا کے بود ایں گرگ ربائی ؟ بنمای	سر پنجۂ دشمن افگن ای شیر خدای

۷۔ محمد گل اندام نے اپنے مقدمہ میں نعت پیغمبر کے بعد لکھا ہے:

خصوصاً امام المغارب والمشارق وجامع اصناف المعارف والحقایق قائل کلمہ "انا کلام اللہ الناطق" اسد اللہ الغالب علی بن ابی طالب علیہ الصلوٰۃ والتحیۃ والاکرام

اس کے بعد تین[1] بیت ہیں،

اس سے محمد گل اندام کا شیعہ ہونا واضح ہے، اور چونکہ وہ حافظ کے بڑے مقرب تھے، اس اعتبار سے قیاس ہوتا ہے کہ حافظ کا بھی یہی مذہب رہا ہوگا،

۸۔ حافظ کہتے ہیں:

کجاست صوفی دجال چشم ملحد شکل	بگو بسوز کہ مہدی دین پناہ آمد

حضرات شیعہ ظہور مہدی اور دجال کے معتقد ہیں، جبکہ اہل سنن کا اعتقاد ایسا نہیں ہے،

۹۔ حافظ کی ایک بیت یہ ہے:

---

[1] یہ ابیات نقل ہو چکی ہیں،

زجان محب رسول است و آلِ او | بر این سخن گواست خداوند اکبرم

اسی غزل کی وجہ سے حافظ کی قبر شاہ اسمٰعیل صفوی کے ہاتھوں خراب ہونے سے بچ گئی۔

۱۰۔ دائرۃ المعارف برتانیکا قصیدۂ مذکور (نمبر ۱) کو حافظ کی ملک قرار دیتے ہوئے انکو شیعہ بتایا ہے، اور اس قصیدہ کا بعض دیوانوں سے حذف ہونا "سودی" مفسر دیوان حافظ کے تعصب کی بنا پر تھا،

۱۱۔ تصوف کے تقریباً تمام سلاسل حضرت علیؓ پر ختم ہوتے ہیں، حافظ عارف ہونے کی وجہ سے خاندان اہل بیت سے بہت زیادہ عقیدت رکھتے تھے۔

یہ ہے خلاصہ جو ڈاکٹر محمد معین نے درج کیا ہے، پھر وہ ان دلائل کی اس طرح جرح[1] و تعدیل کرتے ہیں:

(۱) یہ قصیدہ بہت سست ہے، اور قدیم نسخوں میں پایا نہیں جاتا، علاوہ بریں آخر میں بیت دو

حرامزادہ و بدفعل و شوم و بی بنیاد | بمدح شاہ جہاں کی کجا کند اقرار

متابعت بمنافق چہ میکنی بگذر | زیاد گفتن نامش ہزار استغفار

حافظ جیسے عارف کی طرف اس طرح کی سب و طعن منسوب نہیں کیجا سکتیں،

(۲) یہ غزل قدیم نسخوں میں نہیں ہے، اور حافظ کی اور غزلوں کی طرح متانت عاری ہے،

(۴) یہ بیت کسی قدیم نسخے میں پائی نہیں جاتی، بالکل الحاقی ہے،

(۹) یہ بیت معتبر خطی نسخوں میں نہیں پائی جاتی، آخر میں وہ یہ محاکمہ[2] کرتے ہیں:

"از غزل دیگر و دوبا عی خواجہ و دیگر دلائل میتواں بہ تشیع خواجہ معتقد بود"

اس سلسلے میں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ (۱) مقدمہ میں نعت کے بعد کا یہ حصہ الحاقی ہے، کیونکہ

---

[1] حافظ شیریں سخن ص ۱۱۳ [2] ص ۳۱۲

کسی قدیم نسخہ میں نہیں، چنانچہ مرزا محمد قزوینی نے لکھا ہے:

بدون شک الحاقی میباشد از متاخرین در عہد صفویہ بقصد اینکہ خواجہ را نظر بعض مصالح شیعہ قلمداد کنند (دیوان قزوینی ص "قز" حاشیہ)

نیز "گل اندام" کو جامع دیوان قرار دینا بھی صحیح نہیں، مرزا محمد نے اس سلسلے میں بڑی تفصیل سے بحث کی ہے، ملاحظہ ہوں چند جملے[1]:

این فقرہ یعنی اینکہ در ہفت نسخہ از یازدہ نسخہ ازین مقدمہ ابداً اسمی از جامع دیوان حافظ بنا بر مشہور درین اواخر محمد گلندام نامی بودہ بردہ نشدہ بدون ہیچ شک و شبہہ تولید شک عظیمی در صحت و اصالت نام محمد گلندام می نماید و این احتمال را در ذہن تقویت می نماید کہ شاید این نام الحاقی باشد از یکی از متاخرین گمنام[2]...... الخ

بہر حال جس جملے سے گل اندام کا تشیع ثابت ہوتا ہے، اس کے الحاقی ہونے میں کسی قسم کا شبہہ نہیں، اس لیے اس قیاس سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہو وہ بھی بے بنیاد رہ جاتا ہے،

(۹) یہ بیت بھی الحاقی ہے، کسی قدیم نسخے میں نہ ہونے کے ساتھ ساتھ حافظ کے افکار و خیالات کے بالکل منافی ہے۔

(۱۰) دائرۃ المعارف کے قول کی بنیاد الحاقی قصیدہ پر ہے تو اس کی کوئی اہمیت نہیں باقی رہ جاتی،

---

[1] مقدمہ دیوان ص "قز" [2] اس کے بعد بھی دو قرینے بتائے ہیں، اول یہ کہ دولت شاہ کے سامنے یہ مقدمہ تھا، مگر اس نے کوئی نام نہیں دیا، دوسرے "سودی" نے کسی مخصوص شخص کی طرف یہ مقدمہ منسوب نہیں کیا، مگر ڈاکٹر معین دولت شاہ کی نسبت سے گل اندام کا نام درج کرتے ہیں (حافظ شیرین سخن ص) لیکن میرے خیال میں یہ بڑا اشتباہ ہے کیونکہ اول تو دولت شاہ کے تذکرہ میں اسکا نام نہیں آیا، دوم خلاصۃ الاشعار (۱۰۱۶ھ) میں بھی نہیں، حالانکہ اس میں حافظ کے حالات دولت شاہ سے ماخوذ ہیں،

(۱۱) یہ بحث اس سلسلے میں غیر ضروری ہے کہ جب سارے سلاسل صوفیہ حضرت علیؓ پر ختم ہوتے ہیں تو اس میں تو حافظ کی کوئی خصوصیت نہیں اور اس سے ان کے عقائد مذہبی پر کوئی روشنی نہیں پڑتی، ممکن ہے ڈاکٹر موصوف یہ نتیجہ نکالنا چاہتے ہوں کہ ان کے تصوف سے کسی کو تسنن کا دھوکا نہ ہونا چاہیے۔

البتہ نمبر ۳ کی غزل، نمبر ۵، ۶ کی دو رباعیاں ایسی ہیں جن سے حافظ کی اس غیر معمولی عقیدتمندی کا ثبوت ملتا ہے، جو خاندان رسول اور حضرت علیؓ کے ساتھ تھی لیکن یہ دلائل ایسے نہیں جن کی وجہ سے بطور قطع و یقین ان کو شیعہ کہا جا سکے۔ ان کے اس میلان کا یہ نتیجہ البتہ نکلا کہ لوگوں کو انکے دیوان میں طرح طرح سے الحاق کا موقع مل گیا جس کی بنا پر ان کے بعض افکار و خیالات کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں ہو سکتی، جن الحاقات کا ذکر دیوان کے سلسلے میں اوپر یہاں بھی ہو چکا ہے وہ صرف بطور نمونہ مشتے از خروارے ہیں جسین ترِ مان کے مرتبہ دیوان میں الحاق کے اور بہت سے نمونے ملیں گے جن میں چند کی طرف ذیل میں اشارہ کیا جاتا ہے۔

(۱)	ثنا گویم کریمے را کہ بی مثل است بی ہمتا	پس از آں نعتِ پیغمبر زجان و دل کنم انشا
	سحر گہ خواجۂ قنبر وصیِ نفس پیغمبر	امیر المومنین حیدر، خدیو دلدل و شہبا
	الا ای دشمن ناکس چو شیطانِ لعینِ خس	ترا این لعن باشد بس کہ گشتی یار با اعدا
	بیا بشنو سخن از من مشو با شیرِ دل دشمن	ز دل بیخ جفا بر کن زجاں ترک دغا بنما
(۲)	آں گلبنِ باغِ وفا آں سرو بستانِ صفا	خورشید برجِ ارتضیٰ یعنی علیِ مرتضیٰ
	بدر الدجیٰ صدر التقی کہف الوریٰ زین الہدیٰ	نجم العلیٰ شمس الضحیٰ یعنی وصیِ مصطفیٰ
(۳)	بعزم آنکہ کنم توبہ از محبتِ غیر	شنیدم آیت "توبوا الی اللہ" از لبِ حور

لہ دیوان ص ۴۲۲ ببعد، پہلے تین قصیدے ہیں اور آخری دو مسدس، یہ الحاقی نظمیں صرف اہل بیت کی مدح میں ہیں۔

ازیں سپس من و عیش شراب مرتضوی		حدیث بید و دانش خد ایگاں سرور

۱ دوش بودم در طواف روضۂ خیر الانام		شاہ سلطانِ خراساں آں امام ابن الامام

آں امامی کز شرف دانش بود بر دی تمام		کعبۂ اہل خراساں قبلۂ ہر خاص و عام

بودہ اندر روضۂ اش کا مد بگوشم ایں کلام

السلام الحضرت شاہ خراسان السلام

۲ دوش بودم ز خوف بی عملی		تا سحر با نیاز و درد و دلی

ہاتفی گفت کا ی محب علی		تا بکی در میانِ آب و گلی

گوی تا نبودت ز دین خللی

کہ سلام علی علی ولی

ڈاکٹر محمد معین[1] نے حافظ کے تسنن کے حسب ذیل دلائل دیے ہیں:

(۱) حافظ کہتے ہیں:

من ہماندم کہ وضو ساختم از چشمۂ عشق		چار تکبیر زدم یکسرہ بر ہر چہ کہ ہست

شیعہ مذہب میں نماز میت میں پانچ تکبیریں ہوتی ہیں لیکن سنیوں کے یہاں صرف چار ہیں،

(۲) حافظ بہاء الدین امام اہل تسنن کو مقرب الٰہی جانتے ہیں:

بہاء الحق والدین طاب مثواہ		امام سنت و شیخ جماعت

چو میرفت از جہاں ایں بیت می خواند		بر اہل فضل و ارباب براعت

بطاعت قرب ایزد میتواں یافت		قدم در نہ گرت ہست استطاعت

بدیں دستور تاریخ وفاتش		بروں آر از حروف "قرب طاعت"

---

[1] حافظ شیریں سخن ص ۳۰۱-۳۰۵

(۳) بعض لوگوں نے حافظ کے حسب ذیل بیت سے استدلال کیا ہو کہ وہ اشعری مذہب کے ماننے والے تھے،

بحق کلامت کہ آمد قدیم بحق رسول و بخلق عظیم

در کوی نیکنامی ما را گذر ندادند گر تو نمی پسندی تغیر دہ قضا را

این جان عاریت کہ بحافظ سپرد دوست روزی رخش ببینم و تسلیم وی کنم

مذہب اشعری کے اصول میں قدم قرآن، عدم تغیر قضا، اختیار نداشتن بندہ، در رویت باری در یوم الموعود خصوصیت سے قابل ذکر ہیں،

(۴) حافظ کہتے ہیں:

ببین ہلال محرم بخواہ ساغر راح کہ ماہ امن و امان است سال صلح و صلاح

محرم عزا کا مہینہ ہے، اس میں کوئی شیعہ شراب خواری کی تلقین نہیں کر سکتا،

(۵) حافظ کے زمانے میں اہالی فارس مذہب تسنن کے پیرو تھے (۱) مرزا محمد قزوینی لکھتے ہیں:

در خصوص مذہب ہمی اہالی فارس در عصر خواجہ دلیل قطعی در دست داریم کہ مذہب سنت وجماعت بودہ است و آں عبارت است از مسکوکات سلاطین[۱] حاکمہ آں عصر در فارس یعنی آل مظفر کہ امروز باقی است و در روی آنہا صریحاً اسامی خلفائے اربعہ منقوش ست"

۱۔ سکہ مبارز الدین محمد، نقرہ کاشان، ۷۵۵ھ

رو ے پشت

---

[۱] ب۔ک فہرست مسکوکات لین پول ج ۶ ص ۲۳۶

۲۔ سکہ شاہ شجاع (۷۵۹ھ ۔ ۷۸۶ھ)

روے

پشت

باللہ
المعتضد والسلطان
ضرب
المطاع شاہ شجاع
ایذج
خلد اللہ ملکہ
اثنی ستین و سبعمائۃ

اور اسی طرح شاہ شجاع کے دوسرے سکے جو ۷۶۲ھ اور ۷۷۱ھ میں شیراز میں اور ایک ۷۶۳ھ، ۷۶۸ھ میں کاشان میں اور ۷۶۲ھ میں یزد میں اور لار اور کازرون میں ڈھلے تھے، ان سب میں بغیر استثنا خلفاے راشدین کے نام منقوش ہیں، البتہ شاہ منصور کا ایک سکہ ایسا ہے جو شیراز میں ڈھلا تھا، اور جس پر خلفا کے نام نہ تھے[1]،

(ب) امیر مبارز الدین نے ۷۵۵ھ میں محاصرہ اصفہان کے موقع پر مصر کے خلیفہ ابوبکر معتضد باللہ کے ایلچی کے ہاتھ پر بیعت کی، اور جس طرح اس سے قبل شیخ ابو اسحٰق اینجو نے خلیفہ کا نام خطبہ اور سکہ میں جاری کیا تھا، امیر مذکور نے بھی وہی طریقہ جاری رکھا، اور عراق و فارس و یزد کے علما کو خلیفہ کی بیعت پر مائل کیا، شاہ شجاع نے بھی یہ سنت برقرار رکھی اور ۷۷۰ھ میں علماے دین کو "القاہر باللہ محمد بن ابوبکر" خلیفہ مصر کی بیعت پر متوجہ کر کے اس کا نام خطبہ اور سکہ میں شامل کیا،

اس کے بعد ڈاکٹر معین[2] نے ان قراین پر جرح کی ہے:

---

[1] ڈاکٹر غنی کے پاس بھی ایک سکہ شاہ شجاع کے عہد کا ہے جس پر یہ عبارت ہے [تاریخ عصر حافظ ۹، ۱۷، ح ۱]

روی :-

پشت :-

ضرب
امیر المومنین
والسلطان المطاع
شاہ شجاع خلد
اللہ ملکہ

[2] حافظ شیرین سخن ص ۳۰۹ - ۳۱۱
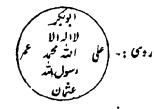
(۱) یہ دلیل "مثبت" نہیں، اس بیت کی تفسیر دو طرح پر ہو سکتی ہے: (۱) بعقیدہ شیعہ (۲) بعقیدہ عرفا، حضرات شیعہ حضرت جعفر صادق سے روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا جس مردہ پر چار تکبیر کہتے وہ نفاق سے متہم ہوتا، ممکن ہے حافظ نے عالم ہستی کی پستی و حقارت کی وجہ سے اس کے لیے چار تکبیریں استعمال کی ہوں،

حضرات صوفیہ کے یہاں چار تکبیر سے مراد فناے آثار ی. فناے افعالی، فناے صفاتی اور فناے ذاتی ہے،

(۲) یہ دلیل بھی سند میں نہیں لائی جا سکتی، اس لیے کہ حافظ آزادی فکر میں ضرب المثل تھے، ان کے نزدیک مذہبی تنگ نظری بے معنی تھی .

(۳) کلام اللہ کی قدمت کا اعتقاد فرقۂ تسنن کے ساتھ مخصوص نہیں، اہل تشیع بھی اس کے قائل ہیں، جیسا کہ مولف لطیفۂ غیبیہ نے صراحت کی ہے .

(۴) اس اعتراض کی کوئی وقعت نہیں، اس لیے کہ عرفا کے نزدیک "ظرفیت زمان" غیر اہم اور صرف "مظروف" پر ارزش ہے. نیز خواجہ کے یہاں اس طرح کی دوسری مثالیں بھی پائی جاتی ہیں، مثلاً مارا دوسہ ساغر بدہ وگو رمضاں باش، اس سے قیاس غلط ہوگا کہ حافظ مسلمان نہ تھے،

(۵) اہالی فارس کے مذہب سے حافظ کے مذہبی معتقدات کا تعین صحیح نہیں ہو سکتا. اس کے علاوہ اولجا یتو نے اپنے دور حکومت میں (۷۰۳ھ - ۷۱۶ھ) تشیع کو ایران کا سرکاری مذہب قرار دیا تھا، اور اس کے زمانے میں شیعہ علما، و عرفا بھی موجود تھے، جن میں شیخ صفی اردبیلی، علاء الدولہ سمنانی، امیر سید علی ہمدانی قابل ذکر ہیں،

مجھے اس سلسلہ میں صرف تین باتیں عرض کرنا ہیں، اول یہ کہ نمبر ۴ میں جس غزل کے شعر

اشارہ ہے، وہ غلطی ہی اور قزوینی کے نزدیک الحاقی اور تیرہ مان کے نزدیک اصلی نمبر ۱۰۳ ص ۷، ہیں، دوسرے یہ علاء الدولہ کا تشیع قطعی نہیں، اس لیے کہ (۱) حدیث میں انھوں نے صحیح مسلم رکن الدین صائن اور رشید بن ابی القاسم سے پڑھی تھی (شرح حال علاء الدولہ سمنانی ص ۲۶-۲۷) (۲) ان کے شیخ عبد الرحمن اسفراینی کے سلسلۂ تصوف میں نجم الدین کبریٰ، نجیب الدین سہروردی، ابوبکر نساخ وغیرہ[لہ] شامل تھے، جو اہل سنت تھے (۳) تیسرے یہ کہ اولجایتو (خدابندہ) [۷۰۳ھ-۷۱۶ھ] چھ سال تک حنفی مذہب کا پیرو رہا، ۷۰۹ھ میں اس نے خلفائے ثلاثہ کے نام سکہ اور خطبہ سے خارج کیے (تاریخ مفصل ایران ص ۳۱۶) اور آخر میں پھر مذہب تسنن اختیار کر لیا "در اواخر عمر امر داد کہ نام خلفارا در سکہ وخطبہ داخل کنند" (تاریخ ایران ص ۳۱۸) [نیز ملاحظہ ہو سفرنامہ ابن بطوطہ ص ۱۵۳] گویا اپنی ۱۴ سالہ حکومت کے زیادہ حصے میں وہ مذہب تسنن ہی پر چلا، درمیان میں چند سال کے لیے شیعہ ضرور ہو گیا تھا،

ڈاکٹر موصوف نے جو دلائل حافظ کے تسنن کے سلسلہ میں پیش کیے ہیں، ان کے علاوہ چند اور قرائن ہیں جو اسی قیاس کے مؤید ہیں،

[۱] حافظ کے اساتذہ میں ڈاکٹر معین نے دوسرے اور ماخذوں سے تین نام گنائے ہیں، (حافظ ص ۸۴)

شمس الدین عبد اللہ شیرازی، میر سید شریف جرجانی، قاضی عضد الدین ایجی۔

ان میں سے شمس الدین عبد اللہ کے متعلق تفصیل نہیں معلوم ہو سکی، بعض لوگ ان میں اور

لہ علاء الدولہ سمنانی ص ۳۴، علاوہ بریں امیر چوپان جس نے باوجود اولجایتو کے حکم کے شیعہ مذہب قبول نہیں کیا تھا (تاریخ ایران ص ۳۱۶ س ۴) کی شیخ سے عقیدت (تاریخ ایران ۹۰۵) سے بھی میرے قیاس کی تائید ہوتی ہے، نیز ملاحظہ ہوں ان کے تعلقات کمال الدین کاشانی سے، (تاریخ ایران ایضاً)

قوام الدین عبد اللہ میں اقتباس کرتے ہیں، البتہ سید شریف جرجانی کی شخصیت بہت مشہور ہے، وہ ۷۴۰ھ[1] میں پیدا ہوئے، اصلاً جرجان [= گرگان یعنی استرآباد] میں پیدا ہوئے، شاہ شجاع کے زمانے میں شیراز میں درس و تدریس میں مصروف تھے، ملا سعد الدین عمر تفتازانی[2] کے معاصر تھے اور بعض موضوعات پر ان سے مباحثے بھی ہوئے تھے، ملا سعد ہی[3] کے توسط سے شاہ شجاع کے دربار میں غیر معمولی امتیاز حاصل ہوا، شیراز کے قدیم مدرسہ دار الشفا[4] میں فریضۂ درس انجام دیتے تھے، حافظ بالکل ہم سن ہونے کے باوجود ان سے کسب فیوض کرتے تھے، شیراز ہی میں ۸۱۶ھ[5] میں وفات پائی، نسباً حسنی حسینی سید اور مذہباً حنفی تھے، شعر و شاعری سے زیادہ رغبت نہ تھی، حیات[6] حافظ کے حوالے سے ڈاکٹر معین[7] نے ایک لطیفہ بھی درج کیا ہے، جس میں انھوں نے حافظ کے اشعار کو حدیث قدسی کہا ہے۔

قاضی عضد الدین عبد الرحمٰن بن احمد[8] ایجی اپنے زمانے کے مشہور ترین علما اور متکلمین میں شمار ہوتے ہیں، ایک واسطے سے قاضی القضاۃ ناصر الدین بیضاوی شافعی کے شاگرد تھے، شاہ ابو اسحاق اینجو، امیر مبارز الدین اور شاہ شجاع کے زمانے میں بڑا اعزاز حاصل ہوا، شاہ[9] شجاع نے بعض کتابیں قاضی صاحب سے پڑھی بھی تھیں، آخر میں امیر شبانکارہ نے انھیں قید کر دیا اور وہیں ۷۵۶ھ[10] میں وفات پائی، حکمت و معانی و بیان و اصول میں صاحب تالیفات ہیں، ان میں سے سب سے زیادہ مشہور مواقف ہے، جو علم کلام میں ہے۔ حافظ نے اس کی طرف اس طرح

---

[1] حافظ شیریں سخن ص ۱۸۳، مگر فہرست مدرسہ سپہ سالار ج اول ص ۱۲۳ میں ۷۴۰ھ ہے [2] وہ شافعی یا حنفی مذہب تھے قاضی عضد کے شاگرد اور بڑے پایہ کے عالم گزرے ہیں (فہرست ج ا ص ۵۵) [3] ایضاً [4] ایضاً [5] فہرست ص ۱۲۳ میں ۸۱۶ھ ہے، نیز ملاحظہ ہو حافظ شیریں سخن ص ۱۸۳، حاشیہ ۴ [6] ایضاً ص ۱۸۸ [7] ملاحظہ ہو حافظ شیریں سخن ص ۱۸۱-۱۸۲ [8] فہرست جلد اول ص ۴۸۵ نیز تاریخ مفصل ایران ص ۳۵۱، ۴۱۹، ۴۲۲ [9] فہرست میں سنہ وفات ۷۵۶ھ دیا ہے اور یہی سنہ پژمان نے بھی دیا ہے (دیوان مقدمہ ص نوزدہم)

اشارہ کیا ہے،

دگر شہنشہ دانش عضد کہ در تصنیف بنای کار مواقف بنام شاہ نہاد

قاضی صاحب کی دوسری تصنیف شرح مختصر ابن حاجب ہے، "مختصر ابن حاجب" اصول میں ہے، اس کے مؤلف ابوعمر عثمان بن عمر معروف با بن حاجب نے اپنی ایک دوسری کتاب "منتہی الاصول" سے مختصر کرکے لکھا ہے،

قاضی صاحب مذہباً شافعی تھے[۱]، غالباً اسی بنا پر قاضی نور اللہ شوستری نے انھیں رئیس الملا[۲] کا لقب دیا ہے، ڈاکٹر معین[۳] لکھتے ہیں:

"پیداست با اہمیتی کہ قاضی عضد در دربار شاہ شجاع داشتہ وخواجہ نیز ہمیں وجہ در آنجا محترم بود باید خواجہ ازو استفادت بردہ باشد رحتی کتب وتصانیف او آشنائی داشتہ باید؛ دائرۃ المعارف اسلامی نیز نویسد محتمل است کہ قاضی عضد استاد حافظ بودہ باشد۔"

[۲] بادشاہوں اور وزیروں کے علاوہ حافظ نے جن جن بزرگوں کا ذکر کیا ہے، ان میں بیشتر بطور یقین اہل تسنن تھے اور کسی ایک کا بطور رگان کے بھی شیعہ ہونا ظاہر نہیں ہوتا، مثلاً حافظ[۴] کا ایک مشہور قطعہ ہے

بعہد سلطنت شاہ شیخ ابو اسحٰق
بہ پنج شخص عجب ملک فارس بود آباد

نخست پادشہی ہمچو او ولایت بخش
کہ جان خویش بپرورد وداد عیش بداد

دگر مربی اسلام شیخ مجد الدین
کہ قاضی بہ ازو آسمان ندارد یاد

دگر بقیہ ابدال شیخ امین الدین
کہ یمن ہمت او کارہای بستہ کشاد

---

[۱] فہرست ج ۱ ص ۴۸۵ [۲] دیوان (پژمان) ص نوزدہ [۳] حافظ شیرین سخن ص ۱۸۲،

[۴] دیوان خلخالی ص ۲۶۸، دیوان قزوینی ص ۳۶۳

دگر شہنشہ دانش عضد کہ در تصنیف | بنای کار مواقف بنام شاہ نہاد
دگر کریم چو حاجی قوام دریا دل | کہ نام نیک ببرد از جہان بخشش و داد
نظیر خویش بنگذاشتند و بگذشتند | خدای عزوجل جملہ را بیامرزاد

شیخ مجد الدین اسماعیل[1] بن محمد بن خداداد (متوفی ۷۵۶ھ) شیراز کے قاضی اور بادشاہ ابواسحاق کے بڑے مقرب تھے، شیراز ہی میں انھوں نے مدرسہ مجدیہ کی بنیاد ڈالی اور اس میں درس بھی دیتے جب سلطان اولجایتو نے مذہب تشیع کی ترویج کا فرمان صادر کیا تو قاضی مجد الدین کو مخالفت کی بنا پر انھیں لشکر میں حاضری کا حکم دیا، قراباغ میں قاضی اولجایتو کی خدمت میں حاضر ہوئے، سلطان کے حکم کے مطابق انھیں وحشی کتوں کے سامنے ڈالدیا گیا، مگر ان کو کچھ نقصان نہیں پہنچا، سلطان اس بات سے اتنا متاثر ہوا کہ قاضی کو خلعت بخشی اور خود تشیع سے تائب ہو گیا، مشہور سیاح[2] ابن بطوطہ نے قاضی مجد کے بڑے دلچسپ حالات درج کیے ہیں، قاضی صاحب سے حافظ جتنے متاثر تھے، اس کا ایک حد تک اندازہ قطعۂ بالا سے ہوتا ہے، ان کی وفات پر جو دوسرا قطعہ لکھا ہے[3]، اس سے حافظ کی غیر معمولی عقیدت کا پتہ چلتا ہے:

مجد دین سرور سلطان قضاۃ اسمٰعیل | کہ زدی کلک زبان آورش از شرع نطق
ناف ہفتہ بد و از ماہ رجب ثانی عشر | کہ برون رفت ازین عالم پر وضع و نسق
کنف رحمت حق منزل وی دان آنگہ | سال تاریخ وفاتش طلب از "رحمت حق"

ڈاکٹر معین[4] لکھتے ہیں:"

"خواجہ حافظ بیشک محضر او را دریافتہ است و بدو اعتقادی داشتہ است۔

---

[1] حافظ شیریں سخن ص ۱۶۹۔ ۱۸۱ مقدمہ دیوان (تہران) ص نوزدہ، تاریخ مفصل ایران ص ۳۱۰، ۳۲۰ حاشیہ

[2] ایضاً و سفرنامہ ص ۱۵۱ و تاریخ مفصل ایران (عباس اقبال) ص ۳۱۰ - ۸ [3] دیوان خلخالی ص ۳۶۶، دیوان قزوینی ص ۳۶۹ [4] حافظ شیریں سخن ص ۱۸۱

کیا ہے،

دگر شہنشہ دانش عضد کہ در تصنیف　　　بنای کار مواقف بنام شاہ نہاد

صاحب کی دوسری تصنیف شرح مختصر ابن حاجب ہے "مختصر ابن حاجب" اصول میں ہے، کے مؤلف ابوعمر عثمان بن عمر معروف با بن حاجب نے اپنی ایک دوسری کتاب "منتہی الاصول" مختصر کرکے لکھا ہے،

قاضی صاحب مذہباً شافعی تھے[۱] غالباً اسی بنا پر قاضی نور اللہ شوستری نے انھیں "رئیس[۲] الملاحدہ" لقب دیا ہے، ڈاکٹر معین[۳] لکھتے ہیں:

"پیداست باہمیتی کہ قاضی عضد در دربار شاہ شجاع داشتہ وخواجہ نیز بہمیں وجہ دراں دربار محترم بودہ باید خواجہ ازو استفادت بردہ باشد وحتی کتب وتصانیف او آشنائی داشتہ باید دائرۃ المعارف اسلامی نیز نویسد محتمل است کہ قاضی عضد استاد حافظ بودہ باشد۔"

[۲] بادشاہوں اور وزیروں کے علاوہ حافظ نے جن جن بزرگوں کا ذکر کیا ہے ان میں سے بیشتر بطور یقین اہل تسنن تھے اور کسی ایک کا بطور گمان کے بھی شیعہ ہونا ظاہر نہیں ہوتا، مثلاً حافظ کا ایک مشہور قطعہ[۴] ہے

بعہد سلطنت شاہ شیخ ابو اسحٰق　　　بہ پنج شخص عجب ملک فارس بود آباد

نخست پادشہی ہمچو او ولایت بخش　　　کہ جان خویش بپرورد وداد عیش بداد

دگر مربی اسلام شیخ مجد الدین　　　کہ قاضی بہ ازو آسماں ندارد یاد

دگر بقیہ ابدال شیخ امین الدین　　　کہ یمن ہمت او کارہای بستہ کشاد

---

[۱] فہرست ج ۱ ص ۴۸۸ [۲] دیوان (پژمان) ص نو ودوم [۳] حافظ شیریں سخن ص ۱۸۲

[۴] دیوان خلخالی ص ۳۷۸، دیوان قزوینی ص ۳۶۳

دگر شہنشہ دانش عضد کہ در تصنیف | بنای کار مواقف بنام شاہ نہاد
دگر کریم چو حاجی قوام دریا دل | کہ نام نیک ببرد از جہان بخشش و داد
نظیر خویش بنگذاشتند و بگذشتند | خدای عز و جل جملہ را بیامرزاد

شیخ مجد الدین اسماعیل بن محمد بن خداداد (متوفی ۷۵۶ھ) شیراز کے قاضی اور بادشاہ ابو اسحاق[1] کے بڑے مقرب تھے، شیراز ہی میں انھوں نے مدرسہ مجدیہ کی بنیاد ڈالی، اور اس میں درس بھی دیتے تھے جب سلطان اولجایتو نے مذہب تشیع کی ترویج کا فرمان صادر کیا تو قاضی مجد الدین سوئی[1] کی بنا پر انھیں لشکر میں حاضری کا حکم دیا، قراباغ میں قاضی اولجایتو کی خدمت میں حاضر ہوئے، سلطان کے حکم کے مطابق انھیں وحشی کتوں کے سامنے ڈالدیا گیا، مگر ان کو کچھ نقصان نہیں پہنچا، سلطان اس بات سے اتنا متاثر ہوا کہ قاضی کو خلعت بخشی اور خود تشیع سے تائب ہوگیا، مشہور سیاح[2] ابن بطوطہ نے قاضی مجد کے بڑے دلچسپ حالات درج کیے ہیں، قاضی صاحب سے حافظ جتنے متاثر تھے، اس کا ایک حد تک اندازہ قطعۂ بالا سے ہوتا ہے، ان کی وفات پر جو دوسرا قطعہ لکھا ہے[3]، اس سے حافظ کی غیر معمولی عقیدت کا پتہ چلتا ہے:

مجد دین سرور سلطان قضا اسمٰعیل | کہ زدی کلک زبان آورش از شرع نطق
ناف ہفتہ بد و از ماہ رجب ثانی عشر | کہ بروں رفت ازیں عالم با وضع و نسق
کنف رحمت حق منزل او داں آنگہ | سال تاریخ وفاتش طلب از "رحمت حق"

ڈاکٹر معین[4] لکھتے ہیں:"

"خواجہ حافظ بیشک محضر او را دریافتہ است و بدو اعتقادی داشتہ است۔

---

[1] حافظ شیریں سخن ص ۱۴۹۔ ۱۸۱ مقدمہ دیوان (قزوینی) ص قو و م، تاریخ مفصل ایران ص ۳۰۸، ۲۳۳ و ۱۳۴
[2] ایضاً و سفرنامہ ص ۱۵۳، و تاریخ مفصل ایران (عباس اقبال) ص ۳۰۷، ۳۰۸ [3] دیوان خلخالی ص ۳۶۶، دیوان (قزوینی) ص ۳۶۹ [4] حافظ شیریں سخن ص ۱۸۱

شیخ امین الدین عارف کامل تھے، ان کا ذکر آیندہ ہوگا، اور قاضی عضد الدین کا ذکر ہوچکا ہے،

حاجی قوام الدین حسن (متوفی ۷۵۴ھ) حافظ کے بڑے ممدوح و مربی تھے، ان کی تعریف میں تین غزلیں اور تین قطعے لکھے ہیں، مثلاً

دریای اخضر فلک و کشتی ہلال — ہستند غرق نعمتِ حاجی قوام ما

نکتہ دانی بذلہ گو چون حافظ شیرین سخن — بخشش آموزی جہان افروز چون حاجی قوام

بر ندی شہرہ شد حافظ میان ہمرہان لیکن — چہ غم دارد کہ در عالم قوام الدین حسن دارد

بحق نعمت حاجی قوام ما کہ قدر — زبہر مصلحت خود بدین رضا ندہد

سرور اہل عمائم، شمع بزم انجمن — صاحب صاحبقران حاجی قوام الدین حسن

لیکن ان کے تسنن کا یقینی علم تو نہیں ہے، مگر قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اسی مذہب کے پیرو تھے،

[۳] جتنے عرفا سے حافظ کے روابط کا پتہ چلتا ہے، وہ سب اہل تسنن تھے، مثلاً

(۱) شیخ امین الدین بلیانی گازرون[1] کے باشندہ تھے، اپنے زمانہ کے بڑے درجے کے پیر طریقت تھے، خرقہ طریقت اپنے چچا اوحد الدین عبد اللہ بلیانی سے پایا تھا، رمضان ۷۱۶ھ میں ان ہی سے "تلقین ذکر" حاصل ہوئی، ان کی وفات ۷۴۵ھ میں ہوئی اور گازرون میں اپنی خانقاہ میں مدفون ہوئے، خواجو کرمانی نے ان کی شان میں بہت سی نظمیں لکھی ہیں، منجملہ ان کے مثنوی گل و نوروز میں انکا ذکر بڑی شد و مد سے کیا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:[2]

امینِ ملت و دین شیخ اعظم — بہ برج حقیقت کہفِ عالم

معین الخلق سر اللہ فی الارض — کہ تعظیمش بود بر اہل دین فرض

---

[1] ملاحظہ ہو حافظ شیرین سخن، ص ۱۰۶، مقدمہ ہمائی ص نو و ہم، ڈاکٹر معین، اقبال اور ہمائی نے ان میں اور خواجہ امین الدین جہرمی ندیم شاہ ابو اسحٰق میں التباس کیا ہے، وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ عصر حافظ ص ۱۰۵ حاشیہ ۱، ۲ و تاریخ مفصل ایران ص ۲۲۴

[2] ایضاً

مقیم راه رو قطب یگانه — چراغ شش رواق هفت خانه

امام الواصلین سرخیل اوتاد — وجودش زبدهٔ قانون ایجاد

الا ای پیک رنجوران مهجور — که چون دوری نهندت طائر طور

تویی آرام بخش جان مشتاق — قدومت راحتی بود ز عشاق

گرت بر گازرون افتد گذاری — بکن بهر من دلخسته کاری

علم زان حضرت علیا برافراز — در آن بستان حضرا آشیان ساز

ببین در ملک وحدت تاجداری — بمیدان حقیقت شهسواری

ز برج بوعلی دقاق ماهی — وز اقلیم ابواسحاق شاهی

خواجو کرمانی کی ان سے ارادت اور ابوعلی دقاق سے انکی عقیدت ان کے تسنن کا پتہ دیتی ہے۔

(ب) سید ابوالوفا کا ذکر خواجہ حافظ نے ایک غزل[1] میں اس طرح کیا ہے:

سحر بلبل حکایت با صبا کرد — که عشق روی گل با ما چها کرد

گر از سلطان طمع کردم خطا بود — ور از دلبر وفا جستم جفا کرد

وفا از خواجگان شهر با من — کمال دولت و دین بوالوفا کرد

جامی نے اشعۃ اللمعات میں ان کو "قدوۃ العرفا خواجہ ابوالوفا" لکھا ہے، اور ان کی طرف حسب ذیل "منظوم پرسش"[2] منسوب کی ہے،

قدوهٔ اهل دانش و تقوی — بنویسد جواب این فتوی

که چه باشد مراد شیخ جنید — رحمة الله ز رمز لون الماء

از چه فرموده صاحب لمعات — عکس آن را که شیخ کرده ادا

---

[1] دیوان (خلخالی) ص [illegible] [2] حافظ شیرین سخن ص [illegible]

عکس آن حیست آنکہ رنگ محبت ہست رنگ حبیب بی ہمتا

اس سے سید مذکور کے تسنن کا اندازہ ہوتا ہے،

(ج) شیخ زین[1] الدین ابوبکر تایبادی علوم ظاہر میں مولانا نظام الدین ہروی کے شاگرد تھے، اور علوم باطن و روحانی میں شیخ الاسلام احمد النامقی الجامی سے کسب فیوض کیا تھا، شیخ الاسلام کیساتھ مشہد مقدس گئے، پھر مزارات طوس کی زیارت کی، اور بابا محمود طوسی کی خدمت میں شرف یاب ہوئے، خواجہ محمد پارسا کا حسب ذیل بیان جامی[2] نے نفحات میں نقل کیا ہے،

اول بار کہ ہمراہ خواجہ بزرگ خواجہ بہاء الدین قدس اللہ تعالیٰ سرہ بسفر حج میرفتم بمرو رسیدم قافلہ دو فرقہ شدند، بعضی میل بجانب مشہد مقدس رضوی کردند و بعضی بجانب ہری کردند، مقرر بہ آنکہ ہمہ در نیشاپور بہم رسند، حضرت خواجہ میل بجانب ہری کردند و فرمودند کہ میخواہیم بصحبت مولانا زین الدین ابوبکر رسیم، من جوان محروم واز احوال خدمت مولوی آگاہی نداشتم بمشہد رفتم ..... وگویند کہ چون حضرت خواجہ بہ تایباد رسید نماز بامداد با خدمت مولانا بجماعت گزاردہ و درصف اول چنانچہ طریق ایشان بودہ بمراقبہ نشستہ بودند وچون مولانا ازاوراد فارغ شدہ برخاست وپیش ایشان آمدہ معانقہ کردہ ونام پرسیدہ خدمت خواجہ فرمودند کہ بہاء الدین مولانا گفتہ باشد کہ برای ما "نقش بند" خواجہ فرمودہ اند کہ "ما آمدہ ایم کہ نقش بریم" خدمت مولانا ایشان را بخانہ بردہ اند و دو سہ روز صحبت داشتہ اند۔"

اس سے مولانا زین الدین کا تسنن پوری طرح ظاہر ہوتا ہے،

مولانا جب حج کو جاتے ہوئے شیراز سے گزرے تھے تو یہاں حافظ کی اس بیت پر بڑا شور مچا ہوا تھا،

گر مسلمانی ہمین است کہ حافظ دارد وای گر از پی امروز بود فردائے

---

[1] یہ ساری تفصیل حافظ شیرین سخن (ص ۱۸۰ تا ۱۹۱) سے لی گئی ہے [2] نفحات الانس ص ۴۲۵ بعد

کہ حافظ "معاد" کے قائل نہیں ہیں، خواجہ مولانا کے ورود کی اطلاع پاکر انکی خدمت میں حاضر ہوئے، مولانا نے فرمایا کہ اس بیت پر ایک ایسی بیت کا اضافہ کر دو تاکہ یہ بیت دوسرے کا مقولہ بن جائے، حافظ نے اس بیت کا اضافہ کیا۔

این حدیثم چہ خوش آمد کہ سحر گہ میگفت   بر در میکدہ ای بادف و نی ترسائی

اس طرح اس مصیبت سے نجات پائی، مولانا مذکور حافظ سے ایک سال قبل ۷۹۰ھ میں فوت ہوئے،

(د) شاہ نعمت اللہ ولی ماہانی متوفی ۸۳۴ھ سے حافظ کے تعلقات عقیدتمندانہ تھے، چنانچہ شاہ صاحب کی حسب ذیل غزل پر ایک غزل لکھی ہے، اور ان پر تعریض کی ہے:

ما خاک راہ را بنظر کیمیا کنیم   صد درد را بگوشۂ چشمی دوا کنیم
در حبس صورتیم و چنین شاد و خرمیم   بنگر کہ در سراچۂ معنی چہا کنیم
موج محیط و گوہر دریای عزتیم   ما میل دل بآب و گل خود چرا کنیم
رندان لاابالی و مستان سرخوشیم   ہشیار را بمجلس خود کی رہا کنیم
از خود برآ و در صف احباب ما خرام   تا سید انہ روی دولت با خدا کنیم

حافظ کہتے ہیں:

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند   آیا بود کہ گوشۂ چشمی بما کنند
دردم نہفتہ بہ ز طبیبان مدعی   باشد کہ از خزانۂ غیبش دوا کنند
معشوق چون نقاب ز رخ در نمیکشد   ہر کس حکایتی بہ تصور چرا کنند
چون حسن عاقبت نہ برندی و زاہدیست   آن بہ کہ کار خود بعنایت رہا کنند
حالی درون پردہ بسی فتنہ میرود   تا آنزمان کہ پردہ برافتد چہا کنند

---

[1] حافظ شیرین سخن ۱۹۱-۱۹۲، اڑمان (مقدمہ دیوان) ص ۱۱۶-۱۱۷

می خور کہ صد گناہ ز اغیار در حجاب
بہتر ز طاعتی کہ بہ روی و ریا کنند

بی معرفت مباش کہ در من یزید عشق
اہل نظر معاملہ با آشنا کنند

حافظ دوام وصل میسر نمی شود
شاہان کم التفات بحال گدا کنند

باوجود اس کے شاہ کے تسنن کے زبردست قرائن موجود ہیں،

[۴] مقدمہ دیوان حافظ میں جدید خطی نسخوں[1] میں یہ عبارت ہے،

اما بواسطۂ محافظت درس قرآن و ملازمت شغل [یا تعلیم] سلطان و تحشیۂ[2] کشاف

و مفتاح[3] و مطالعۂ مطالع و مصباح .... بجمع اشتات غزلیات نپرداخت۔"

لیکن قدیم نسخوں میں یہ "ملازمت شغل سلطان" کے بجائے "ملازمت بہ تقوی و احسان"

اور "تحشیہ" کے بجائے بحث ہے، ظاہر ہے کہ اس نسخہ سے مفہوم میں بڑا تغیر ہو جاتا ہے،

مثلاً جدید نسخوں سے حافظ کی ملازمت سلاطین وقت سے ثابت ہوتی ہے، اور بعض سے یہ

بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی بادشاہ کے معلم بھی رہ چکے تھے، دوسرا بڑا فرق یہ ہو جاتا ہے کہ بجائے

"کشف و مفتاح" کی بحث کے ان کو حاشیہ نگار تسلیم کرنا پڑے گا، بہرحال یہ مسلم ہے کہ حسب ذیل

کتابیں ان کے عمیق مطالعہ میں رہ چکی ہیں:

۱۔ کشاف (۲) مفتاح (۳) مطالع (۴) مصباح۔

غزل کے ضمن میں ایک بیت پائی جاتی ہے،

بخواہ دفتر اشعار و راہ صحرا گیر
چہ وقت مدرسہ و بحث کشف کشاف است

آخری مصرعہ اس طرح بھی پایا جاتا ہے، "چہ وقت مدرسہ و بحث کشف و کشاف است۔"

---

[1] مقدمہ قزوینی (دیوان) میں تو حاشیہ و متن [2] قدیم نسخوں کے علاوہ خلاصۃ الاشعار میں بھی "بحث" ہی ہے مگر اس میں بھی "شغل سلطان" ہی ہے [3] حافظ شیریں سخن میں ان دونوں کی ترتیب بالعکس ہونے کی بنا پر تحشیہ کا تعلق مصباح سے بتایا گیا ہے (ص ۲۲۶)

اس صورت میں کشف وکشاف دونوں کی بحث حافظ کا محبوب مشغلہ قرار پاتا ہے، "کشف" کا پورا نام حاجی خلیفہ نے "الکشف عن مشکلات الکشاف" لکھا ہے، اس کتاب کا مولف سراج الدین عمر بن عبد الرحمٰن فارسی قزوینی متوفی ۷۴۵ھ تھا، یہ کشاف کی شرح یا حاشیہ ہے[1]، اور کشاف قرآن مجید ایک اہم تفسیر ہے[2]، اس کے مصنف علامہ ابو القاسم محمود بن عمر خوارزمی زمخشری (۴۶۷ھ - ۵۳۸ھ) ہیں، یہ کتاب ۵۲۷ھ میں دو سال تین ماہ اور دس روز میں تمام ہوئی اور یہ مدت حضرت ابوبکرؓ کے زمانۂ خلافت کے برابر تھی[3]، مصنف کے زمانہ سے آج تک اسکی شہرت برابر چلی آرہی ہے، بیسیوں علما نے اس پر شرحیں اور حاشیے لکھے ہیں۔

حافظ کے زمانے میں یہ بہت مشہور اور درس میں شامل تھی، حافظ کا ہمعصر و ہمشہر مولف شیراز نامہ[4] لکھتا ہے:

"توضیح کشاف" را نزد ابو سعید محمد اسیرانی خواندہ ام"

اور پدر ابو سعید کے متعلق یوں اظہار خیال[5] کرتا ہے۔

"مدتی از طرف اتابک سعد کوچک وزارت مملکت فارس بوے مخصوص آمدہ کتاب تنقیح کشاف بچہار مجلد از مصنفات اوست"

اسی طرح حافظ کے استاد علامہ میر سید شریف جرجانی نے بھی کشاف پر حاشیہ لکھا تھا، جو اب تک موجود ہے[6]، غرض ان وجوہ سے اگر حافظ نے بھی "کشاف" اور اس کے سلسلے کی دوسری تصانیف کا عمیق طور پر مطالعہ کیا یا ان پر شرح لکھی تو باعث تعجب نہیں، ان کا قرآن کا مطالعہ بہت دقیق تھا جیسا کہ خود ان کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے[7]،

---

[1] دیوان قزوینی ص ۹۶ [2] فہرست کتاب خانہ سپہ سالار ج ۱، ص ۱۵۸ - ۱۶۱ [3] ایضاً ص ۱۵۹ [4] حافظ شیرین سخن ص ۲۶۶ - ۲۶۹، مولف کا نام ابو العباس احمد بن ابی الخیر ہی اور ۷۴۴ھ میں بقید حیات تھا [5] ایضاً [6] ملاحظہ ہو فہرست سپہ سالار ص ۱۵۹ [7] دیوان (قزوینی) ص ۳۱۲

زحافظان جہاں کس چو بندہ جمع نکرد لطائف حکمی با نکات قرآنی

اس تفصیل سے اس امر کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ "کشف کشاف" کا مولف بھی سنی تھا، اور "کشاف" کا بھی، اس سے بھی حافظ کے تسنن کا کسی قدر امکان ہو سکتا ہے،

دوسری کتاب مفتاح ہے، اس نام کی بہت سی کتابیں[۱] ہیں، لیکن حافظ کے زمانے میں سکاکی کی مفتاح العلوم درس میں شامل تھی، جیسا کہ شیراز نامے[۲] کے مولف کے بیان سے پتہ چلتا ہے، سکاکی کا پورا نام سراج الدین ابی یعقوب یوسف ابن ابی بکر سکاکی متوفی ۶۲۶ھ ہے، اگرچہ یہ کتاب صرف و نحو، معانی و بیان سے متعلق ہے، مگر اس کا مصنف سنی تھا،

تیسری کتاب مطالع ہے، اس عنوان سے بہت سی کتابیں[۳] حکمت و کلام میں ملتی ہیں، حافظ کے عہد میں قاضی ناصر الدین بن عمر بیضاوی کی طوالع الانوار من مطالع الانظار بہت مشہور تھی، چنانچہ اکثر مصنفین[۴] نے "مطالع" سے اسی کتاب کو مراد لیا ہے، "قاضی مذکور کی ایک اور کتاب مطالع فی شرح الطوالع بھی ہے، شاید یہی کتاب حافظ کے مطالعے میں رہی ہو، بہرحال کتاب مذکور کے مؤلف اہل تسنن میں مشہور مفسر گزرے ہیں، جو شافعی مذہب[۵] کے پیرو تھے،

چوتھی کتاب مصباح ہے، اس نام کی بھی بہت سی کتابیں[۶] عربی اور فنون دونوں میں مختلف موضوع پر لکھی گئی ہیں، مگر شیراز نامہ کے مولف کے بیان[۷] سے پتہ چلتا ہے کہ قاضی ناصر الدین بیضاوی (متوفی ۶۸۵ھ) کی کتاب مصباح جو علم کلام پر تھی، حافظ کے زمانے میں بہت زیادہ متداول تھی اور خود مولف مذکور نے یہ کتاب سبقاً سبقاً پڑھی تھی، اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ قاضی صاحب ہی کی کتاب حافظ کے مطالعہ میں رہی ہے، اور چونکہ یہ علم کلام پر ہے، اور اس کا مولف شافعی المذہب ہے،

---

[۱] حافظ شیرین سخن ص ۹۰-۹۱ [۲] ایضاً و حاجی خلیفہ فہرست کشف الظنون [۳] ایضاً ص ۹۶-۹۸ [۴] تاریخ ادبیات ایران (براؤن) شرح حال لسان الغیب ج ص ۲۳، مصنف نے ۶۰۳ھ میں اسے لکھا [۵] ریحان الادب ذیل بیضاوی (چاپ طہران) [۶] حافظ شیرین سخن ص ۳۶۷-۳۶۸ [۷] ایضاً ص ۳۶۹

اس لیے حافظ کا تسنن قرین قیاس ہو سکتا ہے۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں ذکر کیا ہے کہ قاضی مجدالدین[1] اپنے مدرسے میں مصابح کا درس دیتے تھے۔ خیال ہوتا ہے کہ مصابح سے مراد بیضاوی ہی کی تالیف ہے۔

[۵] حافظ نے بعض شاعروں کے مصرعوں پر گرہیں لگائیں منجملہ ان کے یزید کے ایک مصرعہ کو الٹ کر اس کی تضمین کی، یزید کی بیت[2] یہ ہے۔

انا المسموم ما عندی بتریاقٍ ولا راق ادر کاسا و ناولہا الا یا ایہا الساقی

اس کا دوسرا مصرعہ حافظ کے دیوان کی پہلی بیت میں اس طرح آیا ہے۔

الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا کہ عشق آساں نمود اول ولی افتاد مشکلہا

پژمان نے حافظ کے لطایف[3] کے ضمن میں یہ لکھا ہے۔

ایں پاسخ دندان شکن را ہم شفاہاً شنیدہ ام کہ شخصی بزبان اعتراض خواجہ را گفت شما چگونہ راضی شدید کہ مفتح دیوان خویش را مصراعی از اشعار یزید ساختہ و گوئید۔ الا یا ایہا الخ خواجہ در پاسخ فرمود اگر گوہری از دہان سگ بیرون افتد میتوان آن را شستہ و بہ فرق نہاد

بہرحال اس لطیفے کے بعد بھی اصل بات اپنی جگہ پر باقی رہ جاتی ہے۔

تفصیلات بالا سے اندازہ ہوگا کہ اگرچہ حافظ کے تسنن کے زیادہ قوی قرینے ہیں لیکن کوئی ایک بھی ایسا مستحکم قرینہ نہیں جس کی بنا پر کوئی بات بطور قطع و یقین کے کہی جا سکے لیکن اسکے ساتھ ہم ڈاکٹر معین کے فیصلہ کو صحیح قرار نہیں دے سکتے، جو حسب ذیل غزل[5] اور دو رباعی[6] کی وجہ سے ان کو شیعہ مذہب

---

[1] حافظ شیریں سخن ص ۱۱۰، سفرنامہ ص ۱۲۶ [2] دیوان حافظ (پژمان) مقدمہ ص ۴۳، حاشیہ نمبر ا [3] ایضاً دیوان ص ۲۸۲ [4] حافظ شیریں سخن ص ۳۱۲ [5] دیوان حافظ (قزوینی)، ص ۲۱۱ [6] دیوان (پژمان) ص ۲۵۱، ۲۵۳

کا پیرو قرار دیتے ہیں ،

طالع اگر مدد دہد دامنش آورم بکف
گر بکشم زہی طرب ور بکشد زہی شرف

طرف کرم زکس نبست ایں دل پر امید من
گرچہ سخن ہمی برد قصۂ من بہر طرف

از خم ابروی توام ہیچ گشایشے نشد
وہ کہ دریں خیال کج عمر عزیز شد تلف

ابروی دوست کی شود دستکش خیال من
کس نزدست ازیں کمان تیر مراد بر ہدف

چند بناز پرورم مہر بتان سنگدل
یاد پدر نمیکنند ایں پسران ناخلف

من بخیال زاہدی گوشہ نشیں و طرفہ آنک
مغبچۂ زہر طرف میزندم بچنگ ودف

بیخبرند زاہدان نقش بخوان و لا تقل
مست ریاست محتسب بادہ بدہ و لا تخف

صوفی شہر بیں کہ چوں لقمۂ شبہہ میخورد
پاردمش دراز باد آں حیوان خوش علف

حافظ اگر قدم زنی در رہ خاندان بصدق
بدرقۂ رہت شود ہمت شحنۂ نجف

مردی زکنندۂ در خیبر پرس
اسرار کرم زخواجۂ قنبر پرس

گر تشنۂ فیض حق بصدقی حافظ
سرچشمۂ آں زساقی کوثر پرس

قسام بہشت و دوزخ آں عقدہ کشای
ما را نگذارد کہ درآئیم زپای

تاکے بود ایں گرگ ربائی بنمای
سرپنجۂ دشمن افگن ای شیر خدای

اگر ان ابیات میں ایک اور غزل کی حسب ذیل[1] بیت شامل کر لی جائے تو بھی ڈاکٹر معین کا فیصلہ درست نہیں قرار پا سکتا ؎

بخیل بوی خدا نشنود بیا حافظ
پیالہ گیر و کرم ورز و الضمان علی

حسین ترمان نے بھی بقول خود "ضعیف" دلائل کی بنا پر حافظ کو شیعہ بتایا ہے،

---

[1] دیوان (قزوینی)، ص ۲۹۹

مثلاً وہ لکھتے ہیں[۱]

مہذا بعضی دلائل گو اینکہ ضعیف باشد در دست است کہ بہ شیعی بودن آن بزرگوار گواہی میدہ:

(۱) خواجہ در اشعار خود از خلفای سہ گانہ نامی نمی برد

(۲) بہ علی و خاندان او صریحاً اظہار ارادت نمودہ

(۳) این شعر از عقیدہ یک نفر سنی عالم ...... دور مینماید ؎

صبا بصوفی دجال چشم ملحد شکل بگو بسوز کہ مہدی دین پناہ آمد

ہم تفصیل سے لکھ چکے ہیں کہ نمبر ۳ میں جس بیت کا ذکر ہے، وہ نہایت مشکوک اور حافظ کے معتقدات و خیالات کے منافی ہے، اور جن اشعار سے حضرت علیؓ و خاندان اہل بیت سے بے پناہ عقیدت ظاہر ہوتی ہے، اور بعض میں خلفاء راشدین پر طعن بھی ملتا ہے، ان میں سے بیشتر الحاقی ہیں، اور صرف دو بیان اور دو غزلیں ایسی ضرور ہیں جن میں حضرت علیؓ سے خصوصی ارادت ظاہر ہوتی ہے، مگر اس سے ان کا تشیع کیونکر ثابت ہو سکے گا؟ اسی طرح کی عقیدت خاندان اہل بیت اور حضرت علیؓ سے ہر سنی رکھتا ہے، اگر کوئی اس کے خلاف ہو تو وہ سنی قرار ہی نہیں پا سکتا، حسین پژمان کو اس بات کا علم نہیں تھا، جیسا کہ ان کے اس بیان[۲] سے صاف ظاہر ہے:

بدیہی است کہ اہل سنت و جماعت بہ خاندان علی توجہی نداشتہ یا لااقل آنہا را در خور پیروی و متابعت نمی دانند۔ آقای فرزام می فرمودند" اگر شیعۂ امامیہ تنہا بہ ائمہ دو از دہ گانہ معتقد ند اہل سنت بتمام خاندان علی عقیدت مند ند و بہ انہا ارادت می ورزند"

.... منظور (پژمان) آں بودہ است کہ اہل سنت و جماعت مانند شیعیان خاندان علیؓ

---

[۱] مقدمہ ص ۴۴، [۲] ایضاً

ستایش نمی کنند یعنی آنها را معصوم نمی دانند و تفویضاً از آنها پیروی نمی کنند معہذا از آقای فرامرزی بی نہایت تشکر نمودہ و خرسندم کہ لااقل مرا بکلی از اشتباہ تام آشنا فرمودند"

حسین بزہان کی شرط اول کے مطابق سارے سنی وادیب وعالم سنی نہیں ثابت ہو سکتے
مختصر یہ کہ حافظ کے تسنن کے دلائل تشیع کی بہ نسبت قوی ضرور ہیں۔ لیکن ہم یقین سے صرف اتنی بات کہہ سکتے ہیں:

"ما دلیلی بر تسنن یا تشیع شخص حافظ بنحو قطع ویقین در دست نداریم"[1]　(باقی)

---

[1] یہی فیصلہ محمد بن عبدالوہاب قزوینی، قاسم غنی اور خلخالی تینوں نے کیا ہے۔

عمادی غزنوی یا عمادی شہریاری

از جناب ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی صدر شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی حیدرآباد

رسالہ معارف بابت مارچ ۱۹۴۷ء میں راقم الحروف کا ایک مضمون عمادی پر شائع ہوا تھا، جس میں بعض متاخرین فضلاء کی تقلید میں عمادی غزنوی کے علاوہ عمادی شہریاری کو ایک دوسرا شاعر فرض کر لیا تھا، لیکن بعد میں انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (اردو) کے لیے جب اس مضمون کی تلخیص کی ضرورت پیش آئی تو غور کرنے پر معلوم ہوا کہ عمادی غزنوی اور عمادی شہریاری دراصل ایک ہی شاعر کے دو مختلف نام ہیں، اور آتشکدۂ آذر اور مجمع الفصحا جیسی کتابوں کی وجہ سے اس تخلص کے دو شاعر سمجھ لیے گئے ہیں۔ لباب الالباب (ج ۲ ص ۲۰۸) میں شعرائے غزنیہ و لوہور کے ذیل میں "استاد الائمہ عماد الدین الغزنوی" نام آتا ہے۔ اس کا قدیم ترین کلام جو ملتا ہے وہ سلجوقی سلطان ملک شاہ کے بھائی ملک ارغون (المتوفی ۴۹۰ھ/۱۰۹۷ء) کی مدح میں ہے:

ای برسمن از مشک بعمدا زده خالے	مسکیں دل من گشت ز خال تو بحالے
حالے بجہان زار تر از حال دلم نیست	تا نیست دل آشوب تر از خال تو خالے
شاہ ہمہ شاہان ملک ارغون کہ ندارد	در مردی و فرہنگ نظیرے و ہمالے
آن قلعہ کشاے کہ ملک فلک اورا	ہر روز دہد مژدہ و بفتحی و جلالے
در معرکہ بستاند و در بزم ببخشد	ملکے بسوارے و جہانے بسوالے
عالم تر و عادل تر از و ہیچ ملک نیست	الا ملک العرش تبارک و تعالیٰ

مونس الاحرار ص ۹۴۲-۹۵۰
حبیب گنج

سید حسن غزنوی (م ۵۵۶ھ / ۱۱۶۱ء) نے اسی قصیدے کی تقلید میں خسرو شاہ بن بہرام شاہ غزنوی (۵۵۲ھ / ۱۱۵۷ء تا ۵۵۵ھ / ۱۱۶۰ء) کی مدح میں کہا تھا۔

ای یافتہ از چہرۂ تو حسن کمالے   دادہ ست جمالیت خداوہ چہ جمالے

خسرو شہ بہرام شہ آں شاہ جواں بخت   کایام نیاورد چناں خوب خصالے

خود حکم تو کن، گیں بر باشعر عمادی   "کای بر سمن از مشک بعمدا زوہ خالے"

سید حسن غزنوی نے عمادی کی تقلید میں ایک قصیدہ بہرام شاہ کی مدح میں بھی لکھا تھا:

خاک را از باد بوے مہربانی آمدہ ست   در دہ آں آتش کہ آب زندگانی آمدہ ست

خسرو اعظم خداوند جہاں بہرام آنکہ   رسم او جاں بخشی و عالم ستانی آمدہ ست

گرم بکشادم فقاعے از سر خوان ثنات   گرچہ شیریں نیست بارے نازدانی آمدہ ست

لیکن یہی قصیدہ سنائی کے یہاں (طہران سنہ ۱۳۲۰ شمسی ص ۹۰) سنجر کی مدح میں ہے، تیسرا شعر اس طرح ہے:

بر سر خوان عمادی من کشادم ایں فقع   "گرچہ شیریں نیست بارے ناروانی آمدہ ست"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آخری مصرع عمادی کے کسی قصیدے کا رہا ہوگا جو اب نہیں ملتا، سید حسن اور سنائی نے عمادی کے قصیدوں پر جو قصیدے لکھے ہیں ان سے ظاہر ہے کہ عمادی کی شاعرانہ حیثیت کیا رہی ہوگی، اور اندازہ ہے کہ وہ اس وقت عمر میں بھی بڑا رہا ہوگا، سنائی نے جوانی میں بلخ کا سفر کیا تھا کیونکہ کارنامۂ بلخ میں سلطان مسعود سوم ابن سلطان ابراہیم غزنوی (المتوفی ۵۰۸ھ) کی مدح ہے جس میں خود انکے والد کا ذکر آیا ہے (حکیم سنائی از خلیل اللہ خلیلی، کابل ۱۳۱۵ شمسی، ص ۲۷) اس وقت عمادی غزنوی نے لکھا تھا،

چوں سنائی اوفتاد از خطۂ غزنیں ببلخ   تازہ کرد از مدحت قاضی حسن رسم سخن

چوں مرا از لشکر سلطاں بلے پیوست بخت   بر در قاضی حسن دیدم معالی را وطن

اندراں فکرت کہ ایں قاضی چو آں قاضی بود   از عرق در آب آتش دلے دیدم خویشتن

آسماں گفت آفتابا با عمادی گو (شعر؟) خاک ایں قاضی حسن از خونِ آں قاضی حسن

ای دریغا روے آں بوسے کہ حسن گفتمے تا زمانہ فرق کردے شعر او از شعر من

گفتمے ای کلکت آں مرغے کہ در پرواز او آورد فرمانِ تو سیمرغ را بر باب زن

گفتمے ای کردہ [کلکت] برخلافِ آسماں مشتری را زہرہ سوز و زہرہ را بربط شکن

(مجموعۂ قصائد فارسی ۲۹/۲ صفحہ ۲۰۰ حبیب گنج)

دوسرے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سنائی نے غزنین سے بلخ کا سفر کیا تھا (یعنی ۵۱۱ھ سے پہلے) اسکے بعد عمادی نے رے کا سفر اختیار کیا، اور وہ لشکر سلطان میں بھی تھا اور غالباً اسی وقت اس نے رے کے ایک بلوک شہریار میں قیام کیا، اس قیام کی مدت معلوم نہیں لیکن اسی مقام سے وہ شاہ مازندران عماد الدولہ فرامرز شاہ کے دربار میں گیا تھا، چنانچہ ایک قصیدہ ہے:

نہ سیم و زر نہ یار داریم پس ما بہ جہاں چہ کار داریم

نزد ہمہ خلق چوں عمادی در عاشقی اعتبار داریم

نومید ز شہریار شہریم امید بہ شہریار داریم

سرمایۂ داد و دیں فرامرز کز ہیبتِ او حصار داریم

تا بر درِ او قرار کردیم بر چرخِ بریں قرار داریم

در لشکر او کمینہ مائیم بنگر کہ چہ کار و بار داریم

تیسرے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ عمادی شہریار شہر سے عماد الدولہ فرامرز کے دربار میں گیا تھا، اور آخری شعر سے واضح ہوتا ہے کہ وہاں کے لشکر میں داخل ہوگیا تھا، جیسا کہ وہ پہلے بھی سلطان مسعود سوم کے لشکر میں رہ چکا تھا۔

ایک اور قصیدے سے معلوم ہوگا کہ یہی شہریار میں رہنے والا عمادی اپنے وطن غزنین کو یاد کر رہا ہے:

اے مہر تو بر سپہر تمکیں ایمن شدہ از نماز پیشیں

سرمایۂ جان عماد دولت ملجاء ممالک سلاطین

آن کس کہ نافت ہمچو زنجیر در حلقۂ مہرت از تف کین

گردد چشمش کشادہ بستہ چون چشمۂ قفل و چشم زرفین

بستان حیات جاودان را از خط رضاے تست پرچین

بے تو نہ بود کسی و نہ باشد مدحے نہ بود تمام تزئین

بے تو نہ کند ضمان تن جان سرّیست دریں سخن بتضمین

زین است کہ از دلم جدا نیست ہستی و بدن براے غزنین

جستم ہمہ آرزو بتصریح گفتم ہمہ رمزہا بتلقین

آن باد ترا کہ خواست داری آمین وراست پیش از آمین

شعر نمبر ۸ سے شاعر کا غزنین سے گہرا تعلق واضح ہوتا ہے اور اس سے پہلے کے قصیدے سے معلوم ہو چکا ہے کہ یہی شاعر شہریار سے اسی ممدوح کے دربار میں گیا تھا، اسلیے ظاہر ہوا کہ یہی عمادی غزنوی بھی ہے اور شہریاری بھی، اب اس ممدوح کے متعلق معلوم کرنا ہے کہ وہ کون تھا؟ Rabino نے مازندان (ص ۱۰۵) میں لکھا ہے کہ شمس الملوک رستم بن قارن (۵۱۱ھ تا ۵۱۴ھ) کا بیٹا سیف الدین عماد الدولہ فرامرز ہی عمادی کا مربی تھا، اور مرزا قزوینی نے (بیست مقالہ ج ۲ صفحہ ۲۷۲ - ۲۷۳) میں لکھا ہے کہ

"باحتمال بسیار قوی، مخدوم عمادی ہمین شخص (فرامرز بن رستم) است ..... (بطور قطع و یقین معلوم نشد کہ آیا وے پسر این رستم بن قارن شہریار است یا پسر فخر الدولہ رستم بن شہریار ....."

لیکن حقیقت یہ ہے کہ عمادی کا ممدوح فرامرز بن مرداویج بن وردان شاہ لنگرودی تھا، تاریخ طبرستان از بہاء الدین محمد بن حسن بن اسفندیار، (مرتبہ عباس اقبال طہران ۱۳۲۰ شمسی جلد دوم ص ۹۳) میں ہے کہ

"سید جمال الدین ابو القاسم علوی آتولی رستۂ استرآباد بود، و او پدر او استرآباد بضمان داشتند و عماد الدولہ مرداویج و فرامرز کہ ممدوح عمادی شاعر بودند پادشاہ بودند و قلعۂ پالمن ملک ایشان بود. بر حج عمادی ہنوز

"در آں قلعہ معمور است و آں را نمی توانند شگافت، چوں مرد آویج و فرامرز درگذشتند
وقلعہ با ارغش افتاد و وروان شاہ برادر او (علی یعنی پسران فرامرز) بخدمت علاء الدولہ
(علی بن شہریار بن نجم الدولہ قارن ۵۱۱ھ تا ۵۳۴ھ) شدند، ایں سید جمال الدین بخدمت
وروان شاہ شد......"

اس عبارت میں مرد آویج کا لقب عماد الدولہ بتایا ہے لیکن عمادی کے کلام میں یہ فرامرز
کا لقب ہے، اور اس نے فرامرز ہی کی مدح لکھی تھی، اسی کتاب (صفحہ ۶۳-۶۴) میں ہے کہ اصفہبد
(علاء الدولہ علی بن شہریار بن قارن) نے استرآباد کے قلعۂ بالمن کا محاصرہ کیا، اس میں فرامرز
ابن مرد آویج تھا، دو مہینہ کے بعد اس نے اصفہبد سے معافی مانگی اور اپنے بیٹے وروان شاہ
کو بطور "نوا" اس کی خدمت میں بھیجا، اسی زمانے میں سلطان محمد بن ملک شاہ (المتوفی ۵۱۱ھ)
کے بیٹوں نے اپنے چچا سنجر کے خلاف سر اٹھایا، سنجر ان کی سرکوبی کے لیے عراق روانہ ہوا
اور اصفہبد کو مدد کے لیے بلوایا، ابھی اصفہبد روانہ نہیں ہوا تھا کہ اطلاع ملی کہ بھتیجوں نے رے
آکر معافی مانگ لی ہے، تاہم اسی کے بعد موسم سرما میں ایک بھتیجا مسعود بن محمد بن ملک شاہ (المتوفی
۵۴۷ھ/۱۱۵۲ء) اصفہبد کے پاس آکر ایک ماہ تک مہمان رہا، اور مال و سپاہ حاصل کرکے گرگان
کی طرف سے واپس ہوا، وہاں فرامرز بن مرد آویج نے باوجودیکہ اس کا بیٹا وروان شاہ
اصفہبد کے حوالے تھا، مسعود سے اصفہبد کی شکایت کی، مسعود نے فرامرز کو پکڑ کر سنجر کے
پاس بھجوا دیا، اور "خواستند کہ او را بپایان قلعہ آورند تا تسلیم کند فرمانِ حق یافت" یعنی فرامرز
کا انتقال ۵۳۰ھ/۱۱۳۵ء کے قریب ہوا ہوگا، کیونکہ ابن اسفندیار (مترجمہ براؤن صفحہ ۵۹) میں ہے،
کہ خلیفہ المسترشد کے قتل (۵۲۹ھ/۱۱۳۵ء) کے بعد سلطان مسعود پہلی بار اصفہبد کے یہاں آیا تھا،
فرامرز کی مدح میں متعدد قصیدے ہیں، ایک قصیدے سے معلوم ہوتا ہے کہ فرامرز پہلے بھی

کسی پریشانی میں مبتلا ہو کر (شعرہ ۔ ۶) خراسان میں رہ چکا تھا:

اے کافر عشق تو مسلمان	دے دیو ہوائے تو سلیمان
طاق است بعشق تو مجازی	بر طاق نہادہ وصل و ہجران
ہر چند مسلّمے تو اورا	در دولت شہریار ایران
قطب ملکان عماد دولت	سرمایۂ امن و پشت ایمان
عید است شہا و عید پارین	رخ داشت ازین دیار پنہان
ممکن نہ بود بہ ہیچ عالے	عید این جا تو در خراسان
عید تو خجستہ باد ہر چند	بر من باشد زعقل تاوان
زیرا کہ ہر آنچہ گفتم اول	زین قول ہمی شود پشیمان
ہر چند ز بودن سہ فرزند	نتوان گفتن بہ وصف یزدان
سود نیست زمایہ در گذشتن	این را عدم از وجود ایشان
سبحان اللہ شد از تمامی	کار تو چنانکہ وصف نتوان
در نعمت تو نکو نباشد	خوردن غم خاندان ویران

آخری اشعار میں عمادی نے اپنے تین بیٹوں کا ذکر بھی کیا ہے، ایک قصیدہ ایسا ہے جس کے تمہیدی اشعار سنائی کے یہاں بھی ہیں (دیوان سنائی صفحہ ۱۱۷ بمبئی ۱۳۲۸ھ) اور سلطان بہرام شاہ غزنوی (المتوفی ۵۵۲ھ) کی مدح میں ہیں، اور وہی اشعار عمادی کے قصیدے میں بھی ہیں، اور وہ اسی عماد الدولہ فرامرز کی مدح میں ہیں:

گر در رخت صف زدہ سنت لشکر دیو و پری	ملک سلیمان تراست گم مکن انگشتری
شاہ فرامرز را د دولت و دین را عماد	خسرو مازندران سایۂ نیک اختری

ایک اچھا قصیدہ اس طرح ہے:

تراچنانکہ توئی دیدہ در نمی یابد ۔۔۔ بصرز نور تو بر تو ظفر نمی یابد[1]

عمادی از پئے جنگ سپاہ ہجرانت ۔۔۔ ز خون دیدہ قوی تر حشر نمی یابد

عماد دولتِ عالی کہ چشم دولت دین ۔۔۔ برون ز بارگہ او بصر نمی یابد

ایک قصیدہ ہے:

دلے کہ بستۂ بندِ بلا تواند بود ۔۔۔ ز آب و آتش و خاک و ہوا تواند بود

عماد دولتِ عالی کہ گردِ موکبِ او ۔۔۔ برائے دیدۂ جان توتیا تواند بود

اسی قصیدہ میں بعض اشارات ہیں:

فدا یگا ناخصمانِ تو بداں بودند ۔۔۔ کہ کین تو ز سعادت عطا تواند بود

بنو شان خبر آں کہ ہر یکے زیشاں ۔۔۔ بہ دام کردۂ خود مبتلا تواند بود

مازندرانی حکمرانوں کی طرح یہ ممدوح بھی امامیہ عقائد کا رہا ہوگا۔

در آفتاب قیامت نسوخت کس زیرا ۔۔۔ بہ سایۂ علم مرتضیٰؓ تواند بود

ایک قصیدہ میں ہے:

اے بہ رخ ہمچو گل، مایۂ شمس و قمر ۔۔۔ وے بہ لب ہمچو مل، گوہر شہد و شکر

شاہ عمادِ دول، کز کف و از طبع اوست ۔۔۔ نخل سخا را رطب، باغ خرد را شجر

شمسۂ روے علم پشت سپاہ ترا ۔۔۔ ہدیہ کند ہر نفس شعلۂ نو ظفر

بعض قصیدوں میں یہ القاب آتے ہیں:

قطب الملوک شاہ عماد دول کہ چرخ ۔۔۔ ہر ساعتے ز قدرتِ او امتحاں برد

شاہ سیف الدین عماد الدولہ کز تعظیم او ۔۔۔ از کفِ خود ہر چہ خواہد رایگاں می افگند

---

[1] لباب الالباب (ج ۱۔ ص ۹۹) میں ہے کہ عمادی کے جواب میں یوسف بن ناصر الکاتب نے خسرو ملک غزنوی کی مدح میں قصیدہ لکھا تھا جس کا مطلع یہ ہے:۔ دہان تنگ ترا وہم در نمی یابد ۔۔۔ بصد فسونِ سخن زو گذر نمی یابد

ایک قصیدہ کے آخری اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ شاعر نے ممدوح کے کسی مہمان کی وجہ سے (غالباً قدر ناشناسی کی وجہ سے) اپنی خودی کو ٹھیس لگنے سے بچایا تھا:

اے نرگس تو طبیب بیمار — وے لالۂ تو امین و طرار

قطب ملکان عماد دولت — کز درگہ اوست لاف ابرار

شاہے کہ بود بہ باغ ملکش — ہموارتر نخ عدل پربار

روزے کہ بر تو بود مہمان — بودم ز حدیث شعر بیزار

زاں بیم کہ بنایدم گفت — در اثنائے ثناء تو بسیار

عذرم بپذیر اگر بمانم — در شیوۂ مدح تو ز رفتار

زیراک اندر نوائے مدحت — برداشت بود بسے فرو دار

ایک قصیدہ اسی عماد الدولہ کے بیٹے شمس الدولہ (؟) کی مدح میں بھی ہے:-

ہر کرا عشقت اختیار کند — بے قراری بہ و قرار کند

شاہ شمس عماد دین و دول — کہ بدو عالم افتخار کند

ملکے، خسروے، خداوندے — کہ کفش طعنہ بر بحار کند

عید را مہرگاں بمیداں تا خیّت — تا ز درگاہ تو در آر کند

تا گمر سعی تو بعید رضا — مہرگاں را امید وار کند

آخری اشعار میں اگر عید اور مہرگان استعارہ نہیں بلکہ حقیقت ہے تو ممکن ہے کہ وہ ۵۵۲ھ/۱۱۵۷ء کا زمانہ ہو، تاہم اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عمادی اپنے ممدوح عماد الدولہ فرامرز کے انتقال کے وقت (۵۳۰ھ/۱۱۳۶ء) قلعۂ بالمن (استرآباد) میں نہ ہوگا، بلکہ طغرل بن محمد ملک شاہ (المتوفی ۵۲۹ھ/۱۱۳۴ء) کے دربار میں ۵۲۷ھ/۱۱۳۲ء سے پہلے پہنچ چکا تھا، کیونکہ اس کے وزیر قوام الدین

القاسم درگزینی (المتوفی ۵۲۷ھ/۱۱۳۲ء) اور اس کے بیٹے جلال الدین کی مدح میں قصیدے لکھے
،، پھر عماد الدولہ فرامرز کے انتقال پر عمادی نے ایک رباعی مرثیے میں لکھی تھی:

اکنوں کہ عماد دولہ در خاک آسود | از دیدۂ من خاک شود خوں آلود
در خاک نہادہ چوں توانم دیدن | آں را کہ مرا ز خاک برداشتہ بود

ایک مرثیہ چھوٹی بحر میں بھی ہے، اور بہت پردرد ہے:-

در غم یار یار بایستے | یا غم را کنار بایستے
بر در دوست بار ممکن نیست | بر در صبر بار بایستے
مست و دیوانہ چند خواہم بود | زیرک و ہوشیار بایستے
ایں کہ من شرمسارم از مردم | سخت من شرمسار بایستے
از فریب جہاں عمادی را | نفسے زینہار بایستے
ایں ہمہ آرزو بیافتمے | حضرت شہریار بایستے
شہ فرامرز کز معالی او | اختراں را شمار بایستے
چوں مدارا نکرد با او مرگ | آسماں بے مدار بایستے

سلطان طغرل بن محمد بن ملک شاہ (المتوفی ۵۲۹ھ/۱۱۳۴ء) اور عمادی کے تعلق کے متعلق راحت الصدور (ص ۲۱۰) میں ہے کہ "امیر عمادی اگرچہ بملک مازندران اختصاصے داشت ولقب او از عماد الدولہ فرامرز شاہ مازندران مبنی است عظمت از شاعری حضرت سلطان (طغرل) یافت۔" پھر عمادی کے دو قصیدے طغرل کی مدح میں ہیں:

(۱) کار خرد ساختہ ست کام ہنر حاصل ست | ہیچ بہانہ نماند شاہ جہاں طغرل ست
خسرو کسری غلام واند کز شرق و غرب | بندہ عمادی بشعر خوب ترین قائل ست

اے زلف و رخت سپہر و اختر — وے روے لبت بہشت و کوثر
سلطان سپہر قدر طغرل — کز قبۂ دانش ست برتر
بر ہم کو بند گرد گیراں — مانند جبال روز محشر
از دو و جہاں شو و کہ گوئی — شیر علم ست شیر محمر

لباب الالباب (ج ۲۔ ص ۲۹۶ ببعد) میں ایک قصیدہ ہے، جس میں اتابک قراسنقر (شعر ۲) "امیر باد" (قتلغ، شعر ۴) وغیرہ کا ذکر بھی آیا ہے:۔

شاہ بہشت مجلس طغرل کہ روز رزم — از نعل بارہ گنبد کوکب حشر شکست
بے شبہتے سنان قراسنقر سترگ — آں روز بند چرخ حوادث ثمر شکست
در باغ عمر دشمن شاہ جہاں طراز — بعزا نبوک نیزہ نہیبت شجر شکست
عجز شکستہ بند طبیعت درست شد — آں گہ کہ میر باد صف آں نفر شکست
آوازۂ رسید بپایۂ بر آسماں — بازار آق سنقر آشوب خر شکست
ایشاں تیر و نیزہ شکستند بہر آنک — صدر جہاں بخامہ ازآں بیشتر شکست

ایک قصیدے میں "امیر باد" عزالدین قتلغ کی مدح ہے (جس کا ذکر تاریخ میں نہیں آتا) جس کی وجہ سے عمادی طغرل کے دربار میں پہنچا تھا، اور اس کا لقب سلطانی ہو گیا تھا:

دست درہم نمی کند کارم — پاسے مردی نہ می کند یارم
لقبم داوہ اند سلطانی — چوں عمادی چرا چنیں خوارم
ہمہ علیم جز آنکہ ورد ثنا — بر سر میر باد می بارم
عز دین خداے قتلغ آں — کز انعام او گراں بارم
از تو سلطاں ثنا ختم گرنہ — من و سلطاں کجا سزاوارم
نہ خورم غم، چرا خورم کہ توئی — از پے بہر مراد غم خوارم

عمادی نے سلطانی ہونے کا ذکر سلطان طغرل کی مدح میں بھی کیا ہے،

دلم از دست بردہ جانی ۔۔۔ چہ کنم با تو دوستی جانی[1]

خون خود خوردم و بخواہم توزد ۔۔۔ از پے وصل تو پشیمانی

جاوداں ماں کہ فر عشق تو بود ۔۔۔ کہ عمادی شدہ ست سلطانی

آستیں بوس تو شود گردوں ۔۔۔ آستاں بوس شاہ ایرانی

شاہ طغرل کہ پیش گاہ ازل ۔۔۔ آیتے ساختش جہاں بانی

زاں نشستی بہ تخت جد و پدر ۔۔۔ تا در آفاق فتنہ بنشانی

ثالث گفتم ارچہ نتواند ۔۔۔ گفتن اندر ثنا ترا ثانی

آخری شعر میں ممدوح کو تیسرا بادشاہ کہا ہے، یعنی طغرل بن محمد بن ملک شاہ، ایک قصیدے میں طغرل کے وزیر قوام الدین ابوالقاسم المتوفی ۵۲۷ھ/۱۱۳۲ء کی مدح ہے:

چشمے کہ ز تو نگار گیرد ۔۔۔ در خون جگر قرار گیرد

وقت ست کہ در غمت عمادی ۔۔۔ جان و دل و دیدہ خوار گیرد

بوالقاسم آں کہ از در او ۔۔۔ انصاف بہ نام کار گیرد

گویند کہ از گسستن عمر ۔۔۔ مردم ز جہاں کنار گیرد

با عمر تو ہر کہ ایں سخن گفت ۔۔۔ لب خاید و اعتذار گیرد

آخری دو شعروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ قوام الدین ابوالقاسم اس وقت تک بوڑھا ہو چکا تھا، اس کی مدح میں یہ شعر بھی عمادی نے کہے تھے:

---

[1] ۵۴۵ھ کے قریب سید حسن غزنوی اور انوری نے مجد الدین ابوالحسن عمرانی کی مدح میں بھی یہی زمین اختیار کی تھی:

اے کہ تن را دل و دل را جانی ۔۔۔ وز دل و جان بہ نکو تر آنی (سید حسن)

دلم لمسہ دوست تو داری دانی ۔۔۔ جاں ببر نیز اگر بتوانی (انوری)

گردون تو می فرازی چون خوانمت سحاب | سلطان تو می نشانی چون گویمت وزیر
از مهر توستانند واز کین تو دهر | ابروے شام وسمہ وپستانِ صبح شیر

(آثار الوزراء، ق ۱۰۳ ا۔ بانکی پور)

قوام الدین کے بیٹے جلال الدین ابو الفضل کی مدح میں بھی ایک قصیدہ ہے، جس میں شاعر کی پشت خمیدہ (شعر ۲) اور ممدوح کی کم عمری (شعر ۵) کا ذکر ہے،

دل و جانم بہ عشق تو سمر ند | ہمہ عالم بدیں حدیث در ند
پشت من گشت حلقۂ در تو | جان فروشند و عشوۂ تو خرند
عشق بازان روے تو بہ نیاز | مدح سازانِ صدرِ داد گرند
مقصدِ آسمان جلال الدین | کہ در دوستش ز جود بار ورند
خواجگانِ جہان غلام تو اند | گرچہ از تو بسال بیشتر ند

سلطان طغرل کے عہد کے ابو منصور المظفر بن ابو الحسن بن اردشیر بن ابو المنصور العبادی الواعظ المروزی (المتوفی ۵۴۷ھ) کی مدح اور عمادی کے بہرہ مند ہونے کا واقعہ راحت الصدور (صفحہ ۲۰۹) میں ہے، اس کی مدح کے دو قصیدے ملتے ہیں:

(۱) رہ می روید و دیدہ بہ رہبر نمی رسد | کان می کنیم و تیشہ بہ گوہر نمی رسد
بر پایۂ سریر تو چرخ ار نداد بوس | عذرش قبول کن کہ مگر بر نمی رسد
تعبیر رمز عشق میاموز عقل را | از بہر آنکہ یک کلمہ در نمی رسد
شوق شراب عشق تو در ہر سحرگہے | الا بکام مغز کشو ر نمی رسد
زنگ ورنگ گوہر عبادی آنکہ زاد | صد خیر می رسد کہ یکے شر نمی رسد

(۲) قد قامۃ القیامہ کجا عشق دادبا | بل عشق صعب تر ز قیامت ہزار بار

ازخیط ناعبادی اگرخیط بایدت | شو دست زن بدامنِ عبادی استوار
شاہِ جلال رانکتۂ وعظِ او سرِیہ | زرِ جمال راسخنِ عذب او عیار
دورانِ اسم اوشود اسلام راجمال | بارانِ اسم او دہد ایام رابہار
یارب تو ئی گواہ عمادی دریں سخن | سرمایۂ رضاے توکردہ ست خواستار
گرعمرِمختصرشودش باک نیست ہیچ | محجوب دارہمتِ او رازاختصار

آخری شعر میں بھی عمادی نے اپنے بڑھاپے کے متعلق اشارہ کیا ہے۔

ان کے علاوہ عمادی کے چند ممدوح اور بھی تھے۔ ابن اسفندیار (ترجمہ براؤن ص ۲۵۳) میں ہے کہ اتابک عبد الرحمٰن بن طغایرک نے اردبیل سے علاء الدولہ علی بن شہریار بن قارن (المتوفی ۵۳۵ھ) کے دربار میں آکر مدد چاہی تھی اور یہ کہ عمادی اس کا مدح نگار تھا عمادی نے ایک قصیدے میں اسے "شہ مظفر" کہا ہے:

چوں نوبتِ حسن تو درآمد | فریاد زعاشقاں برآمد
درویشِ کنار و بوسہ باشد | آن کس کہ زغم تو انگرآمد
اندیشۂ تو مرا مبارک | چوں عید شہ مظفر آمد
عبد الرحمٰن کہ آفرینش | با ہمت او محقر آمد

یہ عبد الرحمٰن بعد میں سلطان مسعود بن محمد ملک شاہ (المتوفی ۵۴۷ھ ۱۱۵۲ء) کا حاجب (راحت الصدور صفحہ ۲۲۵) ہوگیا تھا، ایک ترکیب بند میں آٹھ آٹھ اشعار کے آٹھ بند ہیں، ان میں سے چند اچھے اشعار یہ ہیں:

بند نمبر ا
گفتی بہ چہ ماندۂ دریں غم | خود مشکل من ہمیں سوال ست
دولتِ یارے چو تو نہ دیدم | کز روے تو شاہ بے ملال ست

...لدین کز بزرگواری — تن در نہ دہد بہ تاج داری
گر پند ترا دہد عمادی — نمکین کنش کہ ز اژخائیست
عبدالرحمٰن کہ گر بخواہد — از ہفت سپہر شش بکاہد
نمبرہ — گرد افشاندے ز رزمِ نصرت — تا ئید بہ پرچم سیاہش
نمبرہ — عبدالرحمٰن کز نوک پیکان — بر دیدۂ مشتری نگارد
نمبرہ — چوں در شعرا امیر باشی — بر شارعِ شرع بادگامت
اقبال چو سکۂ نگارد — مشہور مباد جز بنامت

ان چیدہ چیدہ اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدالرحمٰن کا لقب فخرالدین (شعر نمبر۳) تھا، یہی لقب زبدۃ النصرہ (اختصار البنداری طبع ہوتسما، لیدن ۱۸۸۹ء، صفحہ ۱۹۲) میں ہے اور یہ کہ ۵۴۱ھ میں اس نے وفات پائی۔ اشعار نمبر ۲ اور ۹ سے ظاہر ہے کہ وہ سلجوقی شاہ (یعنی مسعود بن محمد بن ملک شاہ) کا تربیت یافتہ تھا، اور شعر ۸ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ممدوح اگر "امیر شعرا" نہیں تو کم از کم شاعری سے ذوق رکھتا تھا، ایک قصیدے میں اس کے فخرالدین ہونے[1] کا ذکر ہے:

رایگاں رخ نمی نماید یار — بہ سخن راست می نہ گردد کار
گر لب اوت نیست در برِ بست — سیم اسپر خدایگان کبار
تخت بخش زمانہ فخرالدین — کز حوالی او گریزد و عار

کوئی ممدوح امیر عزالدولہ عبدالواحد تھا:

کاریست مرادِ نیست یارے — بے یار کرا گرفت کارے

---

[1] راحت الصدور (ص ۲۳۰) میں عبدالرحمٰن کے بیٹے کا نام فخرالدین ملتا ہے۔

از بہر پناہ می نیا ید | جز عز الدولہ شہر یارے
عبد الواحد کہ گوش گردوں | نشنید چنو زمانہ دارے
در سابقہ خدمتے نہ دارم | کاں راست مجال اعتبارے

ایک ممدوح امیر عبد الجلیل تھا،

اے خرد از خدمت تو نیک کام | وی ہنر از دولت تو شاد کام
نام تو اندر دل خورشید نقش | کام ترا بر سر گیتی لگام
راد ہمایوں کف عبد الجلیل | نسخت اقبال زمین تا بہ لام[1]

ایک ممدوح محمود بزغش[2] تھا:

قسیم ورم راد محمود بزغش | کہ بر چرخ رایش کند بربادی؟

ایک عبد الصمد بھی تھا:-

اے دست تو جود را بہانہ | پاے تو وجود را نشانہ
عبد الصمد اکرم الخلایق | سرمایہ بخت جاودانہ

سید حسن غزنوی کا بھی ایک ممدوح عبد الصمد ہے، جو ممکن ہے کہ یہی ہو،

گر نتیجہ بحر است بر خلاف قیاس | نتیجہ آمد بحرے ز گوہر عباس[3]
ابو المحاسن عبد الصمد کہ بخت ابد | بناے دولت ادراء نہاد اساس

ایک دوسرے معاصر عبد الواسع جبلی (م ۵۵۵ھ) کا بھی ممدوح یہی ہوگا،

---

[1] بحر سریع مسدس مطوی موقوف کا یہ قدیم نمونہ ہے [2] ایک بزغش کا ذکر تاریخ سیستان (ص ۳۸۹) میں ہے جو سنجر کا سپہ سالار تھا، اور ۴۹۰ھ میں سیستان آیا تھا، دیکھیں ابن الاثیر ج ۱۰ ص ۱۱۲-۱۱۳)

[3] دیوان سید حسن غزنوی، طہران ۱۳۲۸ شمسی صفحہ ۱۰۰

فخر الدین کز بزرگواری — تن در نہ دہد بہ تاجداری

بند نمبر۲ — گر پند ترا دہد عمادی — نکمیں مکنش کہ تراز خائیست

عبد الرحمٰن کہ گر بخواہد — از ہفت سپہر شش بکاہد

" نمبر۵ — گردافشاندے زرد نصرت — تائید بہ پرچم سیاہش

" نمبر۶ — عبد الرحمٰن کز نوک پیکان — بر دیدۂ مشتری نگارد

" نمبر۸ — چوں در شعرا امیر باشی — بر شارع شرع باد گامت

اقبال چو سکۂ نگارد — مشہور مباد جز بنامت

ان چیدہ چیدہ اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ عبد الرحمٰن کا لقب فخر الدین (شعر نمبر۳) تھا، یہی لقب زبدۃ النصرہ (اختصار البنداری طبع ہوتسما لیدن ۱۸۸۹ء صفحہ ۱۹۲) میں ہے اور یہ کہ ۵۴۱ھ میں اس نے وفات پائی، اشعار نمبر۲ اور ۹ سے ظاہر ہے کہ وہ سلجوقی شاہ (یعنی مسعود بن محمد بن ملک شاہ) کا تربیت یافتہ تھا، اور شعر ۸ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ممدوح اگر "امیر شعرا" نہیں تو کم از کم شاعری سے ذوق رکھتا تھا، ایک قصیدے میں اس کے فخر الدین ہونے[1] کا ذکر ہے:

رایگاں رخ نمی نماید یار — بہ سخن راست می نگردد کار

گر لب اوت نیست در بر بست — سیم اسپر خدایگان کبار

تخت بخش زمانہ فخر الدین — کز حوالی او گریزد عار

کوئی ممدوح امیر عز الدولہ عبد الواحد تھا:

کاریست مرا دنیست یارے — بے یار کرا گرفت کارے

---

[1] راحت الصدور (ص ۲۳۴) میں عبد الرحمٰن کے بیٹے کا نام فخر الدین ملتا ہے۔

از بہر پناہ می نیاید | جز عز الدولہ شہریارے
عبد الواحد کہ گوش گردوں | نشنید چنو زمانہ دارے
در سابقہ خدمتے ندارم | کاں راست مجال اعتبارے

ایک ممدوح امیر عبد الجلیل تھا،

اے خرد از خدمت تو نیک کام | وی ہنر از دولت تو شاد کام
نام تو اندر دل خورشید نقش | کام ترا بر سر گیتی لگام
راد ہمایوں کف عبد الجلیل | نسخت اقبال زمین تا بہ لام[1]

ایک ممدوح محمود بزغش[2] تھا:

قسیم درم راد محمود بزغش | کہ بر چرخ رایش کند بر بادی؟

ایک عبد الصمد بھی تھا:-

اے دست تو جود را بہانہ | پاے تو وجود را نشانہ
عبد الصمد اکرم الخلائق | سرمایۂ بخت جاودانہ

سید حسن غزنوی کا بھی ایک ممدوح عبد الصمد ہے، جو ممکن ہو کہ یہی ہو،

گر نتیجۂ بحر است بر خلاف قیاس | نتیجہ آمد بحرے ز گوہر عباس[3]
ابو المحاسن عبد الصمد کہ بخت ابد | بناے دولت او را بوے نہاد اساس

ایک دوسرے معاصر عبد الواسع جبلی (م ۵۵۵ھ) کا بھی ممدوح یہی ہوگا،

---

[1] بحر سریع مسدس مطوی موقوف کا یہ قدیم نمونہ ہے [2] ایک بزغش کا ذکر تاریخ سیستان (ص ۳۸۹) میں ہے جو سنجر کا سپہ سالار تھا، اور ۴۹۶ھ میں سیستان آیا تھا، دیکھیں ابن الاثیر ج ۱۰ ص ۱۱۲-۱۱۳)

[3] دیوان سید حسن غزنوی، طہران ۱۳۲۸ھ شمسی صفحہ ۱۰۰

عبد الصمد عزیز ملوک و نصیر دین کز عقل ہست عاقلۂ نسلِ بو البشر
نور و سرور چشم و دل حمزہؓ و علیؓ آں مایۂ بزرگی و پیرایۂ ہنر[1]

عمادی کے چند ممدوح اور ہیں جن کے متعلق معلومات نہیں ہیں :-

چوں نسب گوئی امیر ابن الامیر چوں لقب جوئی مجیر ابن الظہیر
عنصرِ دولت محمد شرف الدین کز کفِ او حاصل بحار برآمد
مہدی خرد محمد نعمان کہ از ہنر بر سیرتِ محمد مختار می رود[2]
فرق فرقد امام قطب الدین ہمگی دین کدام قطب الدین
ناصر الدین پہلوان سخن پہلوان و خدایگان سخن
آں شب کہ مرا رسید جعفر گاہی بے خبر از مقام خود تم[3]

اب کچھ ایسے کلام پر بحث کرنے کی ضرورت ہے جس کی وجہ سے عمادی کے زمانے کی تعیین میں شبہات پیدا ہوئے ہیں، ڈاکٹر ریو (Rieu) نے (فہرست برٹش میوزیم جلد دوم، صفحہ ۵۵۸) خیال کیا ہے کہ عمادی کا ایک قصیدہ "جہاں پہلوان" یعنی اتابک محمد بن ایلدگز (المتوفی ۵۸۲ھ) کی مدح میں ہے۔

گنبد مشکیں شدہ ست چرخ زبوی بہار غالیہ پیوند گشت باد چو گیسوی یار . . . . .
گرد رخ شنبلید داشت نسیم بہشت گفتم کیں چیست گفت خاکِ در شہریار
خسرو گردوں کمند شاہ جہان پہلوان آں کہ کند کوہ را ہیبت او اشکبار

---

[1] قصائد عبد الواسع جبلی، حبیب گنج، مخطوطہ نمبر ۹۳ [2] سید حسن غزنوی (ایضاً صفحہ ۵۸) نے بھی یہ زمین اختیار کی تھی : چشم چو بہ سرگل وگل زاری رود اندیشہ درپئے دل و دلدار می رود
[3] اسی زمین میں فلکی شروانی (از ڈاکٹر ہادی حسن، لندن ۱۹۲۹ء، صفحہ ۸۲) کے اشعار بھی ہیں۔

چاشتگھے کز خروش خاک جوشد چو آب	از علم زنگ رنگ باد نماید چو نامہ . . .
پر در تو می رود عمر عمادی خوشتر ست	گرچہ یقین داند عمر نباشد دوبارہ . . .

(لباب الالباب ، ج ۲ ص ۲۵۰، ۲۵ بجد)

لیکن "شاہ جہاں پہلوان" (شعر نمبر ۳) سے اتابک محمد پہلوان مراد لینا صحیح نہیں، بلکہ یعین ممکن ہو کہ یہ قصیدہ کسی سلجوقی سلطان (یعنی طغرل بن محمد بن ملک شاہ جہاں؟) کی مدح میں ہو، کیونکہ "علم زنگ رنگ" (شعر ۴) در اصل سلجوقیوں (اور غزنویوں) کا علم تھا، اور اتابک محمد پہلوان کا علم سرخ تھا، جیسا کہ مجیر بیلقانی نے کہا ہے:

رایت سرخ ترا کافسر فتح و ظفر ست	سایۂ نصرت و پیرایۂ لشکر گیرند

(راحت الصدور صفحہ ۳۱۰)

ایک قصیدہ ملک طغان کی مدح میں بھی ہو جس کو ریو (ایضاً) نے طغان شاہ ابن مؤید آی (۵۶۹ھ تا ۵۸۱ھ) سمجھ لیا ہے، وہ قصیدہ یہ ہے:-

زاں گہ کہ در تصرف ابن سبز گلشنم	در کام اژدہائے نیاز است مسکنم
باز سپید دانشم و در ہمہ جہاں	جز آستان شاہ نباشد نشیمنم
خسرو ملک طغان کہ زبس لطف ملش	از منت عطائے وے آسودہ شد تنم

میرا خیال ہو کہ یہ طغان شاہ ابن مؤید آی ابہ نہیں ملکہ ملک طغان بن الپ رسلان ہو کیونکہ اسی کے بھائی ملک ارغون بن الپ ارسلان (المتوفی ۴۸۹ھ) کی مدح میں بھی عمادی کا یہ قصیدہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں،

شاہ ہمہ شاہان ملک ارغون کہ نہ دارد	در مردی و فرہنگ نظیرے و ہمالے

سید حسن غزنوی جس نے عمادی کی کئی زمینوں کو اختیار کیا ہو، مذکورۂ بالا زمین میں بھی کہتا ہے:

جاں می پرد بعشرت حوران گلشنم	تن می کشد بخدمت دیوان گلخنم

ترسم ز ننگ صحبت زاغ سیاہ تن | باز سپید جان بپرد زین نشیمنم
از بعد پانصد و چہل و پنج گو بیا | در من نگر کہ معجزۂ جدّ خودمنم

سید حسن غزنوی نے "باز سپید" کی ترکیب بھی عمادی کے مذکورۂ بالا شعر نمبر ۲ سے لی ہوگی (لباب الالباب ج ۲ صفحہ ۱۸، ۱۹) میں بھی مجد الدین بن عدنان اور سعد الدین اسعد بن شہاب کے اشعار بھی اسی زمین میں ہیں۔ اسی ملک ارغون اور ملک طغان کے بھائی الب غازی بن الپ ارسلان کی مدح میں عمادی کے یہ اشعار ہونگے،

تا چند ز صحبت مجازی | تا کے سخنان نا نمازی[1]
خود قول بود بدیں دروغے | خود عشوہ بود بدیں درازی
اکنوں بارے شکر فراخ ست | یعنی لب لعل الب غازی

(مجمع الفصحا ج ۱ صفحہ ۳۴۰)

عمادی کے انتقال کے متعلق ابو العلاء گنجوی کے یہ اشعار اہم ہیں:

سخن وراں بہ من امروز اقتدا آرند | روا بود کہ منم قدوۂ ہمہ شعرا
چو رفت جان عمادی بمن گذاشت عماد | چو شد روان سنائی بمن گذاشت سنا
تبارک اللہ پنجاہ و پنج بشمر دم | گہ وداع رحیل ست ازیں فنا بفنا
سر ملوک منوچہر مہر چہر کزو | شدہ ست زندہ و فرخندہ خاندان سنا

(مجمع الفصحا ج ۱ صفحہ ۶۴)

گویا منوچہر (المتوفی ۵۵۰ھ، Manuel de Genealogie by Zambour صفحہ ۱۸۲) کے زمانے میں جبکہ ابو العلاء گنجوی کی عمر ۵۵ سال سے گذر کر چھٹی دہائی (شعر ۳، ۴) میں تھی، اسوقت عمادی اور سنائی (شعر ۲) نے انتقال کیا تھا، خانیکوف (Khanikof) تذکرۂ خاقانی (اورنٹیل کالج میگزین، اگست ۱۹۳۶ء صفحہ ۵۲) میں ابو العلاء گنجوی کی مفروضہ پیدائش ۴۸۵ھ اور ۴۹۰ھ کے درمیان بتائی ہے، اس حساب سے وہ اشعار اس شاعر کی ۵۵ سال عمر کے بعد یعنی ۵۴۰ھ یا ۵۴۵ھ کے بعد لکھے گئے، اور سنائی کا سال وفات ۵۴۵ھ ارجح قرار دیا جاتا ہے، اسلئے ظاہر ہے کہ ۵۴۵ھ تک عمادی بھی وفات پا چکا تھا،

---

[1] تاریخ سیستان (مصحح ملک الشعرا بہار، تہران ۱۳۱۴ھ شمسی) صفحہ ۳۸۸ میں الب غازی کا ذکر یوں آتا ہے: "آمدن (در سیستان) امیر الب غازی بہ ورق چہار دہم جمادی الآخر ۴۹۰ھ"

ہندوستانی زبان کا ایک قدیم مرثیہ

جناب شیخ فرید صاحب لکچرار رابرٹسن کالج جبلپور

حضرت مسیح الاولیا ——— شاہ عیسیٰ جند اللہ[۱] ——— دسویں صدی ہجری کے جید عالم، فاضل متبحر، صوفی صافی بزرگ اور کئی تصانیف کے مالک تھے، ۱۰۳۱ھ/۱۶۲۲ء[۲] میں اس سرائے فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت کی، ایک عقیدت کیش مرید نے ہندوی زبان میں ان کا مرثیہ لکھا جو تاریخ اردو کی ایک اہم کڑی ہے، اس لیے اس کو مختصر تبصرہ کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے،

تلاش کے باوجود مصنف کے نام اور حالات کا پتہ نہ چل سکا، اور نہ مرثیہ کی تصنیف کی کوئی متعین تاریخ معلوم ہو سکی، مگر اس قدر یقینی ہے کہ وفات کے قریب ترین زمانہ میں کہا گیا ہوگا، اس اعتبار سے اس کا زمانۂ تصنیف گیارہویں صدی ۱۰۳۱ھ کے قریب ہوگا،

اس مرثیہ کا ایک نادر اور خوش خط مخطوطہ کتب خانہ درگاہ حضرت الٰہی (برہانپور) میں محفوظ ہے، اس کے سجادہ نشین اور متولی حضرت سید اکرام الدین صاحب اور حضرت سید حبیب الدین صاحب کی مہربانی سے یہ نایاب مخطوطہ مجھے مطالعہ کے لیے مل گیا، جس کے لیے میں انکا شکر گذار ہوں،

زیر نظر مخطوطہ میں کل ۴۴ بند ہیں، ہر بند عموماً پانچ اشعار اور ایک دوہرہ پر مشتمل ہے،

---

[۱] تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ کیجئے راقم السطور کا مضمون (شاہ عیسیٰ) معارف ستمبر ۵۹ء

[۲] تاریخ وفات ۱۵ر شوال ۱۰۳۱ھ مطابق منگل ۱۳ر اگست ۱۶۲۲ء،

آٹھ اشعار نامکمل ہیں، کیوں کہ بعض جگہ عبارت کرم خوردہ ہے، کسی بند میں ایک دو شعر کم یا زیادہ ہیں، اور کسی کے آخر میں ایک دوہرہ زیادہ ہے، اس طرح اشعار کی کل تعداد ۴۲۴ اور دوہروں کی ۴۸ ہے۔

عنوانات فارسی میں، سرخ روشنائی سے اور مطالب اور دوہرے ہندی زبان میں سیاہ روشنائی سے مرقوم ہیں،

حضرت شاہ عیسیٰ کی منقبت اور حضرت شیخ محمد عارف کے عرس کی تفصیلات سے لیکر حضرت کی اس دنیا سے رحلت۔ بہشت کی آرایش، حضرت محمد غوث اور شاہ شکر کے روحوں کی آمد، فرید (مرید) کو اس "وقت آخر" کی اطلاع، حضرت کا انتقال، تجہیز و تکفین، خانقاہ میں ماتم، تدفین۔ اطراف و جوانب میں ماتم، مصنف کا سوز و گداز، حضرت کی روح کا جنت میں داخلہ ارواح انبیاء کی جانب سے استقبال، دیدار الٰہی سے شرف یابی تک کی تمام تفصیلات منظوم ہیں،

اس مرثیہ کی اردوے قدیم سے قرابت، پنجابی اور راجستھانی زبانوں سے اس کے تعلقات اور اثر پذیری کے لحاظ سے اردو کی تاریخ میں اس مرثیہ کی اہم حیثیت ہے، اور ابتک وہ عام نظروں سے پوشیدہ رہا ہے، اس لیے اس کا تعارف ضروری ہے،

(۱) اس میں اسماء کا املا عجیب طریقہ سے لکھا گیا ہے، مثلاً

عیسیٰ کو عیسن، آگرہ کو اگرے، برہانپور کو برنپر اور برہانپر اور دکھن کو دکھم۔

عیسن شاہ جہا گر گیا نے — جا کے کت کنوں نہیں جانے

حکم کیا ہر سرگ بنا دو — برنپر اک ٹھور ملا دو

جگ بہیو سب جن کو چیرو — برہانپر تن کیو بسیرو

کشمیر اور دلی اگرے — جگت گرد کوں روسگرے

ہندی اسماء کا استعمال بڑا لطیف ہے:-

ہراہن (گم کردہ راہ) ابہی، پرمی، مٹھ بولا (شیریں بیاں)، من ماتا (ولپسند) لٹکن (خرام) لٹک (ادا) چت چور (ہوش ربا) برن (ذکر) بچھڑت وغیرہ۔

(۲) جو الفاظ ہ پر ختم ہوتے ہیں، ان کو الف سے لکھا ہے۔ جیسے

مرثیہ کو مرثیا، پیالہ کو پیالا، سندیسہ کو سندیسا۔

موکھ لوگ کہتن بہیو ہیتا معراج نکہیں کہیں مرثیا

سب مرہیں کسو نہیں جیونا یہ پیالا سب کا ہو پینا

شاہنشاہ چلے تن دیسا چت سہو ہی جائے سندیسا

کہیں الفاظ کے آخر میں الف بڑھا دیا ہے، جیسے

دیس کو دیسا۔ قندھار کو قندھارا۔ بات کو باتا،

ملتان، کابل قندھارا شیخو پور، اور پٹن سارا

ع کیا کوئی جانے گر کی باتا

بات کو ایک جگہ بتے بھی لکھا ہے

اک بتے سنو ہماری تم دیے چلے دوکھ بھاری

بات کی جمع باتاں اور بتیاں دونوں لکھی ہیں،

ع کب تک بتیاں اور کہانے

ع سن برہی برہ کا باتاں

(۳) (ی) یائے معروف پر ختم ہونے والے الفاظ کو ہ اور ؤ کے اضافت بھی لکھا ہے مثلاً

پی کو پیہ، پیو- جی کو جیہ، جیو

ع۔ پیہ کارن ہیتہ او نکیو جائے   ع۔ اک ہیو بچھڑت بھئے دوانے
ع۔ جی بتیاں کرکے من مانے   ع۔ او میرے جیہ کے پیارے
تون تو جیو جیو کو ہے پیارو   کن دیکھوں تن جیہ تین نیارو
ع۔ جیہ تین پران ہمارے جہورے

کہیں کہیں ایک ہی بند میں املا کی مختلف شکلیں ہیں، جو اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ اس زمانہ میں تحریر کی "رسم کہن" اور "آئینِ نو" دونوں جاری تھے،

(۵) کہیں "ضرورت شعری" نے دلچسپ صوتی تبدیلیاں بھی پیدا کردی ہیں، مثلاً شامیانے کو شمیانے۔ محل کو کھل۔ خانقاہ کو خانقہ، کھان گاہ، لہو کو لوہو۔ حضور کو ہجور۔ گرد کو گر، گور

(۶) الفاظ کے املا میں ہندی کا اثر غالب ہے یعنی ل کے بجاے ر استعمال کیا گیا ہے مثلاً چیلا = چیرو، چیرا۔ گلے = گرے۔ جلادیں = جراویں۔ کالی = کاری۔

بنگ بہیو سب جن کے چیرو   برہا نیر تن کیو بسیرو
کھان گاہ ان کی ات سوہے   جن سب جگ کے پریمی موہے
نبی ولی سب اگون آئے   آدم لے کر گرے لگائے
ع   دھواں لبان اور اگر جراویں
یا   ع   گھر سے نکسے عسن پیارے

(۷) ضمائر کی اشکال یہ ہیں،

کون، کوئی، اس، جن کو، ان کو، تجھ کو، وہ، اس کے، ہمیں، جائے،
کہ، کنوں، ان، تن کو، ان کوں، تو، واہ، واکے، ہمے، جس کے
تو کو   ہمیں ہم

(۸) حروف اس شکل میں تحریر ہیں :

(الف) حروف ظرف میں = مانہی ، ماہیں ، مانہ . تن

(ب) حروف جار سے = تیں ، سیں ، سیوں

(س) آگے = آگوں ، آگیں

(س) حروف نفی نہ = نان ، نہ ، ناہیں ، نکو

( ) صلہ فعل بہت ات

ایسا ایسو

جیسا جن سا

(۹) افعال :- آیو ، لگایو ، کہیو ، کیو ، لیا ؤد ، چرایو ، رہیو ، پچھیو ، ایا

گنوایو ، نکسو ، گیو ، نبایو ، برایو ، پایو ، وغیرہ

افعال میں حرف آخر (الف) کے بجائے واؤ ہے ،

کچھ افعال کے آخر کا نونؔ (ن) نے کا مفہوم ادا کرتا ہے ، مثلاً

گاون ، لیون ، دیکھن ، ، رون ، کھودن ، کاپن ، برسن

گانے ، لینے ، دیکھنے ، ، رونے ، کھودنے ، کانپنے ، برسنے

اس طرح کی افعال اور بھی شکلیں ہیں ، مگر ان کو طوالت کے خیال سے نظرانداز کیا جاتا

(۱۰) جمع دو طرح کی ملتی ہے

(۱) لفظ کے آخر میں نؔ لگاکر جمع بنائی گئی ہے ، مثلاً

لوگ سے لوگن ، نبی سے نبین ، ولی سے ولین ، تارا سے تا

(ب) کہیں نؔ کے بجائے الف نون ہے ، جیسے بات سے باتاں ، یا بتیا

(۱۰) فاعل اور مفعول کی علامات اکثر موقعوں پر حذف کر دی گئی ہیں،

اب ہم مرثیہ کے مطالب پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں، پہلا بند حضرت مسیح (شاہ عیسیٰ) کی منقبت سے شروع ہوتا ہے،

عین شاہ مہا گر گیانے ‏ جا کے کت کنوں نہیں جانے[1]

نین میں جو نبی ہمارے ‏ ولین میں یوں عین پیارے

جگ لس مانہی عیسن پیارا ‏ چودس چاند جھیو اجیارا

ات سندر محبوب الٰہی ‏ جن ساکوں ، ویہی ساہی

سندر سکھی سبحان پیارے ‏ پربت ہوں نیں ہیں ات بھارے

پیر و مرشد حضرت شاہ لشکر عارف کے عرس کی تیاریاں

عرس سوز شہ لشکر گیرد ‏ عید کیے تھے لوگ گھنیرد

ات اچرج دو ٹھور بنائے ‏ جا کے برن نہ برنے جائے

نیکے بستر آن بچھائے ‏ بھیتوں پر کھل بہرائے

ات بن کے شمیانے آئے ‏ دل بادل اور تنبو تانے

ٹھور ٹھور پر دیپک بارے ‏ انبر پر جوں سوہیں تارے

عرس کی خبر ہر جگہ پھیل گئی اور عقیدت مند جوق در جوق آنے لگے، ان میں صاحب دنیا بھی تھے اور تارک دنیا بھی، حضرت موصوف کے دونوں صاحبزادوں فتح محمد اور عبد الستار، نے لوگوں کا استقبال کیا، اور ان کو حسب مراتب بٹھلایا،

مہا سبھا کے ٹھاکر آئے ‏ جیسے جے تے نہان بھائے

---

[1] خط زدہ الفاظ اوپر کی مثالوں میں دیئے جا چکے ہیں،

لوگوں کے جمع ہو جانے کے بعد "چودھویں کے چاند" کے مانند حضرت عیسیٰ گھر سے نکلے،

گھر تیں نکسے عیسن پیارے   جیسے چودس چاند اجارے

حاضرین کی عطریات سے تواضع کی گئی، موسیقی کے استادوں نے اپنے فن کا کمال دکھلایا،

ادھر محفل عرس گرم تھی، اُدھر (آسمان پر) حضرت عیسیٰ کے لیے جنت سجائی جارہی تھی،

حکم کیا ہر سرگ بناؤ   ہر نبیر اک ٹھور ملاؤ

احمدن کارن تخت بنایا   ات ہیرے اور لال لگایا

تا ہر اچرج سیج بنائے   جا کے برن نہ برنے جائے

شور بھیو سو احمد آیو   جن کارن دو جگ اپایو

سب ارواح ملے اک ٹھوری   ہر نبیر سب اگون دوری

حضرت محمد غوث اور شاہ لشکر محمد عارف کی روحیں حضرت عیسیٰ جند اللہ سے ملنے کے لیے خانقاہ میں آئیں، آپ الگ الگ دونوں سے بغل گیر ہوئے۔

جب گر دیکھے عیسن پیارے   سب لوگن تیں بھئے نیارے

اٹھ کو گر کر لیوں دہائے   محمد غوث لے گریں لگائے

اور شاہ عیسیٰ کو اطلاع دی گئی کہ انھیں عالم بالا میں بلایا گیا ہے،

نبی محمدؐ تو ہ بلا دیں   تجھ کارن سب سرگ بنا دیں

یہ اطلاع حضرتؒ نے اپنے ایک خاص مرید فرید سے اس طرح بیان کی

سنو فرید مرید ہمارے   تم ہو میرے جیہ کے پیارے

ہمے تو ہر کا آنا آیا   نبی محمدؐ ہمیں بلایا

محمد غوث ہم لیون آئے   شہ لشکر سنگ میں لائے

پیر ہمارے ہمیں بلاویں ہم کارن سکھیاں بناویں
اب دن بھئے ہمارے تھوڑے جیہ تین پران ہمارے چھوڑے

اوپر کے بند میں جمع متکلم کی مفعولی حالتوں پر غور کیجئے، ہمیں، ہمے بھی ہے، اور بغیر علامتِ مفعول (کو) کے ہم بھی۔ اور چوتھے شعر کے مصرعۂ ثانی میں ہم ہمارے کے مفہوم کو ادا کر رہا ہے۔

حضرتِ شاہ عیسیٰ محفل سے اٹھ کر چلے گئے۔ اور جب آسمان پر ستاروں کی محفل منتشر ہوئی، تو حضرت کی روح عالم بالا کی طرف پرواز کر گئی۔

جب نکسو ہما تو تارا چھپ گیو چودس چاند ہمارا
چھپ گیو چاند گھٹا آئی کاری چودس رین بھئی اندھیاری
چھپ گیو دیپک بھیو اندھیرا چرن کو نہیں سوجت ہیرا
کوں گیو ہیں عیسیٰ پیارے کو کے سنگ ہوے سرگ سدھارے

آپ کی رحلت سے خانقاہ میں صف ماتم بچھ گئی، تجہیز و تکفین کی تیاریاں ہونے لگیں، "کوثر و زمزم" سے غسل دیا گیا اور "تن سکھ بھیروں" کا کفن پہنایا گیا۔

جنازہ اٹھنے کا منظر ملاحظہ ہو!

سب میتوں مل کھاٹ اٹھائے دیکھو لوگو ہر کو آئے
دھرتی سگری کانپن لاگی انبر ہوے بھری بیراگی
گھن گرجے اور بادر روویں مانس کہ کیوں سکھ کے سوویں
سس سورج اور روویں تارے مانس کر دھون کوں بچارے
دن گر سو دت بھیہ اندھیرا کچھ نا بسا اک میرا تیرا

جب خانقاہ میں آخری دیدار کے لیے جنازہ رکھا گیا تو "اہلِ نصیب" پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے،

سب برہی برہ کے مارے ٹوٹ پڑے جوں ابر تارے
چرن جہار چلے گور گیانے ان بن لو ہو رو رو ہانے

زمین کے نصیب جاگ گئے، گورکنوں نے قبر کھودی، اسے گل و عنبر سے بسایا گیا،

"تدفین" کے بعد شاعر "کل نفس ذائقۃ الموت" کے مفہوم سے غمزدوں کو تسکین دیتا ہے،

مت یوں جانو شاہ سمانے عادک سدہ اور کھرے سیانے
پیر پیمبر جو ات آئے سب اس دھرتی مانہ سمائے
سب مرہیں کسو نہیں جینا یہ پیالہ سب کو ہو پینا
سپنے میں کچھو جو کوئی پائے جاگ پڑے تب ہاتھ نہ آئے
یہ جگ سارا سپنا جانو یا میں سو سنئے(رہے) پچھانو

وفات کے بعد عبدالرحیم خانخانان نے "صرفِ خاص" سے ایک روضہ بنوایا، اور عوام و خواص اس در سے مستفیض ہونے لگے،

اوپر روضہ پاک بنایو جا کون دیکھت جگ برمایو
جو من تیں منا کر آویں یا در تیں محروم نجاویں

اوپر کے اشعار میں جا کون (جس کو)۔ من تیں (منتیں)، یا (اس)۔ تیں (سے) کا استعمال توجہ طلب ہے۔

آپ کی وفات سے خاندیس، دکھن، ہند، سندھ، بلخ، بخارا، روم، شام، کشمیر، آگرہ، دلی، ملتان، کابل، قندھار، شیخوپورہ، پٹن، لاہور، اور اندرکوٹ وغیرہ ساری دنیا میں ماتم بپا ہو گیا۔

بعض نے اس خبر پر یقین نہیں کیا، اور بعض حیران رہ گئے، شاعر پھر تسلی آمیز انداز اختیار کرتا ہے،

محمدؐ سے محبوب سدھائے غوث قطبن سنگھن بجے سائے

جو آیا ات نہ ات جائے جو ایجیا سو جیا بتائے

پیر پیمبر جو ات آئے سب اس دھرتی مانہہ سمائے

اس کے بعد شاعر اس دیس کا بیان کرتا ہے جہاں جاکر کوئی نہیں لوٹا،

شاہنشاہ چلے تن دیسا چت سہوہی جائے سندیسا

ناں ات کے کوئی آئے کہانے کیوں کر جاہر سون لپٹانے

اوت کو گیو نہ ات کو آئے جو اُت کی کچھو خبر سنائے

اوت ات (ادھر اُدھر) کی باتوں میں شاعر بڑے پتہ کی بات کہہ گیا ہے، عالم ارواح کی کسے خبر ہے؛ مگر شاعر کا تخیل اس عالم کی یوں تصویر کھینچتا ہے،

یہ جگ جہار چلے جب آگے نور تجلی برسن لاگے

سرگ لوگ اٹھ دوڑے پرت بادر ان کے اک ٹھورے

نبی ولی سب اگون آئے آدر لے کر گرے لگائے

نوح نبی کے ات من مانے موسیٰ دوڑ گلے لپٹانے

یعقوب نبی دیکھن پر آئے نو دوجے یوسف آئے

اب شاعر کا تخیل اس "خاص محل"[1] میں داخل ہوتا ہے، جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں، اس کے بعد اس سے بھی آگے بڑھتا ہے۔ اور جلوۂ حق جل جلالہ کے دیدار سے حضرت کے مشرف ہونے کے ذکر کے بعد لکھتا ہے،

---

[1] شعر خاص محل جب گر جا بیٹھے آگیں نبی محمدؐ بیٹھے

(خاص محل میں حضرت رسول مقبولؐ کے سامنے جاکر بیٹھے)

مورکھ لوگ مو اگر لوجھے ان او لیا اللہ بسوجھے
لا یموت رسول کھانا جن من سانچ سانچ کے ما
کہت گئے ہیں سب سیانے امر بھئے تے مرہی جانے
جن ہر پریم پیالا پیتا تے مر ہیں کیوں مورک جیا

یعنی نادان کہتے ہیں کہ مرشد کا انتقال ہو گیا ہے، یہ نہیں جانتے کہ جو "مۓ عشق الٰہی" سے سرشار ہیں، وہ مرتے نہیں،

آخری بند میں شاعر کہتا ہے کہ یہ مرثیہ نہیں، معراج (نامہ) ہے،

مورکھ لوگ کٹھن بھیو بیتا
معراج نکہیں کہیں مرثیا

ان اشعار کا غور سے مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مرثیہ میں بعض اشعار ایسے بھی ہیں، جن میں بڑی صداقتیں پنہاں ہیں،

اس مرثیہ کی سادہ اور سلیس زبان اس دور میں اردو کی مقبولیت کی شاہد ہے، اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عوام میں اردو کی مقبولیت کا راز اسی سادگی میں پوشیدہ ہے،

معدن المعانی

از عطاء الرحمٰن صاحب عطا کاکوی پرفیسر پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، پٹنہ

معدن المعانی حضرت مخدوم الملک بہاریؒ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، اس کے مرتب انکے مسترشد زید ابن عربی ہیں جنھوں نے ان کے قریب رہ کر حضرت کے "فرمودات" کو قلمبند کیا ہے، اس مجموعہ کی حیثیت دوسرے ملفوظات مثلاً فوائد الفواد، راحت القلوب، فوائد السالکین وغیرہ کی جیسی نہیں، بلکہ ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے، چنانچہ مرتب نے لکھا ہے کہ اس کو حضرت مخدوم نے بتمامہ پڑھ کر اصلاح سے آراستہ کرکے تشنہ اور نامکمل مضمون کو مکمل کیا ہے، مرتب کے الفاظ یہ ہیں

"شیخ بزرگ دار سبقاً بعد سبق وکلمۃً بعد کلمۃ وحرفاً بعد حرف قرأت کرد وچند جاکہ بیچارہ (مرتب) راسہوے رفتہ بود بلطف اصلاح فرمود، وحکایتے ومقالے مناسب تقریر وبیتے ورباعی مناسب تحریری فرمود۔"

یہ عام ملفوظات کی طرح تاریخ وار نہیں ہے، بلکہ ایک مرتب کتاب ہے، جو مضامین کے اعتبار سے ۶۳ بابوں پر مشتمل ہے، اس سے اس کی اہمیت اور افادیت اور بڑھ گئی ہے، حضرت مخدوم نے سوالات کے جوابات نہایت مدلل، واضح اور تشفی بخش دیے ہیں، بعض اہم مسائل مثلاً ذکر اثبات وجود باری تعالیٰ، معرفت ذات وصفات، علم شریعت وطریقت، ذکر ثبوت جبر وقدر پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے، یہ کتاب اس لیے اور دلچسپ ہوگئی ہے کہ جا بجا مثنوی، رباعی

اور فرد اشعار سے مزین ہے، اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حضرت مخدوم کو شعر و شاعری سے اچھا خاصا لگاؤ تھا اور برمحل اشعار یاد تھے، یہ بھی قیاس ہوتا ہے کہ ممکن ہے حضرت مخدوم خود بھی شعر کہتے ہوں، اس لیے کہ اس دور میں شعر و شاعری کا خاصہ چرچا تھا، آپ کے خالہ زاد بھائی حضرت مخدوم احمد چرم پوش صاحب دیوان شاعر تھے، آپکے خلیفہ حضرت مظفر بلخی اور ان کے خلیفہ حضرت نوشہ توحید بھی شاعر تھے، لیکن ابھی تک اس کی تحقیق نہیں ہو سکی ہے کہ حضرت مخدوم کا منظوم کلام بھی ہے یا نہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کی نثری تصانیف کے مقابلہ میں نظم کی اتنی اہمیت نہ رہی ہو، حضرت مخدوم کی متعدد تصانیف مشہور و مقبول ہیں، مثلاً مکتوبات کا دفتر سہ صدی و دو صدی، معدن المعانی، مخ المعانی، شرح آداب المریدین وغیرہ

معدن المعانی کے قلمی نسخوں کی طرف ابھی میں نے رجوع نہیں کیا ہے، اس وقت ایک مطبوعہ نسخہ پیش نظر ہے، جو دو حصوں میں ۵۰۰ صفحات کو محیط ہے، کتاب کے آخر میں یہ عبارت ہے،

"الحمد للہ ..... کہ معدن المعانی من کلام .... حضرت مخدوم شیخ شرف الحق و الملۃ والدین احمد یحیی منیری بسعی مولوی عبدالقادر فردوسی بتاریخ بست و کیم شہر جمادی الآخری ۱۳۰۳ھ در مطبع شرف پریس بہار محلہ خانقاہ باہتمام شیخ نعمت علی طبع شد"

اس کتاب کو طبع ہوئے کچھ اوپر ۸۰ سال ہو چکے ہیں، اور تصنیف کا زمانہ تقریباً ۶۰۰ سال پہلے کا ہے، حضرت مخدوم کی وفات ۷۸۲ھ میں ہوئی ہے، مادۂ تاریخ "بشرف" ہے،

یہ کتاب افادیت کے لحاظ سے بہت اہم اور بیش قیمت ہے، شہنشاہ اکبر اس کو پڑھوا کر سنتا تھا، ابوالفضل کے پاس بھی اس کا نسخہ برابر رہا، وہ اس سے فائدہ اٹھاتا تھا، اس کتاب میں کثرت سے اساتذہ اور اکابر صوفیہ کے اشعار ہیں، مولانا روم، سعدی، خاقانی، عطار کے اشعار

بکثرت ہیں، اور بہ قول مرتب زید ابن عربی ہر بحث کے سلسلہ میں یہ اشعار زبان مبارک سے جاری ہوئے،
باب بست و پنجم ص ۲۲۲ میں "در ذکر بریدن از خلق" کی بحث میں یہ فقرہ ملتا ہے کہ حضرت مخدوم
ایں مثنویات برخواند

عشق را با کفر و با ایماں چہ کار — عاشقاں را لحظہ با جاں چہ کار

ہر کرا در عشق محکم شد قدم — در گذشت از کفر و از اسلام ہم

منکرے گوید کہ ایں بس منکر است — عشقِ او از کفر و ایماں برتر است

ان اشعار کے بعد عرفی کا یہ شعر بھی ملتا ہے،

عاشق ہم از اسلام خرابست وہم از کفر — پروانہ چراغِ حرم و دیر ندو اند

عرفی کا وجود تو حضرت کے دو سو سال بعد ظہور میں آیا، اس لیے اس کتاب میں اس کے اشعار کا پایا جانا حیرت انگیز ہے۔ غالباً پبلشر نے مضمون کے لحاظ سے ایک شعر اپنی طرف سے بڑھا دیا، اور اسکا احساس نہ ہوا کہ اس سے کتاب ہی مشتبہ ہو جاتی ہے، خدا جانے اور کہاں کہاں اس قسم کے تصرفات ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ حضرت مخدوم کی کل تصانیف کا ایک مکمل مصحح اور دیدہ زیب اڈیشن شائع کیا جائے، اور جس طرح نکلسن نے اپنی زندگی مولانا روم پر وقف کر دی تھی، اسی طرح کوئی صاحب علم اپنی زندگی کو حضرت مخدوم کی تصنیفات پر وقف کر دیں۔

آثارِ علمیہ

مکاتیب مولانا سید سلیمان ندوی بنام شاہ معین الدین احمد

دارالمصنفین کے قیام کے زمانہ میں حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کا برابر ساتھ رہتا تھا، اس لیے سفر کے علاوہ ان سے خط وکتابت کی نوبت نہ آتی تھی، البتہ ان کے قیام بھوپال کے زمانہ سے لیکر وفات تک خط وکتابت کا سلسلہ برابر قائم رہا، اور اس زمانہ کے ان کے بہت سے خطوط محفوظ ہیں، ان کی ترتیب واشاعت کی نوبت معلوم نہیں کبتک آتے، اسلیے شائقین کی خواہش پر مناسب معلوم ہوا کہ معارف میں ان کی اشاعت کا سلسلہ شروع کر دیا جائے، اس نمبر میں پہلی قسط شائع کی جاتی ہے، "م"

(۱)

۲۱ر جنوری ۱۹۵۰ء

عزیز محترم جناب شاہ صاحب ادام اللہ سعدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ کا خط ملا، مبارکباد کا شکریہ، الحمد للہ تعالیٰ خیریت ہے، مزاج اعتدال پر آرہا ہے، امید ہے کہ چند روز میں اصلی حالت پر آجائے، یہ اتفاقی علالت نہیں ہے، بلکہ کوئی اصولی خرابی نظامِ جسم میں آگئی ہے، ایک دفعہ بعد رمضان المبارک بھوپال میں، دو دفعہ حرمین میں اور اب آخری دفعہ جہاز میں یہ علالت پیش آئی، زکام ونزلہ کی ریزش

...ے پر ہوتی ہے، پھر سینہ پر ہوتی ہے اور سخت کھانسی آتی ہے اور بخار ہو جاتا ہے اور ضعف پیدا ہو جاتا ہے، اب اس دفعہ بمبئی کے ایک ماہر ڈاکٹر کا نسخہ استعمال میں ہے۔ آٹھ ہفتوں کے پینے کی ...وا ہے، چار ہفتے گذر گئے، چار باقی ہیں، اللہ تعالیٰ شفائے کلی دیں،

آپ کے خط سے آپ کا شوقِ ملاقات ظاہر ہوا، یہ آپ کی سعادتمندی ہے۔ مگر چونکہ میرا ارادہ خود آنے کا ہے، اس لیے آپ اپنا ارادہ ملتوی کر دیں،

آپ کا نوٹ اخبارات کی افواہ کے متعلق پڑھا۔ اڈیٹر صاحب قومی آواز نے پہلے استفسار کا تار اور اب بعد جواب معذرت کا خط بھیجا ہے،

سنا ہے کہ آپ لوگوں کی طلبی مدرسۂ عالیہ کلکتہ سے آئی تھی، کیا یہ سچ ہے، ابھی تو یہ آغاز ہے،

ع   اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

(۲)

برادرم   سلمکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، آپ کے خطوط ملے، جواب میں تاخیر ہوئی کہ قلب مضطرب متعدد ہمہ گیر فیصلوں میں مصروف تھا، جن میں سے بحمد اللہ ایک فیصلہ کر لیا گیا، یعنی یہ کہ بھوپال سے رخصت ہونے کا فیصلہ کر لیا، اور ۲۰ فروری کو ۲ ماہ کی بلا تنخواہ رخصت کا کاغذ حکومت میں بھیجدیا، یہ تمہید ہے استعفٰی کی، یہ طریقہ اس لیے اختیار کیا کہ یہاں لوگ میرے قیام کیلئے بیحد مصر ہیں، اور حق یہ ہے کہ بھوپال نے اعلیٰ سے لیکر ادنیٰ تک میرے استحقاق سے زیادہ میری قدردانی کی،

اب میری ذاتی خانگی الجھنیں ہیں، ایک کا تقاضا یہ ہے کہ ہم لوگ بالفعل سید حسن صاحب کے پاس رہیں، اور دوسرے کا تقاضا یہ ہے کہ عاصم میاں کے پاس جائیں، دونوں مدد کے محتاج ہیں، مگر دوسری جگہ جانا آسان نہیں، اور نہ ان کا آنا ہی آسان ہے، اس لیے دل پریشان ہے

دارالمصنفین کے متعلق اگرچہ مولوی مسعود علی صاحب حسن ظن رکھتے ہیں لیکن مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ عنقریب حیدرآباد و بھوپال کی امدادیں بند ہوجائیں گی اور تجارت پر جو بندشیں ہیں، ان سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہوگا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دارالمصنفین کے ماہانہ مصارف میں غیر معمولی اضافہ چل نہیں سکتا، خدا کرے میرے یہ اوہام غلط ہوں اسی لیے میں بار بار آپ کے ہاں سے خریداروں کی تعداد اور میزان منگواتا ہوں،

آپ نے اپنے کلکتہ نجانے کا جو عزم ظاہر کیا، اس سے دل بہت خوش ہوا حقیقت یہ ہے کہ اس عمر میں جب قوی مضمحل ہو رہے ہوں خلف رشید کی طلب بہت بڑھ جاتی ہے اور اور اب وہ کیفیت سمجھ میں آتی ہے جو مولانا شبلی مرحوم اور مولانا حمید الدین مرحوم کی دیکھی تھی کہ بعد کے کام کے لیے صحیح جانشین کا تصور ان پر بہت غالب تھا، اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کے اس ایثار کو قبول فرمائے اور آپ کی قناعت میں بیش از بیش برکت عنایت فرمائے، اگر کہیں اور بھی میں چلا گیا تو بھی آپ ہی کی مدد پیش نظر رہے گی،

آجکل مولوی سعید انصاری صاحب خط وکتابت کر رہے ہیں، دارالمصنفین میں بھی رہنے کو تیار ہیں، مگر دارالمصنفین بھی لینے کو تیار ہے یا نہیں، یہ الگ بات ہے، حروف مقطعات پر کسی عراقی نے ایک لغو سی کتاب لکھی ہے، جس کا ترجمہ پاکستانی نوائے وقت میں چھپا تھا، اسکا جواب لکھ کر چھپوایا ہے، جواب اچھا ہے، اس میں ابتداءً مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین رحمہما اللہ تعالیٰ کا اور آخراً سید سلیمان اور مولوی عبد السلام صاحب کا ذکر ہے، اور اپنے نام کے ساتھ سابق رفیق دارالمصنفین لکھا ہے،

میں نے ۱۰ تاریخ سے رخصت طلب کی ہے، امید نہیں کہ ۱۰ تک رخصت کی کارروائی تکمیل پا سکے، اب اس کا انتظار کرنا ہوگا، ریاست بحیثیت ریاست اب باقی نہیں ہے، بلکہ یہ

اُبد

کا نوشتہ ہے کہ ان کا

ہاں آپنے مولوی شبیر احمد صاحب کسی اور

غفر کا صلہ ہے، غفرلہ اللہ چاہیئے،

یحییٰ صاحب سے کہدیجئے کہ دار المصنفین کا کاغذ فروری تک کے لیے دفتر حضور میں بھیجدیا

ہے، روپیہ مارچ میں ملے گا، تقاضا کروں گا، مولوی مسعود علی صاحب اگر ہوں تو یہ خط انھیں بھی

دکھا دیجئے گا، ان کو اور رفقا، کو سلام کہدیجئے، والسلام

سید سلیمان ، ۵ر مارچ ۱۹۵۰ء

(۴۳)

کراچی

عزیز من ادامکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، خط ملا، دل میں ایک دنیا خیالات کی ہے، مگر افسوس ہے کہ دل

[illegible] وقت چند سطروں کی تحریر پر دل آمادہ ہوا ہے، یہ چار ماہ یوں ہی پڑے پڑے [illegible] دفعہ ہوا، مگر صرف اولاد کے مستقبل کا خیال اور بعض قومی و مذہبی آرزوؤں کی تکمیل جلد واپسی سے روک لیتی ہے، میں نے ابھی تک کوئی سرکاری زنجیر اپنے پاؤں میں نہیں ڈالی ہے، بحمد اللہ کہ صبح کی نماز کے بعد ایک گھنٹہ ایک مسجد میں درس قرآن ہوتا ہے سو سوا سو سامعین ہوتے ہیں، جن میں بعض افسران تک بھی ہوتے ہیں، یہی ماحصل زندگی ہے کراچی میں ابتک تین قسم کے لوگ آئے ہیں، یا فقراے پناہ گیر، یا متلاشی روزگار نو تعلیم یافتہ [illegible] وار تجار، مگر خالص اہل علم اور علما، بہت کم آئے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مستقبل میں اگر اسکی [illegible] تو لادینی فضا پیدا ہونا لابد ہے، بحمد اللہ کہ دین کی طلب سب میں موجود ہے، متعدد [illegible] میں قرآن اور سلسلۂ مواعظ ہے، عربی کی ایک بڑی درسگاہ اشرف آباد بہ نسبت [illegible] اشرف علی صاحب ٹنڈو الہ یار ضلع حیدرآباد سندھ میں دار العلوم الاسلامیہ کے [illegible] قائم کی گئی ہے، دیوبند اور مظاہر العلوم کے علماے افاضل مدرس ہیں، ابھی طلبہ کی تعداد پچاس ہے،

یہاں مسلمان اپنا سارا اثاثہ مادی و ذہنی ہندوستان میں چھوڑ کر آئے ہیں، کتب خانے مدرسے اور ادارے ہندوستان میں ہیں، ضرورت ہے کہ یہاں بھی دیوبند، ندوہ، دار المصنفین مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ قائم ہو، ابھی سب افکار اور خاکے ہیں، امکانات بے انتہا ہیں، مگر مشکلات بھی ہیں،

آپ حضرات اپنی جگہ جمے رہیے اور اب دار المصنفین کو بجاے ایک کے دو کی یادگار سمجھیے نیا نظام قائم کیجئے، حالات اگر وہاں ناسازگار ہوں گے تو پھر موقع ہے،

میری شیر کے غار میں مولانا شروانی اور بہت سے اکابر کے خطوط ہیں، ان کو جمع اور محفوظ کیجئے،

انڈین یونین کا ایک چھوٹا سا صوبہ ہے چیف کمشنر یہاں کا مالک ہے، وہ جو چاہے حکم دے اور جو چاہے کرے، ایک ڈکٹیٹر کی شان سے اس کی حکومت ہے، میں نہیں جانتا کہ ہندوستان کے اور صوبوں کا کیا حال ہے، مگر ع قیاس کن ز گلستانِ من بہار مرا،

یہاں کتابیں کچھ جمع ہوگئی تھیں، کچھ خطوط و کاغذات تھے، کل ان کو پیک کرا دیا ہے، انکو دار المصنفین بھیجنا چاہتا ہوں، باقی کپڑے، بستر، برتن وغیرہ ہیں، انکو ساتھ ہی لانا ہوگا،

دو چار روز سے صحت اچھی نہیں، معدہ ٹھیک نہیں، دست آجاتے ہیں، کل بھی یہی ہوا تھا، آج بھی یہی ہے، حالانکہ کھانا صرف دو وقت کر دیا ہے، صبح اور شام، پھر بھی رات کا کھانا ہضم نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ رحم فرمائیں، آپ لوگ بھی دعا کریں،

ابو الجلال صاحب کی کتاب کی گم شدگی کا جو واقعہ پیش آیا وہ نیا نہیں، وہ تو انکی قسمت کا نوشتہ ہے کہ ان کا نوشتہ باقی نہ رہے، یمحوا اللہ ما یشاء و یثبت وعندہٗ ام الکتاب، ہاں آپنے مولوی شبیر احمد صاحب کی وفات پر غفر لہ اللہ لکھا ہے، یہ غلطی آپ سے کیسے ہوئی، غفر کا صلہ ل ہے، غفر لہ اللہ چاہئے،

یحییٰ صاحب سے کہدیجئے کہ دار المصنفین کا کاغذ فروری تک کے لیے دفتر حضور میں بھیجدیا ہے، روپیہ مارچ میں ملے گا، تقاضا کروں گا، مولوی مسعود علی صاحب اگر ہوں تو یہ خط انھیں بھی دکھا دیجئے گا، ان کو اور رفقاء کو سلام کہدیجئے، والسلام

سید سلیمان ، ۵ مارچ ۱۹۵۰ء

(۳)

کراچی

عزیز من ادام کم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، خط ملا، دل میں ایک دنیا خیالات کی ہے، مگر افسوس ہے کہ دل

ایسا بیٹھا ہوا ہے کہ زبردستی چند سطروں کی تحریر پر دل آمادہ ہوا ہے، یہ چار ماہ یوں ہی پڑے پڑے
گذر گئے، واپسی کا ارادہ کئی دفعہ ہوا، مگر صرف اولاد کے مستقبل کا خیال اور بعض قومی و مذہبی
آرزوؤں کی تکمیل جلد واپسی سے روک لیتی ہے، میں نے ابھی تک کوئی سرکاری زنجیر اپنے پاؤں
میں نہیں ڈالی ہے، بحمداللہ کہ صبح کی نماز کے بعد ایک گھنٹہ ایک مسجد میں درس قرآن ہوتا ہے
سو سوا سو سامعین ہوتے ہیں، جن میں بعض افسران تک بھی ہوتے ہیں، یہی ماحصل زندگی ہے،
کراچی میں اب تک تین قسم کے لوگ آئے ہیں، یا فقرائے پناہ گیر، یا متلاشی روزگار، نو تعلیم یافتہ
یا سرمایہ دار تجار، مگر خالص اہل علم اور علماء بہت کم آئے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مستقبل میں اگر اسکی
تلافی نہ ہوئی تو لادینی فضا پیدا ہونا لابد ہے، بحمداللہ کہ دین کی طلب سب میں موجود ہے، متعدد
مرکزی مساجد میں درس قرآن اور سلسلۂ مواعظ ہے، عربی کی ایک بڑی درسگاہ اشرف آباد بہ نسبت
حضرت مولانا اشرف علی صاحب "ٹنڈو الہ یار" ضلع حیدرآباد سندھ میں دارالعلوم الاسلامیہ کے
نام سے قائم کی گئی ہے، دیوبند اور مظاہرالعلوم کے علمائے افاضل مدرس ہیں، ابھی طلبہ کی
تعداد پچاس ہے،

یہاں مسلمان اپنا سارا اثاثۂ دماغی و ذہنی ہندوستان میں چھوڑ کر آئے ہیں، کتب خانے
مدرسے اور ادارے ہندوستان ہی میں ہیں، ضرورت ہے کہ یہاں بھی دیوبند، ندوہ، دارالمصنفین
مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ قائم ہو، ابھی سب افکار اور خاکے ہیں، امکانات بے انتہا ہیں،
مگر مشکلات بھی ہیں،

آپ حضرات اپنی جگہ جمے رہئے اور اب دارالمصنفین کو بجائے ایک کے دو کی یادگار سمجھیے
نیا نظام قائم کیجئے، حالات اگر وہاں ناسازگار ہوں گے تو پھر موقع ہے،
میری شیر کے خانہ میں مولانا شروانی اور بہت سے اکابر کے خطوط ہیں، ان کو جمع اور محفوظ کیجئے،

شروانی صاحب کے خطوط کو نکلوا کر یکجا کرکے اگر مرتب کیا جاسکتا تو معلومات اور انشا پردازی کا اچھا خاصہ مجموعہ ہوتا،

آپ سے ایک فرمایش کو جی چاہتا ہے جس طرح میں نے اور مولوی عبد السلام صاحب نے حضرۃ الاستاذ کی ایک ایک تحریر کو زندہ کیا، آپ صاحبان میرے مضامین و مقالات کو بہ ترتیب جمع کرتے کہ اب میری زندگی ان ہی اوراق سے عبارت ہے، ۲ صفر کو میری عمر قمری حساب سے انہتر ۶۹ سال کی ہوگئی، رہے نام اللہ کا،

الگ خط مولوی مسعود صاحب کو لکھوں گا مضمون کی رسید لکھئے، اتبک عاصم میاں کا پتہ نہیں،

ہاں معارف میں منکرین حدیث کی رد میں جس قدر مضامین آپ کے اور میرے نکلے ہیں انکو جمع کریں، اسی طرح تاریخ حدیث اور تاریخ صحاح پر معارف و الندوہ میں جو کچھ نکلا ہے، اس کو ایک کتاب میں جمع کیجئے، عبد الباری صاحب اگر میرے مضامین معارف کی ایک فہرست بنادیں تو بڑی مہربانی،

والسلام

سید سلیمان، ۱۴ ر نومبر ۱۹۵۵ء

(۴)

برادرم ۔ وفقکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، خطوط ملے، الحمد للہ تعالیٰ خیریت ہے، دو تین روز ہوئے کہ عاصم میاں مع سامان و عیال بخیریت پہنچے، ان کا یہ سفر کافی طویل اور پیچیدہ تھا، مگر بحمد اللہ تعالیٰ کہ اس ہفتخوان کو وہ بخیریت طے کر آئے،

دار المصنفین کی ہستی کو صرف میری ذات سے متعلق نہ سمجھیں، ہر انسان فانی ہے، اس لیے اس کی نسبت فانی ہے، انشاء اللہ تعالیٰ آپ عزیزوں کی محنت سے اس کو بقا نصیب ہو،

آپ کی انشاء ماشاء اللہ بہت ترقی کر رہی ہے خصوصیت کے ساتھ شروانی صاحب کی وفات پر جو شذرات آپ نے لکھے ہیں، بہت بلند و پر زور ہیں، اللہ تعالیٰ مزید زور و بلندی عنایت فرمائیں۔ شروانی نمبر کی مجوزہ ترتیب مناسب ہے،

آپ کے اس یقین دلانے سے کہ آپ دارالمصنفین کی خدمت اسی طرح کرتے رہیں گے بڑی خوشی ہوئی، یہی امید عزیزی صباح الدین سلمہ سے ہے۔ اگر حالات کا نقشہ کچھ پلٹے تو اس کے مطابق عزائم میں تبدیلی ہو سکتی ہے،

دارالمصنفین کی نئی تنظیم کی ضرورت ہے، اور اس کے بغیر اس کی زندگی محال ہے، دارالمصنفین ایک چسٹرڈ باڈی ہے، اس کی تشکیل قانونی ضروری ہے، ضرورت ہے کہ نئے صدر کا انتخاب کیا جائے اور نظامت میں مناسب تبدیلی ہو،

آپ نے میرے کاموں کی تکمیل کا جو ارادہ ظاہر کیا ہے اس سے بڑی تسکین ہوئی، یہاں متعدد ادارے میری اعانت و تعاون کے طالب ہیں، دیکھیے کیا ہو،

میں تو یہاں جیسا آپ جانتے ہیں، چند کپڑے لیکر عارضی پرمٹ پر آیا تھا، مگر مدت اتفاً بڑھتی گئی، باوجود دوستوں کے اس علانیہ مشورہ کے کہ میری اب ضرورت وہاں نہیں، وہاں سے قطع تعلق کا خیال نہ تھا، مگر حالات بدلتے گئے اور نئی صورتیں پیش آئیں، یہ ساتواں مہینہ گذر رہا ہے کہ کوئی ذریعۂ آمدنی اختیار نہیں کیا،

یہاں ایک بڑا دارالعلوم ہے تصنیفی و تبلیغی شعبوں کا قیام ہو چکا ہے، اور اس کے لیے میری صدارت کی تحریک ہے، یہ ادارہ حیدرآباد سندھ کے ضلع میں ٹنڈو (یعنی قصبہ) اللہ یار میں قائم ہو رہا ہے، اس کو سرکار سے کوئی تعلق نہیں ہے، شرفا کا اچھا خاصہ قصبہ ہے، ۵۴ ایکڑ زمین اسکے لیے وقف کی گئی ہے، ابھی چند عارضی کمرے بن گئے ہیں، متعدد اکابر اساتذہ اس سے اب تک منسلک ہو چکے ہیں،

مولوی عبد السلام صاحب کی امام رازی کا اشتہار تو دیکھا مگر اب تک دیدار سے محروم ہوں موصوف کو سلام کہد یجئے،

میری میز پر دفتی میں سیرۃ نبوی حصہ ہفتم کے صاف شدہ مسودہ کے اوراق ہیں، مہربانی کر کے مطلع کیجئے کہ میری یہ یاد صحیح ہے یا نہیں، تقریباً سوا سو صفحے ہوں گے، ذرا اطمینان ہو تو اس کی تکمیل کی جائے۔ اسی طرح میز پر سادہ کاغذوں کی ایک بڑی مجلد کاپی ہے، جس کے شروع میں قرآن پاک کی آیتوں کے حوالے احکام القرآن کے سلسلہ میں ہیں، ڈھونڈھ کر مطلع کیجئے،

مولوی مسعود علی صاحب کی خدمت میں سلام کہد یجئے گا،

والسلام سید سلیمان ۶ر دسمبر ۱۹۵۰ء

(۵)

مورخہ ۴ر مارچ ۱۹۵۱ء

برادر عزیز توفیق الٰہی رفیق حیاتش باد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ کے کئی خط ملے جو آپ کے تعلق خاطر اور محبت قلبی کے شاہد عدل ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو دین وملت کے خدمات کی مزید توفیق عنایت فرمائیں، میں نے جواب میں خاموشی اختیار کی کہ میں نے اپنی کشتی منجدھار میں توکلاً علی اللہ چھوڑ دی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بندۂ محتاج کے ساتھ جو معاملہ بھی فرمائیں گے وہ اس کی عین عنایت اور عین مصلحت وحکمت ہوگی، دار المصنفین میں آپ لوگوں نے جو طے کیا، میں اس پر راضی ہوں، اور درگاہ الٰہی میں داعی ہوں کہ اس کو دار المصنفین کے حق میں مفید ونافع فرمائے،

سپردم بتو مایۂ خویش را تو دانی حساب کم و بیش را

معارف میں آپ اپنے جدید نظام کا ذکر جس طرح چاہیں کریں، آپ کے ہونے کو میں اپنا ہی

ہونا سمجھتا ہوں، اور مجھے آپ کی قائم مقامی سے ویسی ہی خوشی اور طمانیت ہے جو کسی روحانی اور جسمانی خلف الصدق کی جانشینی سے ہو سکتی ہے، خدا کا شکر ہے کہ میں نے اپنی زندگی ہی میں اپنی موت کے بعد کے دار المصنفین کا نقشہ دیکھ لیا،

اب آپ جہاں تک ہو سکے دین و ملت کی خدمت سمجھ کر اس کام کو انجام دیں، اور ساتھ ہی اپنے رفقائے کار کی تیاری میں مصروف رہیں، تاکہ ایک چراغ سے دوسرا چراغ یوں ہی جلتا رہے، اور استاد مرحوم کا سلسلہ قائم رہے، معارف میں آپکے شذرات پڑھے، بحمد اللہ آپ نے شذرات کے معیار کو قائم رکھا، "س" اور "م" [1] میں شاید ہی کسی کو فرق محسوس ہو، وللہ الحمد،

میں نے یہاں کے اپنے حالات ابھی تک کچھ نہیں لکھے، انشاء اللہ کچھ دنوں کے بعد لکھوں گا، بالفعل تو معطلانہ اور متوکلانہ زندگی بسر ہو رہی ہے، گورنمنٹ نے پنجاب یونیورسٹی کمیشن اور لا کمیشن میں ممبر مقرر کیا ہے، اسی سلسلہ میں آج لاہور جا رہا ہوں، ۳۱ کو واپس آؤں گا، یہاں یکم کو تاریخ اسلام کانفرنس ہوگی جس کی صدارت کے لیے مجھ سے خواہش کی گئی ہے،

آپ اپنے رفیق عزیزی صباح الدین سلمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ رفاقت کا پورا حق ادا کیجئے، اور ان کی دلدہی اور دلنوازی اور انکی ضروریات پر پوری رعایت کے ساتھ نظر رکھیں، اور ان کے ساتھ ایسا برتاؤ رکھیں کہ ان کو دار المصنفین سے وحشت نہ ہو،

یہ میں نے صرف اپنی طرف سے ناصحانہ پیش بینی کے طور پر لکھا ہے، ورنہ مجھے معلوم ہے کہ آپ اس میں سے ہر بات کا خود ہی اپنی شرافت اور رفاقت پسندی سے لحاظ رکھتے ہیں، اور اسکا خود انھیں بھی اقرار ہوگا،

والسلام

سید سلیمان

---

[1] معارف یعنی سلیمان اور معین الدین

(۶)

کراچی

عزیز مکرم رفع اللہ تعالیٰ احوالکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ الحمد للہ مع الخیر ہوں، فروری کا پورا مہینہ احتفال علماء الاسلام کی مشغولیتوں میں گذر گیا، بحمد اللہ ۲۰ ملکوں کے مسلمان علماء نے جو عراق سے لیکر الجزائر تک سے آئے تھے، جن میں ایران و نجف کے علماء بھی تھے، بہت سے مفید کام انجام دئے، کام سے الگ میں تو علماء کے اس اجتماع کو تاریخ کا بڑا کارنامہ سمجھتا ہوں، تجاویز جن میں مختلف اسلامی فرقوں کے درمیان ارتباط اور جائز رواداری کی بھی تجویز تھی، باتفاق آرا منظور ہوئیں، نجف کے مجتہد مشہور آل کاشف الغطاء اور مفتی اعظم فلسطین نے مل کر اسلامی فرقون کے درمیان خوشگوار فضا کے پیدا کرنے میں بڑی مدد دی، جامع ازہر کا وفد بھی آنے والا تھا، مگر عین وقت پر شیخ ازہر کی تبدیلی سے وفد روانہ نہ ہو سکا،

آپ نے سنا ہوگا کہ مجمع فواد الاول مصر نے مجھے اپنا رکن منتخب کیا ہے، یہ مصر کی سب سے بڑی علمی عزت ہے، سفیر مصر جو ابھی واپس آئے ہیں، انھوں نے یہ اطلاع دی ہے، ابھی میرے پاس مصر سے سرکاری اطلاع نہیں آئی ہے،

بغداد میں عراق گورنمنٹ کی طرف سے ابن سینا کی ہزار سالہ یاد منائی جارہی ہے، عراق گورنمنٹ نے مجھے اس میں شرکت کی عزت دی ہے، مارچ کے آخر میں ہے، اگر پاکستان گورنمنٹ کی طرف سے اخراجات کی منظوری ہوئی تو جانے کا قصد ہے، ہوائی جہاز سے ۵ گھنٹوں کی راہ ہے، پانی کے جہاز سے ایک ہفتہ لگ جاتا ہے،

فروری کے معارف کی لکھائی چھپائی ماشاء اللہ اچھی ہے کس نے لکھا ہے، قادر خاں کی شان

معلوم ہوتی ہے۔ آپ کا مقالہ اردو والا اچھا ہے، مگر وہاں سوال دلیلوں کا نہیں ہے، بلکہ فیصلہ ہو چکا ہے، دیکھئے علاقائی زبان مانے جانے کی تحریک کہاں تک کامیاب ہوتی ہے۔

دیسل کے معلومات سے شکریہ۔ آپ نے سمعانی سے علماے دیسل کی نقل نہیں بھیجی، وہ بھی بھیجئے، مارچ کا مہینہ بھی میرا بہت مصروف ہے، ۷ سے ۲۰ تک شاید لاہور میں مختلف علمی و تعلیمی اداروں میں شرکت ہوگی۔ اسی میں پنجاب یونیورسٹی میں قصص القرآن کے موضوع پر ایک مقالہ پڑھوں گا، انشاء اللہ تعالیٰ پھر بھاولپور کی جامعہ عباسیہ کے نصاب کا کام کرنا ہے۔ مولوی ناظم صاحب ندوی وہاں کے شیخ الجامعہ ہوگئے ہیں، چارسو تنخواہ ملی ہے، وسط ماہ میں ملتان میں ایک عربی مدرسہ کا جلسہ ہے اس میں شرکت ہوگی۔

معلوم نہیں اعظم گڈھ میں اسمبلی اور کونسل کے ممبر کون کون ہوئے، پڑھا تھا کہ وہاں ناستری اور فرید احمد انصاری کا مقابلہ ہے، اور مئو سے وہاں کے مولوی عبداللطیف صاحب کو کانگرس نے چنا ہے، مولوی حبیب الرحمن صاحب کا خط آیا ہے، بڑی محبت والے آدمی ہیں۔

مدینہ اخبار میں میرے متعلق جو گہرافشانی ہو رہی ہے آپ کی نظر سے بھی گذری ہوگی، جس چیز سے میرا تعلق نہیں، اس میں مجھے شریک کرنا کہاں تک انصاف ہے۔

آپ کے پاس مصر کا ایک طبلق بھیجتا ہوں، یہ بھی عجائبات ڈاک میں سے ہے، پتہ دارالمصنفین اعظم گڈھ ہے، مگر مجھے یہ سیدھا کراچی میں ملتا ہے۔ والسلام

سید سلیمان، یکم مارچ ۱۹۵۲ء

(۶)

کراچی ۵

برادر عزیز وفقکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، آپ کا کارڈ مورخہ ۸ رجون ملا، یہاں بھی چند روز شدید گرمی رہی،

اس لو کی کیفیت تھی، ۱۰۸ ڈگری پارہ تھا، بحمد اللہ کل دوپہر اور رات کو بارش ہو کر ٹھنڈک
ہی، یہاں بھی مقامی تخمی آم چل رہے ہیں، مگر وہ آپ کے ملک کی نفاست یہاں کہاں
بعض اضلاع سندھ میں کوشش ہو رہی ہے کہ ملیح آباد اور لکھنؤ کی قلمیں لگا کر کامیابی حاصل
ا جائے، اس کے لیے ابھی چند سال درکار ہیں، مسلمان جہاں جائیگا اپنا تمدن پیدا کرے گا،
خطوط کی اشاعت میں اس کا خیال رہے کہ اس میں راز کی بات نہ ہو، خصوصاً زندہ لوگوں
خطا نہ چھاپے جائیں، شروانی صاحب کے خطوط چھاپئے،
یہاں دونوں بچیوں کی نسبت کے پیغام چل رہے ہیں، گفتگوئیں جاری ہیں، جہیز کے
ن کیے جا رہے ہیں، اس لیے اگر جلد ہی انجام دینے کی کوشش کامیاب ہوئی تو
سفر مشکل ہے، آپ اپنا کوئی پروگرام معطل نہ کریں،
فہرست ابن ندیم پہنچ گئی، آجکل پروفیسر ہٹی امریکی تاریخ عرب کے مصنف یہاں آئے
ایک پارٹی میں ملاقات ہوئی، کہنے لگے آپ کا نام میں نے پڑھا ہے، اب پھر ۲۸ کو انکے
سفارت خانہ نے ان کے ڈنر میں بلایا ہے، والسلام

سید سلیمان ۲۳ جون ۱۹۵۳ء

مکاتیب شبلی حصہ اول و دوم

مولانا مرحوم کے دوستوں، عزیزوں، شاگردوں کے نام خطوط کا مجموعہ، جس میں مولانا کے
خیالات اور علمی، تعلیمی اور ادبی نکات ہیں، اور حقیقت میں مسلمانوں کی تیس برس
تاریخ ہے، قیمت: جلد اول ۱۲/، دوم ۱۲/

منیجر

مطبوعات جدیدہ

تجدید معاشیات۔ از جناب مولانا عبدالباری صاحب ندوی تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۰۵ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت صہ، پتہ: مکتبہ تجدید دین شبستان قدم رسول، ہارڈنگ روڈ، لاہور:

پیٹ اور روٹی اور اس کا وسیلہ مال انسان کی بنیادی ضروریات میں ہے۔ مگر اسی حد تک جس حد تک بقائے حیات کے لیے ضروری ہے، اس سے زیادہ جہاں حرص بڑھی۔ اس کی کوئی حد نہیں رہ جاتی اور جائز و ناجائز حلال و حرام کی تمیز بالکل اٹھ جاتی ہے، اور انسان حرص و ہوا کا مبتلا اور مال جو خیر ہے، ہر قسم کے مفاسد کا ذریعہ بن جاتا ہے، اس لیے تمام مذاہب اور مصلحین اخلاق نے اس کی حرص سے روکا ہے، مگر موجودہ تمدن کی بنیاد تمامتر مادی ہے، اور اس کا نصب العین ہی دنیوی عیش و تنعم ہے، اس لیے اس میں سب سے زیادہ اہمیت معاشیات یعنی مال و دولت کو حاصل ہو جتنی کہ سب سے بھی اس کے تابع ہو گئی ہے، اور آج دنیا کی قوموں میں جو کشمکش اور مسابقت برپا ہے، وہ صرف اس لیے کہ ہر قوم اپنے لیے زیادہ سے زیادہ سامان تنعم فراہم کرنا چاہتی ہے جس کے نتائج سب کی نگاہ کے سامنے ہیں، اس میں اسلام کا نقطۂ نظر نہایت حکیمانہ اور معتدل ہے، اس نے مال و دولت یا معاشیات کی واجبی اہمیت کو قائم رکھا ہے، مگر اس کے حصول کے ذرائع اور اس کے مصرف پر اتنی قیدیں لگا دی ہیں، جن سے اس کی ساری خرابیاں دور ہو جاتی ہیں اور وہ شر کے بجائے خیر بنجاتا ہے حضرت مولانا اشرف علی کی نگاہ بڑی ہمہ گیر تھی، انھوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں مال و دولت کے متعلق بھی جابجا

خیالات ظاہر کیے ہیں اور انکی اصلی حیثیت واضح کی ہے، ان کے خلیفۂ ارشد مولانا عبد الباری صاحب نے جو انکی دینی تجدیدات کے مختلف پہلوؤں پر کئی کتابیں لکھ چکے ہیں، اب انکی معاشیات کی تجدید پر یہ کتاب لکھی ہے، اس میں انسان کے مقصد حیات، مال و دولت کی حیثیت، اس کے کسب اور صرف کے متعلق حضرت مولانا کے خیالات کو اپنی تمہید و تشریح کے ساتھ اس بسط و شرح اور جزوی تفصیل کے ساتھ مرتب طریقہ سے پیش کیا ہے کہ اس کا کوئی پہلو چھوٹنے نہیں پایا ہے، اس کی جامعیت کا اندازہ کتاب کے مطالعہ ہی سے ہوسکتا ہے، فقہ کی کتابوں میں مالی و معاشی مسائل پر مستقل ابواب اور اس کے بعض پہلوؤں پر مستقل کتابیں موجود ہیں، تجدید معاشیات اس قسم کی فقہی کتاب نہیں ہے جس میں معاشیات کے مسائل اور اس کے نظام پر بحث کی گئی ہو، اس کا نقطۂ نظر زیادہ تر اخلاقی اور زاہدانہ ہے اور معاشیات کے فقہی مسائل کے بجائے انسان کے مقصد حیات اور مال و دولت کے متعلق اسلام کی اصلی اسپرٹ کو واضح کیا گیا ہے، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی نظر بڑی حکیمانہ تھی اور ایسے گوشوں پر پہنچتی تھی جد عام لوگوں کا ذہن مشکل سے منتقل ہوسکتا ہے، اس لیے اس کتاب میں دینی حیثیت کے علاوہ معاشیات کے متعلق خالص دنیاوی اور تجربی حیثیت سے بھی بڑی حکیمانہ باتیں ہیں، فاضل مؤلف کی تشریحات اور تعلیقات نے اس کو اور زیادہ مفید و موثر بنادیا ہے، وہ جدید معاشیات سے بھی واقف ہیں، اس لیے جابجا اس سے بھی بحث کی ہے، جو لوگ معاشیات کو خالص مادی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور اسی حیثیت سے اس کا حل چاہتے ہیں، ان کو تو شاید اس کتاب کے مباحث سے تشفی نہ ہو، لیکن جن کا ذوق دینی و اخلاقی ہی، انکی تسکین و تسلی کے لیے یہ کتاب کافی اور ان کے معاشی امراض کے لیے شافی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اگر ہوا و ہوس کو چھوڑ کر مال و دولت کے متعلق صحیح نقطۂ نظر پیدا ہوجائے تو بہت سے معاشی مشکلات کا خود بخود خاتمہ ہوجائے،

چند دن حجاز میں۔ از جناب حاجی محمد زبیر صاحب لائبریرین اسسٹنٹ یونیورسٹی لائبریری

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۷ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر

قیمت: للعہ پتہ: فرحت منزل، بدر باغ، علی گڑھ۔

یہ حاجی محمد زبیر صاحب کے سفر حج اور زیارت مدینہ طیبہ کا سفرنامہ ہے، اس میں سفر کی روداد، جذبات و تاثرات، حرمین کے مشاہد کے حالات، حج کے فضائل و فوائد، اس کی تاریخ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین، اور بعض اموی و عباسی خلفا کے حج کے حالات، حج کا طریقہ، اس کے مسائل اور دعائیں وغیرہ سفر حج کے متعلق اور مختلف قسم کے ایسے معلومات لکھے ہیں جنکی ایک حاجی کو ضرورت ہوتی ہے، اسلیے اسکا مطالعہ ہم خرما وہم ثواب ہے۔

مختارات ۔ مرتبہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تقطیع بڑی ضخامت ۱۶۰ صفحات، کاغذ اعلیٰ، خوبصورت ٹائپ میں چھپی ہے، قیمت تحریر نہیں، پتہ: دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے عرصہ ہوا عربی زبان و ادب کے اعلیٰ نمونوں کا ایک انتخاب کیا تھا، اس میں ابتدا سے لیکر اس وقت تک کے عربی طرز تحریر کے نمونے تھے، اس انتخاب میں اس کا بھی لحاظ رکھا تھا کہ عربی نثر کے اسالیب کے ساتھ اس کے مذہبی، تاریخی اور تہذیبی عنصر بھی سامنے آجائیں، عربی زبان میں فاضل مرتب کی مہارت و بصیرت مسلم ہے، اسلیے یہ مجموعہ عربی ادب کا گویا عطر ہے، اس کا پہلا اڈیشن عرصہ ہوا لکھنؤ میں معمولی چھپا تھا، اب دوسرا اڈیشن مصر میں نہایت خوبصورت ٹائپ میں چھپا ہے، اس اڈیشن میں مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاوی استاد ادب دارالعلوم ندوۃ العلماء نے مشکل لغات اور اسماء و اعلام وغیرہ تشریح طلب امور کی ضروری شرح بھی کردی ہے، جس سے پڑھنے والوں کے لیے بھی سہولت پیدا ہوگئی ہے، اور اس کتاب کا افادہ بھی بڑھ گیا ہے، یہ مجموعہ اس قابل ہے کہ عربی مدارس کے نصاب میں شامل کیا جائے۔

فہرست مطبوعات کتبخانہ ادارہ ادبیات اردو، جلد اول } مرتبہ مولوی غلام رسول صاحب و مولوی محمد اکبر الدین صاحب ایم اے

تقطیع بڑی، کاغذ، کتابت وطباعت معمولی، قیمت ے ، پتہ: ادارۂ ادبیات اردو، خیر

حیدرآباد دکن،

اردو زبان کے متعلق ادارۂ ادبیات اردو کی خدمات محتاج تعارف نہیں، ا

یہ بھی ہے کہ اس نے ایک قلیل مدت میں ایک وسیع کتب خانہ فراہم کرلیا ہے جس میں

خاص طور سے اردو کی بارہ ہزار سے زیادہ کتابیں ہیں، ان مطبوعات کے علاوہ اردو کے

ہیں مطبوعہ کتابوں میں بھی بہت سی اتنی قدیم ہیں کہ اب نادر و نایاب کی حیثیت رکھتی ہیں، ا

کی فہرست کئی سال ہوئے شائع ہوچکی ہے، اب مطبوعہ کتابوں کی فہرست کی پہلی جلد مرتب کر

اس میں چار ہزار کتابوں اور ایک ہزار اخبارات و رسائل کی فہرست ہے، ان میں

ونایاب ہیں، اردو پر کام کرنے والوں کے لیے یہ فہرست بڑی مفید اور کارآمد ہے،

وجدانِ حافظ۔ مترجمہ جناب منور لکھنوی تقطیع اوسط ضخامت ۱۲۰ صفحات، کا

وطباعت بہتر قیمت مجلد عہ پتہ: کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، دہلی،

شیاما چرن داس صاحب سریواستو دہلی کی پرانی یادگاروں میں ہیں، انکو تصوف ا

ذوق ہے اور عملاً بھی انکی زندگی صوفیانہ اور درویشانہ ہے، اسلیے انکو خواجہ حافظ کے کلام سے

چنانچہ انھوں نے اسکا ایک انتخاب عرفانِ حافظ کے نام سے مرتب کیا تھا، وجدانِ حافظ ا

کسی زبان کی نظم کا دوسری زبان کی نظم میں ترجمہ کرنا یوں بھی مشکل کام ہے، خصوصاً حافظ کے جیسے

لطافت کلام کا ترجمہ اور بھی دشوار ہے، لیکن لائق مترجم کی مہارت معروف و مسلّم ہے، اسلیے انھو

حد تک اصل کی خوبی و لطافت کو قائم رکھنے کی پوری کوشش کی ہے، اور بعض اشعار کے ترجمے تو

نہیں معلوم ہوتے، کتاب کے ایک صفحہ میں اصل فارسی کا شعر ہے اور اسکے بالمقابل دوسرے صفحہ میں

جن لوگوں کو حافظ کے کلام سے ذوق ہے ان کو اس شراب دو آتشہ سے لطف اندوز ہونا چاہ

تقطیع بڑی، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، قیمت سے، پتہ: ادارۂ ادبیات اردو، خیریت

حیدرآباد دکن،

اردو زبان کے متعلق ادارۂ ادبیات اردو کی خدمات محتاج تعارف نہیں، اس کا

یہ بھی ہے کہ اس نے ایک قلیل مدت میں ایک وسیع کتب خانہ فراہم کر لیا ہے جس میں عربی

خاص طور سے اردو کی بارہ ہزار سے زیادہ کتابیں ہیں، ان مطبوعات کے علاوہ اردو کے بہ

ہیں مطبوعہ کتابوں میں بھی بہت سی اتنی قدیم ہیں کہ اب نادر و نایاب کی حیثیت رکھتی ہیں، اردو

کی فہرست کئی سال ہوئے شائع ہو چکی ہے، اب مطبوعہ کتابوں کی فہرست کی پہلی جلد مرتب کرکے ش

اس میں چار ہزار کتابوں اور ایک ہزار اخبارات و رسائل کی فہرست ہے، ان میں سے بہ

و نایاب ہیں، اردو پر کام کرنے والوں کے لیے یہ فہرست بڑی مفید اور کارآمد ہے،

وجدانِ حافظ۔ مترجمہ جناب منور لکھنوی، تقطیع، درمیانی ضخامت ۲۰۰ صفحات، کاغذ،

وطباعت بہتر قیمت مجلد عہ پتہ: کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، دہلی،

نشیا ما چرن داس صاحب منور استوا دہلی کی پرانی یادگاروں میں ہیں، انکو تصوف اور ا

ذوق ہے اور عملاً بھی انکی زندگی صوفیانہ اور درویشانہ ہے، اسیلیے انکو خواجہ حافظ کے کلام سے بھی

چنانچہ انھوں نے اسکا ایک انتخاب عرفانِ حافظ کے نام سے مرتب کیا تھا۔ وجدانِ حافظ اسی کا

کسی زبان کی نظم کا دوسری زبان کی نظم میں ترجمہ کرنا یوں بھی مشکل کام ہے، خصوصاً حافظ کے جیسے سرا

لطافت کلام کا ترجمہ اور بھی دشوار ہے، لیکن لائق مترجم کی مہارت معروف و مسلّم ہے، اسیلیے انھوں۔

حد تک اصل کی خوبی و لطافت کو قائم رکھنے کی پوری کوشش کی ہے، اور بعض اشعار کے ترجمے تو ایسے

نہیں معلوم ہوتے، کتاب کے ایک صفحہ میں اصل فارسی کا شعر ہے اور اسکے بالمقابل دوسرے صفحہ میں اسکا

جن لوگوں کو حافظ کے کلام کا ذوق ہے ان کو اس شراب دو آتشہ سے لطف اندوز ہونا چاہیے،

مطبوعات دارالمصنفین

سلسلہ سیرۃ النبی ﷺ

حصہ اول: ولادت سے فتح مکہ تک کے حالات و غزوات — شے/

حصہ دوم: وفات، اخلاق، عادات کا مفصل بیان — ئے/

حصہ سوم: معجزہ کی حقیقت اور قرآن مجید کی روشنی میں بحث — لعہ/

حصہ چہارم: نبوت پر بحث کے بعد عقائد اسلام پر مفصل حکیمانہ بحث — عہ/

حصہ پنجم: فرائض خمسہ پر سیر حاصل بحث — معہ/

حصہ ششم: اسلامی اخلاقی تعلیمات، اسلامی فضائل و آداب کی تفصیل — لعہ/

(سلسلہ سیر الصحابہ)

خلفائے راشدینؓ: خلفائے راشدینؓ کے ذاتی حالات و فضائل — صہ/

مہاجرین جلد اول: حضرات عشرہ مبشرہ اور بقیہ صحابہؓ کے حالات و فضائل — ئے/

مہاجرین جلد دوم: فتح مکہ سے پہلے کے صحابہ کرام کے حالات — ئے/

سیر الانصار اول: انصار کرام کے فضائل و کمالات — ئے/

〃 دوم: بقیہ انصار کرام کے حالات زندگی — ئے/

سیر الصحابہ جلد ششم: حضرت حسینؓ، امیر معاویہؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ کے مفصل حالات — للعہ/

سیر الصحابہ جلد ہفتم: فتح مکہ کے بعد صحابہ کرام کے سوانح حالات — للعہ/

سیر الصحابیات: ازواج مطہرات، بنات طاہرات اور عام صحابیات کے حالات — ئے/

اسوۂ صحابہ اول: صحابہ کرام کے عقائد، عبادات و اخلاق کی تفصیل — للعہ/

〃 دوم: صحابہ کرام کے سیاسی و انتظامی کارناموں کی تفصیل — ئے/

اسوۂ صحابیات: صحابیات کے مذہبی، اخلاقی اور علمی و عملی کارناموں کا مرقع — ئے/

اہل کتاب صحابہؓ و تابعینؒ: یہودی نصرانی صحابہؓ کے حالات — للعہ/

الفاروق: حضرت فاروق اعظمؓ کی لائف اور عراق و شام، مصر اور ایران کی فتح کے تفصیلی حالات — سے/

سیرت عائشہؓ: حضرت عائشہؓ کے حالات زندگی — صہ/

سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ: عمر ثانی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے سوانح حیات اور ان کے مجددانہ کارنامے — ئے/

(سلسلہ تاریخ اسلام)

تاریخ اسلام حصہ اول: (عہد رسالت و خلافت راشدہ) — ہے/

〃 دوم: بنی امیہ دمشق کی صد سالہ تاریخ — سے/

〃 سوم: ابوالعباس سفاح سے متقی باللہ ۱۳۲ھ تا ۳۳۳ھ تک خلافت عباسیہ کی تاریخ — معہ/

〃 چہارم: خلیفہ مستعصم باللہ تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی تاریخ اور عباسیوں کے تمدنی کارناموں کی تفصیل — ہے/

حکمائے اسلام

حصہ اول و دوم

یوں تو اردو میں مشاہیر حکمائے اسلام کے حالات میں الگ الگ متعدد کتابیں موجود ہیں، الغزالی، امام رازی، ابن رشد تو اسی ادارہ کی کتابیں ہیں لیکن کوئی ایسی جامع کتاب نہ تھی جس میں ان سب کے حالات یکجا کر دیے گئے ہوں، یہ کتاب اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے لکھی گئی ہے جس میں ان کے حالات و سوانح کے ساتھ ان کی ہر قسم کی مذہبی، اخلاقی اور فلسفیانہ خدمات کو نمایاں کیا گیا ہے، اس کے دو حصے ہیں پہلے حصہ میں یعقوب کندی، ابو نصر فارابی، محمد بن زکریا رازی، ابن مسکویہ، ابو ریحان بیرونی، امام غزالی، ابو البرکات بغدادی کے حالات اور ان کے فلسفیانہ مسائل کی تشریح ہے، اور دوسرے میں ابن باجہ، ابن طفیل، ابن رشد، امام رازی، مغلوں اور تاتاریوں کے عہد کے حکما، حکمائے متاخرین، خاندان فرنگی محل، خاندان خیرآباد اور مختلف خاندانوں کے حکما، مثلاً ملا نظام الدین، مولانا بحر العلوم، مولانا فضل حق خیرآبادی، ملا محمود جونپوری، ملا محب اللہ بہاری وغیرہ کے حالات اور انکے نظریات و خیالات کی تشریح، اور انھوں نے اپنے علم و فلسفہ سے اسلام کی جو عظیم الشان خدمات انجام دیں، ان کی تفصیل ہے، مولفہ مولانا عبد السلام ندوی مرحوم، قیمت حصہ اول عمر دوم ہے

اقبال کامل

مشہور حکیم و فلسفی شاعر ڈاکٹر اقبال کے مفصل سوانح حیات، ان کے فلسفہ و شاعری پر تبصرہ اور انکی شاعری کے اہم موضوعوں یعنی فلسفہ خودی فلسفہ بیخودی اور نظام اخلاق وغیرہ کی مرتبہ مولانا عبد السلام ندوی مرحوم، قیمت: ہے

(طابع و ناشر صدیق احمد)

جلد [illegible] نمبر ۳ — مارچ سنہ ۱۹۵۶ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپئے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

تاریخ دعوت و عزیمت

یعنی عالم اسلام کی اصلاحی و تجدیدی کوششوں کا تاریخی جائزہ، نامور مصلحین اور ممتاز اصحاب دعوت و عزیمت کا مفصل تعارف، ان کے علمی و عملی کارناموں کی روداد، اور انکے اثرات و نتائج کا تذکرہ، اسمیں پہلے مصنف کے قلم سے پیش لفظ ہے، اسکے بعد مقدمہ جسمیں اصلاح و تجدید کی ضرورت اور تاریخ اسلام میں انکا تسلسل دکھایا گیا ہے، پھر اصل کتاب شروع ہوتی ہے جو مولانا جلال الدین رومی کی اصلاحی و تجدیدی کوششوں کی تفصیل پر جاکر ختم ہوتی ہے، قیمت : ے ر

مرتبہ مولانا ابوالحسن علی ندوی

مآل و مشیت

اس میں حیات انسانی کے دو بنیادی تصورات : مآل و مشیت کی فلسفیانہ تحلیل کی گئی ہے، یہ ۱۹۵۵ء کی بہترین کتاب ہے جس پر اسکے لائق مصنف جناب خواجہ ظفر حسین خاں صاحب کو حکومت ہند کی طرف سے پانچ ہزار کا انعام ملا ہے، یہ تو موضوع کے اعتبار سے خالص فلسفیانہ اور بہت خشک لیکن مصنف کے انشاء پردازانہ اسلوب تحریر نے اسکو بہت دلچسپ اور دلآویز بنا دیا ہے، ان ہی کے قلم سے فرانس کے مشہور انقلابی مفکر روسو کی ایک تالیف کا ترجمہ اسی اسلوب و طرز انشا میں ادارہ کی طرف سے اس سے پہلے شائع ہو چکا ہے،

قیمت عہ ر

جلد ۷۹ ماہ شعبان المعظم ۱۳۷۶ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۵۷ء نمبر ۳

فہرست مضامین

شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۱۹۲-۱۹۴

مقالات

مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ	سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے	۱۹۵-۲۰۰
منوچہری دامغانی	جناب مولوی ضیاء احمد صاحب بدایونی ایم اے ریڈر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی	۱۸۸-۲۰۵
ابن المقفع کیجانب منسوب ارسطا طالیسی تراجم	جناب حافظ غلام مرتضیٰ صاحب ایم اے لیکچرار عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی	۲۰۶-۲۲۰
دیوان حافظ میں الحاق	جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب لکھنؤ یونیورسٹی	۲۲۱-۲۳۰

آثار علمیہ

مکاتیب مولانا سید سلیمان ندویؒ بنام شاہ معین الدین احمد ندوی		۲۳۱-۲۳۶
مطبوعات جدیدہ	” م “	۲۳۶-۲۴۰

شذرات

افسوس ہے کہ اعظم گڈھ کی ممتاز و مقبول شخصیت مرزا سلطان احمد صاحب ریٹائرڈ ممبر بورڈ آف ریونیو نے طویل علالت کے بعد گذشتہ ۱۰ فروری کو انتقال کیا، وہ پرانے علیگ اور اپنے زمانہ کے لایق ترین عہدہ داروں میں تھے، اپنی قابلیت سے ڈپٹی کلکٹری سے کلکٹری اور بورڈ کی ممبری تک ترقی کی اور جہاں رہے اپنی دیانتداری اور شرافت سے مقبول و نیکنام رہے، بڑے عہدہ داروں میں ایسے شریف اور خلیق انسان کم دیکھنے میں آئے ہیں، ان کا خمیر ہی اخلاق و شرافت سے گوندھا گیا تھا، ادنیٰ و اعلیٰ ہر شخص کے ساتھ ان کا اخلاق یکساں تھا، ہر ملنے والے کے ساتھ کوئی نہ کوئی ایسی خصوصیت ضرور برتتے تھے جس سے اس کو یہ محسوس ہوتا کہ وہ اس کے ساتھ خاص تعلق رکھتے ہیں،

بڑے وضعدار، فیاض اور مہمان نواز تھے جس سے جس قسم کے تعلقات تھے، اس کو عمر بھر نباہا، ملازمت کے زمانہ میں ان کا دسترخوان بڑا وسیع اور گھر مستقل مہمان خانہ تھا، ان کے اعزہ و احباب میں سے کوئی نہ کوئی ان کے یہاں مستقل مقیم رہتا تھا، اور جس کو ضرورت ہوتی اسکی نقدی سے بھی مدد کرتے تھے، ہر حاجت مند کی مدد کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے، اور اس کے لیے ایسے ایسے کام کر گذرتے تھے جس کی ہمت ہر شخص نہیں کر سکتا، وہ بڑے تنخواہ دار تھے لیکن جو کچھ کمایا سب صرف کر دیا، اعظم گڈھ میں دو ہی ایسے شخص تھے جنھوں نے بہت پیدا کیا، مگر اپنے بعد کچھ نہیں چھوڑا، ایک مرزا صاحب، دوسرے اقبال سہیل مرحوم، ملازمت سے رٹائر ہونے کے بعد حکومت پاکستان نے ان کے سامنے پبلک سروس کمیشن کی ممبری پیش کی، مگر انھوں نے وطن چھوڑنا پسند نہ کیا، اور اعظم گڈھ کی سرزمین ہی میں پیوند خاک ہوئے،

دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے پرانے رکن اور اس کے خاص ہمدردوں میں تھے، اور یہاں کے لوگوں سے ان کے عزیزانہ تعلقات تھے، انکی موت سے اعظم گڈھ کا شریف ترین انسان اٹھ گیا جس کا بدل پیدا ہونا اب مشکل ہے، اللہ تعالیٰ انکی نیکیوں کے طفیل میں انکی مغفرت فرمائے، انتقال کے وقت کل ۷۴ سال کی عمر تھی،

یہ خبر بھی افسوس کے ساتھ سنی جائیگی کہ مولانا سید شاہ محمد قمرالدین صاحب پھلواروی امیر شریعت صوبہ بہار نے ۱۳ جنوری کو انتقال فرمایا، مرحوم مولانا سید شاہ بدرالدین صاحب مرحوم امیر شریعت اول کے صاحبزادے اور علم و عمل میں اپنے اسلاف کرام کے خلف الصدق تھے، اپنے بڑے بھائی مولانا سید شاہ محی الدین صاحب مرحوم امیر شریعت ثانی کے انتقال کے بعد ان کے جانشین ہوئے، اور امارت شرعیہ کی روایات اور اس کے مذہبی کاموں کو پوری طرح قائم و برقرار رکھا، ان کی وفات سے خاندان پھلواری کی ایک اہم یادگار مٹ گئی، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے اور ان کے اخلاف کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق بخشے،

اس مرتبہ علی گڈھ میں جامعہ اردو کی ترقی کے حالات سنکر بڑی مسرت ہوئی، اس کے لائق اور سرتاپا عمل رجسٹرار سید ظہیرالدین صاحب علوی لکچرار اردو مسلم یونیورسٹی کی سعی اور جد وجہد سے جامعہ کے امتحانات کا دائرہ بڑا وسیع ہوگیا ہے، ہندوستان کے مختلف صوبوں میں اس کے سنٹر قائم ہو گئے ہیں، اور اس صوبہ کے تو قریب قریب ہر ضلع میں ہیں، اس سال اس کے امتحانات میں چھ ہزار طلبہ شریک ہوئے کئی یونیورسٹیوں نے اس کے اسناد کو تسلیم کرلیا ہے، اور اس کے پاس شدہ کو وہی مراعات دیتی ہیں جو لسانیات مشرقیہ کے سرکاری امتحانات کے پاس شدہ کو حاصل ہیں، امید ہے کہ دوسری یونیورسٹیاں بھی اس کو تسلیم کرلیں گی، اس نے اپنے امتحانات کی کتابوں کی طباعت واشاعت اور فروخت کا بھی انتظام کردیا ہے، اس کا ایک بڑا دفتر اور وسیع عملہ ہے، اس طرح اب وہ اردو کا ایک بڑا مستحکم ادارہ بن گئی ہے، اور یہ نتیجہ ہے تنہا علوی صاحب کی کوششوں کا، اگر اردو کے کارکنوں

شذرات

افسوس ہے کہ اعظم گڑھ کی ممتاز و مقبول شخصیت مرزا سلطان احمد صاحب ریٹائرڈ ممبر بورڈ آف ریونیو نے طویل علالت کے بعد گذشتہ ۱۰ فروری کو انتقال کیا، وہ پرانے علیگ اور اپنے زمانہ کے لایق ترین عہدہ داروں میں تھے، اپنی قابلیت سے ڈپٹی کلکٹری سے کلکٹری اور بورڈ کی ممبری تک ترقی کی اور جہاں رہے اپنی دیانتداری اور شرافت سے مقبول و نیکنام رہے، بڑے عہدہ داروں میں ایسے شریف اور خلیق انسان کم دیکھنے میں آئے ہیں، ان کا خمیر ہی اخلاق و شرافت سے گوندھا گیا تھا، ادنیٰ و اعلیٰ ہر شخص کے ساتھ ان کا اخلاق یکساں تھا، ہر ملنے والے کے ساتھ کوئی نہ کوئی ایسی خصوصیت ضرور برتتے تھے جس سے اس کو یہ محسوس ہوتا کہ وہ اس کے ساتھ خاص تعلق رکھتے ہیں،

بڑے وضعدار، فیاض اور مہمان نواز تھے جس سے جس قسم کے تعلقات تھے، اس کو عمر بھر نبا ہا، ملازمت کے زمانہ میں ان کا دسترخوان بڑا وسیع اور گھر مستقل مہمان خانہ تھا، ان کے اعزہ و احباب میں سے کوئی نہ کوئی ان کے یہاں مستقل مقیم رہتا تھا، اور جس کو ضرورت ہوتی اسکی نقدی سے بھی مدد کرتے تھے، ہر حاجت مند کی مدد کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے، اور اس کے لیے ایسے ایسے کام کر گذرتے تھے جس کی ہمت ہر شخص نہیں کر سکتا، وہ بڑے تنخواہ دار تھے لیکن جو کچھ کمایا سب صرف کر دیا، اعظم گڈھ میں دو ہی ایسے شخص تھے جنھوں نے بہت پیدا کیا، مگر اپنے بعد کچھ نہیں چھوڑا، ایک مرزا صاحب، دوسرے اقبال سہیل مرحوم، ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد حکومت پاکستان نے ان کے سامنے پبلک سروس کمیشن کی ممبری پیش کی، مگر انھوں نے وطن چھوڑنا پسند نہ کیا، اور اعظم گڈھ کی سرزمین ہی میں پیوند خاک ہوئے،

دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے پرانے رکن اور اس کے خاص ہمدردوں میں تھے، اور یہاں کے لوگوں سے ان کے عزیزانہ تعلقات تھے، انکی موت سے اعظم گڈھ کا شریف ترین انسان اٹھ گیا جس کا بدل پیدا ہونا اب مشکل ہے، اللہ تعالیٰ انکی نیکیوں کے طفیل میں انکی مغفرت فرمائے، انتقال کے وقت کل ۴۲ سال کی عمر تھی،

یہ خبر بھی افسوس کے ساتھ سنی جائیگی کہ مولانا سید شاہ محمد قمرالدین صاحب پھلواروی امیر شریعت صوبہ بہار نے ۳۱ جنوری کو انتقال فرمایا، مرحوم مولانا سید شاہ بدرالدین صاحب مرحوم امیر شریعت اول کے صاحبزادے اور علم و عمل میں اپنے اسلاف کرام کے خلف الصدق تھے، اپنے بڑے بھائی مولانا سید شاہ محی الدین صاحب مرحوم امیر شریعت ثانی کے انتقال کے بعد ان کے جانشین ہوئے، اور امارت شرعیہ کی روایات اور اس کے مذہبی کاموں کو پوری طرح قائم و برقرار رکھا، ان کی وفات سے خاندان پھلواری کی ایک اہم یادگار مٹ گئی، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے اور ان کے اخلاف کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق بخشے،

اس مرتبہ علی گڈھ میں جامعہ اردو کی ترقی کے حالات سنکر بڑی مسرت ہوئی، اس کے لائق اور سرتاپا عمل رجسٹرار سید ظہیرالدین صاحب علوی لکچرار اردو مسلم یونیورسٹی کی سعی اور جد و جہد سے جامعہ کے امتحانات کا دائرہ بڑا وسیع ہوگیا ہے، ہندوستان کے مختلف صوبوں میں اس کے سنٹر قائم ہو گئے ہیں، اور اس صوبہ کے تو قریب قریب ہر ضلع میں ہیں، اس سال اس کے امتحانات میں چھ ہزار طلبہ شریک ہوئے کئی یونیورسٹیوں نے اس کے اسناد کو تسلیم کرلیا ہے، اور اس کے پاس شدہ کو وہی مراعات دیتی ہیں جو لسانی مشرقیہ کے سرکاری امتحانات کے پاس شدہ کو حاصل ہیں، امید ہے کہ دوسری یونیورسٹیاں بھی اس کو تسلیم کرلیں گی، اس نے اپنے امتحانات کی کتابوں کی طباعت و اشاعت اور فروخت کا بھی انتظام کردیا ہے، اس کا ایک بڑا دفتر اور وسیع عملہ ہے، اس طرح اب وہ اردو کا ایک بڑا مستحکم ادارہ بن گئی ہے، اور یہ نتیجہ ہے تنہا علوی صاحب کی کوششوں کا، اگر اردو کے کارکنوں

میں ایسے چند عملی آدمی بھی پیدا ہو جائیں تو اس کے مستقبل سے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں،

ناظرین معارف کو یہ خوشخبری سنکر مسرت ہوگی کہ دار المصنفین کی مالی حالت سے متاثر ہو کر حکومت کشمیر نے اس کو دس ہزار کا گرانقدر عطیہ دیا ہے، یہ عطیہ ایسے وقت میں ملا ہی جب دار المصنفین سخت مالی مشکلات میں مبتلا ہے، اس سے اس کو بڑی مدد مل جائیگی، اس عطیہ کے لیے ہم حکومت کشمیر، اس کے وزیر اعظم بخشی غلام محمد صاحب اور دار المصنفین کے محترم صدر جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب نائب وزیر خارجہ حکومت ہند کے شکر گذار ہیں جنکی توجہ آڑے وقتوں میں ہمیشہ دار المصنفین کے کام آتی ہے،

ہماری توقع کے مطابق سیرۃ النبی کی طباعت کے معاملہ میں پنجاب کے اخبارات خاص طور سے نوائے وقت اور ہفتہ وار چٹان اور قندیل نے دار المصنفین کے ساتھ عملی ہمدردی کا ثبوت دیا، اور انکے احتجاج اور شیخ حامد محمود صاحب صدر پاکستان پبلشرز اینڈ بک سیلرز ایسوسی ایشن کی کوشش سے محمد شفیع صاحب مالک مکتبہ مصطفائی نے سیرۃ النبی کی طباعت پر تحریری معذرت نامہ لکھا ہے، اور وعدہ کیا ہو کہ آیندہ سے وہ دار المصنفین کی کوئی کتاب نہ چھاپیں گے ہم ان تمام اخبارات اور شیخ حامد محمود صاحب کے شکر گذار ہیں جنکی کوشش سے یہ معاملہ طے ہو گیا اور دار المصنفین نقصان سے بچ گیا، مگر ضرورت اسکے مستقل انسداد کی ہے، اگر پنجاب کا پریس اور وہاں کے با اثر اصحاب اسی طرح اپنا فرض انجام دیتے رہیں تو یقین ہو کہ پھر کسی ناشر کو اس قسم کی جرأت نہ ہوگی،

تفسیر ماجدی کے دو حصے اس سے پہلے شائع ہو چکے ہیں، اب اسکا تیسرا حصہ شائع ہوا ہے، یہ حصہ سورہ یونس سے لیکر سورہ نحل تک کی تفسیر پر مشتمل ہے، اس تفسیر کی خصوصیات سے اہل علم واقف ہیں، اسلئے کسی تبصرہ و تعارف کی ضرورت نہیں، وہ علم و تحقیق، عقل و نقل، روایت و درایت اور تعبیر ترجمانی کی صحت ہر لحاظ سے اردو کی تفسیروں میں امتیازی حیثیت رکھتی ہے، اور اس میں قدیم و جدید دونوں طبقوں کی تشفی کا پورا سامان ہے، ان معنوی محاسن کے ساتھ تاج کمپنی کی طباعت کے ظاہری حسن و نفاست سے بھی آراستہ ہے، قیمت معلوم نہیں، تاج کمپنی لمیٹڈ کراچی، لاہور اور ڈھاکہ سے ملے گی،

مقالات

مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ

(نقوش و تاثرات)

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن ایم۔ اے

مولانا مناظر احسن رحمۃ اللہ علیہ ضلع پٹنہ کے ایک گاؤں گیلانی کے رہنے والے تھے یہ گاؤں راقم کے وطن دیسنہ سے دو کوس کے فاصلہ پر ہے، ضلع پٹنہ کی مشرقی سرحد کا آخری گاؤں ہے اسکے بعد مونگیر کی سرحد شروع ہو جاتی ہے، اسکا ڈاک خانہ برگہہ ہے، جو گیلانی سے ایک میل پر مونگیر میں ہے، اس لیے مولانا مرحوم سے خط و کتابت کرنے والے ان کو ضلع مونگیر کے ضلع کا باشندہ سمجھتے تھے، لیکن وہ دراصل پٹنہ ضلع ہی کے رہنے والے تھے۔

یہ سطور لکھتے وقت ۱۹۲۰ء کا زمانہ یاد آرہا ہے، جبکہ راقم کے وطن دیسنہ کی آب و ہوا وبائی امراض کی وجہ سے خراب ہوگئی تھی، اس لیے گھر کے تمام لوگ گیلانی منتقل ہو گئے تھے۔ جہاں ہمارے بعض خاص اعزہ بھی رہتے تھے، ہم جس عزیز کے گھر میں مقیم تھے، اسی کے سامنے ایک بڑا مکان تھا جس سے مکینوں کی خوشحالی اور فارغ البالی کا اندازہ ہوتا تھا، راقم اس زمانہ میں سن شعور کو بھی نہ پہنچا تھا لیکن کانوں میں یہ آواز پڑی کہ یہ مکان مولانا مناظر احسن صاحب کا ہے اور گھر میں ان کے متعلق احترام و عقیدت کی جو باتیں سنیں ان سے یہ اندازہ ہوا کہ کوئی بڑے اچھے

مولانا صاحب ہیں، اور شوق پیدا ہوا کہ کاش ان کو دیکھتا،

غالباً ۱۹۲۰ء کا زمانہ تھا، ترک موالات کی تحریک زوروں پر تھی، اس وقت راقم اس تحریک کی نوعیت کو سمجھنے سے قاصر تھا، لیکن گھر کے بعض بزرگوں کو مولانا مناظر احسن کی ایک نظم پڑھتے سنا، جس کے معنوی تو نہیں لیکن صوتی اثرات دل پر ایسے قائم ہوئے کہ مولانا کی ذات گرامی سے دلچسپی کچھ اور بڑھی، گھر میں ان کا ذکر برابر ہوتا رہتا تھا، وہ اس وقت جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں لکچرار ہو چکے تھے، اور ان کی علمی قابلیت و استعداد کے چرچے سے کان آشنا ہونے لگے تھے، گھر میں اعزہ ان سے زیادہ ان کے دادا، چچا اور والد کے فضائل کا ذکر کرتے، جنھیں سنکر دل میں یہ اثر ہوا کہ مولانا ایک بڑے اہل علم خاندان کے فرزند ہیں، ان کے دادا مولانا سید محمد احسن اپنے زمانہ کے جید عالم تھے، یہ معلوم کرکے اور تعجب ہوا کہ انھوں نے شادی اور صاحب اولاد ہونے کے بعد تعلیم شروع کی تھی، اس کا واقعہ یہ ہے کہ جب ان کے یہاں اولاد ہوئی تو کسی نے ان کے ان پڑھ ہونے پر طنز کیا، اس کا ان کے دل پر اتنا اثر ہوا کہ وہ چپکے سے تعلیم کے لیے گیلانی سے نکل کھڑے ہوئے، اور بنارس، لکھنؤ اور رامپور میں تعلیم حاصل کرکے چودہ سال کے بعد وطن لوٹے، اور جب ان کے علم کی شہرت پھیلی تو نہ صرف اطراف و جوانب بلکہ مختلف صوبوں سے طلبہ آکر ان سے فیض حاصل کرنے لگے، ان کے شاگردوں میں ملا عبداللہ ہزارہ صوبہ سرحد کے تھے، وہ مولانا کے ایسے گرویدہ ہوے کہ گیلانی ہی میں متوطن ہو گئے، ملا عبداللہ کے زہد و تورع کے قصے اطراف و جوانب میں اب بھی شوق سے کہے اور سنے جاتے ہیں، مولانا احسن کے شاگردوں میں مولوی محمد رفیع صاحب (شکر نواں ضلع پٹنہ) مولوی عبدالغفور صاحب (کونند ضلع پٹنہ) اور مولوی محمد یٰسین صاحب (رمضان پور ضلع پٹنہ) بھی تھے، یہ تینوں اپنے اطراف کے بڑے رئیس بھی تھے،

مولانا احسن کے دو صاحبزادے تھے، مولانا حاجی ابو نصر، اور مولانا حافظ ابو الخیر، جو مولانا مناظر احسن کے والد تھے، مولانا ابو نصر اپنے علم و فضل اور شعر و شاعری کے ذوق کی وجہ سے اپنے ہم چشموں میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، انھوں نے بھی رام پور اور لکھنؤ میں تعلیم پائی تھی، مولانا مناظر احسنؒ نے ان ہی سے ابتدائی کتابیں پڑھیں، ان کے والد حافظ ابو الخیر صاحب زیادہ تر زمینداری اور کاشتکاری کے کاموں میں لگے رہے، ان کو آموں کے باغ لگانے کا بڑا شوق تھا، اور ان کے باغ کے آم دور دور تک مشہور تھے، بڑے مخیر اور فیاض تھے، ان کی سخاوت و فیاضی کے واقعات سن کر دل پر یہ اثر تھا کہ مولانا مناظر احسن ایسے گھر کے چشم و چراغ ہیں، جہاں علم و فضل کے علاوہ خوشحالی اور فارغ البالی بھی ہے، اس لیے ان کی زیارت کی خواہش دل میں روز بروز بڑھتی گئی۔

دسمبر ۱۹۲۳ء کے آخری ہفتہ میں دیسنہ میں ایک تقریب تھی جس میں شرکت کے لیے حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ بھی اعظم گڈھ سے وطن تشریف لائے تھے، ایک رات وہ صاحب تقریب کے گھر میں بیٹھے تھے کہ معلوم ہوا کہ مولانا مناظر احسن گیلانی سے تشریف لائے ہیں اور حضرت سید صاحب سے ملنے کے لیے آرہے ہیں، دل میں ان کی زیارت کا اشتیاق عرصہ سے تھا، اس لیے اس خبر سے بڑی مسرت ہوئی، اور تھوڑی دیر میں میانہ قد، گندمی رنگ کا ایک خوش وضع اور دلکش انسان میری نگاہ کے سامنے تھا، اور دل نے محسوس کیا کہ اس دلکش جسم میں ایک لطیف روح بھی ہے، ان کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور چہرہ پر بزرگی اور تمکنت کے آثار نظر آئے، حضرت سید صاحبؒ نے اٹھ کر ان سے معانقہ کیا، اور جب دونوں میں باتیں شروع ہوئیں تو مجلس کے اور شرکاء خاموشی سے سننے لگے، میں بھی ایک گوشہ میں بیٹھ کر اپنی آنکھوں سے اپنی جنتِ آرزو کی سیر کرنے لگا، دونوں بزرگ مختلف علمی، مذہبی اور

سیاسی مسائل پر گفتگو کر رہے تھے جس کو میں اچھی طرح سمجھنے سے قاصر تھا، لیکن اس صحبت کی لذت آج تک یاد ہے، اور جب کبھی اس کو یاد کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ایک برج میں دو قمر کو دیکھ رہا تھا، اس مجلس میں ان بزرگوں کا جو احترام ہو رہا تھا، اس سے یہ خیال پیدا ہوا کہ اہل علم ہونا کتنی قابل قدر چیز ہے، اور معاً یہ خواہش بھی ہوئی کہ کاش میں بھی ان بزرگوں کی خاک پا ہوتا،

اس ملاقات کے ایک طویل عرصہ کے بعد جب میں اسکول کی تعلیم ختم کرکے کالج میں پڑھ رہا تھا، ایک دن خبر ملی کہ مولانا حیدر آباد سے آئے ہیں اور علاج کے لیے پٹنہ کے اسپتال میں داخل ہیں، اور ایسا معلوم ہوا کہ وہ مجھکو اپنی طرف کھینچ کر اسپتال بلا رہے ہیں، گو اب تک میرا تعارف ان سے نہیں ہوا تھا، لیکن میں ان کی زیارت کے لیے اسپتال پہنچ گیا، ان کی عیادت کے لیے اور لوگ بھی آئے ہوئے تھے، میں ان کے کمرہ میں جاکر ایک گوشہ میں کھڑا ہوگیا، اور ان کو دیکھتا رہا، ان کا کوئی اپریشن ہوا تھا جس کی تکلیف سے نڈھال تھے لیکن مجھکو ان کے شرف دیدار سے بڑی تسکین ہوئی، مگر ان سے مخاطب ہونے کی جرأت نہ کرسکا اور تھوڑی دیر ٹھہر کر خاموشی سے باہر چلا آیا، اس طرح کئی دن برابر اسپتال گیا اور صرف انکو دیکھ کر لوٹ آتا، اور اسی میں اپنی سعادت سمجھتا رہا، اور ان کے لیے دل سے دعائیں نکلتی رہیں اور جب وہ شفایاب ہوکر اسپتال سے چلے گئے تو مجھکو بھی بڑی مسرت ہوئی،

طالب علمی ہی کے زمانہ میں ایک روز سننے میں آیا کہ مولانا نے اپنے ننہال استھانواں میں ایک پرزور تقریر کی ہے، اور اس میں حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ سے محض معاصرانہ چشمک کی بنا پر ان کی بعض تصانیف پر اعتراضات اور ان کے بعض اشعار پر نکتہ چینی کی ہے، مگر میرا دل اس کو قبول کرنے کے لیے کسی طرح تیار نہیں تھا، لیکن کچھ لوگ اس واقعہ کو ہوا دیتے رہے،

اور اس کی خبر حضرت سید صاحب تک بھی پہنچائی، اور اس کا ذکر نجی صحبتوں میں بھی برابر جاری رہا۔ اتفاق سے اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد مارچ ۱۹۲۹ء میں مولانا کا ایک مضمون "حضرت حکیم مولانا سید برکات احمد ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ" کے عنوان سے معارف میں چھپا، اور اس کو حضرت سید صاحب نے سر مقالہ شائع کیا، اس کو دیکھ کر معاً یہ خیال آیا کہ دونوں بزرگوں کے دل ایک دوسرے سے بالکل صاف ہیں، ان میں خواہ مخواہ بدگمانی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔

اس مقالہ میں مولانا نے اپنے دادا مولانا محمد احسن کا ذکر مولانا برکات احمد کے والد حکیم دائم علی کے استاد کی حیثیت سے کیا تھا، معارف کے ناظرین کی یاد تازہ کرنے کے لیے وہ سطریں یہاں نقل کی جاتی ہیں جن سے مولانا کے خاندان سے متعلق کچھ مفید معلومات بھی حاصل ہو جائیں گے۔

"......بہار کی ایک بستی گیلانی ہے، اس زمانہ میں وہاں کسی سرخ و سفید عمارت میں نہیں، ہزاروں روپے کے فرنیچر کے درمیان نہیں، بلکہ ایک خام مسجد کے کنارے برگد کے درخت کے نیچے کھلے ہوئے تخت پر گذشتہ خاک نشینوں کی ایک یادگار صرف حاضری کے رجسٹروں کی تکمیل نہیں کر رہا تھا، بلکہ ایک طرف ہدایہ و تلویح، دوسری طرف جغمنی اور افق المبین جیسی سنگلاخ کتابوں سے لطیف حقائق اور دقیق نکات و مسائل کے جھرنے جاری کر رہا تھا، وہ کسی وقت اگر منطق و ما بعد الطبیعیات کے رموز اور پیچیدہ غوامض پر شستہ تقریر کرتا تھا تو دوسرے وقت قاضی بیضاوی کی تفسیری اسرار اور تفتازانی کے بیانی و بدیعی نظرات کو مفت بانٹ رہا تھا، ان کا نام مولانا محمد احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ تھا، جو اپنے وقت میں صوبہ کے سرآمد روزگار فضلا میں شمار کیے جاتے تھے، اور جن کی تہذیب و تدوین تحشیہ و تصحیح سے طوسی کے اقلیدس کا پہلا مقالہ عربی

مدارس میں اس وقت تک پڑھایا جاتا ہے"

میرے دل پر مولانا کی خاندانی عظمت کا نقش پہلے ہی سے تھا، مندرجۂ بالا سطور پڑھ کر اور بھی گہرا ہو گیا۔

اب مولانا کی علمی شہرت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی، اور ان کا ذکر ایک شیریں بیان مقرر، جید عالم، لایق معلم، اردو نویس اہل قلم کی حیثیت سے برابر سنتا رہا۔

اس کے بعد ۱۹۳۱ء میں مولانا محمد علیؒ کی وفات پر ان کا مرثیہ پڑھ کر میرا دل انکی طرف اور مائل ہو گیا، مولانا محمد علی مرحوم سے مجھکو بڑی عقیدت تھی، ان کو محبت و اخلاص بہت وجرأت، جوش وعمل، ایثار و قربانی، جانبازی و سرفروشی، رواداری اور حب الوطنی کا بہت بلند نمونہ سمجھتا تھا۔ ان کی قدر اس لیے بھی زیادہ دل میں تھی کہ اگر ایک طرف وہ اعلیٰ کردار کے محب وطن تھے، تو دوسری طرف شیر دل مسلمان بھی، اگر غلامی کی زنجیر توڑنے کے لیے ہر سیاسی تحریک میں پیش پیش رہے، تو ساری عمر توحید کے فدائی اور شمع رسالت کے پروانہ بھی رہے، ان کی موت پر سارا ہندوستان سوگوار تھا، دنیا کے گوشہ گوشہ سے ان کے ماتم و شیون کی صدائیں بلند ہوئیں، مشہور انگریز مصنف ایچ، جی ویلز نے ان کی رحلت سے متاثر ہو کر یہ کہا تھا کہ ان کا دل نپولین کا تھا، ان کی زبان برک کی تھی، اور ان کا قلم میکا و لے کا تھا، اور اس وقت کے وزیر ہند مسٹر بن نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ وہ ایک جلیل القدر مسلمان، ایک زبردست محب وطن، اور عام انسانیت کے ایک عظیم المرتبت پیغمبر تھے،

لیکن ان بیانات کو پڑھ کر مولانا محمد علی کے فدائی کی حیثیت سے پندار تو ضرور محسوس ہوتا، لیکن غمناک جذبات کی تسکین نہ ہوئی، مگر ان پر جب مولانا مناظر احسن کا مرثیہ شائع ہوا، تو ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے جراحتِ دل پر مرہم رکھ دیا ہے، اس کو بار بار پڑھ کر دل کو تسکین دیتا،

ناظرین بھی اس سے محظوظ ہولیں۔

بدینِ مصطفیٰ دیوانہ بودی	فدائے ملتِ جانانہ بودی
بہ بزمِ ما رئیسِ عشقبازاں	بہ رزمِ دشمناں فرزانہ بودی
بہ دل بودی فقیرے بے نوائے	بہ تن لب پیکرِ شاہانہ بودی
سیاست را نقاب چہرہ کردی	دگرنہ عاشقِ مستانہ بودی
سیاست تہمتے بر عشقِ پاکت	ز آئینِ خرد بیگانہ بودی
با پیمانہ تو زورے و شورے	بجا نہا ہمتِ مردانہ بودی
چہ دانستی کجا سوزم نہ سوزم	تو شمعِ دین را پروانہ بودی
رسیدی از راہ اغیار تا یار	عجب مستے عجب دیوانہ بودی
چہ آمد بر سرِ رنداں کہ آں را	ثمر و خمی نہ و پیمانہ بودی

ان ہی دنوں یہ روایت ملی تھی کہ مولانا جب حیدرآباد کے ایک تعزیتی جلسہ میں یہ مرثیہ پڑھنے لگے تو خود دھاڑیں مار کر رونے لگے، حالانکہ ان کا خود بیان تھا کہ وہ نہ کبھی مولانا محمد علی سے ملے تھے، اور نہ ان کو دیکھا تھا، لیکن ان سے غیر معمولی محبت رکھتے تھے، جو ان کے دردمند و حساس دل کے مالک ہونے کی دلیل تھی۔

تعلیم ختم کرنے کے بعد جب میں دارالمصنفین آیا تو ایک روز حضرت سید صاحبؒ کی ڈاک میں مولانا کا رسالہ "النبی الخاتم" دیکھ کر بڑے شوق سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اس کے دیباچہ میں حسب ذیل سطروں پر نظر پڑی:

"علامہ شبلی مرحوم اور ان کے جانشین برحق مولانا سید سلیمان ندوی نے سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اردو زبان کو مضامین سیرت طیبہ سے مالا مال کر دیا ہے"

تا اینکہ دوسری اسلامی زبانوں کو بھی اردو کی اس جامع، شگفتہ، اور مستند کتابوں کا ترجمہ کرنا پڑا۔"

اس کو پڑھ کر یہ خلش باکل جاتی رہی کہ مولانا کو حضرت سید صاحبؒ سے معاصرانہ چشمک ہے، اور اس پر سید صاحبؒ نے معارف میں ایک بہت اچھا ریویو شائع کرایا جو حسب ذیل ہے:

"النبی الخاتم ...... ایک گلدستۂ عقیدت ہے، جسے مولانا مناظر احسن کے عقیدت مند قلم نے سجایا ہے، اس میں مولانا نے اپنے خاص والہانہ رنگ میں سیرت پاک کے واقعات کو ایک خاص انداز اور ترتیب کے ساتھ پیش کر کے نہایت لطیف نتائج پیدا کیے ہیں، اس حیثیت سے یہ اپنے طرز میں منفرد ہے کہ تاریخی واقعات کو وارفتگی بیان کے ساتھ اس طرح نبھایا گیا ہے کہ ناقد مورخین اور ارباب وجد وحال دونوں اپنے اپنے ذوق کے مطابق لطف اٹھا سکتے ہیں، زبان صاف و سادہ لیکن صنائع لفظی سے مالا مال ہے۔"

خود مولانا اپنی تمام تصانیف میں اسی کو سب سے زیادہ پسند کرتے تھے، حضرت سید صاحبؒ نے نجی صحبتوں میں بھی اس رسالہ کی تعریف کی، اور جب مولانا کا ذکر آتا تو ان کے شیریں اخلاق، میٹھی میٹھی باتوں اور لطائف و ظرایف کو بڑے لطف سے بیان کرتے جس سے ثابت ہوتا تھا کہ دونوں کے درمیان معاصرانہ چشمک کی روایت سراسر غلط ہے بلکہ دونوں کے درمیان اخلاص و محبت کی نہریں رواں ہیں، دونوں میں خط وکتابت بھی رہتی تھی مولانا سید صاحب کو کبھی "سید الامام" کبھی "سیدی" اور "سید المرسلین" لکھ کر مخاطب فرماتے، اور اس طرح خط لکھتے جیسے کوئی چھوٹا عزیز اپنے کسی بہت ہی شفیق بزرگ کو لکھتا ہے کسی میں انکی علمی

کمال اور ادبی فضیلت کا اعتراف کرتے کسی میں ان کی کسی تصنیف یا مضمون کی داد دیتے، کسی میں ان کے ذاتی اوصاف مثلاً روحانیت، حلم، بردباری، لینت، شرافت کا ذکر کرتے اور غایت انکسار میں اپنے کو محض مور ضعیف ہی ثابت کرنے کی کوشش کرتے حضرت سید صاحب بھی ان کو "محب اعز و اعز" لکھکر اپنا مکتوب شروع کرتے، اور دونوں اپنے خطوط میں علمی مسائل کے علاوہ خانگی و نجی باتوں سے متعلق بھی ایک دوسرے سے مشورے کرتے رہتے اور مجھکو اندرونی طور پر خوشی ہوتی کہ دونوں ایک دوسرے سے بہت قریب تر ہیں،

۱۹۳۰ء سے پہلے مولانا نے تین رسالے لکھے تھے، روحانی کائنات، حضرت ابوذر غفاریؓ، اور النبی الخاتمؐ۔ یہ راقم اپنی علمی بے مایگی کی وجہ سے ان سے آشنا لطف اندوز نہ ہو سکا جتنا کہ ہونا چاہیے تھا، لیکن ۱۹۳۰ء میں جب الفرقان کا مجدد الف ثانی نمبر شائع ہوا، اور اس میں مولانا کا مضمون "الف ثانی (یا ہزارہ دوم) کا تجدیدی کارنامہ" پڑھا تو ایسا معلوم ہوا کہ ہندوستان کے مغلیہ عہد کی تاریخ کی تمام گرہیں کھل گئیں، راقم کا خاص موضوع ہندوستان میں اسلامی عہد کی تاریخ رہا ہے، اس مضمون کو پڑھنے کے بعد تیموری دور کی تاریخ سمجھنے میں ایک خاص زاویۂ نظر ملا، دین الٰہی پر مضامین برابر پڑھتا رہا تھا، ملا عبد القادر بدایونی کی منتخب التواریخ جلد سوم میں تو اسکی تفصیل ملتی ہے، جو چار سو صفحوں میں انتہائی بے ترتیبی کے ساتھ منتشر ہے، مولانا نے پہلی دفعہ ترتیب و تنظیم کے ساتھ اکبر کی اس بدعت سیئہ کا احاطہ کیا، اس لیے مجھ پر ان کی عالمانہ تحقیق و تنقیح کا بڑا گہرا اثر پڑا، ان مباحث کی تعلیل و توجیہ کے سلسلہ میں جو موشگافیاں انھوں نے کی ہیں، ان سے ان کی غیر معمولی ذہانت اور ذکاوت کا اندازہ ہوا، اس مضمون نے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ آخر کیا بات تھی کہ اکبر نے دین الٰہی تو قائم کیا، لیکن جہانگیری عہد سے پہلے یہ آپ اپنی موت مر گیا،

اور پھر شاہجہانی عہد میں اسلام اور اسلامی روایات کی جو تجدید شروع ہوئی تو عالمگیر کے عہد میں انتہا کو پہنچ گئی، اور گو غیر مسلموں کے نزدیک آج عالمگیر اور تعصب مترادف الفاظ بن گئے ہیں، لیکن اسی مضمون کو پڑھ کر اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر اکبر نے دین الٰہی کے ذریعہ اسلام اور شعائر اسلام کی توہین و تحقیر بلکہ بیخ کنی نہ کی ہوتی تو شاید ہندوستان کی تاریخ میں کوئی عالمگیر نہ پیدا ہوتا، اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آیندہ بھی جب کوئی اکبر پیدا ہوگا تو کچھ عرصہ کے بعد کوئی عالمگیر بھی ضرور افق پر نمودار ہوگا، مولانا نے اپنے مقالہ میں یہ پوری طرح واضح کیا ہے کہ رواداری کے نام پر اکبر نے جو پالیسی اختیار کی تھی وہ در اصل ارتداد، الحاد اور بے دینی تھی، جو اکبر کے بعد بھی مختلف شکلوں میں ابھرتی رہی، حضرت مجدد الف ثانیؒ اور ان کے پیرو اس کو مٹانے کی کوشش میں لگے رہے، یہاں تک کہ ملک ذہنی حیثیت سے دو جماعتوں میں تقسیم ہوگیا، ایک نے اکبر کے روحانی جانشین دارا کی تائید کی، اور دوسری نے عالمگیر کی حمایت کی، دارا شکوہ اکبر کی روایت کو زندہ کرنا چاہتا تھا، اور عالمگیر حضرت مجدد الف ثانیؒ کے تجدیدی کارناموں کو روشن رکھنا چاہتا تھا، اس لیے دارا اور اورنگ زیب کی جنگ گو بظاہر تخت و تاج کی لڑائی تھی لیکن در اصل دو نظریوں اور دو تحریکوں کا تصادم تھا، ایک کا سلسلہ اکبر سے ملتا تھا، اور دوسرے کا حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تعلیمات سے شروع ہوتا تھا، کیونکہ عالمگیر حضرت مجددؒ کے صاحبزادے حضرت میر معصوم کے حلقۂ ارادت میں بھی داخل تھا، اور اس کے سیاسی کاموں میں حضرت معصوم کے مشوروں کو بڑا دخل رہا ہے، جیسا کہ ان کے مکاتیب سے پتہ چلتا ہے، اور بقول مولانا مناظر احسن گیلانی جس تجدیدی عمل کی ابتدا جہانگیر سے ہوئی، اس کا انتہائی کمال عالمگیر کی ذات پر ہوا، ایک بار حضرت سید صاحب نے راقم سے فرمایا تھا کہ دارا شکوہ تخت پر بیٹھتا تو مسلمانوں کی سلطنت تو باقی رہتی لیکن اسلام ختم ہوگیا ہوتا، عالمگیر کے تخت پر

بیٹھنے سے اس کے بعد مسلمانوں کی سلطنت تو باقی نہیں رہی لیکن اسلام باقی رہا، اس اجمال کی تفصیل سمجھنے میں مولانا کے مضمون سے بڑی مدد ملی، اور سچ تو یہ ہے کہ تیموری دور کی تاریخ کا صحیح جائزہ اس وقت تک نہیں لیا جا سکتا جب تک کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ اور ان کے متعلدین کے کاموں کا گہرا مطالعہ نہ کیا جائے، مولانا نے اپنے مضمون میں ان ہی تاریخی رموز و نکات کی موشگافی کی ہے،

کچھ ہی عرصہ کے بعد ان کا ایک طویل مضمون حضرت شاہ ولی اللہ پر الفرقان کے ولی اللہ نمبر میں شائع ہوا اس کو پڑھ کر ایک بار پھر تاریخ ہند پر ان کی گہری نظر کا اندازہ ہوا، اس میں انھوں نے مورخانہ بصیرت کے ساتھ یہ دکھایا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے عہد میں کس طرح اسلام پر تاریک بادل چھایا ہوا تھا، ہندوستان کے شمالی علاقوں میں سکھوں کی قوت ابھر رہی تھی جنوبی ہند میں مرہٹوں کی طاقت کا سیلاب بڑھتا جا رہا تھا، خلیج بنگال کے ساحلی علاقوں سے یورپین ممالک کی طاقتیں ہندوستان پر للچائی ہوئی نظریں ڈال رہی تھیں، اور خود مسلمانوں کے اندر ایرانیوں، تورانیوں اور روہیلوں کے باہمی تصادم سے اسلامی حکومت کی قبا تار تار ہو رہی تھی، بعض صوفیہ کے غلط تصوف اور فقہا کے غلط تفقہ سے امت کے شیرازے میں انتشار پھیلا ہوا تھا، خود ہندوستانی علماء کا طبقہ قرآن و حدیث کی اصلی تعلیم، اصول و فقہ اور عقائد و کلام سے ہٹ کر لاطائل ذہنی اور لفظی مباحث میں الجھا ہوا تھا، اس تجزیہ میں بھی مولانا کی غیر معمولی مورخانہ ذہانت و ذکاوت کا رنگ نمایاں تھا، اور بعض مواقع پر اس لیے بھی حیرت ہوتی کہ ایک ایسے اہل قلم کی نگاہ جس کی تعلیم صرف عربی مدارس میں محدود رہی، کیسے ان باریک گوشوں تک پہنچی، اس لیے اکثر یہ خیال آیا کہ اگر ان کی تعلیم خالص انگریزی طرز کی ہوتی اور وہ اپنا موضوع صرف تاریخ ہند ہی بنا لیتے تو شاید ان کے پایہ کا کوئی مورخ

ہندوستان میں نہ ہوتا، مولانا کی نظر ہندوستان کے سیاسی واقعات کے ساتھ مذہبی رجحانات، تحریکات اور انقلابات پر بھی تھی، اس لیے ان کے نقد و تبصرہ میں بڑی جامعیت ہوتی تھی، جو تاریخ ہند پر دوسرے لکھنے والوں کو میسر نہیں، اسی مضمون میں انھوں نے شاہ ولی اللہ کی سیاسی، دینی اور علمی خدمات کی جو تفصیل بتائی ہے، اس کا اندازہ اہل نظر اور اہل فکر ہی کر سکتے ہیں، پھر اس کے لکھنے میں ان پر جو ایک "حال" اور "وجد" طاری ہے، وہ لائق مطالعہ ہے، ان کا سینہ دینی و ملی احساسات سے معمور نظر آتا ہے، اور مسلمانوں کی کھوئی ہوئی عظمت کے لکھنے میں ان کے قلم سے جو تحریر نکلی ہے، وہ دراصل ان کے سینہ کے آبلے ہیں، جو کاغذ کے صفحات پر پھوٹ پھوٹ کر بہہ نکلے ہیں، یہ مضمون ایک علیحدہ کتاب **آغوش موج کا ایک در تابندہ** کے نام سے بھی شائع ہو گیا ہے،

سنہ ۱۹۳۹ء کے دسمبر میں میرے وطن میں بعض اعزۂ خاص کے یہاں تقریبات تھیں جن میں شرکت کے لیے میں بھی اعظم گڈھ سے گیا تھا، مولانا بھی گیلانی سے تشریف لائے تھے، اور قبل اس کے کہ میں ان کی قدم بوسی کروں، ایک موقع پر میں نے محسوس کیا کہ میرے کاندھے پر کسی کا ہاتھ ہے، اور اسی کے ساتھ ہی آواز بلند ہوئی "السلام علیکم عزیزم!" میں نے پلٹ کر دیکھا تو مولانا تھے، حیدرآبادی شروانی میں ملبوس تھے، سر پر حیدرآبادی رومال تھا، میں کچھ گھبرا سا گیا، انھوں نے از راہ لطف و کرم معانقہ فرمایا، اور پھر میرا ہاتھ پکڑ کر الگ لے گئے، میرے سامنے اس وقت ایک منور چہرہ تھا، جس پر نرمی، شگفتگی، پاکیزگی اور برگزیدگی برس رہی تھی، ان کا نورانی چہرہ دیکھ کر دل کہتا تھا کہ ان کے قلب میں شاید معصیت کا وسوسہ بھی کبھی پیدا نہ ہوتا ہوگا، داڑھی سفید ہو چکی تھی، لیکن چہرہ پر اس طرح زیب دیتی تھی جیسے اسی کے لیے بنائی گئی ہو، آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں، لیکن ان میں ذہانت، مہر اور محبت کی تابانی تھی، دار المصنفین کے

حالات پوچھتے رہے، اور یہاں کے ایک ایک فرد کے متعلق سوالات کیے، ان ہی دونوں ہندوستان
کی تاریخ سے متعلق میرے کچھ مضامین معارف میں شائع ہوئے تھے، ان کا ذکر کرکے ہندوستان
کی تاریخ پر ایسی عالمانہ اور دلکش گفتگو شروع کر دی کہ مجھکو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ شربت کے
گھونٹ میرے حلق سے اتر رہے ہیں، مہابھارت، رامائن، گیتا، البیرونی، ابن بطوطہ، ضیاء الدین
برنی پر ایسی مبصرانہ گفتگو سنی کہ مجھکو حیرت ہو رہی تھی کہ میں کسی عالم دین یا دینیات کے معلم کے سامنے
ہوں یا تاریخ کے کسی ماہر کے پاس بیٹھا ہوں، وہ بات کرنے میں ہاتھوں کو تیزی سے حرکت
دیتے تھے، جو ان کے لطف بیان پر مہمیز کا کام دیتے تھے، کبھی کبھی وہ آنکھوں کو بند کر لیتے اسوقت
شاید وہ اپنی دوربین نگاہوں کو اس مقام پر پہنچا دیتے جہاں ایک عام اہل علم کی نگاہ کا
پہنچنا ممکن نہ تھا، ان کی آواز میں اتار چڑھاؤ تو مطلق نہ تھا لیکن بڑی شیرینی اور حلاوت تھی،
تنہائی کی یہ صحبت دیر تک نہیں رہی، کیونکہ ان کی باتیں سننے کے لیے کچھ اور ہموطن بھی آ گئے،
اور ان کو موضوع سخن بدلنا پڑا، مگر وہ جب تک علمی گفتگو کرتے رہے، میں ان کے فکر و نظر
کی گہرائی میں کھویا ہوا محو حیرت بنا رہا، اور ان کی نکتہ رسی اور مجتہدانہ طریقۂ فکر کے بوجھ سے دبتا چلا گیا،
اس صحبت میں ان کے کچھ ایسے رشتہ دار بھی شریک تھے، جن سے سالے بہنوئی کا رشتہ تھا،
اس وقت مولانا خالص بہاری بن گئے، اور یہ مجلس بے تکلفانہ نقرہ بازیوں، غیر ثقہ جملوں،
قہقہوں اور چہچہوں سے گونجتی رہا، اور مولانا نے اس وقت کسی کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ اہل علم
بھی ہیں،

ان کا قیام اس تقریب میں دو دن رہا، دونوں دن برابر ان سے ملنے کی سعادت حاصل
رہی، ایک موقع پر ان کی خدمت میں تفریحاً عرض کیا کہ آپکے نام کے ساتھ گیلانی دیکھ کر لوگ
مجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا مولانا حضرت عبد القادر جیلانیؒ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، یہ سنکر

سنے لگے، اور فرمایا "گیلانی کی نسبت سے مجھکو گیلانوی لکھنا چاہیے تھا، لیکن شافعی امام شافعی
کے ساتھ نسبت ہے، شافعی اپنے کو شافعوی نہیں لکھتے، پھر اگر میں گیلانی لکھتا ہوں تو اس میں
کیا ہرج ہی، یہ بھی فرمایا کہ اکبر کے عہد میں صدر پہانی ایک بزرگ گزرے ہیں، ان کا ذکر
ملا عبد القادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں کیا ہے، وہ ایک گاؤں پہانی کے رہنے والے
تھے، اور پہانوی کے بجائے پہانی کہلاتے تھے، یہ نکتہ آفرینی سنکر مجھکو ہنسی آگئی، اتفاق سے
ان کی رحلت کے بعد ان کے کاغذات میں بھی اسی قسم کی ایک تحریر دیکھی، وہ اپنی ذہانت سے
روزمرہ کی معمولی سی معمولی باتوں میں بڑے بڑے علمی نکتے پیدا کرتے رہتے تھے۔

اسی قیام کے دوران میں حضرت سید صاحبؒ کا ذکر بار بار آیا، اور مولانا ان سے اپنی عقیدت
و محبت کا اظہار کرتے رہے، ایک موقع پر فرمایا کہ میں سید صاحب کی تصانیف کو اس لیے پسند
کرتا ہوں کہ ان سے نئی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں، جو علمی باتیں پہلے مجمل شکل میں تھیں، سید صاحب
کی تحقیق و تدقیق نے ان کو زیادہ مفصل بنا دیا، اور پھر اپنے داہیں ہاتھ کو زور سے حرکت دیتے
ہوئے کہا کہ ان کی علمی کاوش اور محنت کی داد دینے میں بخل کرنا نہ صرف تعصب و تنگدلی
بلکہ ایک قسم کی عقلی و طبعی دناءت ہے، یہ سنکر مجھکو اور زیادہ انشراح ہوا کہ وہ لوگ کیتنے تنگ نظر
تھے، جو ان پر سید صاحبؒ سے معاصرانہ چشمک کا الزام رکھتے تھے، مولانا نے جب جب سید صاحب
پر کوئی مضمون لکھا، ان کے علمی کمالات کی داد دل کھول کر دی، اور جو گفتگو میں نے ان کی زبان
سے سنی تھی، اس کی تفصیل مولانا کے ایک طویل مقالہ "مولانا سید سلیمان ندوی کا پہلا کارنامہ"
کے عنوان سے سنہ ۱۹۴۰ء کے معارف کے پانچ نمبروں میں پڑھی، اس کی ابتدا ہی میں ارقام
فرماتے ہیں:

"نئے حالات نے جدید ذہنیتوں میں جن نئی نئی الجھنوں کو پیدا کر دیا تھا، خدا ہی جانتا ہے کہ

اعظم گڈھ کے اس زاویہ نشین درویش کے قلم نے ان کی گرہ کشائیوں میں کتنی جلیل و عظیم خدمتیں دی ہیں"

اسی مضمون میں انھوں نے حضرت سید صاحب کی علمی و تحقیقی کاوشوں کی جس قدر تعریف کی ہے، وہ کسی عالم نے اپنے کسی معاصر عالم کے لیے شاید ہی کی ہو،

۱۹۴۰ء کے بعد وہ علمی دنیا کی فضا میں ہر طرف چھائے ہوئے تھے، معارف، برہان، الفرقان، مجلہ عثمانیہ، عثمانیہ یونیورسٹی کے اسٹاف کے میگزین، ندیم، صدق وغیرہ ان کے قلم کی بارش سے سیراب ہو رہے تھے، اور ان کے مضامین کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ وہ کبھی عالم، کبھی متکلم، کبھی فقیہ، کبھی محدث، کبھی مفسر، اور کبھی مورخ کے گوناگوں رنگ جلووں میں نظر آتے تھے،

۱۹۴۱ء میں ادارۂ تحقیقات علمیہ جامعہ عثمانیہ کی طرف سے ان کا ایک طویل مضمون کتاب کی صورت میں **تدوین فقہ** کے نام سے شائع ہوا، پھر اسی ادارہ کی طرف سے ان کی کتاب **تدوین حدیث** کی اشاعت ہوئی، میں نے جب جب ان دونوں کتابوں کے پڑھنے کی کوشش کی تو اپنے کو ان کی فکر و تحقیق کے دریا میں غرق پایا، البتہ ان کی اہمیت حضرت سید صاحب کی گفتگوؤں اور تحریروں سے معلوم ہوئی کہ ہر زمانہ میں کچھ لوگ ایسے بھی پیدا ہوتے رہے ہیں جو عقائد میں کتر بیونت کر کے نئے اسلام کی دعوت دیتے رہے ہیں لیکن خدا کے کچھ ایسے بندے بھی افق پر نمودار ہوتے رہے ہیں، جنھوں نے اپنی اہلیت و استعداد سے ان بدعات کے گرد و غبار کو ہٹا کر اسلام کے منور آئینہ کو روشن رکھا، مولانا کی مذکورۂ بالا کتابیں دراصل ایسے ہی بدعتیوں کے مقابلہ کے لیے لکھی گئیں، ان کی تدوین حدیث پر سید صاحب نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ

اللہ کے مخصوص بندوں نے ایسے بدعتیوں کے ہر تیر کو اپنے سپر سے روکا، اور ان کے ہر اعتراض کو دور کیا، اور ان کے ہر شبہہ کو رفع کیا، اور پھر اسی سلسلہ میں حضرت سید صاحب نے تحریر فرمایا کہ

"اس زمانہ میں اس فرض کو ادا کرنے کے لیے جو دستہ آگے بڑھا، اس کے ہراول میں ہمارے دوست مناظر اسلام، متکلم ملت، سلطان القلم مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی (متع اللہ المسلمین بطول بقائہ) کا نام نامی ہے، جن کے قلم کی روانی اسلام کی محافظت میں تیغ رانی کا کام دیتی ہے، وہ ہر سال اور سال کے مختلف حصوں میں اپنی تحقیقات علمیہ کے بلند نمونے پیش کرتے رہتے ہیں، اور خصوصاً اپنے توسیعی خطبات اور اپنے تلامذہ کے امتحانی مقالات کے پردے میں علم اور دین کی ایسی خدمتیں انجام دے رہے ہیں جو سارے مسلمانوں کی تحسین اور شکریہ کی مستحق ہیں۔"

ان سطروں میں نہ صرف حقیقت و اصلیت کا اظہار ہے، بلکہ مولانا کی علمی فضیلت و عظمت جو حضرت سید صاحب کے دل میں تھی، اس کا بھی پورے اخلاص کے ساتھ اعتراف ہے،

۱۹۴۴ء میں دفتر الفرقان بریلی سے ان کا ایک رسالہ **الدین القیم** شائع ہوا، جس میں مولانا نے صوفی اور متکلم بن کر "صوفیانہ علم کلام" پیش کیا تھا، اور وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کی مباحث کے ذریعہ کائنات کے اس معمہ کو حل کرنے کی کوشش کی تھی جس کو عقل اور فلسفہ حل کرنے سے عاجز رہا۔

اسی سال ان کی ایک ضخیم کتاب **ہندستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت** حصہ اول (ضخامت ۴۰۶ صفحے) ندوۃ المصنفین سے شائع ہوئی، یہ کتاب بھی عجیب و غریب ہے۔ اس کا موضوع نام سے ظاہر ہے، لیکن اگر کوئی شخص اس میں ابواب یا فصلی سرخی قائم کرنے کی کوشش کرے تو اس کے بس کی بات نہ ہوگی۔ بلکہ مولانا عتیق الرحمن صاحب ناظم ندوۃ المصنفین

اس کو شائع کرتے وقت اس کے مضامین کی فہرست بھی ترتیب دینے سے قاصر رہے، اور ان کو شروع میں محض چند عنوانات کی فہرست ہی دینے پر اکتفا کرنا پڑا، اس کتاب میں مولانا مسلمانوں کے نظام تعلیم، نصاب تعلیم، طریقۂ درس، طلبہ کے قیام و طعام اور اخلاق وغیرہ پر لکھنا چاہتے تھے لیکن ان کا قلم بقول حضرت سید صاحبؒ "منطقی ترتیب" اور "مصطلحہ تصنیفی رسوم" کے بجائے افادیت کا خوگر تھا، اس لیے کتاب میں ایسے ضمنی مباحث بھی بکثرت آگئے ہیں جن کا تعلق موضوع سے تو نہیں ہے لیکن وہ بجائے خود مفید ہیں، مولانا خود اس کتاب کے دیباچہ میں ارقام فرماتے ہیں:

"دارالعلوم دیوبند کے مجلہ شہریہ دارالعلوم کے مدیر کا عنایت نامہ آیا کہ مضمون لکھ کر بھیجدو، دارالعلوم ایک تعلیمی ادارہ ہے، اسی مناسبت کا خیال کرکے چار پانچ صفحوں کے مختصر مضمون کا ارادہ کرکے میں نے غلام علی آزاد بلگرامی مرحوم کی کتاب مآثر الکرام کو الٹنا پلٹنا شروع کیا بعض کارآمد دلچسپ باتیں ہاتھ آئیں قلم اٹھایا لکھنا شروع کیا، اب میں نہیں جانتا کہ پھر کیا ہوا، قلم رواں ہوا، چلا، چلتا گیا، بات میں بات کا خیال آتا جاتا تھا، اور لکھتا جاتا تھا، پانچ صفحوں کے لکھنے کے لیے بیٹھا تھا، وہی اس وقت ۷۵۰ صفحات کی شکل میں آپ کے سامنے موجود ہے۔"

اور پھر یہ پڑھکر اور بھی حیرت ہوئی کہ یہ سات سو پچاس صفحے کل بیس دن کی مدت میں لکھے گئے، فرماتے ہیں:

"بچوں کو مسلم الثبوت، ہدایہ، بخاری اور ترمذی جیسی درسی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے والے سے کسی تاریخی مضمون کی توقع بھی نہ کرنی چاہیے، وہ بھی کل بیس دن کی یہ مدت ہے طلبہ امتحان کی تیاریوں میں مصروف ہیں، اسی میں کچھ فرصت ہمدست ہوئی، لکھتا چلا گیا اور اسی مسودہ کو پریس میں بھیج رہا ہوں۔"

قلم کی اس برق رفتاری اور علم کی اس صاعقہ پاشی کی مثال کم ملے گی !! عہد ماضی کے تعلیمی نظام کے لکھنے میں ان کے ذاتی خیالات بھی بے چین ہو ہو کر قلم سے ٹپکتے چلے گئے ہیں، اور یہ ذاتی خیالات زیادہ تر اس ناوک فگنی کا ردعمل ہے، جس کا ہدف مسلمانوں کا مذہبی تعلیمی نظام رہا ہے، جیسا کہ خود مولانا کا بیان ہے کہ ان ٹیسوں اور ہوکوں کی بے چینیاں ہیں، جو ان تیروں کے زخموں نے ان کے دل میں پیدا کر دی تھیں، اس کے دیباچہ کے حسب ذیل فقروں کے پڑھنے کے بعد اس کے مطالعہ کی نوعیت ہی بدل جاتی ہے، اور اس کے پڑھنے میں ایک کیف محسوس ہونے لگتا ہے۔

"مجھے رلایا گیا ہے، تب رویا ہوں، ستایا گیا ہوں، تب کراہا ہوں، ممکن ہے کہ اس سلسلہ میں بعض مواقع پر میرے نالے ذرا زیادہ بلند ہو گئے ہیں، قابو سے قلم کہیں باہر ہو گیا ہو اس میں مجھے معاف رکھا جائے۔"

جس سوز و درد کے ساتھ یہ کتاب لکھی گئی تھی، اس کے لحاظ سے اس کا مقبول ہونا لازمی تھا، حضرت سید صاحبؒ نے اس پر تبصرہ لکھتے ہوئے تحریر فرمایا تھا "ہمارے قدیم طریقہ تعلیم اور اصول تعلیم پر اس سے زیادہ جامع کتاب نہیں"۔ افسوس ہے کہ اس کی دوسری جلد شائع نہ ہو سکی۔

اس کتاب کے دیباچہ میں مولانا نے خود اپنے سے شکایت کی ہے، کہ وہ عمل کی قوت سے تقریباً تہی دم ہو چکے ہیں، اور اب ان میں علمی کام کا نہ عزم ہے، اور نہ ارادہ، لیکن ان کی طبیعت میں عجز و انکسار کچھ ایسا تھا کہ وہ اپنی نجی اور معاشرتی زندگی میں بھی اپنی جانب کسی عظمت و ہوا کے انتساب پسند نہ فرماتے تھے، مگر نقد ان عزم کے ا... قرائن کے باوجود ان کے مضامین ملک کے علمی رسالوں میں برابر شائع ہوتے رہتے تھے، ۱۹۴۴ء میں ان کا ایک طویل مضمون ندیم گیا میں

"تشاد متکلم اسلام کی شان میں" نظر سے گذرا تو اردو شعروشاعری میں بھی ان کے پاکیزہ ذوق اور ناقدانہ نظر کا اندازہ ہوا۔

۱۹۴۷ء میں ان کی ایک ضخیم کتاب "اسلامی معاشیات" حیدر آباد سے شائع ہوئی جو بڑی تقطیع کے ۴۵۳ صفحے پر مشتمل ہے، اب تک اس موضوع پر اردو میں کوئی کتاب نہ تھی، اور غالباً عربی زبان میں بھی اس نوعیت کی کوئی تصنیف نہیں ہے، یہ مولانا کے اجتہاد اور نکی وسعتِ نظر کی دلیل ہے کہ انھوں نے اسلامی معاشیات پر ایک کتاب لکھ کر معاشیات کے دوسرے نظاموں کے مقابلہ میں اسلام کا ایک مستقل نظام پیش کر دیا، ممکن ہے کہ ان کی **اسلامی معاشیات** فنی حیثیت سے ماہرین کی نگاہوں میں اہم نہ ہو، لیکن اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ مولانا ہی نے اردو میں اسلامی معاشیات کے لٹریچر کی داغ بیل ڈالی، آگے چل کر اس موضوع پر بہت سی کتابیں شائع ہوں گی، اور اسلامی معاشی نظام کا ایک واضح اور روشن نقشہ لوگوں کے سامنے آئے گا، لیکن اس فن کی تعمیر کا معمار اول مولانا ہی کو تسلیم کرنا پڑے گا، کلام پاک کی ایسی آیتوں سے جن کی تلاوت ہم روزانہ کرتے ہیں، انھوں نے ایسے حقایق پیش کیے ہیں کہ ان کو پڑھنے کے بعد ان کی غیر معمولی بصیرت اور ذہانت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے،

ابھی اس کتاب کا چرچا اہل علم کے حلقہ میں ہو ہی رہا تھا کہ کراچی سے ان کی ایک دوسری کتاب **حضرت امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی** شائع ہوئی، یہ بھی بڑی تقطیع کے ۳۹۹ صفحات پر مشتمل ہے، راقم اپنی نااہلی کی وجہ سے ان کی کسی کتاب پر علمی تبصرہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا، ان کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ وہی ارباب علم و نظر کر سکتے ہیں جو خود بھی مولانا کی طرح علوم و فنون کے بحر بیکراں کے شناور ہوں، لیکن ان کی کتابوں پر سرسری نظر ڈالنے سے

بھی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کے قلم سے علم کا دریا بہہ رہا ہے، اور دریا کی موجوں کی طرح ان کی تحریر میں اضطراب و تلاطم ہے، اور جس طرح دریا کی پرشور لہروں میں ہمواری نہیں ہوسکتی اسی طرح ان کی پرزور تحریروں میں موضوع کے لحاظ سے ترتیب و تنظیم نہیں ہوتی، وہ خود ایک مکتوب میں حضرت سید صاحبؒ کو لکھتے ہیں،

"ایک دفعہ جھونک میں لکھنے بیٹھتا ہوں تو لکھتا چلا جاتا ہوں، پھر اس کی نظر ثانی حک و اصلاح میرے لیے مشکل ہوتی ہے، میں چھاپنے والے پر چھوڑ دیتا ہوں کہ خرافات کو حذف کرکے کارآمد اجزا کا انتخاب کرلیں۔"

لیکن جن چیزوں کو وہ خرافات سمجھتے تھے، وہ اب بیش بہا معلومات کا خزانہ معلوم ہوتے ہیں، ان کے مضامین اور تصانیف میں موضوع سے غیر متعلق باتیں بکثرت ہوتی ہیں جن سے ان کی تحریر میں بڑی طوالت پیدا ہو جاتی ہے لیکن ان غیر متعلق باتوں میں بھی اتنے کارآمد معلومات ہوتے ہیں، جو بہت سی کتابوں کے مطالعہ سے بے نیاز کر دیتے ہیں، پھر تحریر کے آرٹ کے نقطۂ نظر سے یہ کہنا پڑے گا کہ وہ اطناب کے بادشاہ تھے، وہ کوزہ کے چند قطروں کو اپنے سیال قلم سے سیلاب بنا دیتے تھے، اور ایسا کرنے میں ان کو کوئی غیر معمولی محنت و مشقت نہ کرنی پڑتی، وہ جیسے بولتے تھے، ویسے ہی لکھتے تھے، اسی لیے ان کی تحریر میں تکلف اور تصنع نہیں پایا جاتا، اگر ان سے ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی بھی گفتگو کرتا تو اس میں بھی اپنی ذہانت سے کوئی نہ کوئی عالمانہ یا معلمانہ نکتہ ضرور پیدا کر دیتے، یہی حال ان کی تحریر کا تھا، کہ بات میں بات پیدا کرتے چلے جاتے تھے، حافظہ بڑا قوی تھا، جو چیز کہیں ایک بار پڑھ لیتے وہ ذہن میں محفوظ ہو جاتی تھی، اور جب لکھنے بیٹھتے تھے تو حافظہ اپنی پوری تحویل ان کے حوالہ کر دیتا، اور وہ ان سب کو اپنی تحریر میں سمیٹنے کی کوشش کرتے، اور ان کے سمیٹنے میں

ان کا قلم بالکل نہ تھکتا، اور جب ایک بار چل جاتا تو پھر نہ رکتا۔ افسوس ہے کہ ان کی صحت نے ان کے قلم کا ساتھ نہیں دیا، ورنہ کمیت کے لحاظ سے کوئی معاصر اہل قلم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، پھر بھی انھوں نے جس قدر لکھ دیا ہے، اس کی کیفیت سے وہی لطف اندوز ہو سکتے ہیں جو خود بھی اہل نظر اور دیدہ ور ہیں، یہ ضرور ہے کہ ان کے مضامین میں تہذیب و تنظیم کے بجائے ایک قسم کا انتشار ہے، جو درا صل ان کی علمی شوریدگی کا نتیجہ ہے، اس کے باوجود ان کی کوئی تحریر ایسی نہیں جو فکر و نظر کی گہرائی اور وسعت سے خالی ہو، یا جس میں ان کی غیر معمولی ذہانت اور بصیرت نمایاں نہ ہو، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خالی اوقات میں سوچا کرتے تھے، اور جب لکھنے بیٹھتے تو سفینہ ان کے علم سینہ کا متحمل نہیں ہوتا تھا، وہ اپنے غور و فکر کے سارے نتائج کسی نہ کسی شکل میں ان لوگوں تک پہنچا دینے کی کوشش کرتے تھے، جو فائدہ اٹھا سکتے تھے علم کے ایک معلم سے یہی توقع کی جاتی ہے، اس لحاظ سے وہ اپنے مضامین اور تصانیف میں عالم اور معلم دونوں نظر آتے ہیں، لیکن وہ ہمیشہ علم کی عظمت و برگزیدگی کے قائل رہے، اس لیے اس کا کبھی "بیوپار"[۱] نہیں کیا، وہ کتاب لکھکر ناشر کو دیدیتے، وہ چھپ کر دوسروں کے ہاتھوں میں پہنچ بھی جاتی اور ان کو خبر تک نہ ہوتی، ان کو جب معلوم ہوتا تو کبھی ناشر کو لکھ کر منگواتے، یا کوئی لاکر دیدیتا تو دیکھ کر خوش ہو جاتے کہ چھپ گئی، اور یہی ان کی ساری محنت کا صلہ ہوتا، معاوضہ یا رائلٹی قبول کرنا مطلق پسند نہ کرتے تھے، اور پھر اپنے علمی کارناموں کے رد و قبول اور داد و تحسین سے بھی بے نیاز تھے، ایک موقع پر راقم کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا۔

"غریب مضمون نگاروں اور کتب سازوں کی محنت و زحمت کا اندازہ وہ

---

[۱] یہ لفظ جناب رشید احمد صاحب صدیقی کے ایک مضمون سے مستعار ہے،

طبقہ کیا کرسکتا ہے جو صرف پڑھ کر کتاب کو چھوڑ دیتا ہے، دس منٹ میں جو مضمون پڑھ

لیا جاتا ہے، بسا اوقات اس کی تیاری میں دس مہینے صرف ہوتے ہیں، اپنی کاریگری سے

کاریگر کو جو خوشی ہوتی ہے وہی کام کا کافی صلہ ہے۔"

اور غالباً وہ اردو کے تنہا مصنف ہیں جن پر کسی اہل قلم نے حریفانہ یا معاصرانہ تنقید یا

خردہ گیری کی جرأت نہیں کی، جو ان کے علمی اخلاص کی ایک بڑی دلیل ہے،

وہ بڑے شیریں بیان مقرر بھی تھے، یہ برابر خبر ملتی تھی کہ حیدر آباد میں عید میلاد النبی کے

موقع پر حضور نظام خاص طور پر ان کی تقریر سننے کے لیے شریک ہوتے ہیں، وہ اپنی تقریروں

میں بڑے دلچسپ قصے اور لطیفے بیان کرتے جن سے سامعین بہت محظوظ ہوتے، ان کو واعظانہ

رنگ کے علاوہ تبلیغی، علمی اور کبھی کبھی سیاسی تقریر کرنے میں بڑی قدرت حاصل تھی، وہ اپنی

تقریر کی "متین شوخی" سے لوگوں کو ہنساتے تو اپنے عالمانہ استدلال اور عارفانہ نکتہ وری

سے ان کو متاثر بھی کرتے تھے۔

دسمبر ۱۹۴۵ء میں وطن جاتے ہوئے بہار شریف پہنچا تو میرے پہنچنے سے ایک روز

پہلے وہاں مسلمانوں کا ایک بہت بڑا سیاسی جلسہ تھا، اس میں مولانا کو تقریر کرنے کے لیے

خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا، میں تقریر سننے کی سعادت سے تو محروم رہا، لیکن ہر شخص کی زبانی

ان کی پرجوش تقریر کا ذکر سنا، اور پھر جب میں مولانا سے ملنے کے لیے حاضر ہوا تو ان کے

اردگرد بہت سے لوگوں کو پایا جو ان کی تقریر کی تعریف کر رہے تھے، مگر وہ اپنے مزاحیہ

انداز میں اس مدح سرائی کا موضوع بدل دینے کی کوشش کرتے، ان میں کبھی بھی تشخص پسندی

نہیں آئی، اسی لیے وہ اپنی فضیلت اور برگزیدگی کی داد لینے یا سننے میں ہمیشہ مستغنی اور بے نیاز

رہے، حالانکہ وہ خود ہم عصروں کے کمال کی داد دینے میں بڑے فیاض تھے، بلکہ بعض دوستوں

کے اوصاف بیان کرنے میں تو قصیدہ خواں ہو جاتے۔ ان کے ہم چشموں میں شاید ہی کسی کو انکی تحریر سے کوئی تکلیف پہنچی ہو۔ ان کی طبیعت میں بڑی سٹھاس تھی، اس لیے نجی گفتگو میں بھی ان کی زبان سے کبھی کوئی ایسی بات نہ نکلتی جس سے کسی کی دل آزاری ہو بعض اوقات تو اسی شفقت و محبت میں نوآموز اہل قلم کے لیے ایسے تعریفی کلمات لکھ جاتے جن کا وہ مستحق نہ ہوتا لیکن ان کی تعریف یا داد دل بڑھانے اور کام کا حوصلہ پیدا کرنے کی خاطر ہوتی، اور ان کی اس مخلصانہ فراخدلی نے ان کے بہت سے شاگردوں کو اہل قلم اور مصنف بنا دیا، اور ان کے احباب تو ان کے علم و فضل کے علاوہ ان کی سیر چشمی، رواداری، جوہر شناسی، قدر دانی، مرنجاں مرنج طبیعت اور مزاج کی شگفتگی سے ہمیشہ ان کے گرویدہ رہے۔

(باقی)

معارف سلیمان نمبر

معارف کا سلیمان نمبر جو شائقین و قدردانانِ معارف کی طلب و خواہش پر ۱۹۵۵ء میں شائع کیا گیا تھا، اس کے اب بہت کم نسخے رہ گئے ہیں، آپ فوراً خرید لیں، ورنہ طبع ثانی کا انتظار کرنا پڑے گا، اس میں مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے سیر و سوانح، اخلاق و شمائل، فضائل و کمالات اور ان کے علمی و دینی و قومی و ملی و اصلاحی و تعلیمی کارناموں اور خدمات کا پورا مرقع آگیا ہے۔ پہلے سیرت و سوانح کا حصہ ہے، پھر عمومی حیثیت کے مضامین ہیں، آخر میں مرحوم کے سلوک و تصوف پر روشنی ڈالی گئی ہے اور پھر قطعات تاریخ ہیں۔ قیمت علاوہ محصول ڈاک للعہ

مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی

منیجر

منوچہری دامغانی

از جناب مولوی ضیاء احمد صاحب بدایونی ایم اے ریڈر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی

عرب فاتح جہاں گئے اپنا مذہب، تہذیب، زبان و ادب بھی ساتھ لیتے گئے، اور مفتوحین کی تہذیب و تمدن پر ایک ہمہ گیر اور دیرپا اثر چھوڑ گئے، عراق، شام، مصر اور دوسرے ممالک کی تاریخ ہمارے دعوے کی شاہد ہے، البتہ جہاں تک زبان کا تعلق ہے، ایران ضرور ایک حد تک سخت جان نکلا لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ ایرانی زبان اور ایرانی ادب پر بھی عربی کا زبردست اثر ہے، الفاظ، تراکیب، انداز بیان، طرز تخئیل، تلمیحات، اشارات، امثال، اصطلاحات، تشبیہات، استعارات، قواعد زبان، اصول اوزان، غرض کون شعبہ ہے جو عربی کا مرہون احسان نہیں، فارسی ادیبوں کی تصانیف میں ہر ہر قدم پر آیات و احادیث، اقوال و اشعار عرب کے حوالے ملیں گے، فارسی شعرا کے یہاں بھی کم و بیش یہی حال ہے، لیکن اس وصف میں منوچہری کی شخصیت سب سے ممتاز نظر آتی ہے، اس کے کلام میں عربی کی صدائے بازگشت اس قدر نمایاں ہے کہ جو شخص عربی ادب پر کافی دسترس نہ رکھتا ہو، وہ اس کے اشعار سے پورے طور پر حظ نہیں اٹھا سکتا،

منوچہری غزنوی دور کا شاعر ہے، اور تمام تذکرہ نگاروں نے اس کی قصیدہ نگاری کو سراہا ہے، صحیح سال ولادت تو معلوم نہیں، البتہ یہ مسلم ہے کہ وہ چوتھی صدی ہجری کے آخر میں پیدا ہوا، لباب الالباب، تذکرۃ الشعرا دولت شاہ، مجمع الفصحاء، شعر العجم، تاریخ ادبیات

ایران شفق، اور براؤن وغیرہ تقریباً سب نے اس کی کنیت ابوالنجم، نام احمد اور تخلص منوچہری بتایا ہے، لباب الالباب میں اس کے باپ کا نام قوص (؟) اور دولت شاہ نے احمد قلبن کیا ہے، اسکے برخلاف صاحب مجمع الفصحا کے نزدیک اس کے باپ کا نام یعقوب تھا، اگرچہ اس نے اپنا ماخذ نہیں بتایا لیکن اس کا بیان قرین قیاس معلوم ہوتا ہے، وہ شاہی خاندان سامانیہ سے تعلق رکھتا تھا، جیسا کہ خود کہتا ہے

منم از نژاد بزرگان ساماں کہ بودند شاہان چیز دکو اکب

اس کا لقب شصت گلہ تھا، جس کی توجیہ تذکرہ نگاروں نے یوں کی ہے کہ وہ سلاطین کی فیاضی سے نہایت دولتمند اور ساٹھ گلوں کا مالک تھا لیکن ڈاکٹر شفق[1] کا خیال ہے کہ یہ در اصل ایک دوسرے متاخر شاعر شمس الدین احمد بن منوچہر کا لقب تھا، ہمنامی کے التباس نے یہ لقب منوچہری کو بخش دیا، مجمع الفصحا کے مولف کی تحقیق یہ ہے کہ یہ شصت گلہ نہیں بلکہ شست گلہ ہے، یعنی ایسا شخص جس کا انگوٹھا چھوٹا اور موٹا ہو، یا اس میں کوئی ذاتی نقص ہو، اس معنی کی تصدیق لغت سے بھی ہوتی ہے، اس کا وطن دامغان تھا، جو خراسان کا ایک شہر ہے، اور طہران کے شمال مشرق میں واقع ہے، اکثر بڑے اور مشہور آدمیوں کی طرح اس کے ابتدائی حالات زندگی بالکل تاریکی میں ہیں، لیکن اتنا معلوم ہے کہ وہ شروع ہی سے غیر معمولی دل و دماغ اور حیرت انگیز ذہن و حافظہ لے کر آیا تھا، اور لڑکپن ہی میں بدیہہ گوئی کی آزمایشوں میں کامیاب رہ کر مشہور ہو گیا تھا، اس کے کلام کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ علوم متداولہ اور عربی ادب میں دستگاہ کامل رکھتا تھا، چنانچہ خود کہتا ہے،

من بدانم علم دین و علم نحو و علم طب

---

[1] تاریخ ادبیات ایران از شفق و راحۃ الصدور،

اس کو عام طور پر شعرائے دربار محمود میں شمار کیا جاتا ہے، مگر جیسا کہ علامہ شبلی نے لکھا ہے اس کا دربار محمود سے تعلق درست نہیں، کیونکہ اس کی کلیات میں کوئی قصیدہ محمود کی مدح میں نہیں ملتا، دراصل وہ امیر منوچہر بن قابوس بن وشمگیر کے دربار سے متوسل تھا، اور اسی مناسبت سے اس نے منوچہری تخلص اختیار کیا تھا، منوچہر زیاری خاندان کا فرمانروا تھا، جس نے اکیس سال طبرستان میں حکومت کرکے ۴۲۴ھ میں وفات پائی، اس سے تین سال[1] قبل محمود غزنوی کی وفات ہوئی اور اس کا فرزند محمد تخت پر بیٹھا، مگر وہ جلد ہی قید کر لیا گیا، اور اس کا بھائی مسعود وارث سلطنت ہوا، منوچہری کے اکثر قصائد اسی مسعود اور اسکے وزرا، و امرا کی مدح میں ملتے ہیں، بعض قصائد منوچہر وغیرہ کی تعریف میں بھی محفوظ رہ گئے ہیں، اس بنا پر کہنا چاہئے کہ وہ سلطان مسعود کے عہد میں دربار غزنی کا متوسل اور مقربین سلطان میں شامل ہوا، کہا جاتا ہے کہ وہ ملک الشعرا عنصری کا شاگرد تھا، لیکن یہ محض دربار میں رسائی حاصل کرنے کا ذریعہ اور اس کی خوشنودی کا طریقہ تھا، ملاحظہ ہو قصیدہ شمع، ورنہ وہ عنصری سے شاعری میں برتر تھا، دولت شاہ اور تقی کاشانی کا بیان ہے کہ وہ ابو الفرج[2] کا شاگرد تھا، مگر ہمیں اس کے تسلیم کرنے میں دو وجہ سے تامل ہے، اول تو قدیم تذکرہ نگار اس تلمذ کا ذکر نہیں کرتے، دوسرے ابو الفرج سجزی کے کلام کا جو نمونہ دستیاب ہوا ہے وہ اسکا درجہ دوم کے شاعر سے زیادہ حیثیت نہیں دیتا، اگر یہ بیان صحیح ہے تو اس کی خوش قسمتی میں کیا شک ہے کہ اس کو منوچہری سا شاگرد ملا، جو فخر استاد ثابت ہوا، دولت شاہ کے بیان کے بموجب یہ ابو الفرج سجزی عنصری کا بھی استاد ہے، غالباً اسی سے لوگوں کو دھوکا ہوا، اور وہ سجزی

---

[1] جن اشعار سے عوفی کو دھوکا ہوا ہے وہ محمود کی نہیں بلکہ مسعود بن محمود کی مدح میں ہیں، دوسرے تذکرہ نگاروں نے بھی عوفی کی تقلید کی ہے، اغلب یہ ہے کہ وہ ۴۲۱ھ میں رے سے غزنی پہنچا ہے [2] دیکھو تذکرہ دو

منوچہری کا استاد سمجھ بیٹھے، اس کے حالات اور کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت دولتمند تھا، اور لوگ اس پر حسد کرتے تھے، منوچہری سالک راہ طریقت اور امام الحرمین[1] کا شاگرد اور معتقد تھا اس نے عمر زیادہ نہیں پائی، اور ۴۳۲ھ[2] میں سفر آخرت کیا۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، منوچہری کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت جس میں وہ سب سے منفرد ہے، عربی اسلوب ہے، قبل اس کے کہ اس کی تفصیل پیش کی جائے، عربی شاعری پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنا ضروری ہے،

عہد جاہلیت یعنی زمانہ قبل از اسلام میں عربوں کی زندگی تمامتر بدویت کی زندگی تھی، نہ وہ کسی پر حاکم تھے نہ کسی کے محکوم، ہر قبیلے کا شیخ جدا تھا، اسی کو جا ہو حاکم سمجھ لو۔ وہ ایک بے آب و گیاہ ملک کے رہنے والے تھے، ان کی ملکیت میں اونٹوں کے گلے اور بکریوں کے ریوڑ کے سوا کیا تھا، جب تک کسی علاقے میں چارہ، پانی ملا، وہاں ٹھہرے، جب وہ ختم ہو گیا تو خیمے اکھاڑ کر دوسری جگہ جا بسے، اکثر ایسا ہوتا تھا کہ چارے اور پانی پر دوسرے قبیلے سے لڑائی چھڑ جاتی اور برسوں جاری رہتی، فاتح فریق مفتوح کی عورتوں کو اسیر کر لیتا اور مویشی کو ہانک کر لے جاتا،

یہی وجہ تھی کہ وہ لڑکیوں کی پیدائش کو اپنے حق میں ایک فال بد سمجھتے تھے، اسی بدوی زندگی میں کبھی ایسا ہوتا کہ کسی نوجوان کو اپنی بنت عم یا ہمسایہ قبیلے کی کسی دوشیزہ سے پاک محبت ہو جاتی، اور دونوں میں چھپ چھپ کر ملاقاتیں ہوتیں، ان حالات کے ساتھ قدرت نے ان کو بعض اعلیٰ اخلاق سے بھی بہرہ ور کیا تھا، یہ صحیح ہے کہ وہ تندخو، جنگجو، عیش پرست، اور سخت دل تھے، مگر اس کے ساتھ ہی شجاعت، سخاوت، حریت ضمیر اور وفائے عہد میں بھی ان کا جواب نہ تھا،

---

[1] امام الحرمین ابو المعالی عبد الملک بن محمد جوینی جنکا شمار امام غزالی کے اساتذہ میں ہے [2] لباب الالباب عوفی

گرم مزاج، جوشیلی طبیعت، آزادانہ زندگی ان کی خصوصیات تھیں جن پر ان کو ناز تھا، زبان آوری میں وہ خود کو عرب (کھل کر بات کرنے والا) اور اپنے سوا سب کو عجم (گونگا) کہتے تھے، پھر خدا نے ان کو زبان ایسی عطا کی تھی، جس کا ذخیرۂ الفاظ بے پناہ، جس کی قوت اَن تھاہ اور جس کی صلاحیتیں غیر معمولی تھیں، یہی وجہ ہے کہ جس موضوع پر وہ کچھ کہتے وہ از دل می خیزد و بر دل می ریزد کا مصداق ہوتا، لڑائیوں کے رجز، کامیابی کے فخریہ ترانے، مقتولین جنگ کے مرثیے، حسن و عشق کے نغمے جس جوش اور زور کے ساتھ عربی شاعری میں ملتے ہیں، دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں بھی بمشکل ملیں گے، ان کے کلام میں مدح اور ہجو کے نمونے بھی موجود ہیں، مگر خوبی یہ ہے کہ مدح اکثر صلے سے بے نیاز، اور ہجو عموماً ابتذال سے پاک ہے، اسی کا نتیجہ تھا جب نابغہ اور اعشیٰ نے مدح کا صلہ قبول کیا تو وہ تمام قوم میں بدنام ہوگئے، ایک مرتبہ زہیر نے ہرم بن سنان کی مدح میں کچھ شعر کہے، کیونکہ اس نے اپنے اثر سے دو قبیلوں میں مصالحت کرا دی تھی، ہرم نے شاعر کو ایک گراں قدر رقم بھیجی، اس نے رقم تو لے لی، لیکن اس روز سے یہ طریقہ اختیار کر لیا کہ جب کسی محفل میں جاتا اور وہاں ہرم بھی موجود ہوتا، تو ہرم کو چھوڑ کر باقی حاضرین کو سلام کرتا اور کہتا " انعموا صباحاً غیر هرم بن سنان - وخیرکم استثنیت "

اسی طرح ایک بار کسی اموی خلیفہ نے ایک شاعر سے اپنی مدح کی فرمایش کی، اس نے چھوٹتے ہی جواب دیا " اِفعَل حتیٰ اَقولَ " کچھ کرکے دکھاؤ تو میں کہوں،

غرض ان کی شاعری زندگی کی ترجمان، تصنع سے پاک اور صداقت کی تصویر ہوتی تھی،

وان اشعر بیت انت قائلہ بیت یقال اذا انشدتہ صدقا

یہی وجہ تھی کہ شاعری کو عرب سوسائٹی میں خاص وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، اور جب کسی قبیلے میں کوئی شاعر نامور ہوتا تو دوسرے قبائل آآکر اس کو مبارک باد دیتے، عربی

شاعری کا عموماً اسلوب یہ تھا کہ شاعر دوران سفر میں اپنے رفیقان راہ کی طرف مخاطب ہو کر کہتا ہے، ٹھہرو، ذرا سامنے والے کھنڈر پر رولیں، یہ وہ جگہ ہے جہاں ایک زمانے میں محبوبہ کا قبیلہ ٹھہرا تھا، یہ ان لوگوں کے خیموں کا مقام ہے، یہاں ان کے اونٹ باندھے جاتے تھے، اس جگہ ان کے چولھوں کا نشان ہے، کیا زمانے تھے، جب چھپ چھپ کر محبوبہ سے ملاقاتیں اور راز و نیاز کی باتیں ہوا کرتی تھیں، اسی ضمن میں ایام وصال کی یاد، عہد فراق کے مصائب کی داستان، کوہ و بیابان کی سختیاں، اپنے کارناموں اور اپنے قبیلے کے مفاخر کا ذکر، اپنے اونٹ یا گھوڑے کی رفاقت کا بیان سب کچھ آجاتا تھا، یہ سیدھے سادے سچے واقعات اب بھی طبیعت پر اثر کیے بغیر نہیں رہتے، یہاں نمونے کے طور پر ہم امرء القیس کے مشہور معلقہ کے چند اشعار کا خلاصہ پیش کرتے ہیں، آغاز یہ ہے:

قفا نبك من ذكرى حبيب و منزل بسقط اللوى بين الدخول فحومل

رفیقو ٹھہرو ذرا ہم دوست اور اس کے فرودگاہ کی یاد میں جو سقط اللوی میں واقع ہے، رو لیں

پھر کہتا ہے کہ اگرچہ باد جنوب و شمال چلتی رہتی ہے، مگر دیکھو اس کے قیام گاہ کے نشان اب تک باقی ہیں، آہ وہ دن نہیں بھول سکتا جب محبوبہ جدا ہو رہی تھی، ادھر میری آنکھوں سے اشکوں کی جھڑی جاری تھی، ادھر احباب تسلی دے رہے تھے۔ اس کے بعد شاعر حسینوں سے ملنے اور ان کے ساتھ رنگ رلیاں منانے کا بیان بہت مزے لے لیکر کرتا ہے، اور عشق کا جلاپا، محبوبہ کا سراپا، اپنی بیقراری، اس کی دلداری، اپنی دلیری و پامردی، گھوڑے کی بیاباں نوردی، ریگزار و کہسار کے مراحل، سفر و حضر کے منازل، عجب نادر اور پر اثر انداز میں دکھاتا ہے، نیچرل تشبیہات اور لطیف اشارات کی بدولت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خیال کے پردۂ سیمیں پر ڈیڑھ ہزار برس پہلے کی چلتی پھرتی تصویریں جلوہ گر ہیں،

کی مثالوں سے ہمارے دعوے کی تصدیق ہوسکتی ہے۔ اس کا ایک قصیدہ ہے، "وقت بہار آمد وقت ورد مورد" اس میں غیر مانوس عربی قوافی کی بھرمار ملاحظہ ہو، مجند، عسجد، معبد (ایک مطرب کا نام)، مصعد، مسہد، مطرد، ارمد، مبلد، ارعد، موقد، مبرد، مسدد، مزرد، مردد، یقود، قدفد وغیرہ، اسی طرح دسن، فطن، ذدیزن، مغتکن، مجن، شطن، عکن، لاتعجلن، عطن، یا باطیہ، اودیہ، اندیہ، تہدیہ، اخبیہ، ادعیہ، خابیہ، الویہ، ادیہ، اضحیہ، یا سے (میہ ایک معشوقہ کا نام)، حے، یبوے، أبَے، بنے، قُصَے وغیرہ وغیرہ، وہ عربی تراکیب بلکہ مصرع کے مصرعے اس بے تکلفی و صفائی کے ساتھ لاتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے، چند شعر سنیے:

سلامٌ علیٰ دار ام الکواعب　　بتان سیہ چشم عنبر ذوائب
رسوم الطلل والدیار الدوارس　　چو بر صدر منشور توقیع صاحب
ہمن را زگشتہ ویار سلاحف　　چمن زار گشتہ دجار ثعالب

. . . .

زخیمہ بروں آمدہ خوبرویاں　　گرازاں چو طاوس گرد مشارب
لب لعل عناحاک خم جعد کافر　　رخ خوب لامع سر زلف لاعب
معنبر ذوائب معقد عقائص　　مسلسل غدائر مسجل ترائب
خراماں بت من میان جواری　　چو حور بہشتی میان کواعب

. . . .

فگندم بہ حال و زمام نجیبم　　وألهمت بالنحر والنحر واجب
چو مرکب فدائے بت دلستاں شد　　مرا گفت دلبر کہ طال المعاتب
شدم از صحاری من اندر عماری　　وقد صرت حقاً سعید العواقب

تمہید طویل ہوگئی لیکن ان اصحاب کی خاطر جو عربی سے متعارف نہیں ہیں، ایسا کرنا ناگزیر تھا، غرض منوچہری کے قصیدوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ عربی اشارات و تلمیحات بکثرت ہیں، بظاہر تو یہ ایک طرح کی روایت پرستی اور نقالی معلوم ہوتی ہے کہ ایک شخص ایران کے خیابانوں اور مرغزاروں میں رہتا ہوا عرب کے ریگستانوں، ورٹیلوں کی تصویر کشی کرے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی رنگ (شروع میں کتنا ہی سطحی اور مصنوعی ہو) مرور ایام سے کسی شخص کے دل و دماغ پر اتنا چھا جائے کہ پھر وہ اس سے باہر نکلنے اور سوچنے پر قادر نہ اس صورت میں وہ مصنوعی لبادہ جو بطور تفنن استعمال کیا تھا، آخر اصلی پیرہن کی طرح جسم چست ہو جاتا ہے، دور کیوں جاؤ، ریاض خیرآبادی کے دیکھنے والے ابھی بکثرت ہیں، مرحوم نے عمر بھر کبھی دختِ رز کو منہ نہیں لگایا، اس کے باوجود ان کی شاعری میں تین چوتھائی کے بقدر خمریات ملتی ہیں، اور کون کہہ سکتا ہے کہ ان کی شاعری جوش و اثر میں کسی سے کم ہے بات یہ ہے کہ انھوں نے شروع میں غالباً تمثیل (Allegory) یا رمز (Symbolism) کے طور پر عشق کی سرمستی کو شراب سے تعبیر کیا، رفتہ رفتہ یہی کیفیت ان کے لیے حقیقت، اور قال ان کے حق میں حال بن گیا، ایک خالی الذہن شخص ان کا کلام پڑھ کر لامحالہ یہ سمجھے گا کہ ریاض کی تمام عمر میخانے ہی میں گذری ہوگی۔

آمدم برسرِ مطلب، منوچہری کا کلام بیشتر قصائد اور مسمطات[1] پر مشتمل ہے، ان دونوں کو اس کے شاہکار سمجھنا چاہیے۔ یوں تو اس کے یہاں غزلیات، قطعات اور رباعیات بھی ملتی ہیں، مگر ان میں کوئی خاص بات نہیں ہے، موضوع کے لحاظ سے اس کا کلام مدح یا خمریات سے باہر نہیں جاتا، لیکن تمام اصناف پر عربی ادب کی چھاپ لگی ہوئی ہے، نیز

---

[1] منوچہری نے بکثرت مسمط لکھے ہیں اور خوب لکھے ہیں بعض کا خیال ہے کہ وہ پہلا مسمط گو شاعر ہے۔

آپ نے دیکھا کہ نہ صرف تراکیب و عبارات عربی ہیں، بلکہ انداز تخیل و پیرایۂ بیان بھی وہی ہے، وہی امرا القیس کی طرح معشوقہ اور اس کی سہیلیوں سے چھیڑ چھاڑ، وہی ان کی مہمانی کیلیے اپنا اونٹ ذبح کرنا، اور پیادہ ہونے پر معشوقہ کی عماری میں جگہ پانا، وہی بیہڑ اور ریگستان میں اونٹوں پر سفر، وہی تاریک اور طوفانی رات میں راہ کے مصائب،

ایک جگہ عربی شعرا کے نام گناتا ہے، مثلاً

کو جریر و کو فرزدق کو زہیر و کو لبید ۔۔۔ روبۂ عجاج و دیک الجن و سیفِ ذویزن

دوسرے قصیدے میں کہتا ہے

امرا لقیس و لبید و اخطل و اعشائے قیس ۔۔۔ بر طلل ہا نوحہ کردندے و بر رسم تلے

آن کہ گفت است آذنتنا و آنکہ گفت اد نتنی[1] ۔۔۔ آنکہ گفت السیف اصدق آنکہ گفت اہلی ہوی

ایک مقام پر اپنے فخر اور اپنے حریف پر طعن کے طور پر لکھتا ہے:

من بسے دیوان شعر تازیاں دارم زبر ۔۔۔ تو ندانی خواند الا ہبی بصحنک فاصبحین[2]

اس نے متعدد قصیدے شعرائے عرب کے جواب میں ان ہی کی زمینوں میں لکھے ہیں، اور اس کا فخر کے طور پر اظہار بھی کر دیا ہے، چنانچہ ایک نظم میں جو عبد اللہ بن المعتز کی (و نحن بنو العم اولی بہا) زمین میں لکھی ہے، کہتا ہے:

بہ زیر و بم شعر اعشائے قیس[3] ۔۔۔ زننده ہمی زد بہ عنا بہا

---

[1] پہلا ٹکڑا حارث بن حلزہ یشکری کے قصیدے کا ہے، دوسرا کُثیر کے قطعہ کا، تیسرا ابو تمام کے اور چوتھا متنبی کے قصیدے کا ہے، اد نتنی کی بجائے شعر العجم میں الاہبی، اور فرانس کے مطبوعہ دیوان منوچہری میں الذ انتین ہے، لیکن دونوں غلط ہیں [2] یہ عمرو بن کلثوم تغلبی کے قصیدے کا ابتدائی ٹکڑا ہے [3] یہ بحر اعشیٰ قیس سے منسوب ہو کر ایران میں راہ اعشیٰ (اعشیٰ کی وصل) ہی کے نام سے مشہور ہے،

وکاس شربتُ علےٰ لذۃٍ | واخریٰ تداویتُ منہا بہا
لکے یعلم الناس انی امرءٍ | اخذت المعیشۃ من بابہا

علیٰ ہٰذا: بہ آں وزن ایں شعر گفتم کہ گفت است | ابوشیص اعرابیؒ باستانی
اشاقک[1] واللیل ملقی الجران | غراب ینوح علی غصن بان

عربی ادب اور عربی تاریخ کے حوالے جس قدر منوچہری کے یہاں ملتے ہیں کسی فارسی شاعر کے کلام میں نہیں پائے جاتے۔ اعشیٰ کا سودہ بن علی یمانی (صحیح ہوذہ بن علی یمامی ہے) سے، ابو نواس بن ہانی کا خصیب مالک سے، علی بن ابراہیم کا ہارون رشید سے شاعری کے گراں قدر صلے حاصل کرنا اس کے اشعار میں آیا ہے جس کے لیے عربی ادب و تاریخ سے آگاہ ہونا ضروری ہے، اسی طرح معبد[2]، صاحب بن عباد، مبرد، ابو معاذ، بشار، ابن [illegible] ابن رومی، اصمعی، ابن جنی، جمیل، بثینہ، عزہ، جریر، ام اوفی، سیبویہ، جحی، [illegible] اشعری، اور دوسری تلمیحات کا حال ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ عربیت فردوسی کی ایرانیت کا ردعمل تھی۔

علوم کی اصطلاحات بھی اس نے اکثر برتی ہیں، مثلاً:

منجم ببام آمد از نورسے | گرفت ارتفاع سطرلابہا
زدہ چتر ناہید اندر مشارق | گرفتہ زحل راہ سوے مغارب
ثریا چو در تاج مرجان عمانی | زبانا چو در دیر قندیل راہب
ہم بداں رہ کاشتقاق فعل از فاعل بود | سعد بیرخ از کینت وز نام تو گیرد اشتقاق

---

[1] عام نسخوں میں ساتاک ہے، مگر صحیح اشاقک ہے [2] ان تلمیحات کے لیے عربی ادب و تاریخ کی طرف مراجعت کی جائے۔

با نظم ابن رومی و با نثر اصمعی	با شرح ابن جنی و با نحو سیبویہ
با خط ابن مقلہ و با حکمت زہیر	با حفظ ابن معتز و با صحبت اُبے
شدہ نسر طائر بسان سہ بیضہ	شدہ نسر واقع چنان شاخ نخلے

آخری شعر جس قصیدے کا ہے اس میں برابر کئی شعروں میں نجوم کی اصطلاحات بے تکلف استعمال کرتا چلا گیا ہے،

اس وصف کے علاوہ منوچہری کی دوسری خصوصیات پر بھی نظر ڈالتے چلیے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ایک فطری شاعر (Born poet) تھا، اور جو خصوصیات ایسے شاعر کے لیے درکار ہیں وہ اس میں بدرجۂ کمال موجود تھیں سب[1] جانتے ہیں کہ شاعری کی عمارت دو بنیادوں پر قائم ہے تخئیل اور محاکات، اگرچہ شعر میں بڑی حد تک تخئیل کی کارفرمائی ہوتی ہے، تاہم محاکات کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا،

منوچہری کے کلام میں تشبیہات کی ندرت اور فراوانی کو تخئیل کا، اور منظر نگاری، واقعہ نگاری اور سراپا نگاری کو محاکات کا کرشمہ سمجھنا چاہیے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں خصوصیات پر جدا جدا بحث کی جائے،

تشبیہات۔ اس کی تشبیہات عموماً نیچرل، نادر، مرکب اور متحرک ہیں، اور یہی اوصاف ہیں جن کو دیکھ کر اس کی قوت تخئیل پر ایمان لانا پڑتا ہے، اس عہد تک تخئیل میں وہ نزاکت اور پیچیدگی پیدا نہیں ہوئی تھی جو بعد کو خاقانی اور نظامی کی شاعری کا طرۂ امتیاز بنی، پھر بھی منوچہری کے یہاں تخئیل میں بڑی دلکشی پائی جاتی ہے، مثلاً

چو چنبرہاے یاقوتین بروز بادہ گلبن ہا	جہندہ بلبل و صلصل چو بازیگر بہ چنبرہا

---

[1] شعر العجم

یعنی بہار میں گلاب کے درخت ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے یاقوت رنگ کی رسی کے حلقے ہیں اور بلبلیں اور قمریاں جو ان پر پھدکتی پھرتی ہیں گویا بازیگر رسی پر کرتب دکھا رہے ہیں،

چو حوراند نرگس ہا ہمہ سیمین طبق بر سر نہادہ بر طبق ہا بر زر رسا و ساغرہا

نرگس (عبہر) سفید پھول ہوتا ہے جس کا درمیانی حصہ زرد ہوتا ہے، شاعر کہتا ہے، نرگس کے پھول گویا حوریں ہیں جو سر پر چاندی کے تھال لیے ہوئے ہیں، اور ان تھالوں میں خالص سونے کے پیالے رکھے ہوئے ہیں،

پوپو یک پیکے نامہ زدہ اندر سر خویش نامہ گہ باز کند گہ شکند بر شکنہا

یعنی ہدہد ایک قاصد ہے جس نے اپنے سر میں خط گھرس لیا ہے کبھی خط کھولتا ہے اور کبھی تہ کر کے لپیٹ لیتا ہے،

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تشبیہات کا اس کے دماغ میں بڑا ذخیرہ ہے جس کو بے دریغ لٹاتا ہے، پھر زبان کی روانی اور الفاظ پر قدرت کا یہ حال ہے گویا دنیا موجیں مار رہا ہے، ایک تشبیہ میں باغ کے پھلوں کا ذکر کرتے ہوئے تشبیہات کا انبار لگا دیا ہے، فارسی شعرا پر عموماً الزام ہے کہ ان کے یہاں باغ و بہار کے بیان میں نازک خیالی اور بلند پروازی کی توکمی نہیں مگر سیکڑوں اشعار پڑھ جایئے خیالی طوطا مینا کے سوا کچھ نہیں حقیقی بہار اور باغ کا نقشہ کو سوں نظر نہیں آتا لیکن منوچہری کی شاعری اس عیب سے بری ہے، لکھتا ہے:

آبی چو یکے کیسہ گکے از خز زردست در کیسہ یکے بیضۂ کافور کلان است
و اندر دل آں بیضۂ کافور رباحی دو نافہ بر دہ نافگک مشک نہان است

یعنی امرود گویا زرد ریشم کی ایک تھیلی ہے جس میں کافور کا بڑا سا انڈا رکھا ہوا ہے، اور اس انڈے کے اندر مشک کے چھوٹے بڑے نافے چھپے ہوئے ہیں،

وآں سیب بگردار یکے مردم بیمار کز جملۂ اعضاے تن او راد و رخان است

یک نیمہ رخش زرد و دگر نیمہ رخش سرخ ایں را ہیجان دم وآں را یرقان است

"یعنی سیب نہیں، بلکہ ایک بیمار ہے جس کے تمام اعضا میں صرف دو رخسارے نظر آتے ہیں، ان میں بھی ایک رخسارہ سرخ، دوسرا زرد، گویا ایک کو دوران خون کا مرض ہے، دوسرے کو یرقان کا" اسی طرح پانچ اشعار میں انار کا وصف، اور انیس اشعار میں انگور کی تمثیل چلی گئی ہے، جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، ہم یہاں طوالت کے خوف سے صرف ترجمے پر اکتفا کریں گے، کہتا ہے

"انار ایک حاملہ عورت سے مشابہ ہے جس کے شکم میں متعدد بچے ہیں، جب تک اس کو زمین پر دے مارو بچہ پیدا نہیں ہوتا، جہاں پیدا ہوا لوگ اس کو کھا جاتے ہیں، عورت کے زیادہ سے زیادہ دو یا تین بچے پیدا ہوتے ہیں، مگر اس کے پیٹ میں بیک وقت تین تین سو بچے پائے جاتے ہیں، سب جانتے ہیں کہ جب تک بچہ کی ولادت نہیں ہوتی ماں اس کے لیے بستر نہیں لگاتی، لیکن انار کے پیٹ میں بچوں کے لیے زرد بستر لگا ہے، اور اس پر بچے کے سر کا نشان ہے" اب انگور سیاہ کی تعریف سنیے "اس کو ایک غالیہ رنگ عورت سمجھو جس کا شکم گویا غالیہ دان ہے، (غالیہ ایک سیاہ خوشبو کا نام ہے) اس کے شکم میں ایک جان (عرق) اور تین دل (بیج) ہیں، اور لطف یہ ہے کہ یہ دل ہڈی سے بنے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ جاندار کے لیے جان اور دل کی ضرورت ہے، لیکن اس میں دل کی جگہ ہڈیاں اور جان ہے، جان یا روح کا کوئی رنگ نہیں ہوتا، مگر انگور کی روح لالے کی طرح سرخ رنگ ہے، پھر روح خوشبو سے معرا ہوتی ہے، اس میں مشک و عنبر کی سی خوشبو ہے، اگر انگور چاند کی طرح حسین اور سیاہ رنگ ہے تو تعجب کی کیا بات ہے، کیا حسین سانولے نہیں ہوتے، (چاند کے سیاہ داغوں ہی کو کیوں نہ دیکھ لو) اس میں اگر کوئی عیب ہے تو یہ کہ یہ دختر رز جوان ہونے کے باوجود کنوارپن میں حاملہ ہوگئی ہے،

اس کا شوہر کے بغیر حاملہ ہونا مریمؑ بنت عمران کے واقعے سے ملتا جلتا ہے، بلکہ اس سے زیادہ پرلطف ہے، حضرت مریمؑ کے دہن میں روح پھونکی گئی تھی، مگر اس کے نہ دہن ہے، نہ لب، ان کے شکم سے فرزند پیدا ہوا، اس کے بطن سے زندگی جنم لیتی ہے، جیسے وہ روح اللہ تمام مخلوق کے سردار تھے، یہ راح (شراب) بھی تمام دنیا پر حکمرانی کرتی ہے، اُن کو لوگوں نے پکڑ کر کھینچا اور قتل کر دیا تھا، اس کو بھی لوگ کھینچتے اور قتل کرتے ہیں، انھوں نے ایک دو مردوں کو معجزہ کے طور پر زندہ کیا تھا، یہ تمام دنیا کو زندگی دیتی ہے، ان کے ہاتھ میں زندگی اور موت تھی، تو اس کے قبضے میں بھی ہے، ان کے قتل کے درپے یہودی ہو گئے تھے، اس کو مسلمان بھی قتل کرنے سے نہیں چوکتے، لیکن جیسے ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا، اس کو بھی نقصان نہیں پہنچ سکتا، جیسے ان کو رنج کے بعد راحت میسر ہوئی، اس کا بھی یہی حال ہے، ان کو آسمان پر جگہ ملی، اس کو امیروں اور رئیسوں کے ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں،[1]

ہم نے دل پر جبر کر کے یہ ترجمہ نقل کیا ہے، دکھانا یہ تھا کہ منوچہری کے یہاں تخئیل کی زرخیزی اور اسالیب ادا کی فراوانی حیرت انگیز ہے، شعر پر شعر لکھتا چلا جاتا ہے، اور زور بیان میں فرق نہیں آتا، اگر وہ اپنی قوت ان لغویات اور مدحیات میں ضائع کرنے کے بجائے کسی صحیح مصرف میں استعمال کرتا تو فردوسی سے سبقت لے جاتا،

تشبیہات کی مثالیں اس کے یہاں بکثرت ہیں، خصوصاً دخت رز کے حاملہ ہونے اور وضع حمل کرنے کی داستان بار بار نئے نئے پیرایوں میں سناتا ہے، شاید خاقانی کی طرح اس کو یہ تشبیہ ضرورت سے زیادہ مرغوب تھی، مگر طوالت کے خوف سے ان ہی مثالوں پر اقتصار کرنا مناسب ہے،

محاکات۔ منوچہری کے کلام میں واقعات کا تسلسل، جزئیات کی تفصیل اور بیان کی قدرت

---

[1] منوچہری نے نہایت بیباکی سے شراب اور حضرت عیسیٰؑ میں موازنہ کیا ہے، ہم ان اشعار کو نقل کفر کفر نباشد کے طور پر درج کرتے ہیں،

کا یہ عالم ہے کہ جس منظر، شخص، یا واقعے کا ذکر کرتا ہے، سچ مچ تصویر کھینچ دیتا ہے، اور قارئین کو ناظرین کی صف میں لا بٹھاتا ہے،

ایک قصیدے میں اپنے سفر کا حال، رات کی طوفانی کیفیت حسینوں سے ملاقات، محبوبہ سے راز و نیاز، اس کے اور اس کی سہیلیوں کے لیے اونٹ ذبح کرنا، اور پھر محبوبہ کی عماری میں سوار ہو کر منزل مقصود تک پہنچنا بیان کیا ہے، اور آنکھوں کے سامنے پورا نقشہ کھینچ دیا ہے،

شب تیرہ و باد غضبان ندقد	ہمی آمد آوازِ غول از جوانب
چو آواز رعد از سحاب بہاری	فتادہ برہ بر غطیط نجائب
ہمہ راہ و بے راہ خار مغیلاں	عقابان وادی بسانِ عقارب
فتاد آنگہے چشم من بر قوافل	عیون غرقہ در خون الدمع ساکب
زدہ خیمہا دیدم اندر مجاری	درخشاں چو در دیدہ مصباح ثاقب
زخیمہ بروں آمدہ خوبرویاں	گرازاں چو طاؤس گردش کواعب
معنبر ذوائب معقد عقائص	مسلسل غدائر مجنبل ترائب
ہمہ دل سیاہی ہمہ رخ الٰہی	ہمہ بر بدائع ہمہ تن عجائب
خراماں بت من میان جواری	چو حور بہشتی میانِ کواعب
ز ارواح صافی تر اندر لطائف	ز خورشید روشن تر اندر کواکب
مرا گفت مہمان ناخواندہ خواہی	قمر چہرگانے مقوس حواجب
اگر زانکہ داری سر میز بانی	زما بہ نہ بینی انیس و مصاحب
نگندم رحال و زمام نجیبم	والہمت بالنحر والنحر واجب
چو مرکب فداے بت دلستاں شد	مرا گفت دلبر کہ طال المعاتب

شدم از صحاری من اندر عماری   وقد صرت حقاً سعید العواقب

ان اشعار کو پڑھ کر اس کی منظر نگاری، واقعہ کی تصویر کشی، اور سراپا کی عکاسی کا کلمہ پڑھنا پڑتا ہے، درحقیقت جس عمارت کو صدیوں کے بعد قاآنی نے بلند کیا اس کی بنیاد مدتوں پہلے شعرائے غزنویہ خصوصاً منوچہری نے ڈال دی تھی، یہ درست ہے کہ وہ دوسرے شعرا کی طرح مدح میں مبالغہ اور خوشامد سے بہت کام لیتا ہے، لیکن اوپر کی خصوصیات نے ایک حد تک ان سب کی تلافی کر دی ہے۔

اجازت دیجئے کہ اس کے ایک دوسرے مشہور قصیدے کے چند شعر اور بطور نمونہ پیش کر دوں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی عرب بدو اپنے رفیق اونٹ پر اپنے خیمے سے رخصت ہو رہا ہے، اس کی معشوقہ رو رو کر جل تھل بھر دیتی ہے، اور وہ اس سمجھا بجھا کر کہ وہ بیابان کی سختیاں سہنے کے لیے چل کھڑا ہوتا ہے۔

الا یا خیمگی خیمہ فروہل   کہ پیش آہنگ بیروں شد ز منزل
تبیرہ زن بزد طبل نخستیں   شتربانان ہمی بندند محمل
نماز شام نزدیک است و امشب   مہ و خورشید را بینم مقابل

. . . .

نگار من چو حال من چنیں دید   ببارید از مژہ باران وابل
تو گفتی پلپل سودہ بکف داشت   پراگند از کف اندر دیدہ پلپل
بیامد اوفتاں خیزاں بر من   چناں مرغے کہ باشد نیم بسمل
دو ساعد را حمائل کرد بر من   فرو آویخت از من چوں حمائل

. . . .

چو برگشت از من آں معشوق ممشوق نہادم عابری را سنگ بر دل

اس کے بعد سفر کے مراحل و مصائب کی تفصیل ہے

اب ترتیب کے لحاظ سے (کہ اہمیت کے لحاظ سے) آخر میں یہیں چند باتیں اس کی زبان کے بارے میں کہنا ہیں، سچ پوچھیے تو شعر و ادب میں اصل کھیل زبان و بیان کا ہے، کیونکہ ایک شاعر یا ادیب پہلے فن کار ہے اور پھر مفکر، خیالات تو دوسروں کے یہاں بھی ہوا کرتے ہیں، شاعر یا ادیب جب ان کو اپنے زبان کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرتا ہے تو سننے والے سر دھننے لگتے ہیں، اسی کے متعلق کہا گیا ہے

واذا قیل اطمع الناس طرا واذا رم اعجز المعجزینا

یہی چیز ہے جس کی طرف style is The man کے مقولے میں اشارہ کیا گیا ہے، اور یہی وصف ہے جو کسی اہل قلم کو صاحب طرز بناتا ہے،

منوچہری کے اشعار میں صفائی اور روانی کا یہ عالم ہے کہ گویا دریا لہریں لے رہا ہے، الفاظ پر ایسی قدرت اور بندشوں میں اس قدر چستی کم شعرا کے حصے میں آئی ہوگی بحروں کا ترنم اور موسیقیت بے ساختہ دل کو کھینچتی ہے، قصد تھا کہ اس کے کلام سے اس وصف کی مثالیں پیش کی جائیں، مگر پھر یاد آیا کہ اب تک جو اشعار مختلف خصوصیات کے تحت نقل ہوئے کیا وہ تمثیل کے لیے کافی نہیں، تاہم اگر اس پر اصرار ہو تو چند اشعار اور سہی،

جہانا چہ بے مہر و بد خو جہانی چو آشفتہ بازار بازارگانی

بدر دکساں صابری اندرو تو بہ بدنامی خویشتن ہمداستانی

بہر کار کردم ترا آزمایش سراسر فریبی سراسر زیانی

وگر آزمایمت صدبار دیگر ہمانی ہمانی ہمانی ہمانی

عمی ترکس بہ آنکش عنی ترکنی تو

فرو ترکس آنکش تو برتر نشانی

بے شبہہ اس کلام میں صنائع و بدائع کا استعمال بھی ہے، اور غیر مانوس الفاظ بھی ملتے ہیں، جو امتداد زمانہ سے متروک ہو چکے ہیں، مگر ان سب باتوں کے باوجود اشعار کی روانی اور سلاست میں ذرا فرق نہیں آتا۔

ابن المقفع کیجانب منسوب ارسطا طالیسی تراجم

از جناب سید غلام مرتضیٰ صاحب ایم اے لیکچرار عربی و فارسی، الہ آباد یونیورسٹی

[مندرجہ ذیل مقالہ اصل میں استاد پول کراوس نے جرمن زبان میں لکھا تھا، اس کے بعد ڈاکٹر عبدالرحمٰن بدوی نے اس کو چند دیگر مقالات کے عربی زبان میں ترجمہ کرکے التراث الیونانی فی الحضارۃ الاسلامیۃ کے نام سے شائع کیا، اب اسی مقالے کا اردو ترجمہ ہدیۂ ناظرین ہے، ڈاکٹر بدوی نے اس مقالے پر حسب ذیل نوٹ لکھا ہے:

"یہ علمی بحث اس مقالے پر تبصرہ ہے، جو مستشرق فرانسسکو جبرئیلی نے "مؤلفات ابن المقفع" کے عنوان سے لکھا تھا، اور ۱۹۳۱ء میں "مجلۃ الدراسات الشرقیۃ" کی تیرہویں جلد میں صفحہ ۱۹۷ - ۲۴۷ میں شائع ہوا تھا، اور یہ تبصرہ بھی ۱۹۳۳ء میں اسی رسالے کی چودہویں جلد میں "ابن المقفع کے متعلق" کے عنوان سے صفحہ ۱ - ۱۲ میں ہوا تھا، اس کے دو حصے تھے: ایک ارسطا طالیسی تراجم کے متعلق تھا، ذیل کا مضمون اسی کا ترجمہ ہے، دوسرا حصہ باب برزویہ کے بارے میں تھا۔"]

جبرئیلی نے ابن المقفع کے متعلق جو بسیط مقالہ لکھا ہے اس میں اس مسئلہ پر بحث ہے کہ یہ روایت کہ ابن المقفع نے فارسی ادب کے دوسرے تراجم مثلاً کلیلہ و دمنہ اور خدائی نامہ وغیرہ کی طرح ارسطو کی مؤلفات کے کسی جزو کا بھی ترجمہ کیا ہے، کیا کسی صحیح بنیاد پر قائم ہے؟ اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ ابن المقفع کی تمام علمی کاوشیں ادبی حیثیت رکھتی ہیں، مؤلف (جبرئیلی) کی رائے میں اس کا احتمال نہیں ہے کہ یہ نسبت صحیح ہو، لیکن انھوں نے اس خیال

کی تائید میں کوئی دلیل نہیں دی اور نہ ان اہم ملحوظات کی توجیہ کی ہے، جو اس بارہ میں مسلمان مصنفین کے یہاں پائے جاتے ہیں، جبرئیلی کے ملاحظات درج ذیل ہیں،

"اس لیے ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ ابن المقفع سریانی زبان جانتا تھا جس میں عموماً یونانی فلسفہ کے مختصرات اور تراجم لکھے جاتے تھے، رہا ان کتابوں کے پہلوی ترجموں کا وجود، جیسا کہ اس سے قبل فیزرش نے گمان کیا تھا، اور جس کی طرف عربی اور ایرانی تراجم نے بھی بلے اشارے کیے ہیں، تو یہ ایسا مفروضہ ہے جس کی کافی شواہد سے تائید نہیں ہوتی۔"

جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا کہ جس سبب سے ارسطاطالیسی تراجم ابن المقفع کی جانب منسوب ہو گئے ہیں، وہ در اصل ایک غلطی ہے، جس میں پچھلے اسلامی مورخین مبتلا ہو گئے ہیں۔

سب سے پہلا ماخذ جو ابن المقفع کے ان تراجم کی طرف اشارہ کرتا ہے، وہ صاعد اندلسی کی "طبقات الامم" ہے، چنانچہ اس کا مصنف لکھتا ہے کہ

"رہی منطق تو پہلا شخص جو اس حکومت (دولت عباسیہ) میں اس کا درس کے لیے مشہور ہوا، وہ عبد اللہ بن المقفع ایرانی خطیب ہے جو ابو جعفر منصور کا کاتب تھا، اس نے ارسطو کی تینوں منطقی کتابوں کا جو منطق صوری میں ہیں ترجمہ کیا، ایک کا نام کتاب قاطیغوریاس، کتاب باری ارمینیاس اور کتاب انالوطیقا ہیں، کہا جاتا ہے کہ اس کے زمانہ تک پہلی کتاب کے سوا ارسطو کی کسی کتاب کا ترجمہ نہیں ہوا تھا، اسی طرح اس نے کتاب المدخل کا ترجمہ کیا جو فرفوریوس الصوری کی ایساغوجی کے نام سے مشہور ہے، نیز یہ ترجمے نہایت آسان اور فہم سے قریب عبارت میں ہے، ایک ہندی کتاب کا بھی جو "کلیلہ دمنہ" کے نام سے مشہور ہے ترجمہ، یہ پہلی کتاب ہے، جو فارسی زبان سے عربی میں ترجمہ ہوئی، ابن المقفع عمدہ کتابوں کا مصنف ہے، جن میں رسالہ "فی الادب" اور "السیاسة" مشہور ہیں، اس کا ایک رسالہ "الیتیمة"

اس کا موضوع سلطان وقت کی اطاعت و فرمانبرداری ہے"۔

متاخرین نے اس باب میں اس سے زیادہ نہیں کیا کہ طبقات الامم کی اس عبارت کو جوں کا توں نقل کر دیا، مثلاً ابن القفطی نے تاریخ الحکماء میں "عبداللہ بن المقفع" کے نام کے تحت تقریبا حرف بحرف نقل کیا، اسی طرح ابن ابی اصیبعہ نے عیون الانباء (مطبوعہ ا، لمرء، قاہرہ ۱۸۸۲ء) کی جلد اول صفحہ ۳۰۸ پر "برزویہ" نام کے تحت یہی کیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ صاعد نے یہ روایت کہاں سے لی، ابن ندیم کی الفہرست میں ابن المقفع کے بارے میں ایک طویل فصل ہے جس میں مؤلف نے اس کے حالات و تالیفات کو بیان کیا ہے لیکن اس کی فلسفیانہ تصانیف کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں ہے (ص ۱۱۸ مطبوعہ فلوگل) حالانکہ اس کا ذکر ہے کہ فارسی زبان سے ترجمہ کرنے والوں میں ایک ابن المقفع بھی تھا، اور مترجمین میں سر فہرست اسی کا نام رکھا ہے۔

البتہ الفہرست میں ایک دوسرے مقام پر اس قسم کے بیانات ملتے ہیں، جو پہلی نظر میں صاعد کے قول کے مشابہ معلوم ہوتے ہیں، مثلاً صفحہ ۲۴۸ و صفحہ ۲۴۹ میں ابن المقفع کا شمار ان لوگوں میں کیا گیا ہے جنھوں نے قاطیغوریاس اور باری ارمنیاس کو مختصر کیا تھا، اس کی تائید جاحظ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے جو اس نے کتاب الحیوان (مطبوعہ قاہرہ ۱۳۲۳ھ) کی جلد اول صفحہ ۳۸ پر لکھا ہے۔ جاحظ المتوفی ۲۵۵ھ اس واقعہ سے بہت ہی قریب زمانہ میں تھا، اس لیے وہ متاخرین ترجمہ کرنے والوں میں سے اکثروں سے ذاتی طور پر واقف رہا ہوگا، وہ ترجمہ کے مسئلہ کی تنقید اور یونانی زبان سے جو تراجم ہوئے ہیں، ان کی قدر و قیمت بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ تراجم اصل تصانیف سے مستغنی نہیں کر سکتے، کیونکہ اس صورت میں یہ فرض کرنا پڑے گا کہ مترجم کی فہم و دانش اسی درجہ کی ہے، جو اصل مصنف کی تھی، اور بھلا ابن البطریق

ابن ناعمہ، ابو قرہ، ابن فہر، ابن وہیلی اور ابن المقفع رحمہم اللہ تعالیٰ ارسطاطالیس کے جیسے اور خالد افلاطون کے جیسے کہاں ہو سکتے ہیں"

یہاں جاحظ کے ان اقوال پر تفصیلی بحث کا موقع نہیں ہے، اور اتنا ثابت کر دینا کافی ہے کہ ایک ایسی کتاب جو تیسری صدی کے نصف اول میں تصنیف ہوئی اس میں ابن المقفع کا ارسطو کے مترجم کی حیثیت سے ذکر ہے،

ایسی صورت میں یہ سوال کہ "کیا جبرئیلی اپنے شکوک میں حق بجانب نہیں ہے" بہت پیچیدہ ہو جاتا ہے، اور اس کا حل ابھی تک دریافت نہیں ہو سکا ہے، اور الفہرست بھی اس راہ میں صحیح نشاندہی کرتی ہے، اس سے قبل ہم نے لکھا ہے کہ ابن ندیم نے اس فصل میں جو اس نے عبداللہ ابن المقفع پر لکھی ہے، یونانی تراجم کے باب میں ایک لفظ بھی نہیں کہا ہے، حالانکہ یہ اہم مسئلہ ایسا نہ تھا جس کو ابن ندیم نظر انداز کرتا، خصوصاً جب کہ اس نے دوسرے مقام پر بھی اس کا ذکر کیا ہو، اس صورت میں اس کا بہت زیادہ احتمال ہے کہ اس فصل میں اس کا ذکر نہ کرنا اسکی دلیل ہو کہ وہ ارسطو کے مترجم اور ادیب مشہور کو ایک شخص نہ سمجھتا ہو، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ وہ ارسطو کی دو کتابوں (قاطیغوریاس اور باری ارمینیاس) کے مترجمین کی فہرست میں صرف "ابن المقفع" کا ذکر کرتا ہے، نہ کہ "عبداللہ بن المقفع" کا، اس سے یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں دو مختلف اشخاص اور آپس میں رشتہ دار تھے، جن میں سے ہر ایک "المقفع" کے نام سے موسوم تھا، جس طرح اس کے اسلاف موسوم تھے،

یہ نظریہ ایک دوسرے طریقے سے بآسانی ثابت ہو جاتا ہے، چنانچہ ایک نیا مگر بوسیدہ مخطوطہ، جو سینٹ جوزف کالج بیروت کی لائبریری میں نمبر ۳۳۸ پر ہے، جس کا کئی سال ہوئے فرلانی نے تفصیلی ذکر کیا ہے، ایساغوجی، قاطیغوریاس، باری ارمینیاس اور انالوطیقا کے

عربی ترجمہ پر مشتمل ہے، جسے محمد بن عبد اللہ المقفع نے کیا تھا، اس سے اس مسئلہ میں شک باقی باقی نہیں رہ جاتا کہ یہ وہی مترجم ہے جس کی طرف الفہرست اور جاحظ نے اشارہ کیا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ محمد بن عبد اللہ (بن) المقفع اس مشہور کاتب کے بیٹے کے سوا کوئی دوسرا شخص نہ ہو، کیونکہ دوسرے ماخذوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابن المقفع کے واقعی ایک لڑکا تھا، جس کا نام محمد تھا، چنانچہ الفہرست ص ۱۱۸ میں ہے کہ اسلام لانے سے قبل اس کی کنیت ابوعمر تھی، بعد میں ابو محمد ہوئی، اور ابن خلکان نے صراحۃً اس کے بیٹے محمد کا ذکر کیا ہے، البتہ ہم اسکی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، اس روایت کو کہ عبد اللہ بن المقفع منصور کا کاتب تھا، ان لوگوں کے سوا اور کوئی بیان نہیں کرتا جو ارسطو کی کتابوں کے ترجموں کو اس کیجانب منسوب کرتے ہیں، میرا گمان غالب ہے کہ یہ روایت درحقیقت اس کے بیٹے محمد سے متعلق ہے، کیونکہ عبد اللہ بن المقفع نے جیسا کہ جبرئیلی نے مقالۂ مذکور میں لکھا ہے کہ ۱۳۹ھ میں وفات پائی، اس لیے یہ بہت ممکن ہو کہ یہ اس کا بیٹا ہوگا، جو خلیفہ منصور المتوفی ۱۵۸ھ سے متوسل تھا،

اب ہم اس چیز کی طرف رجوع کرتے ہیں جو بیروت کے مخطوطہ میں درج ہے، اور ان بحث کرینگے کہ اس کے مضمون اس کے عنوان کی تائید کرتا ہے یا نہیں، اس بحث میں ہم فارابی کے بیان پر اکتفا کریں گے،

فارابی کہتا ہے کہ جس چیز کی ہم کو تحقیق کرنا ہے وہ ارسطو کی مذکورہ بالا کتابوں کا ترجمہ نہیں بلکہ ان کی شرحوں کا مختصر خلاصہ ہے، جو ابن ندیم کے اس بیان کے مطابق ہے کہ ابن المقفع نے صرف قاطیغوریاس، باری ارمنیاس کا خلاصہ کیا تھا، ابن ندیم کو یہ معلوم ہی تھا کہ زیر بحث مسئلہ خود ان کتابوں کا نہیں، بلکہ ان کی شروح کا ہے،

ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ ارسطاطالیسی شرح کیا تھی، جو بعد میں ظہور میں آئی۔ کیونکہ فرلانی نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے اس کے زیادہ گہرے مطالعہ اور موازنہ میں مدد نہیں ملتی۔ خود فرلانی نے شرح المقولات کے مقدمہ میں اس تقابل و تشابہ کی طرف اشارہ کیا ہے، جو شرح المقولات اور یحییٰ نحوی اور سرجیوس راس عینی کی شرحوں کے درمیان پایا جاتا ہے، لیکن ان کے بیانات یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فرفوریوس کی ایساغوجی کی شرح قدیم مترجمین کے طبقۂ متاخرین کے زمانہ میں کی گئی تھی، یعنی پہلے فلسفہ کے متعلق ایک عمومی مقدمہ ہے جس میں فلسفیانہ مصطلحات کی تعریف اور علوم کی تقسیم ہے، پھر فرفوریوس کی کلیات خمسہ کی بحث ہے۔ اب اگر مخطوطہ کے جزء اول کے خاتمہ پر یہ لکھا ہے کہ کتاب ایساغوجی ختم ہو گئی تو اس کے بجائے یہ کہنا زیادہ صحیح ہوتا کہ شرح کتاب ایساغوجی ختم ہو گئی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ [illegible] کی شرح ایساغوجی اس جزء اول کی اساس پر ہو جو اب مفقود ہے، لیکن جیسا کہ یہ مشترک [illegible] ایک زمانہ میں سریانیوں اور عربوں میں اس کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔

البتہ باری ارمنیاس اور انالوطیقا کی شرحیں کس کی ہیں، دوسری شرح مخطوطہ کے تقریباً سو سو اوراق پر مشتمل ہے، اس کے مترجم کا نام محمد بن عبد اللہ ابن المقفع تحریر ہے، اس کے متعلق ہم بعد میں گفتگو کریں گے۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ آیا منطق کی ان چاروں کتابوں کی شرحوں کی تلخیص یا ترجمہ کی نسبت اس شخص کی جانب صحیح ہے جس کی جانب وہ منسوب ہیں، یا اس کو آگے چل کر کسی قدیم مترجم (مسئلہ زیر بحث میں محمد بن عبد اللہ ابن المقفع) کی جانب منسوب کر دیا گیا ہے۔ فرلانی کو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ نسبت صحیح ہے، کیونکہ یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ کوئی منتقل نسبت کرنے والا اپنی جگہ کا دی کو کسی مشہور مترجم یا کم از کم الفہرست کی مبہم عبارت کا لحاظ کرتے ہوئے

مور ادیب ابن المقفع ہی کی جانب منسوب کرنے کے بجائے محمد بن عبد اللہ بن المقفع سے ایک
مل غیر معروف شخص کی جانب منسوب کرے، نفس کتاب سے متعلق داخلی تنقید کے ذریعے بھی
ستدلال کیا جاسکتا ہے،

مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کتابیں جن سے مترجم نے پیش نظر مخطوطہ میں اعتنا کیا ہے، فرفوریوس
لی ایساغوجی اور منطق ارسطو کی پہلی تین کتابیں ہیں، اور فرلانی کے بیانات سے یہ ظاہر نہیں
ہوتا کہ مخطوطہ پوری انالوطیقا کی شرح پر مشتمل ہے یا نہیں، اور اس کو اتفاق پر محمول نہیں کیا
جاسکتا، کیونکہ مایرہوف کی بحثوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ سریانی خانقاہوں کے مدارس ان چار
کتابوں کے علاوہ کسی اور کتاب کی تعلیم یا تفسیر سے اعتنا نہیں کرتے تھے، اور غالباً اس کی
وجہ متاخرین اسکندرانیین کی تقلید تھی جس کا بڑا سبب مذہبی رواج تھا جیساکہ اس کے
ماخذ (الفارابی) سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسکندریہ میں مصنفات ارسطو کی تدریس ایک مذہبی
کونسل کی قرارداد کے مطابق صرف ان ہی کتابوں میں محدود کر دی گئی تھی، اور یہ رواج
فارابی کے زمانے تک باقی تھا، ارسطو سریانیوں کے یہاں بھی صرف منطق کا مصنف سمجھا
جاتا تھا، جس طرح قرون وسطیٰ کے لاطینی علماء کے یہاں سمجھا جاتا تھا، صرف مسلمانوں ہی نے
اس ارض ممنوعہ میں داخل ہونے کی جرأت کی اور جو کچھ ارسطو نے لکھا اس میں سیاست
کے سوا سب پر توجہ کی،

یہ واقعہ اس عبارت سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے جو ہمارے پیش نظر مخطوطہ
کے ورق نمبرہ ۲۵ پر خاتمہ کتاب کے طور پر مرقوم ہے، (فرلانی ص ۲۱۲)

"تم کتاب انولوطیقا و لیس بعدہ من ھذہ الکتب الا کتاب أفودوطیقی ولم
یمنعنا من استقرائہ الا ما تقدمنا فی صدر الکتاب جماعاً رأینا کا فیاً عن التفسیر"

فرلانی کا یہ خیال غلط ہے کہ "افودالطبیعی" سے مراد ارسطو کی کتاب الطبیعہ ہے، اس لیے اس کے بجائے "السمع الطبیعی" ہونا چاہیے کیونکہ یہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ منطقی کتابوں کے سلسلے میں کتاب الطبیعہ کے ذکر کے کوئی معنی نہیں، دوسرے کتاب الطبیعہ کا ترجمہ عربی نام سمع الکیان ہے، نہ کہ "سمع الطبیعی" یا "السماع الطبیعی"۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ یہاں "افودالطبیعی" کے بجائے "افودیقطیقی" یا اس کے مشابہ کوئی ایسا لفظ ہونا چاہیے جس کے معنی ارسطو کی تحلیل ثانی کے ہوں، یہاں اس لیے کہ اصل عبارت یہ ہے:

"تم کتاب انولوطیقا ولیس بعدہ من شانہ [illegible] الا کتاب افود الطبیعی ولم یمنعنا من استقلالہ (دیکھیے روزی [illegible]) الاما قد اقدمنا فی صدر الکتاب جماعا رأینا (ممکن ہے کہ یہ رأینا ہو) کافیا عن التفسیر"

اس کا افسوس ہے کہ بیروت کے مخطوطہ میں یہ مقدمہ محفوظ نہیں رہ گیا، ورنہ اس [illegible] کتاب افودیقطیقا کے انتقال سے اعراض کے اسباب مل جاتے، ممکن ہے کہ لفظ "جماعا" میں تحریف ہو، اور صحیح لفظ "اجماعا" یعنی مذہبی کونسل کی قرارداد یا اس کے مانند کوئی اور چیز [illegible] کہ ہمارے پیش نظر مخطوطہ میں صرف اورغانون کی پہلی تین کتابوں اور ایساغوجی کے بارے میں بحث ہے، اس کا ثبوت ہے کہ جو کتاب ہمارے سامنے ہے وہ اس قدیم [illegible] اسلوب پر عہد اسلامی کی ارسطاطالیسی کتابیں تھیں۔

اصطلاحات کتاب کی بحث ہمیں اسی نتیجے پر پہنچاتی ہے اور فرلانی نے بھی اس مسئلہ کی جانب متنبہ کیا ہے کہ مترجم نے پوری کتاب میں جوہر کے معنی کو لفظ "عین" سے تعبیر کیا ہے، حالانکہ عام فلسفیانہ تراجم میں اس کے بجائے فارسی لفظ "جوہر" ہے۔

یہ مسئلہ اس لیے اور بھی زیادہ اہم ہے کہ فلسفہ کے علاوہ دوسرے اسلامی فنون خصوصاً علم کلام اور تصوف وغیرہ کی کتابوں میں لفظ "عین" کے بجائے "جوہر" (اور "ذات") کا استعمال ہوا ہے، لیکن یہ اصطلاح بعد کی مترجمہ کتابوں اور ان اسلامی ارسطاطالیسی فلسفے کی کتابوں کی اصطلاح کے مقابلہ میں جو ان کی بنیاد پر مرتب کی گئیں، نامانوس ہے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ لفظ "عین" اسلام میں فلسفیانہ تعلیمات کے عہد اول میں ایجاد ہوا، اس کے بعد لفظ "جوہر" نے اسکو نکال دیا،

اس کے علاوہ شرح ایساغوجی کے ابتدائی کلمات جن کو فرلانی نے نقل کیا ہے، مثلاً

"ان لکل صناعة متاعًا" [یعنی ہر فن کے لیے ایک متاع ہونا ضروری ہے]

ممکن ہے کسی متن کا لفظی ترجمہ ہوں، مثلاً وہ عبارت جو شرح امونیوس میں کلیات خمسہ کے الفاظ کے لیے استعمال کی گئی ہے، جس کے ایک لفظ کا ترجمہ یہاں لفظ "متاع" سے کیا گیا ہے، حالانکہ عربی میں اس اصطلاح کا ترجمہ لفظ "موضوع" سے کیا جاتا ہے، اور وہ تقسیم بھی قابل غور ہے جو مخطوط کے گزشتہ صفحہ میں موجود ہے، اس سے ہماری مراد یہ تقسیم ہے:

(۱) حکمة تبصر القلب وتفکره وہ حکمت جو قلب کے تبصر و تفکر سے متعلق ہے،

(۲) حکمة حرکة القلب وقوته وہ حکمت جو قلب کی حرکت اور اسکی قوت سے متعلق ہے،

ان دو قسموں سے مراد علوم نظریہ اور علوم عملیہ ہیں، اگر ہم پوری کتاب پر غائر نظر ڈالیں تو یونانی فلسفیانہ اصطلاحات کے ترجمہ کے تغیرات اور ان کلمات کو جو بعد میں ان کی جگہ استعمال کیے گیے، شرح و بسط سے بیان کر سکتے ہیں، لیکن جن اصطلاحات کا ہم نے ذکر کیا وہ مخطوطہ کی اس تاریخ کے تعین کی تائید کے لیے کافی ہیں، جسے ہم نے دلائل سے ثابت کیا ہے، اگرچہ مخطوطہ کی اصطلاحات کی قدامت سے ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ یہ ترجمہ دوسرے تراجم کی طرح یونانی یا سریانی زبان سے نہیں، بلکہ درمیانی زبان فارسی (پہلوی) سے کیا گیا ہو جیسا کہ فرلانی کا خیال ہے،

کیونکہ یہ مسئلہ کہ یونانی لفظ اوسیا (جس کے معنی جوہر ہیں) کا ترجمہ فارسی لفظ "جوہر" سے نہیں، بلکہ عربی لفظ "عین" سے کیا جاتا تھا، فرلانی کے خیال کے برعکس ثابت کرتا ہے، ہمارے پاس اس کا ایک اور ثبوت بھی ہے کہ محمد بن عبد اللہ (بن) المقفع کے ترجمہ (یا خلاصہ) کی اصل یونانی ہے، جسے ہم بعد میں بیان کریں گے،

مخطوطہ کی توقیع سے ان نتائج کی جن تک ہم پہنچ سکے ہیں ایک ایسے طریقے سے تائید ہوتی ہے جس کی ہمیں توقع بھی نہ تھی، اس کے لیے ہم محرف متن مطبوعہ فرلانی کو نقل کرتے ہیں، اس کے بعد ضروری تصحیح کے بارے میں گفتگو کریں گے،

"تمت کتب الثلاثة من ترجمة محمد بن عبد الله المقفع. وقد ترجمها بعد محمد، ابو نوح الكاتب النصراني، ثم ترجمها بعد ابی نوح، سلمة الحرانی صاحب بيت الحكمة ليحيى بن خالد برمكی لليث الرحبعة كلها قبل هولاء المترجمين الذين تكسانی الملكانی النصرانی۔"

اس عبارت میں پہلا اشکال "صاحب بیت الحکمۃ" کا فقرہ ہے، گفتگو یہاں ارسطو کی پہلی تین کتابوں کے ان تراجم سے ہے جو محمد کے ترجمہ کے بعد ابو نوح اور سلم نے کیے تھے، ان دو مترجمین کے بارہ میں ہم بعد میں بحث کریں گے، یہاں پر اتنا اشارہ کردینا کافی ہے کہ وہ بیت الحکمۃ جس کا صدر سلم تھا، اس کو مامون ہی نے قائم کیا تھا، اس لیے یہ ناممکن ہے کہ اس نے ارسطو کی کتابوں کا جو ترجمہ کیا تھا، وہ یحییٰ بن خالد برمکی کے لیے کیا ہو، جس کا سال وفات زیادہ سے زیادہ ۱۹۰ھ (۸۰۵ء) ہوسکتا ہے، اس کے علاوہ "قبل ہولاء المترجمین" کا فقرہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہاں بھی گفتگو محمد ہی کے ترجمہ کے متعلق ہے، اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ متن میں لفظ "یحییٰ" سے قبل لازمی طور پر کچھ نقص (Lacuna) ہوگا، اور

اس نقص میں محمد بن عبداللہ بن المقفع ہی کے کاموں کے متعلق کوئی فقرہ ہوگا، اس بنا پر متن کی تکمیل کے باب میں میرا میلان مندرجۂ ذیل اصلاح کی جانب ہے،

"وقد ترجمہ محمد بن عبداللہ المقفع لیحییٰ بن خالد البرمکی الکتب الثلاثۃ بعینہا کلہا"

لیکن یہاں پر ایک دوسری وقت اس عبارت کے آخری کلمات خصوصاً لفظ "تکسانی" کی وجہ سے ہے، اس لیے کہ لفظ "الذین" کے بعد ایک فعل ہونا چاہیے جس کا فاعل "الملکانی النصرانی" ہے، اب یا وہ فعل تحریف شدہ لفظ "تکسانی" میں موجود ہے، یا یہ لفظ اس الملکانی کے تحریف شدہ نام یا اس کے کلیسائی عہدے کو ظاہر کرتا ہے، اور فعل کاتب سے سہواً چھوٹ گیا ہے،

یہ بات پہلی ہی نظر میں توقیع کی مذکورۂ بالا عبارت سے ظاہر ہو جاتی ہے کہ ہمارے پیش نظر ایک ایسی پرانی تصنیف کا تذکرہ ہے (سلم کا مذکورۂ بالا ترجمہ) جو لکھی تو مامون کے زمانے میں گئی مگر اس سے پہلے جب کندی اور حنین نے ان کتابوں کی تفسیر و تلخیص کی تھی، ورنہ ان دونوں کے نام ضرور مذکور ہوتے، اور یہ توقیع ہم کو اسلام میں ارسطاطالیسی تقالید پر نظر ڈالنے کا موقع دیتی ہے جو کسی اور ذریعہ سے ممکن نہ تھا،

فرلانی نے محمد بن عبداللہ بن المقفع کے ساتھ دوسرے دو مترجمین کی شخصیتوں کے بارے میں تحقیق کی زحمت نہیں گوارا کی، حالانکہ ان کے متعلق ہم بہت کچھ جانتے ہیں، سلم جس کا لقب صاحب بیت الحکمۃ ہے، وہ مامون کا معاصر تھا، اس کے متعلق الفہرست میں یہ ہے کہ سہل بن ہارون کے ساتھ اپنے زمانہ کا مشہور کاتب اور مامون کے خزانۃ الحکمۃ کا مہتمم تھا، اس کے گہرے تعلقات تھے، وہ مترجم تھا اور خاص طور پر فارسی سے عربی میں ترجمہ کرتا تھا، غالباً اس سے مراد وہ اقتباسات ہیں جو اس نے کلیلہ و دمنہ سے تیار کیے تھے، جیسا کہ

الفہرست کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے، الفہرست ص ۲۴۳ (اور ابن ابی اصیبعہ جلد اول ص ۱۸۶) میں یہ بھی ہے کہ اس کو دوسرے علماء کے ساتھ یونانی مصنفین کی کتابوں کی تلاش کے لیے قسطنطنیہ بھیجا گیا تھا، اسی طرح الفہرست ص ۲۶۸ اور ابن القفطی ص ۹۷ میں ہے کہ اس مترجم کو مجسطی کے ایک قدیم ترجمہ کی اصلاح کا کام بھی سپرد کیا گیا تھا، اور اشتینشنید رجو اس کو (سلم کو) مترجم سلام الابرص سمجھتا ہے، اس کا یہ خیال غلط ہے، وہ حران کا باشندہ تھا اس کا علم ہمیں صرف اسی توقیع سے حاصل ہوتا ہے، جو ہمارے مخطوطہ کے خاتمہ پر ثبت ہے،

وہ شخص جو ارسطو کی کتابوں کے مترجمین میں سلم سے پہلے گذرا ہے، اس توقیع کی رو سے ابو نوح "الکاتب النصرانی" تھا، اس کی شخصیت کو ہم یقینی طور پر متعین کر سکتے ہیں کیونکہ جاثلیق طیماتاؤس اول (متوفی ۸۲۳ء) جسے خلیفہ مہدی اور ہارون رشید کے دربار میں بڑا مرتبہ حاصل تھا اور جس کو خلیفہ نے ارسطو کی کتابوں کے عربی زبان میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا تھا، وہ اکثر اپنے رسائل میں جن میں سے ۵۷ رسائل اب بھی محفوظ ہیں، ان تراجم کا ذکر کرتا ہے، اور یہ بھی بیان کرتا ہے کہ ان تراجم میں ابو نوح نے اس کو مدد دی، چنانچہ ان خطوں میں جو اس نے قسیس فتیون کو بھیجا تھا (مجموعہ رسائل کا نمبر ۴۳) ارسطو کی کتاب طوبیقا کے عربی ترجمہ کا ایک خاص طرز سے ذکر کیا ہے، اس کا وہ حصہ جو اس ترجمہ سے متعلق ہے یہ ہے:

خلیفہ نے ہم کو ارسطو فلسفی کی کتاب طوبیقا کو سریانی زبان سے عربی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا، اور بفضل خدا اس کام کو شیخ ابو نوح نے انجام دیا، میں نے اس حصے میں جو سریانی زبان سے متعلق تھا کسی قدر اس کی مدد کی، وہ خود سریانی اور عربی دونوں میں خاص مہارت رکھتا ہے، ممکن ہے کسی نے بھی پہلے اس کتاب کا عربی میں ترجمہ کیا ہو، ہم نے اس سے قبل بھی تم کو اس کے متعلق لکھا تھا، اور اس سلسلے میں جو واقعات پیش آئے، ان کی خبر بھی دی تھی، لیکن یہ ترجمہ خلیفہ کی

کی نظر سے نہیں گزرا اور یہ تراجم نہ صرف لفظی بلکہ معنوی حیثیت سے بھی سقیم ہیں، ایک تو موضوع کی دشواری کی وجہ سے، دوسرے مترجمین کی کم علمی وجہ سے"۔

رسائل طیماتاؤس میں دوسرے مقامات پر بھی ابونوح کا تذکرہ ملتا ہے، اور اسمانی نے عمرو بن متی طرہانی کی کتاب تاریخ البطارقہ پر اعتماد کرکے اس کے متعلق بعض دوسری چیزوں کا بھی ذکر کیا ہے جن سے اس کا نام اور زیادہ متعین ہو جاتا ہے، مثلاً اس کے نام کے ساتھ انباری لکھا ہے، اور یہ بھی تحریر کیا ہے کہ وہ موسیٰ بن مصعب والی موصل کا کاتب تھا، (اس کا مقابلہ اس کے لقب کاتب نصرانی سے کیجئے جو بیروت کے مخطوطہ کی توقیع میں موجود ہے) اور تعلیم میں طیماتاؤس کا ہم سبق اور اس کا دوست بھی تھا، اس نے ۷۷۹ء میں اس کے جاثلیق منتخب ہونے میں نمایاں خدمات انجام دی تھیں، ایک چیز یہ بھی قابل غور ہے کہ عبد یشوع نے اسکی کتابوں کی فہرست میں ایک کتاب کا ذکر کیا ہے، جو قرآن مجید کی تردید میں ہے، (شرا جادی قرآن) لیکن ہمارے نزدیک یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی کہ وہ وہی ابونوح بن الصلت ہو جس کو الفہرست نے ص ۲۴۴ میں یونانی زبان کے مترجمین کے زمرے میں ذکر کیا ہے،

ان واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ارسطو کی کتابوں کے مختلف تراجم کے متعلق جو کچھ توقیع میں مذکور ہے وہ بالکل صحیح ہے، اور محمد بن عبد اللہ (بن) المقفع نے خلیفہ مہدی یا ہادی کے عہد خلافت میں اورغانون کی کتابوں کا یحییٰ بن خالد کے لیے خلاصہ یا ترجمہ کیا، اور نصرانی کاتب ابونوح، ہارون رشید کا معاصر تھا، لیکن سلم جو بیت الحکمۃ کا مہتمم تھا اس نے ایک مدت کے بعد مامون کے عہد خلافت میں اس کام کو انجام دیا، توقیع میں ایک ایسی قیمتی روایت ہے، جس سے تاریخ اسلام میں قدیم ترین ارسطاطالیسی تراجم کا پتہ چلتا ہے، ان تراجم کی تاریخ کے لیے ضروری ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ مترجم اول نے سریانیوں کے طریقے کے مطابق

رغانون کی صرف پہلی تین کتابوں کا ترجمہ کیا لیکن ابونوح اور طیماتاوس کے زمانے میں دوسری کتابوں کا بھی ترجمہ ہوا جیسا کہ ہم اس سے قبل بیان کرچکے ہیں، یا کم از کم اس کے کچھ حصوں خصوصاً کتاب طوبیقا کا ترجمہ ہوا، اور اس کے ساتھ ابودیقطیقا، کتاب الخطابہ اور کتاب الشعر کا بھی ترجمہ کیا گیا، پھر بھی فلسفۂ ارسطو سے واقفیت کا دائرہ منطقی کتابوں کے علاوہ مامون ہی کے عہد میں وسیع ہوا، ممکن ہے سلم پرانے طبقے سے تعلق رکھتا ہو لیکن ترجمہ کی وہ تحریک جس کا علمبردار حنین بن اسحاق تھا، اور جس کا سلسلہ چوتھی صدی کے نصف آخر میں یحییٰ بن عدی اور ابن زرعہ تک قائم رہا، اسی تحریک نے ارسطو کی جملہ تصانیف کو مسلمانوں کے لیے فراہم کیا،

رہا یہ سوال کہ محمد بن عبداللہ (بن) المقفع کا ترجمہ یا خلاصہ سریانی زبان سے ہوا یا یونانی سے تو اس کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ کرنا ممکن نہیں، کیونکہ اس مقصد کے لیے پورے مخطوطہ پر غائر نظر ڈالنا ضروری ہے، طیماتاوس نے اپنے مقدم الذکر رسالہ میں ارسطو کی کتاب طوبیقا کے ان قدیم تراجم کے بارے میں جو بلا واسطہ یونانی زبان سے کیے گئے، جو کچھ لکھا ہے، اگر اس کو ملحوظ رکھا جائے تو میرے نزدیک اس کا امکان ہے کہ محمد نے سریانی ترجمہ کے وسیلہ براہ راست اصل یونانی سے ترجمہ کیا ہو،

بہرحال اس بحث سے ہم جن نتائج تک پہنچے ہیں مسلمانوں کی علمی تاریخ کے اعتبار سے انکی بہت بڑی اہمیت ہے، کیونکہ اب یہ ثابت ہوگیا ہے کہ ارسطاطالیسی کتابیں قطعی فارسی زبان سے عربی میں ترجمہ نہیں کی گئیں، جیسا کہ اکثر لوگوں کا خیال ہے، اور اس کا سبب ابن المقفع کی جانب منسوب ایک روایت ہے جس کے سمجھنے میں لوگوں نے غلطی کی، نیز یہ کہ تاریخ اسلام میں ارسطاطالیسی تراجم کی پہلی منزل جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا، اہل مغرب (سریانی قوم اور اہل اسکندریہ) کے ارسطاطالیسی تصانیف کے ساتھ اعتنا سے کوئی علحدہ چیز سمجھنے کا امکان نہیں، اور یہ چیز اس وقت اور بھی واضح ہوجاتی ہے جب اس کو ہم ملحوظ رکھیں، کہ اہل فارس کا اثر ریاضی اور علم الافلاک میں برابر قائم رہا جیسا کہ نلینو اور اُس کا نے

ثابت کیا ہے، اسی طرح اسلام کے ابتدائی زمانے میں علم طب پر بھی مشرق کا اثر پڑا اور طب ہندی جو اس وقت فارس کے بڑے بڑے مدارس میں چھائی ہوئی تھی، قریب قریب اس میں ضم ہو گئی،

بایں ہمہ ان چیزوں میں یونان کا ترکہ اس درجہ قوی اور مستحکم تھا کہ اس نے تقریباً تمام مشرقی عناصر کو ان سے نکال پھینکا، اور یہ چیز تیسری صدی کے اختتام سے پہلے تک موجود تھی، جہاں تک فلسفہ کا تعلق ہے، اس پر مشرق کا کوئی مستقل اثر نہیں پڑا، یہ ممکن ہے کہ ارسطو اور افلاطون کی تصانیف نوشیروان کے لیے فارسی زبان میں ترجمہ ہوئی ہوں، جیسا کہ اجیثاس کا بیان ہے، گو یہ روایت اس کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے ثابت نہیں ہوتی، البتہ یہ ثابت ہے کہ اسلام سے قبل جندیسا پور اور ایران کے دوسرے شہروں میں طب کے اعلیٰ مدارس میں فارسی زبان میں فلسفہ کی تعلیم ہوتی تھی، ممکن ہے فلسفیانہ اصطلاحات مثلاً یونانی لفظ اوسیا کے لیے جوہر کا لفظ ان ہی مدارس نے وضع کیا ہو، لیکن یہ حقیقت ثابت شدہ ہے کہ یونانی فلاسفہ کی کتابوں میں سے کوئی بھی کتاب فارسی زبان سے عربی میں ترجمہ نہیں کی گئی،

دیوان حافظ میں الحاق

از جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب لکھنؤ یونیورسٹی

(۳)

حافظ و شاہان ہند ہندوستان کے بادشاہوں کی علم نوازی ضرب المثل تھی، وہ علماء و فضلاء کی سرپرستی میں اشرفیوں پانی کی طرح بہاتے تھے، اور عرب و ایران کے علماء و شعراء کو زر کثیر دے کر اپنے یہاں بلاتے تھے، حافظ کے معاصر بادشاہوں نے بھی اس قدیم روایت کو برقرار رکھا، شعر و سخن کی قدر دانی کا پورا ثبوت دیا، حافظ کی ایک غزل میں شاہ غیاث الدین کا نام آیا ہے جو بنگال کا بادشاہ معلوم ہوتا ہے، اس بادشاہ نے حافظ سے تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی، مگر سلطان مذکور کی شخصیت میں اختلاف ہے، اسلئے تعلقات پر روشنی ڈالنے سے قبل اسکی شخصیت کا تعین ضروری ہے،

غیاث الدین نام کے حسب ذیل بادشاہوں کا نام[1] ہندوستان کی تاریخ میں ملتا ہے،

۱- غیاث الدین بلبن بادشاہ دہلی ۶۶۴ھ - ۶۸۵ھ

۲- غیاث الدین تغلق " " ۷۲۱ھ - ۷۲۵ھ

۳- غیاث الدین بن شاہ اسکندر بادشاہ بنگال و لکھنوتی ۷۶۸ھ - ۷۷۵ھ

۴- غیاث الدین تغلق بن سلطان فیروز شاہ بادشاہ دہلی ایک سال ۷۹۰ھ

۵- غیاث الدین بہمنی بن محمود شاہ بہمنی بادشاہ دکن چند ماہ ۷۹۹ھ

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۷۴، ۱۲۱، ج ۲ ص ۲۹۶ - ج ۱ ص ۱۵۰، ۳۰۴، ج ۲ ص ۳۰۴، ۳۵۴، ج ۲ ص ۲۱۵

۶۔ غیاث الدین بن سلطان محمود خلجی سلطان مالوہ ۸۷۳ھ۔ ۹۰۶ھ

اس فہرست سے ظاہر ہے کہ صرف تیسرے اور چوتھے غیاث الدین حافظ کے معاصر تھے، اور چونکہ حافظ نے اپنی غزل میں "بنگالہ" کا نام صراحۃً لکھا ہے، اس لیے سوائے غیاث الدین بن شاہ سکندر پادشاہ بنگال کے اور کوئی دوسرا مراد نہیں ہو سکتا،

بعض لوگوں نے[1] اشارہ کیا ہے کہ بادشاہ بنگال نے حافظ کو دعوت بھیجی تھی، مگر یہ خیال صحیح نہیں، حافظ نے سلطان غیاث الدین کے بھیجے ہوئے مصرعوں پر جو غزل لکھی تھی[2] وہ غزل یہ ہے:

ساقی حدیث سرو و گل و لالہ میرود	وین بحث با ثلاثۂ غسالہ میرود
می دہ کہ نو عروس چمن حد حسن یافت	کار این زمان ز صنعت دلالہ میرود
شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند	زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ میرود
طی مکان ببین و زمان در طریق شعر	کاین طفل یک شبہ رہ یکسالہ میرود
آن چشم جادوانۂ عابد فریب بین	کش کاروان سحر ز دنبالہ میرود
از رہ مرو بعشوۂ دنیا کہ این عجوز	مکارہ می‌نشیند و محتالہ میرود
باد بہار می‌وزد از گلستان شاہ	وز ژالہ بادہ در قدح لالہ میرود
حافظ ز شوق مجلس سلطان غیاث دین	خامش مشو کہ کار تو از نالہ میرود

فزونی استرآبادی مولف کتاب "بحیرہ"[3] حسام الدین عوض خلجی (غیاث الدین خلجی) کی حکومت کے ضمن میں لکھتا ہے:

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ ادبیات ایران (شفق) چاپ دوم ص ۳۰۵ مقدمہ دیوان نذر ان ص ۸۷ [2] اس میں ایک بیت اور ہے جو الحاقی ہے: خوی کردہ می‌خرامد و بر عارض سمن :: از شرم روی او عرق از ژالہ میرود

[3] یہ کتاب ۱۰۳۲ھ میں کشمیر میں مکمل ہوئی (ملاحظہ ہو میخانۂ عبدالنبی حالات فزونی استرآبادی) اور تہران میں ۱۳۲۸ھ میں طبع ہوئی، مؤلف نے ہندوستان اور ایران کے بہت دلچسپ حالات بہم پہنچائے ہیں،

"متوجہ ہندوستان ہوا اور محمد بختیار سے مل گیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب سکہ و خطبہ ہوگیا اور اس کا خطاب سلطان غیاث الدین ہوا، چنانچہ خواجہ حافظ نے حسب ذیل مقطع میں اشارہ کیا ہے:

حافظ بیا[1] بمجلس سلطان غیاث دین   نامش مشوکہ کار تو از نالہ میرود

کہتے ہیں کہ غسالہ نام ایک مطرب سلطان غیاث الدین خلجی کی مجلس میں تھی، اور اسکی تین لڑکیاں سرو و گل و لالہ تھیں، جو حسن و موسیقی و رقص میں ماہر روزگار تھیں، ایک روز غایت شوق سے بادشاہ کی زبان پر حسب ذیل مصرعہ جاری ہوا، ع ساقی حدیث سرو و گل الخ، اس نے شعرائے دربار سے دوسرا مصرعہ لگانے کا حکم دیا، مگر کوئی بادشاہ کے منشا کے مطابق مصرعہ لگانے میں کامیاب نہ ہوا، ایک تاجر مجلس میں موجود تھا، اس نے دفعۃً حافظ کا نام لیا، بادشاہ نے حافظ کے متعلق مزید حالات دریافت کیے، تاجر نے کہا ایک جوان شاعر ہے جس نے تازہ تازہ شعر کہنا شروع کیا، اس کے بعد حافظ کے کچھ شعر سنائے جو بادشاہ کو بہت پسند آئے، اور اس نے تاجر کے ذریعہ اس مصرعہ پر غزل کہنے کی فرمائش کی، ایک سال کے بعد تاجر شیراز واپس آیا اور حافظ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سوغات اور رقعہ دیکر سلطان کے دربار کے سارے حالات بیان کئے، خواجہ حافظ بہت محظوظ ہوئے اور غزل کہنے پر راضی ہوگئے، دوسرے دن جمعہ تھا، صبح تاجر کی ملاقات خواجہ سے ہوگئی، غزل ہو چکی تھی، اور یہ مصرعہ اسی مناسبت سے کہا تھا

ایں طفل یک شبہ رہ یکسالہ میرود

مجلس کے خصوصیات معلوم ہی ہو چکے تھے، سلطان کے مصرعہ پر یہ گرہ لگائی

دیں بحث باثلاثۂ غسالہ میرود

غزل تاجر کو مل گئی اور کچھ دنوں کے بعد تاجر ہندوستان آیا اور غزل بادشاہ کو پیش کی گئی

---

[1] کذا فی الاصل،

بہت پسند آئی۔" وشصت خروار قماش نفیس سوای عطریات و دیگر چیزہا بخدمت خواجہ ارسال داشت و تا این پیوستہ خواجہ را بسوغات لایق یاد آوری مینمود"

ظاہر ہے کہ مولف بحیرہ نے اس واقعہ کو جس بادشاہ سے متعلق بتایا ہے، وہ غیاث الدین بن اسکندر شاہ بنگالہ سے الگ ہے، اس میں صرف نام کا اشتباہ نہیں، بلکہ واقعات بھی مختلف ہیں، مولف کے نزدیک وہ بادشاہ ادنیٰ درجے سے ترقی کرکے بادشاہ ہوا تھا، حالانکہ غیاث الدین شاہ بنگال ایسا نہ تھا، اس کا باپ بھی بادشاہ تھا، ڈاکٹر محمد معین[1] نے بحیرہ کے بیان کردہ سلطان غیاث الدین کو سلطان غیاث الدین ابن محمود خلجی بتایا ہے، مگر یہ غلط ہے، اس لیے کہ سلطان غیاث الدین خلجی کا باپ شاہ محمود خلجی مالوہ کا نہایت جلیل القدر بادشاہ تھا، اس لیے بحیرہ کی تفصیل اس بادشاہ پر بھی پوری طرح نہیں اترتی، صرف غیاث الدین تغلق[2] چھوٹے درجے سے بڑے درجے تک پہنچا تھا، پہلے وہ حاکم دیبالپور و لاہور تھا، پھر ناصر الدین خسرو خاں کو ۷۲۱ھ میں شکست دیکر غیاث الدین کے نام سے دہلی کا فرمانروا ہوا، مگر اول تو اس کا نام غازی ملک تھا، جبکہ بحیرہ کے مطابق بادشاہ کا نام حسام الدین عوض خلجی تھا، دوسرے وہ حافظ کا معاصر نہیں ہوسکتا، کیونکہ ۷۲۱ھ میں حافظ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، بہرحال بحیرہ کے بیان کیے ہوئے حالات اس نام کے کسی ایک بادشاہ پر پورے نہیں اترتے، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ لوگوں نے "بحیرہ" کی بیان کی ہوئی تفصیل سے اختلاف کیا ہے، اور یہ "گنجینہ عرفان" کے بیان کے مطابق اور بقول ڈاکٹر معین[3] "قصہ بحیرہ درست تر و با متن غزل موافق تر است" البتہ بحیرہ کا یہ بیان بالکل صحیح ہے کہ یہ غزل حضرت ہی بھر میں تیار ہوگئی تھی، لیکن ڈاکٹر قاسم غنی نے اس غزل کو سلطان غیاث الدین محمد بن سلطان عماد الدین احمد

---

[1] حافظ شیریں سخن ص ۲۶۵ [2] دیکھئے فرشتہ ج اول ص ۱۲۱ ببعد [3] حافظ کا سنہ پیدائش ۷۲۶ھ کے قریب رہا ہوگا [4] حافظ شیریں سخن ص ۲۶۵ حاشیہ [5] ایضاً (متن)

ابن مبارز الدین محمد کی طرف منسوب کیا ہے[1]، ان کے بیان کے ضروری اجزاء درج ذیل ہیں،

"غزلی راکہ خواجہ دربارۂ او سرودہ در اینجا نقل کنیم :

ساقی حدیث سرو و گل و لالہ میرود — وین بحث با ثلاثۂ غسالہ میرود[2]

سلطان غیاث الدین محمد پسر بزرگ سلطان عماد الدین احمد بن امیر مبارز الدین محمد است کہ در تواریخ آل مظفر ... کمتر نام او بردہ شدہ است۔ از جملہ محمود کتبی در وقایع سال ہفتصد و نود و سہ نوشتہ است کہ سلطان زین العابدین از اصفہان نزد عم خود سلطان احمد کرمان فرستادہ استمداد جست کہ متفقاً با شاہ منصور بجنگند و در ماہ صفر سلطان احمد با فرزند سعید شہید [خود] سلطان غیاث الدین محمد بتوجہ سیرجان شد" ....

کلمۂ سلطان جزء اسم او ست کہ در زمان آل مظفر شائع بود و بسیاری از شاہزادگان این خانوادہ کلمۂ "سلطان" ضمیمہ اسم آنہا بودہ است ....

شبلی نعمانی واز قول او مرحوم او داد براون نوشتہ اند کہ مقصود از این "سلطان غیاث الدین" مذکور در غزل خواجہ حافظ یکی از ملوک ہند است ولی شبلی نعمانی ہیچ ماخذی بدست نمیدہد و تصور میرود کہ اشتباہ او ناشی از این بیت باشد :

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند الخ

مرحوم او داد براون با کمال احتیاط و با مسئولیت خود شبلی این قصہ را نقل میکند و بہیچ جای دیگر صحبتی از این موضوع نیست"

---

[1] تاریخ عصر حافظ ص ۴۲۰ - ۴۲۱ [2] مضمون شعر عربی است کہ "اشرب بالنبیذ ثلاثۃ ... فیہا الشفاء وصحۃ الایمان - ذقیل القدح الاول یکسر العطش والثانی یہری الطعام والثالث یفرح النفس ومازاد علی ذالک فضل" محاضرات جلد اول ص ۳۲۳ (بحوالہ تاریخ عصر حافظ ص ۴۲۰)

لیکن یہ قول درست نہیں معلوم ہوتا، اس لیے کہ جہاں غیاث الدین کو سلطان لکھا ہے
وہاں اسے اس بیت میں شاہ بھی قرار دیا ہے:

بادِ بہاری وزد از گلستان شاہ الخ

اس سے صاف ظاہر ہے کہ غیاث الدین صرف شاہزادہ ہی نہ تھا بلکہ اچھا خاصہ بادشاہ تھا،

دوسری بات یہ ہے کہ یہ غزل غیاث الدین ہی کے نام پر معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے اس کا یہ شعر یقیناً بادشاہ ہی سے متعلق سمجھا جائے گا:

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند ‌‌‌‌ ‌ زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ میرود

بنگالہ کا فقرہ غیر مربوط نہیں ہے، اس لیے غیاث الدین کو شاہ بنگال تصور کرنا بالکل صحیح ہے، اور جبکہ اس نام اور لقب کا بادشاہ اسی زمانے میں بنگال میں موجود تھا تو خواہ مخواہ اس سے انکار کرنا درست نہیں،

تیسری بات یہ ہے کہ کم از کم ایک قدیم ماخذ[1] نکل ہی آیا، اور میرے خیال میں مولانا شبلیؒ کے سامنے اس کے علاوہ دوسرا کوئی اور ماخذ رہا ہوگا۔

حافظ اور محمود بہمنی | تاریخ فرشتہ سے معلوم[2] ہوتا ہے کہ شاہ محمود بہمنی (۷۸۰ھ-۷۹۹ھ) بڑا سخن ور اور علم نواز بادشاہ گزرا ہے، ایک بار ایک ایرانی شاعر اس کے دربار میں آیا اور قصیدہ پیش کیا، بادشاہ نے ایک ہزار "تنکہ طلا" مرحمت کیا، اس طرح اسکی سخاوت و قدرشناسی عالمگیر ہوئی، خواجہ حافظ اس بادشاہ کا حال سنکر "راغب سفر دکن" ہوئے، لیکن بعض موانع کی وجہ سے ان کا ارادہ "قوت" سے "فعل" میں تبدیل نہیں ہوتا تھا، جب میر فیض اللہ[3] انجو نے کچھ زادِ سفر

لہ قزوینی کی بحیرہ جو ۱۰۲۲ھ کی تالیف ہے، قزوینی کی ایک اور کتاب فتوحات عادلشاہیہ عادلشاہیوں کی تاریخ ہے، جسکا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں ہے ۲ھ ج اول ص ۳۰۲ ۳ھ حافظ شیریں سخن ص ۱۲۴ پر یہ نام میر فضل اللہ دیا ہے،
(باقی حاشیہ ص ۲۲۷ پر)

شیراز بھیج کر دکن آنے کی دعوت دی تو حافظ بڑے شوق سے تیار ہو گئے، اور زاد سفر میں سے کچھ اپنے بھانجوں اور بیواؤں کو دیا اور کچھ سے قرض ادا کر کے ہندوستان کے ارادہ سے لاہور تک آئے۔ یہاں اپنے ایک دوست کو پریشانی میں دیکھ کر بالکل تہیدست ہو گئے لیکن دو ایرانی سوداگر یعنی زین العابدین ہمدانی اور خواجہ محمد گازرونی حافظ کے سفر خرچ کے متکفل ہو گئے[1]، اور سب ساتھ ہرمز پہنچے، خواجہ حافظ ان دونوں کے ساتھ محمود شاہی کشتی میں جو دکن سے آئی تھی سوار ہوئے، ابھی کشتی روانہ نہیں ہوئی تھی کہ باد مخالف کے چلنے سے سمندر میں طوفان آیا، خواجہ بہت گھبرا گئے اور اس سفر سے اتنا متنفر ہوئے کہ بہانہ کر کے کشتی سے اتر گئے اور ایک غزل کہہ کر ایک دوست کے ذریعہ میر فیض اللہ انجو کی خدمت میں بھیج دی[2]؛

دمی با غم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد   بمی بفروش دلق ما کزیں بہتر نمی ارزد

جب یہ غزل میر فیض اللہ کے پاس پہنچی تو انھوں نے موقع سے بادشاہ کو تمام واقعات سے مطلع کیا، بادشاہ نے ملا محمد قاسم مشہدی کو جو دربار کے وابستگان میں تھے "ہزار تنکہ طلا" دیا کہ ہندوستان سے سامان خرید کر خواجہ حافظ کے پاس شیراز لیجائیں"

مگر اس سارے بیان میں اس بات کا ادنیٰ اشارہ نہیں کہ شاہ محمود نے حافظ کو دکن آنے کی دعوت دی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۶) اور است علامہ سعد الدین تفتازانی کا شاگرد بتایا ہے لیکن ص ۲۲۰ (متن) میں میر فیض اللہ ہی ہے نیز ملاحظہ ہو حاشیہ ص مذکور، مقدمہ پژمان ص ۳، پر مرزا افضل الہ ملتا ہے۔

[1] تاریخ فرشتہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ ان سوداگروں کے برتاؤ سے خوش نہ تھے، ج ۱ ص ۳۰۲ [2] مگر مقدمہ پژمان ص ۳، پر کرایہ کی کشتی کا ذکر ہے [3] فرشتہ میں اس غزل کے ۸ شعر درج ہیں، جن میں یہ شعر الحاقی ہے ؎

بشو این نقش دلتنگی کہ در بازار یکرنگی   بہ نعمتہای گوناگون می احمر نمی ارزد

اسکے بجائے خلخالی، قزوینی اور پژمان نے یہ بیت دی ہے ؎ تراآن بہ کہ روی خود ز مشتاقان بپوشانی :: کہ شادی جہانگیری غم لشکری نیرزد اسکے علاوہ دو اور الحاقی بیتیں اس غزل میں موجود ہیں: (۱) دیار دیار مردم رامقید میکند لیکن :: چہ جای پارس کاین محنت جہان یکسر نمی ارزد (۲) برو کنج قناعت جو بکنج عافیت بنشین :: کہ یکدم تنگدل بودن بحر و بر نمی ارزد (نیز ملاحظہ کیجئے پژمان ص ۹۲ ج ۳)

اس غزل میں قدیم نسخوں کی رو سے صرف ۷ اشعار ہیں، لکھنؤ اڈیشن میں ۱۰ شعر ہیں جن میں مندرجہ بالا تین یقیناً الحاقی ہیں، (نولکشوری (۱۸۸۵ء) ص ۱۲۰ - ۱۲۱) اور یہ الحاق حافظ کے سفر دکن کے قرین کو قوی کرنے کی بنا پر عمل میں آیا تھا۔

تھی لیکن بعض[1] کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ خود شاہ نے حافظ کو دعوت دی تھی، حافظ کے دل میں ہندوستان آنے کا خیال پہلے سے نہ تھا،

ڈاکٹر محمد معین[2] نے حسب ذیل غزل کو بھی شاہ محمود سے متعلق بتایا ہے،

من باشم کہ براں خاطر عاطر گذرم	لطفہا میکنی ای خاک درت تاج سرم
دلبرا بندہ نوازیت کہ آموخت بگو	کہ من این ظن برقیبان تو ہرگز نبرم
ہمتم بدرقہ راہ کن ای طایر قدس	کہ دراز است رہ مقصد و من نوسفرم
ای نسیم سحری بندگی ما برساں	کہ فراموش مکن وقت دعای سحرم
خرم آنروز کزیں مرحلہ بربندم رخت	وز سر کوی تو پرسند رفیقان خبرم
پایۂ نظم بلند است و جہانگیر بگو	تا کند "پادشہ بحر" دہان پرگہرم
راہ خلوتگہ خاصم بنما تا پس ازیں	می خورم با تو و دیگر غم دنیا نخورم
حافظا! شاید اگر در طلب گوہر وصل	دیدہ دریا کنم از اشک و در و غوطہ خورم

اس کے بعد خود ڈاکٹر موصوف[3] نے یہ اضافہ کیا ہے:

"بعضی تصور کردہ اند کہ ایں غزل در بارہ پادشاہ ہرمز گفتہ شدہ و "پادشہ بحر" اوست ولی بنظر صحیح نمی آید، زیرا حافظ ہرگز او را ندیدہ، پس از مراجعت حافظ بشیراز بود کہ صلۂ شاہ ہرمز بوسیلۂ ذہبگاہ خواجہ بدیدن او نرفت درصورتیکہ در غزل فوق خواجہ فرماید راہ خلوتگہ خاصم بنما الخ"

لیکن اگر حافظ کے بادشاہ ہرمز کو نہ دیکھنے کی وجہ سے یہ غزل اس کی طرف منسوب نہیں ہو سکتی تو یہی وجہ تو شاہ محمود بہمنی کے انتساب میں بھی حائل ہو سکتی ہے،

دوسرے یہ کہ شاہ محمود کو "پادشہ بحر" کہنا موزوں ہے، کسی جزیرہ کے بادشاہ کے لیے

---

[1] مجلہ نوبہار شمارہ ۱۱ بحوالہ حافظ شیریں سخن ص ۱۲۴ [2] ایضاً ص ۲۰۸ [3] ص ۱۲۵ حاشیہ

البتہ یہ خطاب دلپذیر ہوگا،

تیسرے یہ کہ مقطع میں بھی دریا کے سارے مناسبات کا بیان ثابت کرتا ہے کہ ممدوح کا تعلق سمندر سے ضرور تھا،

چوتھے یہ کہ بیت ششم[1] جس سے ڈاکٹر موصوف نے اس کی عام نسبت سے انکار کیا ہوا ہے، وہ دیوان غلجانی ص ۱۸۷ و قزوینی الحاقی ہے۔ اور پژمان کے یہاں بھی متن میں نہیں حاشیہ میں اضافہ ہے۔ اور ساتھ ہی یہ نوٹ بھی ہے: "این بیت ہم در این غزل است ونسبت آن بخواجہ مناسب نیست۔"

ان تفصیلات کے باوجود ڈاکٹر قاسم غنی اس غزل کو شاہ ابو اسحٰق اینجو کی طرف منسوب کرتے ہوئے حافظ کے سفر دریا اور دعوت ہندوستان کو افسانہ قرار دیتے ہیں[2]:

"افسانہ ئی کہ راجع بسفر دریائی خواجہ حافظ و عزم ہندوستان داشتن وبعد منصرف شدن او نوشتہ اند (رجوع شود بتاریخ فرشتہ جلد اول ص ۳۰۲ فارس نامہ ناصری ج ۲ ص ۱۴۵) از روی این شعر بسی آسان می نمود اول غم دریا ببوے سود :: غلط کردم کہ این طوفان بصد گوہر نمی ارزد، وامثال آن ساختہ شدہ است وبطوریکہ در قسمت "شرح حال خواجہ حافظ" خواہیم گفت اساس تاریخی ندارد، در این غزل احتمال قوی میرود کہ بیت چہارم شکوہ تاج سلطانی الخ اشارہ بشاہ شیخ ابو اسحٰق باشد۔ زیرا او تنہا شاہی است کہ در زمان او (حافظ) در فارس کشتہ شدہ است۔"

ڈاکٹر غنی نے "بحث در افکار و احوال حافظ" کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، اس کی دو جلدیں یعنی "تاریخ عصر حافظ" اور "تاریخ تصوف در اسلام" تو حلیہ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں، لیکن اس سلسلے کی سب سے اہم کتاب یعنی "شرح حال خواجہ حافظ" کی تکمیل کا موقع ابھی نہیں آیا، اس لیے ڈاکٹر موصوف کی تحقیقات سے ہم واقف نہ ہو سکے، جو انھوں نے حافظ کے متعلق کی ہیں اور ہم ان دلائل سے محروم

[1] نیز ملاحظہ ہو حافظ شیریں سخن ص ۱۶۹ [2] تاریخ عصر حافظ ص ۳۰۶، حاشیہ نمبر ۱

رہے، جن کی بنا پر وہ حافظ کے سفر ہندوستان کو افسانہ اور بے اساس ٹھہراتے ہیں، انکی عدم موجودگی میں کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہم فرشتہ کے قول کو مسترد کردیں جس کا علم تاریخ دکن کے بارے میں نہایت وسیع تھا، اور جس نے اس سفر کی ساری تفصیلات دی ہیں، اس کے علاوہ کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر فرشتہ کو اس واقعہ کے گھڑنے میں کیا مصلحت تھی،

اگر ڈاکٹر قاسم غنی کے اس قوی احتمال کو کہ شکوہ تاج سلطانی الخ والی بیت شاہ اسحٰق کے قتل پر دلالت[1] کرتی ہے، حقیقت سمجھ لیا جائے تو بھی یہ کیونکر تسلیم کیا جا سکے گا کہ پوری غزل اسی واقعہ سے متعلق ہے، غزل جیسی داخلی شاعری سے جس کی ہر بیت عموماً دوسری بیت سے معنوی طور پر کوئی علاقہ نہیں رکھتی، اس طرح کا استنباط صحیح نہ ہوگا، اکثر دیکھا گیا ہے کہ غزل کا ایک شعر کسی پرانے دردناک واقعہ پر مبنی ہوتا ہے، مگر اس کے دوسرے ابیات کا اُس خاص واقعہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اس لیے ڈاکٹر صاحب کے مفروضات کی تائید کے باوجود ان کا نتیجہ فی الحال قابل قبول نہیں، البتہ اگر ان کے سارے دلائل سامنے ہوتے اور ان کی تائید کسی اہم تاریخی ماخذ سے ہوتی تو ان کا نتیجہ ضرور قابل توجہ ہوتا، ورنہ جو واقعہ اس قدر مشہور ہو چکا ہو اس کو یوں ہی افسانہ کہہ کر مسترد نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] شاہ کا قتل ۷۵۸ھ میں واقع ہوا، اس وقت حافظ کی عمر زیادہ سے زیادہ ۳۰ - ۳۱ سال کی رہی ہوگی۔ چونکہ غزل میں جن خیالات کا اظہار ہے وہ بڑے تجربے پر مبنی ہیں اس لئے اتنی عمر کے نوجوان کی طرف منسوب نہیں ہو سکتے۔ غرض یہ بات مسلم ہی ہے کہ یہ غزل شاہ موصوف کے قتل کے بہت بعد لکھی گئی۔ اس لحاظ سے بھی اسکو شاہ اسحٰق سے متعلق بتانا صحیح نہیں ہے۔

جلوۂ صد رنگ : جناب حبیب احمد صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی سکریٹری یوپی گورنمنٹ کا مجموعۂ کلام جو موصوف کی غزلوں نظموں اور کچھ متفرق اشعار پر مشتمل ہے،

دارالمصنفین اعظم گڈھ،

آثارِ علمیہ

مکاتیب مولانا سید سلیمان ندوی بنام شاہ معین الدین احمد ندوی

مورخہ ۳ جنوری ۱۹۵۱ء

(۸)

برادر عزیز القدر وفقکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ کے اس اظہار سے خوشی ہوئی کہ آپ دار المصنفین کو دو کی یادگار سمجھ کر باقی رکھنے کی کوشش کریں گے، میری عمر چاند کے حساب سے ۶۵ سال کی ہوئی، اب نئے کام کا وقت نہ تھا، مگر کیا جائے کہ تقدیر الٰہی یہی تھی، دیسنہ ویران ہوچکا، اعظم گڈھ میں قلب کے لیے راحت کا سامان نہ تھا، تیسری جگہ کا قصد کیا، ۷ ماہ ہوچکے ہیں، ہنوز روز اول ہے یعنی دل ودماغ فیصلہ سے عاجز ہیں، گو زمانہ خود فیصلہ کر رہا ہے، سرکاری قید سے ابتک آزاد ہوں،

دار المصنفین کے قیام کے لیے ضروری ہے کہ اس کو دوبارہ منظم کیا جائے، ارکان کچھ چل بسے کچھ چل رہے ہیں، کچھ بے تعلق ہوگئے، اس لیے ارکان کا انتخاب کرکے تعداد پوری کرلیں، پھر ان میں سے ارکان عاملہ کو چنیں، ارکان عاملہ کی ایک کمیٹی ہو، جو علمی وعملی دونوں شعبوں کی نگرانی کرے، آپ نظامت آپ قبول کرلیں اور عملی مولوی صاحب رہیں، جیسے ابتک ہیں، عاملہ کی خالی جگہوں میں سے ایک پر ناظم علمی کی حیثیت سے آپ خود ہی ممبر ہوجائیں گے، مولوی مناظر صاحب کو بھی لے لیں، انشاء اللہ میر صباح الدین صاحب کو لے لیں، سید عبد الحکیم دیسنہ اور سید مرتضیٰ علی صاحب دہلوی بھی ہوسکتے ہیں، مجلس دار المصنفین کی

صدارت ڈاکٹر محمود صاحب کو دیجائے، ماجد میاں کو مجلس انتظامیہ کی صدارت دے سکتے ہیں، گو مولانا حمید الدین کے بعد یہ عہدہ غیر ضروری ہوگیا ہے، میں نے سنا ہے کہ ماجد میاں کا وظیفہ حیدرآباد والا بند ہوگیا ہے، اچھا ہو کہ دار المصنفین ان کو وظیفہ دے کر اپنالے،

میرے یہاں آنے کے بعد کیا دار المصنفین کی مانگ میں ترقی نہیں ہوئی ہے؟ دار المصنفین نولکشور پریس نہیں ہے، جس کا مقصد محض سرمایہ پیدا کرنا ہو، بلکہ وہ ایک ذہنی دعوت ہے جس کا ہر جگہ پھیلانا بھی اس کی کامیابی ہے،

۱۱ کو دہلی سے ہوائی جہاز سے مشرقی پاکستان کا قصد ہے، ہفتہ عشرہ میں واپسی ہوگی،

والسلام   سید سلیمان

(۹)

سید سلیمان ندوی   مورخہ ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء

برادر عزیز   وفقکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ معارف آیا، دیکھکر خوش ہوا، اولاد کسی کی طرف منسوب ہو، اگر اچھی ہو تو کو بہرحال اس کو دیکھکر خوشی ہوتی ہے، میں نے پہلے بھی لکھا ہے اور اب پھر لکھتا ہوں کہ اپنی تکمیل کے ساتھ ایک دو دینی صلاحیت کے طلبہ کی تربیت بھی ضروری ہے تاکہ یہ کام چلتا رہے، میرے خیال میں دار المصنفین صرف ایک دار الاشاعۃ نہیں، بلکہ یہ ایک دینی و ذہنی دعوت ہے جس نے ہنیروں کو متاثر کیا ہے، جس طرح اس کی ضرورت ہندوستان کو ہے، اس سے زیادہ ضرورت اس کی پاکستان کو ہے،

انکار حدیث کا فتنہ یہاں پھیل رہا ہے، ضرورت ہے کہ معارف کے تمام پچھلے مضامین ایک ترتیب خاص سے مرتب کرکے چھپوائے جائیں، یہ کام اگر وہاں ہوسکتا ہو تو وہاں چھپوائیے، ورنہ مرتب کرکے یہاں بھیجئے تو یہاں چھپایا جائے، اسی طرح میرا پرانا خیال جو صحاح ستہ کی تاریخ کا تھا، اسکو پورا کیجئے، موطا اور بخاری پر میرا، مسلم پر مولوی عبد السلام صاحب کا اور ترمذی پر آپ کا مضمون ہے، غرض اس کو مکمل کرکے چھپوائیے یا مسودہ

یہاں بھیجئے تو یہاں چھاپا جائے،

جاڑوں سے میرے داہنے ہاتھ میں درد رہتا ہے، تیل کی مالش ہوتی ہے، مگر ہنوز زائل نہیں ہوا ہے، اس لیے لکھنے میں تکلیف ہوتی ہے،

ڈاکٹر عبد الحئی صاحب کے خط میں آپنے جو کچھ لکھا ہے، اس کو پڑھ کر متاثر ہوا، اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے سایہ میں رکھیں اور توفیق عمل عطا فرمائیں،

مولوی عبد السلام صاحب سلام قبول فرمائیں، مولوی مسعود علی صاحب تو ابھی وطن ہوں گے۔

عزیزی صباح الدین بھی وطن میں ہوں گے،

کتبخانہ میں خطبات عرب و ہند کا ایک اور نسخہ ہوگا جس کے آخر میں میرے کچھ اضافے ہیں عبد صاحب سے لکھکر اس اضافہ کی نقل بھجوا دیں۔

یحییٰ صاحب سے کہکر سیرۃ نبوی، سیر الصحابہ اور تاریخ اسدم کے ہر حصہ کے پانچ پانچ نسخے رجسٹرڈ ڈاک سے بھجوا دیں،

مولانا شبلی مرحوم کی تصانیف یہاں تمام مطبع والے چھاپ رہے ہیں چنانچہ تاج کمپنی والوں نے بھی شروع کر دیا ہے، آم یہاں مل رہے ہیں، مگر آپ والے کہاں

ہاں حسرت موہانی پر کچھ لکھ رہا ہوں، اگر لکھیے تو بھیجدوں، والسلام

سید سلیمان

(۱۰)

مورخہ ۱۹ رمضان ۱۳۷۰ء

عزیز مکرم حفظکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم، آپ کے دو کارڈ ملے، آفتاب احمد سلمہ کے لیے ایک تحریر جاتی ہے۔ الیاس احمد جن کا نام آپ نے لکھا تھا وہ تو آئے نہیں، انکا انتظار کیا۔ اب آپکے دوبارہ طلب پر آپ ہی کے نام

بھیج رہا ہوں، آپ لکھتے ہیں کہ میرے گذشتہ ملفوف میں کوئی جواب طلب بات نہ تھی، میں نے آپ سے عرب و ہند کے تعلقات کے اس دوسرے نسخہ کے آخر سے جو دار المصنفین میں ہے، ان قلمی اضافوں کی ایک نقل مانگی تھی، جو اس میں میں نے کیے تھے، اور لکھا تھا کہ مولوی عبد الباری صاحب سے نقل کرا کے بھیجد یجئے، آپ گرمی اور روزے کی شدت میں بھول گئے،

(۱) خواتین اسلام کی بہادری کا ایک نسخہ بھیجد یجئے، یحییٰ صاحب نے جو نسخہ بھیجا تھا وہ بیچ سے ناقص ہے،

(۲) رسالہ اہل السنۃ کی کاپی اگر کتبخانہ میں ہو تو چند روز کیلئے بھیجد یجئے، طبع جدید کے بعد واپس کر دونگا،

(۳) میں نے ایران سے فارسی زبان میں خیام کے فلسفیانہ رسالے منگوائے تھے، آپ فلسفہ کی الماری میں دیکھیں، چھوٹی تقطیع ہے، اس کا نام اور پتہ صاف لکھوا کر بھیجد یجئے، ورنہ وہی رسالہ کچھ دن کے لیے بھیجد یجئے،

چند آم از قسم چونسہ وغیرہ بازار سے ہاتھ آئے ہیں، ڈاکٹر آفتاب احمد سے ڈھاکہ میں ملاقات ہوئی تھی،

والسلام سید سلیمان ۔ ۲۵ر جون ۱۹۵۱ء

۱۱

۳ر اگست ۱۹۵۱ء

برادر عزیز القدر ادام اللہ توفیقکم بما یحب و یرضیٰ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ آپ کا لفافہ پہنچا جس سے تشفی ہوئی، خط کے جواب میں دیر ہوتی ہے تو یہی شبہہ ہوتا ہے کہ ضائع ہو گیا، امید ہو کہ آپ بخیریت ہوں گے، کتابیں پہنچیں، رسالہ درخواست نامۂ خیام جو آپنے بھیجا ہو، یہی مطلوب تھا، افسوس ہو کہ ناقص نکلا یعنی ناقص ہی شائع ہوا ہے، میری کتاب خیام میں کلیات الوجود کے نام سے پورا رسالہ ہے، مگر کرم خوردگی کے سبب سے ہمارے نسخہ کے بعض حرف پڑھے نہ جا سکے، انکی اس سے تصحیح ہو گئی، رسالہ سے فراغت اسی دن ہو گئی، اس کو واپس بھیجدوں گا،

حسرت پر میرا مضمون ابتک لکھا ہوا ہو، کوئی صاف کرنے والا نہیں، جو صاف کر دے، اس لیے کہ کاتب سے غلطیوں کا ڈر ہے،

مولانا شیروانی پر جو میں نے لکھا تھا اور معارف میں چھپا تھا میرا خیال ہو کہ میں نے صحیح لکھا تھا، مگر آپکے یہاں غلط چھپا، اگر میرا اصلی مسودہ مطبع سے مل سکے تو دیکھیے کہ میں نے نہیں لکھا تھا، وہ آپ کے باں غلام محی الدین چھپا، اس پر برہان والوں کو موقع ہاتھ آیا، چونکہ آپ مجھے اپنی محبت سے اپنے بزرگوں کا درجہ دیتے ہیں، اس لیے دو نصیحتیں کرتا ہوں، ایک یہ کہ دار المصنفین کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ آگے بھی یہ چراغ جلتا رہے، اسلیے جوہر قابل کی تلاش میں رہیں، اور جب کوئی ملے تو اس کی تربیت کریں۔

دوسری چیز یہ ہے کہ من نہ کردم شما حذر بکنید اپنا جائز حق کبھی نہ چھوڑیے، دنیا اسکی قدر نہیں کرتی، میں نے اپنی سادگی اور دنیا ناشناسی سے ہر جگہ نقصان اٹھایا، آپنے بہت اچھا کیا جو جامعہ یا مدرسہ عالیہ کا قصد نہیں کیا، دار المصنفین سے باہر کبھی قدم نہ رکھیں، آپ کا معاوضہ حسب ضرورت ہمیشہ بڑھ سکتا ہے، آپ اس کو اپنی زندگی کا کام بنائیں، ورنہ یہ لاکھوں کا سرمایہ اور عمروں کا حاصل تباہ ہو جائیگا،

اب آیندہ آپ کیا لکھنا چاہتے ہیں، کوئی موضوع پیش نظر ہے، عرب ہند کے تعلقات کا جو نسخہ وہاں ہے اس کے بالکل آخر میں دیکھیں، چند سطریں اضافہ کیلیے قلم سے لکھی ہیں، جس میں جیمو رکے جوتوں کا ذکر ہے اس کو نقل کر کے بھیج دیجئے، اس کا پہلا نسخہ جو میرا تھا، آپ کا بھیجا ہوا مل گیا۔

کتب احادیث صحاح ستہ کی تاریخ کے بارہ میں آپنے کچھ نہیں لکھا۔ والسلام

سید سلیمان

(۱۲)

کراچی ۵ ۱۳ دسمبر ۱۹۵۱ء

برادر عزیز السلام علیکم ورحمۃ اللہ

الحمد للہ بخیریت ہوں، آجکل تقویت اعصاب کے انجکشن اور تقویت قلب کی مفرح دوا کھا رہا ہوں،

یہاں اجمیر کے ایک شریف مخلص ندوی طبیب حکیم نصیر الدین ندوی مل گئے ہیں، تمام ندویوں کے یہاں وہ مرکز محبت ہیں، نہایت شریف و فیاض و مخلص نوجوان ہیں مجھے اور میرے تعلق کے تمام احباب اعزہ سے

محبت کرتے ہیں، وہ بیچارہ اکثر میرے معالج رہتے ہیں، ڈاکٹری معالج ڈاکٹر یونس صاحب ہیں،

یکم دسمبر ۱۹۵۱ء کو ٹنڈو آدم (نواب شاہ سندھ میں) جو یہاں سے چند گھنٹوں کے راستہ پر ہے، ایک مدرسہ ندوۃ العلوم کی بنیاد ایک ندوی عالم وطبیب حکیم بابو عبداللہ (بارہ بنکی) نے ڈال دی، جلسہ میں اکثر ندوی برادری کے اصحاب اور بعض دیوبند کے حضرات موجود تھے، احکام بر سر امداد ہیں،

معارف میں لکھنؤ کانفرنس کی روداد پڑھی، امید ہے کہ آپ کا مضمون بھی جلد پڑھوں گا،

پاکستان میں سرکاری امداد سے ایک ہسٹاریکل کانفرنس بن گئی ہے، اسکا آئندہ اجلاس مارچ میں لاہور میں ہوگا، اگر آپ یا صباح الدین صاحب کوئی تاریخی مضمون بھیج سکیں تو بھیج دیں، میں ڈابل بندر کی جائے وقوع کی تعیین پر لکھنا چاہتا ہوں، اگر آپ عرب جغرافیہ کی کتابوں میں بلاذری سے لیکر انساب سمعانی تک سے ڈابل کے متعلق عبارتوں کے اقتباسات بھیجدیں تو بڑی مدد ملے، کیا آپ یہ کر سکتے ہیں،

والسلام سید سلیمان

(۱۴۳)

کراچی ۵

عزیز مکرم زادکم اللہ تعالیٰ توفیقاً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، آپکا ڈابل اور دیبل کے اقتباسات ملے جزاکم اللہ تعالیٰ، ان دنوں متفرق کاموں میں مصروف رہا، یہاں مصروفیت زیادہ تر جلسوں کمیٹیوں اور ملاقاتوں اور دعوتوں میں رہتی ہے، ابھی کسی منظم کام کی بنیاد نہیں پڑی ہے کوششیں جاری ہیں، اللہ تعالیٰ کامیاب فرمائیں، بالفعل اتحاد علماء الاسلام اور عربی کانفرنس بنام مجمع اللغۃ العربیہ کے اجلاس فروری کے ۱۴ سے ہو رہے ہیں، مصر اور شام کے اضطرابات کے باعث وہاں سے کوئی نہیں آ رہا ہے، باقی ممالک سے آنے والوں کی امید ہے، یہ دنیائے اسلام کے علماء کا پہلا تاریخی اجتماع ہوگا، خدا کرے کہ اتفاق و اتحاد پر اسکا انجام ہو، شیعہ علماء بھی ایران و عراق سے آ رہے ہیں، خبر تو روس کے علماء کے آنے کی بھی ہے، الجزائر اور عراق سے لوگ آچکے ہیں، سیلون سے آ رہے ہیں،

آپکا اردو والا مضمون پڑھا، اچھا اور مفید ہے، جامعہ میں کیا موضوع بیان ہوگا، کیا جامعہ اسلامیہ کا تخیل ابھی باقی ہے، دار المصنفین کی روداد ملی، بحمد اللہ اسکی آمدنی اس کی بقا کی ذمہ داری کر رہی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ بھوپال بند ہو چکا اور حیدرآباد سے بھی آئندہ امید نہیں۔ والسلام سید سلیمان، ۱۱ فروری

مطبوعات جدیدہ

بہادر شاہ اور انکا عہد - از مولوی رئیس احمد صاحب جعفری ندوی تقطیع بڑی،

ضخامت ۶۰۳ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت تحریر نہیں، پتہ کتاب منزل کشمیری بازار لاہور۔

مولوی رئیس احمد صاحب جعفری ان زود قلم مصنفین میں ہیں، جن کے قلم سے تصانیف کا دریا رواں رہتا ہے، وہ ایک ایک سال میں کئی کئی کتابیں لکھ ڈالتے ہیں، اور ایسی ایسی ضخیم کہ ایک ایک کتاب کئی کئی کتابوں پر بھاری ہوتی ہے، مذکورۂ بالا کتاب بھی اسی قسم کی عظیم الجثہ تصنیف ہے، یہ بہادر شاہی عہد کا مرقع ہے جس میں اس کے ہر رخ کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے، یہ دور اگرچہ تیموریوں کے خاتمہ کا زمانہ تھا، ان کی شان و شوکت قصہ پارینہ بن چکی تھی پھر بھی دلی کی تہذیبی بہار پورے شباب پر تھی اور بقول میر

دلی کے نہ کوچے تھے اوراق مصور تھے   جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

لیکن انقلاب ۱۸۵۷ء میں اس بہار پر بھی خزاں آگئی، اس دور کے متفرق سیاسی، علمی اور تمدنی حالات مختلف کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں، کوئی ایسی کتاب موجود نہیں ہے جس سے اس عہد کی پوری تصویر نظر آجائے، اسی مقصد کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے، اس میں اس دور کے ہر رخ کی جھلک دکھانے کی کوشش کی گئی ہے، اور اس جامعیت کے ساتھ کہ اس کا کوئی اہم رخ چھوٹنے نہیں پایا ہے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے عنوانات کی فہرست ۵ ہم صفحوں میں آئی ہے، اس کی موٹی موٹی سرخیاں یہ ہیں، بہادر شاہ کے عہد کا سیاسی

پس منظر، ان کے دور کے سیاسی حالات، انگریزوں سے تعلقات کی نوعیت، بہادر شاہ کے ذاتی حالات اور ان کے اوصاف وخصوصیات، قلعہ معلیٰ کی زندگی، تیموری تہذیب کے مختلف مرقعے، دلی کے علماء ومشائخ، شعرا و ادبا و ارباب ہنر، اخبارات، علمی وادبی ترقیاں، بہادر شاہ کے عہد کی نئی نسل، انگریزوں کی الحاق کی پالیسی، مختلف ریاستوں کا انضمام، ان کی بدعہدیاں، غدر کے اسباب ونتائج، اور اس کے حالات وغیرہ، ان میں سے ہر بحث بڑی جزدی تفصیل کے ساتھ لکھی گئی ہے، جس سے بہادر شاہ کے عہد کی پوری تاریخ اور اس زمانہ کی دلی کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے، مصنف کی انشا پردازی اور زور قلم پوری کتاب میں نمایاں ہے، مگر یہ ظاہر ہے کہ اتنے گوناگوں مباحث میں تمام واقعات کا تحقیقی معیار پر پورا اترنا ضروری نہیں ہے، لیکن اس سے بہادر شاہی عہد کی تاریخ کا نہایت موثر اور دلکش مرقع نظر آجاتا ہے۔

سیرت اشرف - مرتبہ جناب منشی عبد الرحمن صاحب، تقطیع بڑی ضخامت ۵۰۱ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد عـــہ، پتہ ادارہ نشر المعارف، چلیک ملتان شہر

حضرت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ کی سب سے مفصل سوانح عمری دربار اشرفی کے خسرو خواجہ عزیز الحسن غوری مرحوم نے ان کی زندگی میں لکھی تھی، جو کئی جلدوں میں ہے، اس موضوع پر دوسری اہم کتاب مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کی تالیف حکیم الامت ہے جو ایک خاص طرز سے مرتب کی گئی ہے، اس کے علاوہ مولانا مرحوم کے خلفاء اور متوسلین نے مختلف پہلوؤں پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے ہیں، ان کے ملفوظات اور تحریروں میں بھی ان کے کمالات اور کارناموں کا بڑا مواد موجود ہے، اب اس سلسلہ کے ایک اور متوسل منشی عبد الرحمن صاحب نے ان سب کی مدد سے سیرت اشرف مرتب کی ہے، اس میں حضرت مولانا کے مختصر سوانح، ان کے اخلاق وسیرت، عادات وخصائل، کمالات وخصوصیات اور علمی ومذہبی کارناموں کو بڑی جامعیت واختصار

کے ساتھ مرتب کیا ہے، اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی اس کی جامعیت اور ترتیب ہے، حضرت مولانا کے متعلق جن معلومات کے لیے بہت سی کتابوں کی ورق گردانی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ تنہا اس کتاب میں مل جاتے ہیں، اس لحاظ سے یہ کتاب حضرت مولانا کے حالات و سوانح کا خلاصہ و عطر ہے۔

کتاب الآثار امام محمد۔ مترجمہ جناب مولانا ابو الفتح محمد صغیر الدین صاحب، ضخامت ۶۳۰ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی قیمت مجلد آٹھ روپئے، پتہ محمد سعید اینڈ سنز ناشران و تاجران کتب، قرآن محل، مقابل مولوی مسافر خانہ کراچی۔

حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الآثار حدیث کی نہایت قدیم اور احناف کی اہم ترین کتابوں میں ہے، حتی کہ موطا امام مالک سے بھی قدیم ہے، اس سے پہلے حدیثوں کے جو مجموعے تالیف کیے گئے، ان میں بغیر کسی ترتیب کے محض احادیث و سنن کو جمع کر دیا گیا تھا، اور اب وہ ناپید بھی ہیں، کتاب الآثار پہلی کتاب ہے جو فقہی ترتیب پر مرتب کی گئی ہے اور جس میں حضرت امام اعظم کا تفقہ بھی نمایاں ہے، اس کے بعد کے تمام مولفین نے اس کی تقلید کی، یہ کتاب صحابہ کرام اور ائمہ عظام کے نو سو منتخب آثار کا مجموعہ ہے، اس لیے قدامت و صحت اور ترتیب و تفقہ ہر لحاظ سے یہ کتاب حدیث کی ممتاز ترین کتابوں میں ہے، اور امام اعظمؒ کے بہت سے تلامذہ سے مروی ہے جن کے نسخوں میں حذف و اضافہ اور باہم اختلاف و ترمیم بھی ہے، ان میں امام محمد کی روایت کردہ کتاب الآثار سب میں زیادہ جامع اور مستند ہے، اور کتاب الآثار امام محمد کے نام سے موسوم ہے، اردو میں ابتک اس کا ترجمہ نہیں ہوا تھا، اس لیے مولانا ابو الفتح محمد صغیر الدین صاحب نے مع اصل کے اس کو اردو کا جامہ پہنایا ہے، اور جابجا فوائد کے ماتحت ضروری امور و مسائل کی تشریح بھی کر دی ہے، ترجمہ صاف و سلیس ہے، کتاب کے شروع میں امام محمد کا مختصر حال، حضرت امام اعظمؒ کے فضل کمال، ان کے حفظ و اتقان حدیث میں ان کے درجہ، کتاب الآثار کی تالیف کی تاریخ، اس کی خصوصیات پر تبصرہ اور

اس کے مروجہ مختلف نسخوں کا ذکر ہے۔

موطا امام محمد مترجم اردو۔ مترجمہ خواجہ عبد الوحید صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۵۴ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد للعہ پتہ: محمد سعید اینڈ سنز ناشران وتاجران کتب قرآن محل مقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی،

حدیث کی کتابوں میں موطا امام مالک کا درجہ محتاج بیان نہیں، اس کے بھی بہت سے رواۃ ہیں، ان میں دو راویوں کی موطا زیادہ مشہور ہے، ایک یحییٰ بن یحییٰ لیثی اندلسی کی روایت کردہ، دوسرے امام محمد شیبانی کی، پہلی عرف عام میں موطا امام مالک کہلاتی ہے، اور دوسری موطا امام محمد، ان دونوں میں موطا امام محمد بھی اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر تمیاز حاصل ہے، موطا امام محمد کا ترجمہ اردو میں ہو چکا ہے، مگر وہ پرانے طرز کا ہے، اسلئے خواجہ عبدالوحید صاحب نے مع اصل کے ترجمہ کیا ہے، اور جابجا فوائد کے عنوان سے تشریح طلب امور کی شرح بھی کر دی ہے، کتاب کے شروع میں مولانا عبد الرشید صاحب کے قلم سے ایک مقدمہ ہے، جس میں موطا امام مالک اور موطا امام محمد کا مفصل تعارف اور ان کی خصوصیات وغیرہ کا ذکر ہے، یہ مقدمہ زیادہ تر موطا امام محمد پر مولانا عبدالحئی مرحوم فرنگی محلی کے مبسوط عربی مقدمہ سے ماخوذ ہے۔

قصص النبیین جزو ثالث۔ جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تقطیع اوسط ضخامت ۱۳۸ صفحات، خوشخط ٹائپ میں عمدہ کاغذ پر چھپی ہے، قیمت تحریر نہیں، مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے ملیگی۔

فاضل مولف نے عربی مدارس کے طلبہ کیلئے انبیاء علیہم السلام کے قرآنی قصص پر عربی ریڈروں کا جو مفید سلسلہ شروع کیا ہے، یہ اس کا تیسرا حصہ ہے، جس میں حضرت موسیٰ کا قصہ ہے، اور بنی اسرائیل کے قیام مصر کے زمانہ سے حضرت موسیٰ کی وفات تک بنی اسرائیل کو جو واقعات پیش آئے، انکو جن جن حالات سے گذرنا پڑا، اور پیہم انعامات الٰہی کے بعد انکی سرکشی کی سزا میں انکا جو انجام ہوا، انکو قرآنی آیات کی روشنی میں بڑے موثر اور سبق آموز انداز میں بیان کیا گیا ہے، اس طرح اس کتاب کے ذریعہ عربی زبان کیساتھ مذہب و اخلاق کی بھی تعلیم ہو جاتی ہے، اور طلبہ کو قرآن مجید سے بھی مناسبت پیدا ہو جاتی ہے، کتاب کی افادیت کے لیے مصنف کا نام نامی پوری ضمانت ہے۔

" م "

مکتبہ دار المصنفین

سلسلۂ سیرۃ النبی

حصہ اول: ولادت سے فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ﷲ/

حصہ دوم: وفات، اخلاق و عادات کا مفصل بیان: ﷲ/

حصہ سوم: معجزہ کی حقیقت، قرآن مجید کی روشنی میں بحث و تبصرہ لعہ/

حصہ چہارم: تبلیغ نبوی کے اصول، عقائد اسلام پر مفصل و حکیمانہ بحث عہ/

حصہ پنجم: فرائض خمسہ پر سیر حاصل بحث معہ/

حصہ ششم: اسلامی اخلاقی تعلیمات و اسلامی فضائل و آداب کی تفصیل لعہ/

(سلسلۂ سیر الصحابہؓ)

خلفائے راشدینؓ: خلفائے راشدینؓ کے ذاتی حالات و فضائل صہ/

مہاجرین جلد اول: حضرات عشرہ مبشرہ اور بقیہ صحابہؓ کے حالات و فضائل ﷲ/

مہاجرین جلد دوم: فتح مکہ سے پہلے کے صحابہ کرام کے حالات صہ/

سیر الانصار، اول: انصار کرام کے فضائل و کمالات ﷲ/

" دوم: بقیہ انصار کرام کے حالات زندگی ﷲ/

سیر الصحابہ جلد ششم: حضرات حسنینؓ، امیر معاویہؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ کے مفصل حالات للعہ/

سیر الصحابہؓ جلد ہفتم: فتح مکہ کے بعد کے صحابہ کرام کے سوانح و حالات للعہ/

سیر الصحابیاتؓ: ازواج مطہرات، بنات طاہرات اور عام صحابیات کے حالات عہ/

اسوۂ صحابہؓ اول: صحابہ کرام کے عقائد، عبادات و اخلاق کی تفصیل للعہ/

" دوم: صحابہ کرام کے سیاسی و انتظامی کارناموں کی تفصیل صہ/

اسوۂ صحابیاتؓ: صحابیات کے مذہبی، اخلاقی اور علمی و عملی کارناموں کا مرقع عہ/

اہل کتاب صحابہؓ و تابعینؒ: یہودی و نصرانی صحابہؓ کے حالات للعہ/

الفاروق: حضرت فاروق اعظمؓ کی لائف اور عراق و شام، مصر و ایران کی فتح کے تفصیلی حالات ﷲ/

سیرت عائشہؓ: حضرت عائشہؓ کے حالات زندگی صہ/

سیرت عمر بن عبد العزیزؒ: عمر ثانی حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے سوانح حیات اور انکے مجددانہ کارنامے عہ/

(سلسلۂ تاریخ اسلام)

تاریخ اسلام حصہ اول: (عہد رسالت و خلافت راشدہ) ﷲ/

" دوم: بنی امیہ دمشق کی صد سالہ تاریخ ﷲ/

" سوم: ابو العباس سفاح سے متقی للہ ۱۳۲ھ تا ۳۳۳ھ تک خلافت عباسیہ کی تاریخ معہ/

" چہارم: خلیفہ مستعصم باللہ تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی تاریخ اور عباسیوں کے تمدنی کارناموں کی تفصیل ﷲ/

حکمائے اسلام

حصہ اول و دوم

یوں تو اردو میں مشاہیر حکمائے اسلام کے حالات میں الگ الگ متعدد کتابیں موجود ہیں، الغزالی، امام رازی، ابن رشد تو اسی ادارہ کی کتابیں ہیں لیکن کوئی ایسی جامع کتاب نہیں تھی جس میں ان سب کے حالات یکجا کر دیے گئے ہوں، یہ کتاب اسی کمی کو پورا کرنے کیلیے لکھی گئی ہے جس میں ان کے حالات و سوانح کے ساتھ ان کی ہر قسم کی مذہبی، اخلاقی اور فلسفیانہ خدمات کو نمایاں کیا گیا ہے، اس کے دو حصے ہیں، پہلے حصہ میں یعقوب کندی، ابو نصر فارابی، محمد بن زکریا رازی، ابن مسکویہ، ابوریحان بیرونی، امام غزالی، ابوالبرکات بغدادی کے حالات اور ان کے فلسفیانہ مسائل کی تشریح ہے، اور دوسرے میں ابن باجہ، ابن طفیل، ابن رشد، امام رازی مغلوں اور تاتاریوں کے عہد کے حکما، حکمائے متاخرین، خاندانِ فرنگی محل، خاندانِ خیرآباد اور مختلف خاندانوں کے حکما، مثلاً ملا نظام الدین، مولانا عبد العلی بحر العلوم، مولانا فضل حق خیرآبادی، ملا محمود جونپوری، ملا محب اللہ بہاری وغیرہ کے حالات اور انکے نظریات و خیالات کی تشریح، اور انھوں نے اپنے علم و فلسفہ سے اسلام کی جو عظیم الشان خدمات انجام دیں، ان کی تفصیل ہے، مولفہ مولانا عبد السلام ندوی مرحوم، قیمت حصہ اول سعہ دوم سے

اقبال کامل

مشہور حکیم و فلسفی شاعر ڈاکٹر اقبال کے مفصل سوانح حیات، ان کے فلسفہ و شاعری پر تبصرہ اور انکی شاعری کے اہم موضوعوں یعنی فلسفہ خودی فلسفہ بیخودی اور نظام اخلاق وغیرہ کی تشریح

مرتبہ مولانا عبد السلام ندوی مرحوم، قیمت: ــہ

(طابع و ناشر صدیق احمد)

رجسٹرڈ نمبر

اپریل ۱۹۵۷ء

معارف

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیہ سالانہ

دفتر دارالمصنفین اعظم گڈھ

(۱) جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی

(۲) جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی

(۳) شاہ معین الدین احمد ندوی

(۴) سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے

تاریخ دعوت و عزیمت

یعنی عالم اسلام کی اصلاحی و تجدیدی کوششوں کا تاریخی جائزہ، نامور مصلحین اور ممتاز اصحاب دعوت و عزیمت کا مفصل تعارف، ان کے علمی و عملی کارناموں کی رُوداد، اور انکے اثرات و نتائج کا تذکرہ، اسمیں پہلے مصنف کے قلم سے پیش لفظ ہے، اسکے بعد مقدمہ جسمیں اصلاح و تجدید کی ضرورت اور تاریخ اسلام میں انکا تسلسل دکھایا گیا ہے، پھر اصل کتاب شروع ہوتی ہے جو مولانا جلال الدین رُومی کی اصلاحی و تجدیدی کوششوں کی تفصیل پر جا کر ختم ہوتی ہے، قیمت : ۔ے/

مرتبہ مولانا ابوالحسن علی ندوی

مآل و مشیت

اس میں حیات انسانی کے دو بنیادی تصور مآل و مشیت کی فلسفیانہ تحلیل کیگئی ہے، یہ وقت کی بہترین کتاب ہے جسپر اسکے لائق مصنف جناب ظفر حسین خاں صاحب کو حکومت ہند کیطرف سے پانچہزار کا انعام ملا ہے، ہے تو موضوع کے اعتبار سے خالص فلسفیانہ اور بہت خشک لیکن مصنف کے انشا پردازانہ اسلوب تحریر نے اسکو بہت دلچسپ ولآویز بنا دیا ہے، ان ہی کے قلم سے فرانس کے مشہور ادیب کا ایک مقالہ کا اردو ترجمہ اسی اسلوب و طرز نگارش میں ادارہ کیطرف سے اس سے پہلے شائع ہو چکا ہے۔

قیمت ۶ر

جلد ٧٩ ماہ رمضان المبارک ١٣٧٦ھ مطابق ماہ اپریل ١٩٥٧ء نمبر ٤

فہرست مضامین

شذرات | شاہ معین الدین احمد ندوی | ٢٤٢-٢٤٤

مقالات

مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ | سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے | ٢٤٥-٢٦٦

یونانی منطق کے قدیم عربی تراجم | جناب شبیر احسن صاحب نوہروی ایم اے، ایل ایل بی، بی ٹی، ریچ | ٢٦٧-٢٨٨

ایران کے کتب خانے | جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب لکھنؤ یونیورسٹی | ٢٨٩-٣٠٢

اسلامی تصوف کا نظری اور عملی پہلو | جناب گوپی چند صاحب نارنگ ایم اے | ٣٠٣-٣٠٨

آثار علمیہ

مکاتیب مولانا سید سلیمان ندوی بنام شاہ معین الدین احمد ندوی | ٣٠٩-٣١٥

ادبیات

تدریسی اشارے | جناب سید اختر علی تلہری | ٣١٦

مطبوعات جدیدہ | م | ٣١٧-٣٢٠

شذرات

ابھی چند سال ہوئے مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ عربی کے ماتحت ادارۂ علوم وفنون اسلامی
نام سے ایک علمی ادارہ قائم ہوا ہے جس کا مقصد اسلامیات پر تحقیقات ہے، اس مرتبہ اس کے لائ
ڈاکٹر عبد العلیم صاحب کے ساتھ اس کو دیکھنے کا موقع ملا، ادارہ کے متعلق ایک کتبخانہ ہے، گو ابھی
ہے لیکن اسلامیات کی تحقیقات سے متعلق عربی اور فارسی کی اہم اور ضروری کتابیں موجود ہیں اور ا
اضافہ کا سلسلہ برابر جاری ہے، ان میں بعض نئی مطبوعات اور پرانی کتابوں کے نئے عمدہ اڈیشن ایسے
آئے جو ہندوستان میں دستیاب نہیں ہوتے، ان کو ڈاکٹر صاحب مصر، ٹرکی اور ایران کے سفر سے
تھے، کئی ریسرچ اسکالر اسلامیات کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقات کا کام کر رہے ہیں، ابھی یہ ادارہ
منزل میں ہے، اگر اس سے پورا کام لیا گیا تو امید ہے کہ آیندہ چل کر ایک مفید اور اہم ادارہ بنجائے گا

اس سلسلہ میں وقت کی ایک اہم ضرورت کا تذکرہ نامناسب نہ ہوگا جسکا احساس اور لوگو
بھی ہے ہندوستان میں کم وبیش ایک ہزار سال سے ہندو مسلمانوں کا ساتھ ہے، اسکے باوجود ایک محدود دا
کے علاوہ من حیث القوم دونوں قوموں نے ایک دوسرے کے مذہب، انکے تصورات، نظام زندگی او
وفنون کو سمجھنے کی بہت کم کوشش کی جس سے آجتک انکے متعلق غلط فہمیاں ہیں، گو ہر زمانہ میں مسلمانوں
ایسے اہل علم موجود رہے ہیں جنکو اس ضرورت کا احساس تھا، اور انھوں نے اس فرض کو انجام بھی دیا، چن
قدیم علماء و مصنفین میں ابو معشر فلکی، ابو ریحان بیرونی، امیر خسرو دہلوی اور غلام علی آزاد وغیرہ نے ہندوؤں کے مذا
اور علوم وفنون کی بڑی خدمت کی اور انکے متعلق عربی اور فارسی میں معلومات کا بڑا ذخیرہ فراہم کر دیا، ا
دور کے علماء میں مولانا شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مناظر احسن گیلانی نے اس ضرورت کی طرف توجہ کی اور اس پر مضامین لکھے

سید سلیمان ندوی نے تو عرب و ہند کے تعلقات جیسی ضخیم اور فاضلانہ کتاب لکھی جو ہند و مسلمانوں کے تعلقات کے مختلف پہلوؤں پر حاوی ہے، اور جس میں اس قسم کے بہت سے مسائل آگئے ہیں، ہندوؤں میں صرف ڈاکٹر تارا چند کا نام قابل ذکر ہے،

مگر اب تک جسقدر کام ہوا ہے، وہ ضرورت کے مقابلہ میں ناکافی ہے، اسلیے ہند و مسلمان اہل علم و قلم اور انکے علمی اداروں کا یہ فرض ہے کہ وہ ایک دوسرے کے مذہب، علوم اور تہذیب کے متعلق ایسا مستند اور تحقیقی لٹریچر مہیا کریں جس سے ان کی صحیح شکل نظر آئے خصوصاً مسلمانوں کو مذہب اسلام، اسلامی علوم اور اسلامی تاریخ و تہذیب کو ان کی اصلی شکل اور ہندوستان میں ان کے مذہبی اور تمدنی اثرات کو پوری تفصیل سے پیش کرنے کی ضرورت ہے، اور اگر ہو سکے تو ہندی میں، اس سے ان چیزوں کے متعلق غلط فہمیاں بھی دور ہونگی اور انکی عظمت بھی لوگوں کے دلوں میں قائم ہوگی، یہ کام مذہبی و علمی اور قومی و سیاسی ہر حیثیت سے ضروری ہے، دار المصنفین کے آیندہ کاموں میں بھی انشاء اللہ اسکا لحاظ رہیگا، توقع ہے کہ وہ علوم و فنون اسلامی بھی اسکو پیش نظر رکھے گا،

مسلمانوں کی دینی تعلیم کا سب سے بڑا مرکز ہمیشہ سے دلی اور صوبہ متحدہ رہا ہے، عربی کے تمام بڑے بڑے دار العلوم یہیں ہیں، مگر مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں یعنی موجودہ مغربی و مشرقی پاکستان میں بھی ہر زمانہ میں مذہبی تعلیم کا بڑا چرچا رہا ہے، اور اب بھی یہاں عربی کے بکثرت مدارس ہیں، انگریزی حکومت نے بھی یہاں کے مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کا لحاظ کرکے، ان صوبوں میں عربی و دینی تعلیم کی سرپرستی کی اور اس کی اشاعت کے مختلف ذرائع اختیار کیے تھے، چنانچہ یہاں عربی کے سرکاری و نیم سرکاری مدارس اور ان کے امتحانات کا پورا انتظام قائم ہے، کلکتہ اور ڈھاکہ میں مدرسہ عالیہ اور لاہور میں اورینٹل کالج عربی تعلیم کے بڑے مرکز ہیں، ڈھاکہ یونیورسٹی میں دینیات کا مستقل شعبہ قائم ہے، ان سرکاری تعلیم گاہوں کے علاوہ قومی مدارس کی بہت بڑی تعداد ہے، خصوصاً مغربی پاکستان میں متعدد ایسے مدارس ہیں جو دار العلوم کی حیثیت رکھتے ہیں، مگر یہ سب پرانے طرز کے ہیں، اور ان میں کوئی ربط و نظام نہیں ہے، اسلیے انکا فائدہ محدود ہے،

پاکستان کے قیام کے بعد قدرۃً وہاں عربی اور دینی تعلیم کی ضرورت و اہمیت اور بڑھ گئی ہے، اگر ان مدارس کی اصلاح اور تنظیم ہو جائے تو ان سے بڑا کام لیا جا سکتا ہے، اس ضرورت کے پیش نظر

ندوی نہیں، وہبی ندوی ہیں، یعنی تعلیم کے لحاظ سے تو ندوی نہیں لیکن اپنے فطری ذوق کی بنا پر ندوی ہیں، مونگیر میں مولانا محمد علیؒ نے ان کو تبلیغی کاموں میں لگایا، وہ چونکہ شروع ہی سے اچھے واعظ اور مقرر تھے، اس لیے اس کام کو اچھی طرح انجام دیا، مولانا محمد علیؒ کے خاندان سے ان کا رشتہ بھی ہوگیا تھا، ان کی ایک بہن مولانا محمد علیؒ کے بڑے صاحبزادے مولانا لطف اللہ مرحوم سے منسوب تھیں،

کچھ دنوں کے بعد وہ مونگیر سے پھر دیوبند بلالیے گئے، اور پچاس روپے ماہانہ پر القاسم کی ادارت پر مامور ہوئے، اسی زمانہ میں کلکتہ کے ایک انگریزی اخبار انڈین ڈیلی نیوز نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مبارک میں کوئی گستاخانہ تحریر شائع کی، تو علماء کی ایک جماعت کلکتہ پہنچی جس میں مولانا مناظر احسن بھی تھے، ان کی دینی حمیت اور ایمانی غیرت اس قدر جوش میں آئی کہ شاتم رسول اور اس کے ہم مذہبوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیدیا، کلکتہ کے ایک دوسرے اخبار اسٹیٹس مین نے ایک افتتاحیہ لکھکر حکومت کو ان کے خلاف ابھارا، اور گرفتاریاں شروع ہوگئیں، مولانا کے دوستوں اور ہموطنوں نے ان کو کلکتہ چھوڑنے پر مجبور کیا، اور وہ زبردستی بمبئی اور مدراس کے راستے سے دیوبند روانہ کردیے گئے، مگر راستے میں عید کا چاند دیکھکر حیدرآباد اتر پڑے، وہاں مولانا حمید الدین فراہیؒ سے ملاقات ہوئی، اس زمانہ میں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہونے والی تھی، مولانا حمید الدین نے ان کو یونیورسٹی میں درخواست دینے کا مشورہ دیا، وہ دیوبند چھوڑنا نہیں چاہتے تھے، لیکن خود دیوبند والوں نے ان کو یہ رائے دی کہ دکن میں دیوبند کے ایک عالم کا تقرر دینی حیثیت سے مفید ہوگا، اس لیے انھوں نے درخواست دیدی، ان کا تقرر ایک سال تک یونیورسٹی میں نہ ہوسکا، اس درمیان میں وہ مولانا حمید الدین فراہیؒ سے درس لیتے رہے، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی اس زمانہ میں حیدرآباد کے صدر الصدور تھے، اور وہاں

سرگرمیوں کا مرکز تھے، اسی لیے مولانا فراہیؒ مولانا گیلانیؒ کو ان کے پاس لے گئے، اور یہ
بطور امانت آپ کے سپرد کرتا ہوں۔" شروانی صاحب نے فرمایا "یہ امانت میرے پاس
لی"۔ مولانا گیلانی ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ "ان کے لطف و کرم کی موسلا دھار بارش
ملاقات کے بعد شروع ہوا، وہ زندگی کے آخری دنوں تک برستا رہا، امانت کا پورا
والے نے ادا کر دیا" عثمانیہ یونیورسٹی میں تقرر سے پہلے حیدرآباد کے قیام کے زمانہ
بیل ہو گئے، اور مستقل کھانسی اور بخار رہنے لگا، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی
ساتھ علی گڈھ لے گئے اور وہاں علاج کرایا، اس کے بعد وہ اپنے وطن گیلانی چلے گئے
کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی سے تقرر کا خط ملا، اور وہ ۱۹۲۰ء میں شعبۂ دینیات کے
ہو گئے، اور ۱۹۴۹ء میں اس شعبہ کے صدر کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے، پانچ سو
اس گراں قدر تنخواہ اور پنشن کے باوجود اپنی پرانی سادگی کسی حال میں نہیں چھوڑی،
قیام میں زیادہ تر ایک مسجد کے حجرہ میں رہے،
بوڑھے ہو کر ریٹائر ہوئے اور گیلانی میں آکر قیام کیا تو ان کا قلم اور بھی جوان ہو گیا،
وہ علمی کام کرتے رہے، وہ حضرت شیخ محی الدین بن عربیؒ سے بہت متاثر تھے، اور
موں کو تفصیل کے ساتھ لکھنا چاہتے تھے، چنانچہ لکھتے ہیں،

"سچی بات تو یہ ہے کہ ان کے کلام کے سمجھنے اور اس سے استفادہ کے لیے ایمان کو
ظر سلیم کے ساتھ ضرورت ہے کہ علم میں وسعت ہو، محدود معلومات والے تنگ نظر
کے لیے بسا اوقات ان کی باتیں نقصان رساں ہو جاتی ہیں، لیکن یہ ان کے کلام کا
بلکہ پڑھنے والوں کا نقصان ہے۔"

یں یہ تمام شرائط موجود تھے، اس لیے شیخ اکبر کو ان سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا تھا،

حافظ نذر احمد صاحب لیکچرار علوم اسلامی اسلامیہ کالج لاہور نے پاکستان کے دونوں حصوں کے مدارس کا جائزہ لیکر اس کی روداد شائع کی ہے، اور ہمارے پاس بھی اس کو اظہار رائے کے لیے بھیجا ہے، اس جائزہ میں پاکستان کے عربی مدارس کی تعداد، انکی جائے وقوع، ان کے نصاب اور طلبہ کی تعداد کا پورا نقشہ دیا ہے، اگرچہ یہ جائزہ مکمل نہیں ہے، پھر بھی اس کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان کے دونوں حصوں میں عربی مدارس کی اتنی بڑی تعداد ہے کہ انکی اگر اصلاح و تنظیم ہوجائے تو ان سے بڑا فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، اور یہ کام پاکستان کے لیے کچھ مشکل نہیں ہے اور اس میں امداد کرنا حکومت کا بھی فرض ہے۔

عربی مدارس درحقیقت دین کی حفاظت کے قلعے ہیں، اگر یہ مدارس نہ ہوتے تو ہندوستان اور پاکستان دونوں سے مذہب رخصت ہوچکا ہوتا، اور آج اس کی جو مدھم روشنی بھی باقی ہے وہ ان ہی مدارس کا فیض ہے، مگر حالات کے تغیر کے ساتھ دینی تعلیم کے نصاب، اسکے طریقہ تعلیم میں اصلاح اور جدید ضروریات کا بھی لحاظ ضروری ہے، اس کے بغیر اس زمانہ میں دین کی صحیح خدمت نہیں ہوسکتی اور نہ جدید تعلیم کی چکا چوند کے سامنے عربی مدارس کا چراغ جل سکتا ہے، خصوصاً پاکستان کے عربی مدارس اور عربی تعلیم کی اصلاح نہایت ضروری ہے، ورنہ وہاں مغربیت اور بے دینی کا جو سیلاب آیا ہے، وہ مذہب اور اسلامی تہذیب اور روایات سب کو بہالے جائے گا۔

معارف پریس میں ابتک باہر کا کام نہیں لیا جاتا تھا، مگر اب ایک نئی مشین کا اضافہ ہوگیا ہے جس سے باہر کے کاموں کی بھی گنجایش نکل آئی ہے، جو صاحب ذوق حسن و نفاست اور صحت کے ساتھ اپنی کتابیں یا اشتہار وغیرہ چھپوانا چاہتے ہوں وہ معارف پریس میں چھپوا سکتے ہیں،

معارف میں بھی دارالمصنفین کی کتابوں کے علاوہ اور کسی قسم کا اشتہار شائع نہیں کیا جاتا تھا، مگر اس کا خسارہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ اس اصول کو مجبوراً توڑنا پڑا، اور آیندہ سے اس میں سنجیدہ اشتہار شائع کیے جائیں گے، مشتہرین کو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

مقالات

مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ

(نقوش و تاثرات)

از جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ایم، اے

(۲)

مولانا کی زندگی علمی کاموں سے معمور رہی لیکن ہنگامے کے کاموں سے بالکل پاک ہی، ان کی داستان حیات بس اتنی ہے کہ پڑھتے رہے، پڑھاتے رہے، لکھتے رہے لکھاتے رہے، ابتدائی تعلیم اپنے وطن گیلانی میں پائی، وہاں سے ٹونک گئے، جہاں مولانا برکات احمد ٹونکی کے حلقۂ درس میں نو سال تک رہے، پھر دیو بند گئے، اور مولانا محمود حسنؒ، علامہ انور کشمیریؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا اصغر حسینؒ سے فیضیاب ہوئے، طالب علمی ہی کے زمانہ میں دیو بند کی مجلس شوریٰ میں طلبہ کی طرف سے نمایندہ منتخب ہوئے، جو اس زمانہ میں بڑا اعزاز تھا، دار العلوم کے ماہوار رسالوں القاسم اور الرشید کی ادارت ان کے سپرد ہوئی جس کے معاوضہ میں تیس روپے ماہانہ مقرر ہوئے، جب ان کے مضامین القاسم میں شائع ہوئے تو اکبر الہ آبادی نے ان کو بڑے حوصلہ افزا خطوط لکھے، دیو بند سے آکر کچھ دنوں مونگیر میں ندوۃ العلماء کے بانی مولانا محمد علی رحمۃ اللہ کی خانقاہ میں بھی رہے، ان کا خود بیان ہے کہ یہاں کی "خانقاہی زندگی میں ندوۃ العلماء کی گنگا جاری و ساری" تھا، جس کا اثر ان پر بھی پڑا، حضرت سید صاحبؒ ان کے متعلق فرماتے کہ وہ کبھی

ندوی نہیں، وہبی ندوی ہیں، یعنی تعلیم کے لحاظ سے تو ندوی نہیں لیکن اپنے فطری ذوق کی بنا پر ندوی ہیں، مونگیر میں مولانا محمد علیؒ نے ان کو تبلیغی کاموں میں لگایا، وہ چونکہ شروع ہی سے اچھے واعظ اور مقرر تھے، اس لیے اس کام کو اچھی طرح انجام دیا، مولانا محمد علیؒ کے خاندان سے ان کا رشتہ بھی ہوگیا تھا، ان کی ایک بہن مولانا محمد علیؒ کے بڑے صاحبزادے مولانا لطف اللہ مرحوم سے منسوب تھیں،

کچھ دنوں کے بعد وہ مونگیر سے پھر دیوبند بلالیے گئے، اور پچاس روپے ماہانہ پر القاسم کی ادارت پر مامور ہوئے، اسی زمانہ میں کلکتہ کے ایک انگریزی اخبار انڈین ڈیلی نیوز نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ مبارک میں کوئی گستاخانہ تحریر شائع کی، تو علماء کی ایک جماعت کلکتہ پہنچی جس میں مولانا مناظر احسن بھی تھے، ان کی دینی حمیت اور ایمانی غیرت اس قدر جوش میں آئی کہ شاتم رسول اور اس کے ہم مذہبوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیدیا، کلکتہ کے ایک دوسرے اخبار اسٹیٹس مین نے ایک افتتاحیہ لکھکر حکومت کو ان کے خلاف ابھارا، اور گرفتاریاں شروع ہوگئیں، مولانا کے دوستوں اور ہموطنوں نے ان کو کلکتہ چھوڑنے پر مجبور کیا، اور وہ زیر دستی بمبئی اور مدراس کے راستے سے دیوبند روانہ کردیے گئے، مگر راستے میں عید کا چاند دیکھکر حیدرآباد اتر پڑے، وہاں مولانا حمید الدین فراہیؒ سے ملاقات ہوئی، اس زمانہ میں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہونے والی تھی، مولانا حمید الدین نے ان کو یونیورسٹی میں درخواست دینے کا مشورہ دیا، وہ دیوبند چھوڑنا نہیں چاہتے تھے، لیکن خود دیوبند والوں نے ان کو یہ رائے دی کہ دکن میں دیوبند کے ایک عالم کا قیام دینی حیثیت سے مفید ہوگا، اس لیے انھوں نے درخواست دیدی، ان کا تقرر ایک سال تک یونیورسٹی میں نہ ہوسکا، اس درمیان میں وہ مولانا حمید الدین فراہیؒ سے درس لیتے رہے، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی اس زمانہ میں حیدرآباد کے صدر الصدور تھے، اور وہاں کے

کی دینی و علمی سرگرمیوں کا مرکز تھے، اسی لیے مولانا فراہیؒ مولانا گیلانیؒ کو ان کے پاس لے گئے، اور یہ کہا "ان کو بطور امانت آپ کے سپرد کرتا ہوں"، شروانی صاحب نے فرمایا "یہ امانت میرے پاس محفوظ رہے گی"، مولانا گیلانی ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ "ان کے لطف و کرم کی موسلا دھار بارش کا سلسلہ اس ملاقات کے بعد شروع ہوا، وہ زندگی کے آخری دنوں تک برستا رہا، امانت کا پورا حق ادا کرنے والے نے ادا کر دیا" عثمانیہ یونیورسٹی میں تقرر سے پہلے حیدر آباد کے قیام کے زمانہ میں مولانا علیل ہو گئے، اور مستقل کھانسی اور بخار رہنے لگا، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی ان کو اپنے ساتھ علی گڑھ لے گئے اور وہاں علاج کرایا، اس کے بعد وہ اپنے وطن گیلانی چلے گئے یہاں آنے کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی سے تقرر کا خط ملا، اور وہ ۱۹۲۰ء میں شعبۂ دینیات کے استاد مقرر ہو گئے، اور ۱۹۴۹ء میں اس شعبہ کے صدر کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے، پانچ سو پنشن ملی، لیکن اس گرانقدر تنخواہ اور پنشن کے باوجود اپنی پرانی سادگی کسی حال میں نہیں چھوڑی، حیدر آباد کے قیام میں زیادہ تر ایک مسجد کے حجرہ میں رہے،

جب بوڑھے ہو کر ریٹائر ہوئے اور گیلانی میں آکر قیام کیا تو ان کا قلم اور بھی جوان ہو گیا اور آخر تک وہ علمی کام کرتے رہے۔ وہ حضرت شیخ محی الدین ابن عربی سے بہت متاثر تھے، اور ان کے کارناموں کو تفصیل کے ساتھ لکھنا چاہتے تھے، چنانچہ لکھتے ہیں،

> سچی بات تو یہ ہے کہ ان کے کلام کے سمجھنے اور اس سے استفادہ کے لیے ایمان قوی اور نظر سلیم کے ساتھ ضرورت ہے کہ علم میں وسعت ہو، محدود معلومات والے تنگ نظر لوگوں کے لیے بسا اوقات ان کی باتیں نقصان رساں ہو جاتی ہیں، لیکن یہ ان کے کلام کا نہیں بلکہ پڑھنے والوں کا نقصان ہے"

ان میں یہ تمام شرائط موجود تھے، اس لیے شیخ اکبر کو ان سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا تھا،

ں کام کو شروع کرنے سے پہلے ان کا قلم مختلف سمتوں میں چلتا رہا، اور مختلف قسم کے مضامین
نہ ساتھ ان کا قلم مولانا محمد قاسمؒ بانی دارالعلوم دیوبند کے سوانح پر چل پڑا تو ایک ہزار
ہ کر رکا، جب اس کا مسودہ دیوبند پہنچا تو وہاں کے اہل علم نے اس کو تین جلدوں
کیا، دو جلدیں تو چھپ گئی ہیں، ایک جلد ابھی باقی ہے،
ہ دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے رکن تو عرصہ سے تھے، پنشن کے بعد مجلس عاملہ کے بھی
ے گئے، مارچ سنہ ۱۹۵۵ء میں دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کا ایک اہم جلسہ ہوا، اسمیں
کے لیے وہ گیلانی سے اعظم گڈھ تشریف لائے، میری مسرت کی انتہا نہ رہی، جب انھوں نے
ا قیام گاہ میں قیام فرمایا، اس جلسہ میں مولانا کے علاوہ جناب ڈاکٹر سید محمود (جو اس وقت
وزیر ترقیات تھے) مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا محمد عمران خاں مہتمم دارالعلوم
ما، بھی تشریف لائے تھے، جب ہم لوگ ان حضرات کی پیشوائی کے لیے اسٹیشن
لانا کی سادگی دیکھ کر دنگ رہ گئے، ان کے ساتھ صرف ایک دری، ایک چادر،
، المونیم کا ایک لوٹا، اور ایک کپڑے میں لپیٹے ہوئے ایک دو جوڑے کپڑے تھے،
ذات بھی نمود و نمایش کی آلایشوں سے پاک تھی، یہ دارالمصنفین میں ان کی پہلی
اوری تھی، اس لیے یہاں کے ایک ایک فرد سے بڑی گرمجوشی اور محبت سے ملے،
بزرگوں کی آمد سے دو تین دن تک دارالمصنفین میں بڑی چہل پہل رہی، دارالمصنفین
کے علاوہ شہر کے معززین کا بھی اجتماع رہتا، لیکن ہر محفل میں مولانا ہی بلبل ہزار داستان
بنے رہتے تھے، مذہبی، علمی، تاریخی، سیاسی جو موضوع بھی زیر بحث ہوتا، مولانا
اور ذہانت سے کوئی نہ کوئی ایسا نکتہ پیدا کر دیتے کہ حاضرین ان ہی کی طرف مائل
ان کی گفتگو میں ایسی رنگین سنجیدگی اور متین شوخی ہوتی کہ پوری مجلس زعفران زار

بن جاتی، اور ان قہقہوں میں بھی لوگ یہ محسوس کرتے کہ ان پر حکمت و دانش کی بارش ہو رہی ہے۔

سقوط حیدر آباد کا ذکر آیا، تو فرمایا کہ ایک روز قاسم رضوی اپنے رضاکاروں کے دستہ کے ساتھ ان کے مکان کے احاطے میں چلے آئے، اور دیر تک فوجی قواعد کرتے رہے اسی احاطہ میں مسجد بھی تھی لیکن جب مغرب کی اذان ہوئی تو قاسم رضوی کے سوا ان مجاہدوں میں سے کسی نے بھی خانۂ خدا میں آنے کی زحمت گوارا نہیں کی، نماز کے بعد مولانا نے قاسم رضوی سے فرمایا کہ تمھارے مجاہدوں کی قوت ایمانی تو آج دیکھ لی تمھاری جو فوجی وحربی قوت ہے اس کا حال تم کو مجھ سے زیادہ معلوم ہے، پھر ایک بڑی طاقت کے خلاف کس برتے پر لڑنے چلے ہو، قاسم رضوی نے کہا جیتا ہوں، چلاتا ہوں، شاید کارگر ہو جائے، مولانا نے یہ واقعہ بیان کرکے فرمایا "یہ کیسی بڑی نادانی تھی"۔

اسی ذیل میں جماعت اسلامی کے ایک پرجوش کارکن نے ان کو اپنی جماعت کا مخالف سمجھ کر ان سے مناظرانہ رنگ میں بحث شروع کردی، لیکن مولانا کی صلح پسند اور شادمان و فرحاں طبیعت میں کسی کی دل آزاری کی گنجائش ہی نہیں تھی، اس لیے بحث کرنے کے بجائے زیر لب تبسم کے ساتھ فرمایا کہ بھائی، یہ بتاؤ کہ مولانا مودودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سگے بیٹے ہیں، اور ہم سب ان کے سوتیلے بیٹے ہیں کہ وراثت میں مولانا مودودی ہی تنہا اسلام کو صحیح سمجھنے کا حق رکھتے ہیں، اور ہم کو کوئی حق نہیں، مولانا کے کہنے کے انداز میں کچھ ایسی دل آویزی تھی کہ اسی پر بحث قہقہوں میں گونج کر ختم ہو گئی۔

ایک دوسرے موقع پر کسی سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ بہار شریف میں ایک عربی مدرسہ وہاں کے طلبہ کو ایک مدرس سے شکایت تھی کہ وہ اچھا نہیں پڑھاتے ہیں، ایک بار عثمانیہ یونیورسٹی کی چھٹیوں میں حیدر آباد سے اس قصبہ میں پہنچا تو مدرسہ کے متولی صاحب نے

اصرار کیا کہ میں اس مدرسہ میں ایک سبق پڑھا دوں، میں نے ان کی خواہش کی تعمیل کر دی، درس سے طلبہ بہت خوش اور مطمئن ہوئے، متولی صاحب نے مدرس سے مخاطب ہو کر کہا کہ "آپ بھی ایسا ہی کیوں نہیں پڑھاتے"؟ مدرس نے جز بز ہو کر کہا "مولانا بارہ سو پاتے ہیں، پلاؤ قورمہ کھا کر پڑھاتے ہیں، جیسا کھاتے ہیں، ویسا پڑھاتے ہیں، میں تیس روپئے پاتا ہوں، دال بھات کھاتا ہوں، جیسا کھاتا ہوں ویسا پڑھاتا ہوں"، یہ جواب سن کر متولی صاحب خاموش ہو گئے، مولانا جب یہ واقعہ سنا رہے تھے، تو جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب بھی تشریف فرما تھے جو اس وقت حکومت بہار کے وزیر تھے، اور پہلے وزیر تعلیم بھی رہ چکے تھے، مولانا نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ ملک میں زیادہ تر دال روٹی پر گذارہ کرنے والے ہی تعلیمی اور علمی خدمت میں لگے ہوئے ہیں،

اور پھر اسی سلسلہ میں فرمایا کہ "نان شعیر" ہی پر "قوت حیدری" اور "قوت ایمانی" کا مدار رہا ہے، ہندوستان کے بزرگان دین اور خصوصاً صوفیہ کرام نے فاقے کر کے یہاں کے لوگوں کے اخلاق و کردار کو سنوارا ہے، اور یہ واقعہ بیان کیا کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے خلفاء میں ایک بزرگ حضرت شیخ قطب الدین منور گذرے ہیں، جو ہانسی میں رہتے تھے، سلطان محمد تغلق وہاں گیا، تو شہزادہ فیروز کو ایک لاکھ تنکے دیکر ان کی خدمت میں بھیجا، شیخ نے اتنی بڑی رقم دیکھ کر فرمایا، یہ درویش ایک لاکھ تنکے لے کر کیا کرے گا، درویش کے لیے تو دو سیر کھچڑی اور ایک سیر روغن کافی ہے، جب ان سے زیادہ اصرار کیا گیا تو صرف دو ہزار رکھ لیے، اس میں سے بھی کچھ تو اپنے مرشد کے مزار کے لیے اور بقیہ فقراء میں تقسیم کر دیے،

دار المصنفین کی یادگار مجلسوں میں ایک مجلس یہ بھی تھی اور جب یہ مجلس یاد آتی ہے، تو خیال ہوتا ہے کہ زندگی کے جو دن اس میں گذرے وہ بہترین دنوں میں سے تھے، مولانا جب

رخصت ہونے لگے تو ان کی خدمت میں دار المصنفین کی طرف سے مصارف سفر پیش کیے گئے،
انھوں نے یہ کہکر لینے سے انکار فرمایا کہ میں تو اپنے گھر آیا ہوں، گھر والوں سے اخراجات لینا
کیا معنے، ان کے اس اخلاص سے دار المصنفین کا ہر فرد متاثر ہوا،

مئی ۱۹۵۱ء میں جب راقم الحروف گھر گیا، تو قدمبوسی کے لیے گیلانی جانے کا قصد کیا۔
لیکن اہل وطن نے مولانا کو میلاد النبی کی ایک مجلس میں تقریر کرنے کے لیے اصرار سے مدعو کیا
تھا، وہ اس وقت قلب کے مریض ہو چکے تھے، ڈاکٹروں نے تقریر کرنے کی ممانعت کر دی تھی،
مگر وہ اپنی خلقی مروت میں عزیزوں کی فرمایش رد نہ کر سکے، اور دیسنہ تشریف لائے، یہ انکی
تقریر سننے کا پہلا اتفاق تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارک سورہ والضحیٰ کی تفسیر
کی روشنی میں بیان کی، اس بیان کا طرز تو سیدھا سادہ تھا، لیکن اس قدر موثر تھا کہ پوری مجلس
رسول اکرم کے جام محبت سے سرشار اور مخمور ہو رہی تھی، اس زمانہ میں گاؤں والے تقسیم ہند
کے نتائج سے متاثر تھے، ان پر بڑی یاس و ناامیدی چھائی ہوئی تھی، مولانا نے ان کی تسکین
و تسلی کے لیے بڑی وضاحت سے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے دو
حصے ہیں، ایک مکی اور ایک مدنی، ہندوستان کے مسلمانوں کو آپ ہی کے اسوۂ حسنہ پر چل کر
اب مکی زندگی بسر کرنی ہے، انھوں نے اس کو کچھ ایسے دلنشین انداز میں بیان کیا کہ گاؤں والوں
کو بڑی ڈھارس ہوئی، تقریر کے آخر میں مگہی زبان میں ایک نعت پڑھی جو ان ہی کی فکر سخن کا
نتیجہ ہے، ان کے پڑھنے کے انداز میں کچھ ایسا درد و اثر تھا کہ ان کی ترنم آواز آج تک کانوں
میں گونج رہی ہے، اس نعت کا ایک بند ذیل میں درج ہے، شاید ناظرین کو بھی لطف حاصل ہو،

دنیا بھٹکی پھرتی، چھا گئلے تھا اندھیالا رے — دکھی سکھی راجہ پرجا سگرو تھے متوالا رے
من کی سوئی نگری پر پڑل تھے کئی تالا رے — جتنے دیکھو چورے چور کوئی نہیں رکھوالا رے
بنیا کی ان گھڑیوں میں آئی کیو کملی والا رے

اس قسم کی نعت میں وہ اپنے کو "سوامی دھرمی جی گیلانی والے" کہتے تھے۔

جولائی ۱۹۵۳ء میں ان کی قدمبوسی کے لیے گیلانی حاضر ہوا، گو یہ گاؤں راقم کے گاؤں دیسنہ سے صرف دو کوس کے فاصلہ پر ہے، لیکن ایک عرصہ کے بعد وہاں جانے کا اتفاق ہوا تھا، گیلانی پہنچا تو سواری کا یکہ آموں کے ایک بڑے باغ میں رکا، معلوم ہوا کہ یہ مولانا ہی کا باغ ہے، اس کے مقابل کئی گیہوں کا ایک اور بڑا سرسبز و شاداب باغ نظر آیا، یہ بھی مولانا ہی کا تھا، باغ کے بعد ایک چھوٹے سے چمن سے گذر کر مولانا کی مردانہ نشست میں پہنچا، یہ ایک دو منزلہ چھوٹی سی عمارت تھی، جو مولانا نے خاص اپنے لیے بنوائی تھی، اسی سے متصل ایک بہت بڑا دو منزلہ زنان خانہ تھا، مردانہ نشست کے سامنے ایک تالاب تھا، اس سے ذرا کچھ فاصلہ پر ایک چھوٹا سا آم کا ایک اور باغ تھا، یہ بھی مولانا ہی کا تھا، ان کو آموں سے بڑا ذوق تھا، بہار، حیدر آباد، بمبئی، لکھنؤ اور ملیح آباد کے مشہور آموں کے درخت انھوں نے منگوا کر لگائے تھے، اور جس طرف انکی نظر اٹھتی ان کو اپنے لگائے ہوئے باغ نظر آتے تھے، انکے مکان اور باغات کو دیکھکر انکی فارغ البالی اور خوشحالی کا اندازہ ہوتا تھا، مگر خود انکی سادگی دیکھکر انکے علم کی گہرائی کا یقین آتا تھا، اس گہرائی کو دیکھکر ان کی سادگی پر تعجب ہوتا، ان کی کل کائنات ایک چارپائی تھی، اسی پر قلم اور دوات رکھ لیتے، اور علم و فن کا خزانہ لٹاتے رہتے، چارپائی کے بغل میں دو تخت تھے، ان پر معمولی سا فرش اور اس کے اوپر ایک قالین تھا، قالین اور فرش کے درمیان ان کا دفتر تھا، ان کے سارے کاغذات اور خطوط قالین کے نیچے پڑے رہتے تھے، کمرے میں چار بڑی بڑی الماریوں میں منتخب کتابیں تھیں، یہی ان کا آفس اور کتبخانہ سب کچھ تھا، لکھتے لکھتے جب تکان محسوس کرتے، تو چارپائی کے نیچے ہاتھ بڑھا کر ٹین کا ایک معمولی سا ڈبہ گھسیٹتے، اس میں مٹی کے تین کلھڑوں میں کتھا، چونا اور ڈلی تھی، اور کپڑے کے ایک ٹکڑہ میں کچھ پان

پلتے ہوتے، یہ پاندان ان کی ساری زمینداری کھیتی، باغ اور گراں نقد تنخواہ کا حاصل تھا جسکے وہ بلا شرکت غیرے مالک تھے، بقیہ کسی اور چیز سے ان کو کوئی سروکار نہ تھا، اسی وجہ سے پان کی گلوری بناتے اور اس کو کھا کر پھر تر و تازہ ہو جاتے، اور ان کا نہ تھکنے والا قلم پوری تیزی سے رواں ہو جاتا، جب ان کی نظر اپنے باغوں کی طرف اٹھ جاتی تو قلم اور تیز ہو جاتا، شاید ان کے سب سے اچھے مضامین اس زمانہ میں لکھے گئے جب درختوں کے خوش رنگ آم ان کے کیف و سرور میں اضافہ کرتے رہتے تھے۔

ان کے صرف ایک لڑکا اور لڑکی ہے، لڑکا اس وقت پاکستان میں اڈمنسٹریٹو سروس میں ہے، اور لڑکی ان کے منجھلے بھائی مکارم احسن صاحب کے صاحبزادے سے بیاہی ہوئی ہے مولانا کی ساری دلچسپی و محبت مکارم صاحب ہی کے ساتھ تھی، وہی ان کے ذہنی اور قلبی سکون کے سرچشمہ تھے، اگر مولانا کو کسی ایسی جگہ پہنچا دیا جاتا جہاں آموں کا ایک باغ ہوتا، اور ان کے سامنے مکارم احسن صاحب ہوتے اور ان کو قلم، دوات اور کاغذ دیدیا جاتا تو وہ یہی سمجھتے کہ ان کو جنت نعیم کی ساری نعمتیں مل گئی ہیں، گیلانی میں ان کو یہ ساری چیزیں میسر تھیں، اس لیے وہاں سے ہٹنا کسی حال میں پسند نہ کرتے تھے، صاحبزادے نے بار بار اپنے یہاں بلایا، پنجاب یونیورسٹی میں ان کو ڈیڑھ ہزار ماہانہ کی جگہ پیش کی گئی، کراچی یونیورسٹی نے اصرار کے ساتھ بلایا لیکن انھوں نے اپنی جنت کسی حال میں چھوڑنا پسند نہیں کی۔ ان کو اپنے کمرہ کی کھری چارپائی پر دنیا کی ساری لذتیں حاصل تھیں، اسی پر بیٹھ کر وہ لکھتے رہتے تھے، اور مکارم صاحب اپنے دیہی کاموں میں مشغول رہتے تھے، اور جب وہ کھیت اور باغ کو دیکھکر واپس آتے تو مولانا قلم چھوڑ دیتے، پھر ان کی زبانی باغ کی کیاریوں، کھیتوں، مینڈوں اور کاشتکاروں کے جھگڑوں کی باتیں ایسی دلچسپی سے سنتے کہ معلوم ہوتا کہ ان کے لیے اس سے زیادہ لذیذ تر حکایت۔۔۔

اور کوئی نہیں، جب کوئی اہل علم کہیں سے ان سے ملنے کے لیے آجاتا اور مکارم صاحب موجود ہوتے تو مولانا خود خاموش ہو جاتے اور مکارم صاحب ہی علمی گفتگو شروع کر دیتے جو مولانا کی کہی ہوئی باتوں کی صدائے بازگشت ہوتی، لیکن خود مولانا اس کو بڑے غور و انہماک سے سنتے، اور شاید وہ غایت محبت میں مکارم صاحب کو اپنے سے زیادہ علم کا اداشناس اور نکتہ ور سمجھنے لگے تھے، جب مکارم صاحب اٹھ کر چلے جاتے تو مولانا کے منہ سے پھر موتی جھڑنے لگتے ان کے اس وصف کو دیکھکر حیرت ہوتی تھی،

اس ملاقات میں ان کی حکیمانہ ظرافت سے دن بھر محظوظ ہوتا رہا، ایک موقع پر جب ہندستان و پاکستان کے مسلمانوں کا ذکر آیا تو بڑے اذعان و اعتماد کے ساتھ فرمایا کہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کا مستقبل روشن پاتا ہوں اور اس کی وضاحت میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا، کہ مولانا اشرف علی تھانوی کے ایک مرید کا لڑکا اسلامیہ اسکول میں تعلیم پاتا تھا، اس کے باوجود اس کے عقائد خراب تھے، مرید نے حضرت مولانا سے اس کی شکایت کی، انھوں نے فرمایا لڑکے کو اسلامیہ اسکول سے نکال کر کسی غیر مسلم اسکول میں داخل کر دو، مرید نے ایسا ہی کیا، کچھ دنوں کے بعد مرید نے اطلاع دی کہ لڑکا اب پھر اسلام کی طرف مائل ہو رہا ہے، اور کچھ دنوں کے بعد بالکل صحیح راستہ پر آگیا، مرید نے مولانا تھانوی سے پوچھا کہ یہ طریقۂ علاج سمجھ میں نہیں آیا، مولانا نے فرمایا کہ لڑکا جس ماحول میں تھا، اس کے خلاف جانا پسند کرتا تھا، اس لیے جب وہ غیر مسلم اسکول میں چلا آیا تو وہاں کے ماحول کے خلاف اسلامی شعار کی طرف مائل ہو گیا، مولانا گیلانی نے یہ واقعہ بیان کر کے فرمایا کہ پاکستان کے مسلمان اپنے نئے ماحول میں کیا ہو جائیں گے، اللہ ہی بہتر جانتا ہے، لیکن ہندوستان کے مسلمانوں پر نئے ماحول کا جو ردعمل ہوگا، وہ میری نظر میں امید افزا ہے، ان میں مذہبی احساسات اور ملی جذبات کی بنا پر غیر شعوری طور سے پوری قوت

مدافعت موجود ہے، جو ہر زمانہ میں برقرار رہے گی، جیسا کہ صدیوں سے رہی ہے، ہندوستان میں باہر سے جو قومیں آئیں، وہ سب یہاں کی قوموں میں ضم ہو گئیں لیکن مسلمانوں نے اپنی انفرادیت باقی رکھی، ان کی مذہبی غیرت وحمیت میں بڑا استحکام ہے، جو کمزور ہو سکتا ہے لیکن ختم نہیں ہو سکتا، اس پر ضرب کاری پڑ سکتی ہے، لیکن اس کا کوئی اسٹیصال کرنا چاہے تو ممکن نہیں، مولانا کچھ اس یقین کے ساتھ یہ گفتگو فرما رہے تھے کہ مجھکو بھی ہندستان کے مسلمانوں کا مستقبل تاریک نظر نہیں آرہا تھا،

اس ملاقات کے چار مہینے بعد جب نومبر ۱۹۵۳ء میں مولانا نے حضرت سید صاحب کے انتقال کی خبر کراچی ریڈیو سے سنی، تو کلیجہ تھام کر زمین پر بیٹھ گئے، اور ان کو محسوس ہوا کہ ان پر قلب کا شدید حملہ ہوا ہے جس سے وہ جانبر نہ ہو سکیں گے، اسی پریشانی میں انکی زبان سے نکلا

آج محفل علم کی افسوس سونی ہو گئی　　دین و دانش کے چمن کی لٹ گئی گویا بہار
اب کریگا کون ہم ہیچ دین کے اسرار کو　　کاوش تحقیق کی صیقل گری سے آشکار

پھر اس میں کچھ اور اشعار بڑھا کر پورا ایک مرثیہ لکھدیا، جس کی ایک نقل دار المصنفین کو بھی بھیجی، حضرت سید صاحب کی رحلت پر پورا دار المصنفین سوگوار تھا، ان کے اس مرثیہ نے اور بھی سوگوار بنا دیا، اور جب مولانا ابو الحسن علی ندوی نے حضرت سید صاحب کی تعزیت میں ندوۃ العلماء لکھنؤ میں جلسہ کیا تو مولانا نے اپنی ناسازی طبع کے باوجود اس میں شرکت کے لیے گیلانی سے لکھنؤ سفر کرنے کی زحمت گوارا کی، اس جلسہ کے ایک اجلاس کی صدارت بھی انھوں نے کی تھی اور حضرت سید صاحب پر ایک طویل مقالہ بھی پڑھا تھا، وہ اندرونی طور پر تو بہت مغموم اور ملول تھے، اور مقالہ پڑھنے میں ان کے آنسو رواں ہو جاتے تھے لیکن انکی

سدا بہار طبیعت کی شگفتگی اور سنجیدہ ظرافت کا اظہار بھی موقع بموقع ہوتا رہا، حضرت سید صاحب پر مقالہ پڑھ رہے تھے، تو سیرۃ النبی کے سلسلہ میں ایک ایسا مقام آیا جس کی وضاحت ایک بانی لطیفہ کے ذریعہ سے کی، فرمایا کہ والد صاحب کو اپنی کسی جائداد کے سلسلہ میں عدالتی کارروائی کرنی پڑی، اس مقدمہ کی تحقیقات کے سلسلہ میں ایک ہندو مجسٹریٹ ان کے یہاں آیا اور ہمدردانہ پوچھا کہ اگر آپ کے خاندان میں کوئی ولی گزرا ہے تو میں کاغذ میں ذکر کر دوں، والد صاحب نے فرمایا کوئی ولی تو نہیں گزرا ہے لیکن نبی گزرا ہے، مجسٹریٹ نے کہا نبی سے کام نہیں چلے گا، ولی کی ضرورت ہے، اس کی نظر میں نبی سے زیادہ ولی کی اہمیت تھی۔

اس موقع پر ندوۃ العلماء میں بڑا شاندار اجتماع ہوا تھا، لکھنؤ کے علاوہ بھوپال، پھلواری شریف، دریاباد اور اعظم گڈھ کے بہت سے علماء و فضلاء جمع ہوئے تھے لیکن عام اجلاس اور نجی مجلسوں میں مولانا ہی بڑے چھوٹے سب کا مرجع بنے ہوئے تھے، اور ہر شخص ان کی باتوں کی مٹھاس اور نرمی سے لطف اندوز ہو رہا تھا، موضوع سخن زیادہ تر حضرت سید صاحبؒ ہی کی ذات گرامی تھی، ایک موقع پر فرمایا کہ سید صاحب کا سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ اپنے علم و فضل کے باوجود حضرت تھانوی کے آستانے پر جا کر جھک گئے، پھر کہنے لگے کہ اگر دل کی تربیت نہ ہو تو عرش دماغ کو روشن کر کے آدمی نہ خود کوئی نفع حاصل کر سکتا ہے، نہ دوسروں کو پہنچا سکتا ہے، جب مجھکو خبر ملی کہ سید صاحب تھانہ بھون سے منسلک ہو گئے تو میں بے حد مسرور تھا، اور ان کو مبارکباد کے کئی خط لکھے۔

لکھنؤ سے واپسی کے بعد میں نے حضرت سید صاحب کے نام مشاہیر کے جو خطوط دارالمصنفین میں محفوظ ہیں، ان کو دیکھنا شروع کیا، تو ان کے بیعت ہونے کے سلسلہ میں مولانا گیلانی کے بہت سے عجیب و غریب خطوط نظر آئے، مثلاً ایک مکتوب مورخہ ۲۵ اپریل ۱۹۴۲ء

یہ واضح رہے کہ مولانا نسباً سید تھے،

میں کس والہانہ انداز سے تحریر فرماتے ہیں،

"الحمد للہ علم کی دولت کے ساتھ معرفت و عمل کی نعمت بھی آخر میں آپ کے لیے مقدر تھی، آستانۂ تھانہ بھون کی حاضری کا حال مولانا عبد الباری صاحب سے معلوم ہوتا رہتا تھا۔ ھنیا لکم ثم ھنیا لکم الصادقین کی معیت آپ کو مبارک ہو۔ انعمت علیہم کے صراط کی ہدایت اصل ہدایت ہے، غضب اور ضلالت سے نجات کی واحد راہ یہی ہے۔ "حسن اولٰئک رفیقا" کی سند کے ساتھ الرفیق الاعلیٰ کی مجلس انس کی شرکت ہر قسم کی مجلسوں سے گذرنے کے بعد انشاء اللہ رسوخ تام کی بشارت و ضمانت کی حامل ہو۔ عجب راہ ہے، نہ یہاں محاسدہ ہے، نہ مباغضہ، نہ منافسہ، نہ مقابلہ، بلکہ ہر ایک دوسرے کے لیے داعی بخیر مدت ہوئی اس راہ سے دو دو چار ہو چکا ہوں لیکن اب تک وہ حلاوتیں دل ناکام کو یاد ہیں، جو کسی زمانہ میں میسر آئی تھیں آپ لوگوں کی انقلابی زندگی خیر کی طرف اور میرا انقلاب شر کی طرف باعث عبرت ہے۔"

اس خط میں مولانا کے آئینۂ دل کا جوہر نظر آرہا ہے، وہ حضرت سید صاحب سے عمر میں بہت چھوٹے تھے لیکن ان کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ وہ راہ سلوک پر ان سے بہت پہلے گامزن ہوئے، اور جس زمانہ میں حضرت سید صاحب یہ کہہ رہے تھے کہ

خرد نے مجھکو عطا کی نظر حکیمانہ

تو مولانا یہ کہنے میں حق بجانب تھے کہ

سکھائی عشق نے مجھکو حدیث رندانہ

ان پر یہ حقیقت بہت پہلے آشکارا ہو چکی تھی کہ

ہے ابد کے نسخۂ دیرینہ کی تمہید عشق عقل انسانی ہے فانی، زندۂ جاوید عشق

مکتوب بالا میں ان کے "دل ناکام" کی صدا درحقیقت ان کے "دل کامگار" کی غمازی کر رہی ہے، مگر اس کے اظہار میں کیسی حلاوت ہے، وہ اپنی "صحت نفس" کی خاطر جو "مخالفت نفس" کر رہے ہیں، وہ لایق غور ہے، اور یہ درجہ سلوک کی کٹھن منزلوں کے طے کرنے کے بعد ہی حاصل ہو سکتا ہے جب حضرت سید صاحبؒ کو مولانا تھانوی کے یہاں سے خلافت ملی، تو مولانا "محاسدہ" "منافسہ" اور "مقابلہ" سے پاک ہوکر "تجرید" کی حالت میں ۳ر فروری ۱۹۴۳ء کو لکھتے ہیں :-

سیدی الامام! بشری لکم وطوبی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

این قالب فرسودہ گر از کوئے تو دور ست

الکلب علی بابک لیلا و نہارا

کچھ عجیب حال ہے، جب آپ کی زیارت موجب اجر و ثواب بنی تو جسے ثواب واجر کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہی اس سعادت سے محروم ہے، آپ کہاں سے کہاں پہنچے اور پہنچائے گئے، اور ہم جرس کاروان کی صرف آواز ہی سنتے رہے، مولانا عبدالباری صاحب سے والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا کی جو تفسیر آپ کے ساتھ ہو رہی ہے، اس کی خبر میں سنتا رہتا ہوں کتنی مسرتیں ان خبروں میں اپنے لیے پاتا ہوں، آپ کو اس کا شاید اندازہ نہ ہوگا، خبر ملی تھی کہ آستانۂ حکیم الامت مدظلہ العالی سے سند خلافت بھی حاصل ہو چکی ہے، معارف کے شذرات میں جو کچھ حسن قلم سے شائع ہوئے، اب اس کی عبدیت اور بندگی میں کون شک کر سکتا ہے، بندے نے بندے کے بندے ہونے کی توثیق کی، میرے نزدیک تو خلافت کا حاصل ترجمہ یہی ہے، جب سب کچھ گناہوں سے مٹ جائے اور

از خدا خواہم و زغیر نخواہم بخدا کہ نیم بندۂ غیر و نہ خدائے دگر است

اسی ایک حقیقت واقعیہ کا تحقق تام بس سب کچھ صرف یہی ہے۔ ایاک نعبد وایاک نستعین کے مقام پر سرفرازی نصیب ہوئی، انشاء اللہ فردوس میں اس کے منازل کی تیاری ہے، ایسی مہمان نوازی کو لایبغون عنھا حولا سے کر لو کان البحر مدادا لکلمات ربی لنفد البحر۔ طلب لامحدود کے لیے مطلوب کو بھی لامحدود ہونا چاہیے، بلکہ مطلوب کی لامحدودیت ہی نے اس طالب کو پیدا کیا جس کی "بلوعیت" کسی نقطہ پر ختم نہیں ہوتی کسی راہ میں ہو، خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنھوں نے اپنی فطرت کے اس جذبہ کو اسی راہ پر لگا دیا جس کے پیدا کرنے والے نے اسے پیدا کیا تھا کہ آدمی نے اس بلوعیت کو خود نہیں پیدا کیا، ورنہ قناعت کے فاعل کا مجہول کیوں کیا جاتا، دیکھیے قدم بوسی کی تمنا کب پوری ہوتی ہے اور حالات کیا عرض کروں ؎

ہمیں نالہ ماند مسکیں حسن را زداں روز ترسم کہ ایں ہم نماند

واللہ اعلم نسل انسانی کی دیوار کس کروٹ گرنے والی ہے، خیر ہم تو بہت ہی چکے اتنا کہ حساب سے عہدہ برآ ہونا صرف فضل ہی کے محول ہے، اب تو ساٹھ زیادہ ہی حال ہے

عنقریب ست کہ از ما اثرے باقی نیست شیشہ بشکستہ وے ریختہ وساقی نیست

یہ مکتوب چھپنے کے لیے نہیں لکھا گیا تھا محض ایک نجی خط ہے، جو قلم برداشتہ لکھا گیا ہے۔ لیکن اس کے پڑھنے کے بعد دل پر یہ اثر پڑتا ہے کہ یہ تحریر ایک پاک دل اور پاک طینت ہی انسان کے قلم سے نکل سکتی ہے، اس میں ایسا سالکانہ ذوق و شوق اور عارفانہ کیف و بیخودی ہے، جو لکھنے والے کے "تزکیہ نفس"، "تصفیۂ قلب اور تجلیۂ روح" کا پتہ دیتی ہے، اور "گوہر عشق"، "گوہر روح" اور "گوہر معرفت" کے پرکھنے والے جوہری نے حضرت سید صاحبؒ کو ۳ مارچ ۱۹۴۳ء کو پھر ایک نجی مکتوب میں تحریر فرمایا۔

سیدی الکریم ، زادکم اللہ عرفانا و قربا ۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

یقیناً ہم مینیوں کے حدود سے آپ بہت بلند ہو چکے ہیں، یونہی بلندی کیا کم تھی،

اور اب تو ماشاء اللہ حکیم الامت مدظلہ العالی کی نیابت و خلافت کی دولت سے

سرفراز ہیں، چالیس سال تک مولانا شبلی کی، اور عمر عزیز کے چہل سالہ کے بعد مولانا تھانوی

کی نیابت کی، ع رندکے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی، عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ

کا واقعہ یاد آیا، خلافت کے زمانہ میں لباس کی قیمت چند درہم سے آگے نہ بڑھی، پوچھنے والے

نے ولید اور عبد الملک کی گدی پر بیٹھنے والے سے پوچھا مشہور جواب ہے کہ تمنا کی مدینہ کی

ولایت کی، پوری ہوئی، فاطمہ بنت عبد الملک سے شادی کی، پوری ہوئی، خلافت کی،

پوری ہوئی، اب جنت کی تمنا کی باری ہے، صرف اس کا سامان ہے، آپ نے بھی یہی کیا

اور خوب کیا، ومثل ھذا فلیعمل العاملون، بارک اللہ فیکم وعلیکم۔

مولانا کے خطوط سے کیسی وضاحت ہو جاتی ہے کہ حضرت سید صاحب نے کیوں تھانہ بھون

کے آستانہ پر جاکر اپنی جبین نیاز رکھدی تھی،

مقام عقل سے آساں گذر گیا اقبال   مقام شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ

جب راقم کا دل مولانا کی روحانی عظمت سے متاثر ہو رہا تھا، ان ہی دنوں ان کا ایک

مضمون "مسلمانوں کا اندلس مسلمانوں کی نگاہ میں" معارف میں شائع ہوا جس کی سطر سطر

سے اسلام کے لیے ایک بے چینی اور تڑپ ظاہر ہوتی ہے، اور ایک عارفانہ بصیرت سے دکھایا

گیا ہے کہ اگر مردانِ حکومت اسلام کی تمکین اور استقرار کے لیے قرآنی نصب العین سامنے

رکھتے تو وہ ختم نہ ہوتی، لیکن ان کی حکومت کے زمانے میں قرآن سے چشم پوشی اختیار کی گئی، قرآنی

دعوت کے پیش کرنے والے مومنوں سے اعراض کیا گیا، اور ان لوگوں کو جو اسلام اور پیغمبر اسلام

کو ساری انسانیت کا مشترکہ ورثہ قرار دینے پر اصرار کرتے تھے، رسوا اور بدنام کیا، اور ان کے مقابلہ میں مستقل محاذ بنا لیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی ہی بھڑکائی ہوئی آگ میں مرد آہنوں کی حکومت خود ہی جل بھن کر ختم ہوگئی، آخر میں مولانا نے ایک بہت ہی حکیمانہ بات لکھی ہے کہ مسلمانوں کے لیے وہ اندلس زیادہ پائدار ہوتا جس میں خواہ الحمراء، الزہراء، قرطبہ اور غرناطہ نہ ہوتے مگر مسلمانوں پر جو فرض آخر الامم ہونے کی حیثیت سے عائد کیا گیا ہے، اگر اس کو وہاں کا حکمراں طبقہ پیش نظر رکھتا تو وہ سیاسی مصائب و آفات کے جن گردابوں میں تہ و بالا ہو کر رہ گئے، شاید یہ صورت پیش نہ آتی،" مولانا کا یہ پیام آج بھی تمام اسلامی ممالک کے حکمرانوں کے لیے ہے، یعنی اگر وہ مادی اور نمایشی کاموں کو انجام دینے کے بجائے مسلمانوں کے اخلاق، کردار اور سیرت کا الحمراء اور قرطبہ بنانے میں مشغول ہو جائیں تو کوئی قوت ان کو نہیں مٹا سکتی،

اس مضمون کے پڑھنے کے کچھ ہی دنوں کے بعد مجھکو آگرہ جانے کا اتفاق ہوا، تاج محل دیکھنے گیا، تو اس کی غیر معمولی صناعی، بے مثل کاریگری، اور دوشیزہ رعنائی دیکھنے کی ساری لذت مولانا کے مضمون کو یاد کرکے جاتی رہی، اور یہی خیال آیا کہ اگر ہندستان کے مسلمان حکمراں شاندار عمارتیں بنانے کے بجائے یہاں کے مسلمانوں کے کردار کا تاج محل اور اخلاق کا لال قلعہ بنا گئے ہوتے تو آج ان کی تاریخ کچھ اور ہوتی،

نومبر ۵۳ء میں مولانا کے قلب پر جو حملہ ہوا تھا، اس نے مستقل مرض کی شکل اختیار کرلی، مارچ ۵۴ء میں ان پر اس کا ایسا سخت حملہ ہوا کہ امید زیست جاتی رہی لیکن ان کے جاں نثار بھائی مکارم صاحب نے علاج میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، ان کو گیلانی سے پٹنہ اسپتال لے آئے اور معالجہ میں روپے پانی کی طرح بہائے، وہ پٹنہ ہی میں مقیم تھے کہ میں ان کی عیادت کے لیے حاضر ہوا، ڈاکٹروں نے ان کو بہت ہی کم بولنے کی اجازت دی تھی، اور مکارم صاحب

نے اور بھی زیادہ پابندی عائد کر رکھی تھی، لیکن مولانا نے اس ناچیز کو دیکھکر ساری پابندیاں توڑ دیں
مکارم صاحب روکتے رہے، مگر ان کی باتیں چل نکلیں تو پھر کسی کے روکے نہیں رکیں، زیادہ تر
تفریحی باتیں رہیں، لیکن ان میں بھی ان کی دقت نظر دکھائی دیتی تھی، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی
کا ذکر آیا، تو فرمانے لگے کہ ان کی طبیعت میں بچپن ہی سے بڑی نکتہ رسی تھی، وہ دیوبند میں تعلیم
پا رہے تھے، تو ان کے کسی ہم درس کی کتاب غائب ہو گئی، اس نے درس کے وقت مدرس سے
شکایت کی کہ کسی لڑکے نے اس کی کتاب چرالی ہے، مدرس صاحب جھلّا کر بولے، افسوس ہے کہ
دیندار لوگ بھی چور ہوتے ہیں، مولانا اشرف علی اُسی وقت بول اٹھے کہ ایسا نہ فرمائیں، بلکہ یہ کہیں کہ
"کوئی چور دیندار لوگوں کے ساتھ پڑھنے آگیا ہے" مولانا گیلانی کو ارادت تو مولانا محمود الحسنؒ سے
تھی لیکن ان کو مولانا تھانویؒ سے بھی بڑی عقیدت تھی، اور ان کا ذکر ہمیشہ بہت ہی محبت اور
احترام سے کرتے، وہ اسی وسیع المشربی کی وجہ سے ہر طبقہ میں محبوب رہے، پٹنہ میں ان کے
معالج ڈاکٹر عبدالحیٔ تھے، جو وہاں کے مشہور و مقبول ہونے کے علاوہ بڑے مشغول طبیب ہیں، لیکن وہ
مولانا کا علاج بڑی محبت اور تن دہی سے کر رہے تھے، اور اسکو بڑی سعادت سمجھتے تھے۔

کچھ دنوں کے بعد وہ پٹنہ سے گیلانی واپس چلے گئے، اور مکارم صاحب کی نگرانی میں بڑی
احتیاط سے زندگی بسر کرنے لگے، ان کو لکھنے پڑھنے سے بالکل منع کر دیا گیا تھا، لیکن وہ حریصانہ
نظروں سے اپنی کتابوں کی الماریوں کی طرف دیکھا کرتے تھے، شیخ ابن عربی پر لکھنے کیلئے دارالمصنفین
سے بہت سی کتابیں منگائی تھیں، ان کو کبھی کبھی الٹ پلٹ کر دیکھ لیتے تھے، مگر مکارم صاحب
کی تیکھی نظروں کو دیکھکر بند کر دیتے، گو ہم لوگوں کو جب خطوط لکھتے تو اپنی زندگی کی مایوسی
کے باوجود علمی دنیا میں مراجعت کی امیدیں بھی دلاتے، ان کو دنیا میں اگر کوئی حسرت باقی
رہ گئی تھی، تو یہی کہ بعض چیزیں جو ان کے سینہ میں ہیں، ان کو سفینہ میں منتقل کرنے سے معذور

ہو رہے تھے،

راقم مئی ۵۶ء میں اعظم گڈھ سے وطن پہنچا تو ان کی قدمبوسی کے لیے گیلانی پہنچنے کا ارادہ کرہی رہا تھا کہ ایک روز ڈاک سے ان کا حسب ذیل محبت نامہ ملا۔

عزیز محترم ......[1] السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہٗ

اتنے طویل المدت مرض کے متعلق یہ واقعہ ہے کہ مرجانے یا تندرست ہوجانے کا فیصلہ قدرتی ہے، لیکن کیا کیجئے، آپ کا یہ مریض المسمی بہ مناظر احسن گیلانی نہ اب تک مرا ہے اور نہ اچھے ہونے کی بشارت سنا سکتا ہے، اسی حال میں مگن ہے جس میں دیکھا گیا۔ کل شاہ صاحب[2] قبلہ کا نوازش نامہ ملا جس میں آپ کے دیسنہ پہنچنے کی خبر درج تھی، دارالمصنفین کی جو امانت ہمارے پاس محفوظ ہے، اس کو آپ کے حوالہ کردینا چاہتا ہوں، کیونکہ اب شیخ ابن عربی پر کچھ لکھوں تو ضرورت ہے کہ دوسری دفعہ پیدا کیا جاؤں، اب فرمائیے کہ اس کے لیے کیا کروں، کیا دیسنہ ان کتابوں کو کسی کے معرفت بھیج دوں! مگر آپ کی ملاقات سے محرومی معمولی محرومی نہ ہوگی، بہرحال جو رائے عالی[3] ہو، اس سے مطلع فرمائیں، ڈاک سے اس لیے خط بھیج رہا ہوں کہ زمینداری ختم ہونے کے بعد اب چٹھی جاتی کی کوئی راہ ڈاک کے سوا باقی نہیں رہی۔۔۔۔"

اس خط کے فوراً ہی بعد میں گیلانی حاضر ہوا تو ان کے چہرہ کو تو منور لیکن جسم کو نحیف، لاغر اور کمزور پایا، اور ان کے دونوں پاؤں پر آماس دیکھکر عجیب کیفیت گذری، مجھکو دیکھکر چارپائی سے اٹھ کھڑے ہوئے، بڑی محبت اور گرمجوشی سے بغل گیر ہوکر فرمایا "خوب آگئے

---

[1] مولانا اپنے اخلاص و شفقت میں چھوٹوں کے لیے بھی ایسے القاب لکھ دیتے جنکے وہ مستحق نہ ہوتے، اس لیے یہ القاب حذف کردیے گئے ہیں۔ [2] جناب شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی مراد ہیں [3] یہ الفاظ ان کے ظرف عالی کا ثبوت ہیں۔

اب چل چلاؤ ہے"، یہ سن کر دل پر ایک چوٹ لگی، مکارم صاحب موجود تھے، اس لیے وہ رک رک کر باتیں کرتے رہے، مگر جب مکارم صاحب اٹھکر چلے گئے، تو گفتگو کا سرچشمہ بہہ نکلا، فرمانے لگے گیلانی بہت عزیز ہے، اس لیے یہیں پڑا ہوں، پھر گیلانی پر اپنی ایک مطبوعہ مثنوی پڑھنے کو دی جس کے بعض اشعار یہ ہیں!

مسقط الراس وہ وطن پیارا — عہد طفلی کا اپنے گہوارا
منظر اس کا ہے کیسا دیدہ زیب — ان وہ مینو سواد زہد فریب
وہ درختوں کی اس کے رعنائی — اور باغوں کی حسن و زیبائی

پھر بڑی احتیاط سے ایک ملفوف خط دیکر کہا "اس کو پڑھو، میں نے اسی خط کی بنا پر گیلانی نہیں چھوڑا"، میں نے وہ خط لیا تو اس کے اوپر ان ہی کے ہاتھ سے لکھے ہوئے یہ فقرے تھے،

"ایک تاریخی مکتوب یعنی نامۂ سلیمانی جس میں گیلانی میں قیام پر اصرار کیا گیا ہے۔"

میں نے خط کھول کر پڑھا تو معلوم ہوا کہ حضرت سید صاحبؒ نے ان کو ۱۱ فروری ۱۹۴۷ء میں بھوپال سے حیدرآباد دکن تحریر فرمایا تھا،

محب اعز واعز، متعنا بہ برکاتکم،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ میں لوگوں کی اس حرکت کو پسند نہیں کرتا کہ ہمارے مقتولین وشہدا کا ایسا نقشہ کھینچیں کہ باقی ماندوں پر رعب اور ہراس چھا جائے، ورنہ ایک دن پورا ہندوستان خالی کرنا پڑے گا۔ آپ اب بھی گیلانی میں ہیں، اور آیندہ بھی یہیں رہیں گے۔"

ابھی خط پڑھ ہی رہا تھا کہ انھوں نے فرمایا کہ حضرت سید صاحبؒ نے میرے لیے پیشین گوئی کی تھی، بلکہ ان کا حکم تھا، اسی لیے میں یہاں پڑا ہوں،

حضرت سید صاحبؒ سے ان کی یہ عقیدت کتنی قابل قدر ہے، پھر وہ ان ہی کے متعلق

دیر تک گفتگو کرتے رہے، اور فرمانے لگے، میں نے پہلی بار غالباً ۱۹۳۰ء میں ہی انکو مولانا تھانوی کے پاس بھیجا تھا، اور جب وہ مولانا سے مل کر واپس آئے تو کچھ خوش نہ تھے، ملاقات کی تفصیل سے اندازہ ہوا کہ اس موقع پر انھوں نے مولانا تھانویؒ سے پورے عالمانہ انداز میں گفتگو کی تھی، میں نے سید صاحب سے عرض کیا آپ کی ناخوشی بے جا نہیں، مولانا تھانویؒ کو آپ تو پسند آئے لیکن آپ جس مقام سے بول رہے تھے، وہ ان کو پسند نہیں آیا، سید صاحب یہ سنکر پھڑک اٹھے، اسی سلسلہ میں مولانا نے فرمایا کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ جب حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کے پاس پہنچے تو ایک روز حضرت گنج شکرؒ نے ان سے کہا "آؤ آج تمکو عوارف المعارف پڑھائیں" حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ اس کتاب کو پہلے پڑھ چکے تھے، اور اس پر پوری طرح حاوی تھے، اس لیے ان کو خیال ہوا کہ درس سے ان کے علم میں کوئی اضافہ نہ ہوگا، مگر مرشد کا حکم تھا، اس لیے کتاب لے کر پہنچے، درس میں کسی مسئلہ پر حضرت نظام الدینؒ نے بحث کرنے کی کوشش کی، حضرت فرید الدینؒ کتاب بند کرکے اٹھ کھڑے ہوئے، اور کئی روز تک حضرت نظام الدینؒ سے مخاطب نہیں ہوئے، مرشد کی یہ آزردگی دیکھکر حضرت نظام الدینؒ نے ان سے پوچھا کیا میں نے درس میں کوئی غلط بات کہی تھی، حضرت گنج شکرؒ نے فرمایا نہیں، جو بات کہی تھی وہ تو صحیح تھی لیکن جس مقام سے تم کہہ رہے تھے وہ صحیح نہ تھا،

مولانا نے اس واقعہ کو کچھ ایسے موثر انداز میں بیان کیا کہ اس کو سنکر مجھکو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میری آنکھوں کے سامنے سے تاریکی کے پردے اٹھ گئے، زندگی کو سمجھنے اور سلجھانے میں یہ کتنا اہم نکتہ ہے : راقم خاموشی کے ساتھ ان کی گفتگو کی روانی اور شیرینی سے لذت لیتا رہا، لیکن اسی زمانہ میں اپنے ایک عزیز ڈاکٹر محمد امام سپرنٹنڈنٹ پٹنہ میڈیکل کالج اسپتال

سے وہاں کا ایک واقعہ سنا تھا، جو ان کی خدمت میں عرض کیا، وہ یہ تھا کہ اسپتال کے جنرل وارڈ میں ایک فوجی کپتان کا بچہ داخل ہوا، اس کی ماں تیمارداری میں تھی، جو آس پاس کے مریضوں کو بہت تنگ کرتی تھی، اور اس سے سب ہی پریشان تھے بغل ہی میں ایک بوڑھا لیکن ظریف مریض بھی تھا، ایک روز فوجی کپتان وہاں آیا، بوڑھے مریض نے اشارے سے اسکو اور اسکی بیوی کو اپنے پاس بلایا، اور اس کی بیوی کو مخاطب کرکے کہا "بیٹی! ایک قصہ سنو، ایک شخص کہیں جارہا تھا کہ راستے میں اس کو اللہ میاں مل گئے، اس نے اللہ میاں سے پوچھا "آپ نے انسانوں کے کھانے کے لیے تو طرح طرح کی نعمتیں پیدا کیں، لیکن آپ خود کیا کھاتے ہیں؟ اللہ میاں بتانے پر راضی نہیں ہوئے لیکن جب وہ بضد ہوا تو فرمایا، ہم بس ایک ہی چیز کھاتے ہیں، اور وہ انسان کا غرور ہے، یہ قصہ سنا کر بوڑھے مریض نے اس عورت سے کہا کہ بیٹی! کہیں ایسا نہ ہو کہ تو بھی اللہ میاں کی غذا نہ بن جائے"

یہ قصہ سن کر مولانا جو لیٹے ہوئے تھے، اٹھ کر بیٹھ گئے، فرمایا کہ کیا خوب قصہ سنایا، پھر کلام پاک کی آیتیں پڑھ کر سنانے لگے، اور ان کی تفسیر میں فرمایا کہ اللہ میاں نے کہا ہے کہ میں نے سب کچھ اپنے بندوں کو دیدیا ہے، اپنے پاس کچھ نہیں رکھا، البتہ کبریائی کی ایک چادر ہے، جس کو اوڑھے رہتا ہوں، اب اگر کوئی بندہ اس کو بھی مجھ سے لینا چاہتا ہے تو میں برہم ہو جاتا ہوں کہ اس کو یہ بھی گوارا نہیں کہ میرے پاس یہ چادر بھی رہے، اس مزاحیہ تفسیر میں گوش شنوا کے لیے کیا کچھ نہیں ہے،

ان ہی دنوں معارف میں جینڈیہ کاش جوہر کی ایک غزل شائع ہوئی تھی، سلسلۂ کلام میں مولانا نے پوچھا، یہ کون اہل دل ہیں؟ عرض کیا کہ ابھی بالکل ہی نوجوان ہیں، فرمایا کہ یہ تو کوئی دل ہی والا کہہ سکتا ہے ؎

یہ کمال ضبط غم ہے کہ سلیقۂ محبت
مرا دل تو رو رہا ہے مگر آنکھ تر نہیں ہے

پھر کہا کہ ظالم نے کیا کہہ دیا ہے

وہ تمام تر توجہ با ایں سازش تغافل
وہ یوں باخبر ہیں جیسے انھیں کچھ خبر نہیں ہے

اور پھر بڑی حسرت سے یہ شعر پڑھا

غم جستجو کے صدقے وہ مقام دل بھی آیا
کہ بجز خیال جاناں کوئی ہم سفر نہیں ہے

شاید وہ اپنے "مقام دل" میں اپنے "ہم سفر" کو دیکھ رہے تھے۔

سلسلۂ کلام جاری تھا کہ مکارم صاحب آگئے، اس لیے وہ خاموش ہوگئے، پھر جب مکارم صاحب گاؤں کے قصے سنانے لگے تو مولانا ان کی گفتگو سننے میں محو ہوگئے۔

میرا قیام دن بھر رہا، آموں کا موسم تھا، اس لیے دسترخوان پر آموں کا ڈھیر تھا، خود مولانا نے صرف چند قاشیں کھائیں، لیکن آموں کی رعنائی دیکھ کر اور ان کی تعریف سن کر بہت مسرور نظر آرہے تھے، مکارم صاحب کی گفتگو سننے کے بعد جب کبھی ان کو خود باتیں کرنے کا موقع ملتا تو وہ زیادہ تر اپنی موت ہی کا ذکر کرتے، اور ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا کہ اب ان کے دل میں کوئی خواہش باقی نہیں رہ گئی ہے۔ ہاں دکھ تھا تو یہ کہ وہ اپنی نظروں کے سامنے چاروں طرف کتابیں دیکھتے تھے لیکن پڑھ نہیں سکتے تھے، اور پڑھنے سے زیادہ لکھنے سے معذور ہو چکے تھے، وہ گویا اپنے آپ کو آب حیات کے پاس کھڑا دیکھتے لیکن اس کے پینے پر پابندی عائد تھی۔ ان کے لیے یہ تکلیف ناقابل برداشت تھی جس کو دور کرنے کے لیے کبھی اپنے چھوٹے نواسے انس، کبھی پالتو تیتر اور مور سے دلچسپی لیکر وقت گزارنے کی کوشش کرتے۔

جب میں ان سے رخصت ہونے لگا تو عجب پر درد منظر تھا، میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیکر فرمایا، میں تو اب برابر یسٰ پڑھتا ہوں،

دل نہیں لگتا تو کیوں گھبراؤ شاد جی چکے بس تا بکے مرجاؤ شادؔ
منہ پھیر و اس نگاہ مست سے برچھیاں سینہ پر تن کر کھاؤ شادؔ

اور یہ شعر تو گویا ان کی موت کی پیشین گوئی تھی،

ہیں نے مانا بخشوالوگے گناہ اور جو اس کی بھی نہ مہلت پاؤ شادؔ

اس کو پڑھ کر فرمایا، کن کن آرزوؤں کے لیے آدمی زندہ رہے، اور یہ اشعار سن کر تو میں بھی آبدیدہ ہوگیا،

خط شوق اپنا لفافہ میں رکھو آرزوؤں کو کفن پہناؤ شادؔ
دے چکی اک عمر تک دنیا فریب اب نہ اس دھوکے کے اندر آؤ شادؔ

لیکن وہ خود اس طرح مسرور اور شادان ہو کر ان اشعار کو پڑھ رہے تھے جیسے اس دار المحن کو چھوڑ کر ایک ابدی دار المسرت کی طرف کوچ کے لیے بے چین ہوں،

جب میں ان سے رخصت ہوا تو یہ خیال کرکے دل بیٹھا جاتا تھا کہ اب شاید ملاقات کی نوبت نہ آئے، اور بار بار یہ خیال آتا تھا کہ حضرت سید صاحبؒ کی رحلت کے بعد کبھی کبھی مولانا کی صحبت میں جو ذہنی سکون اور روحانی لذت مل جاتی تھی، کہیں اس سے بھی محروم نہ ہو جاؤں۔

دلیسنہ واپس آنے کے پانچویں ہی روز یعنی ۵ جون ۱۹۵۶ء کو یکایک خبر ملی کہ مولانا جنت کو سدھار گئے، یہ خبر اتنی دیر میں ملی کہ شرکت جنازہ کی سعادت سے محروم رہا، دوسرے دن علی الصباح گیلانی پہنچا، جب مکارم صاحب نظر آئے تو مجھکو دیکھکر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، وہ مولانا سے صرف چار سال چھوٹے تھے، لیکن اس طرح رو رہے تھے جیسے کوئی بچہ اپنے شفیق باپ کی موت پر روتا ہو، بڑے بھائی نے اپنے چھوٹے بھائی سے جیسی محبت کی اس کی مثال بہت ہی کم ملے گی، وہ رو رو کر بیان کرنے لگے کہ بھائی مرحوم ادھر کئی روز سے

بہت اچھے تھے، گذشتہ رات کو اور بھی زیادہ خوش تھے، رات کے گیارہ بجے تک قوالی کی دھن میں کچھ غزلیں پڑھوا کر سنتے اور ہر شخص سے لطف و محبت کی باتیں کرتے رہے، بارہ بجے ان کو آرام کرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا، ان کو دیر تک نیند نہیں آئی، مگر پھر سو گئے، صبح سویرے اٹھے، وضو کیا، کھڑے ہو کر فجر کی نماز ادا کی، وظیفہ پڑھا، پھر پلنگ پر آکر لیٹ گئے، ملازم سے کہا رات نیند کم آئی تھی، اس لیے چادر اڑھا دو، سوؤں گا، سوئے تو ابدی نیند سو گئے، اور جب ہم لوگوں نے سانس رکتے ہوئے دیکھا تو ان کا چہرہ جوانوں کی طرح شگفتہ اور شاداب ہو گیا تھا،

کیسی اچھی موت پائی، ایک پاکیزہ روح اسی طرح عالم بالا میں منتقل ہوتی ہے، معلوم ہوا کہ جنازے میں آس پاس کے گاؤں کے ہندو مسلمان بکثرت شریک ہوئے تھے، اور اس چھوٹے سے گاؤں میں ہر طرف آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے، اسی آمد میں مولانا مرحوم کے کچھ کاغذات اور کتابیں دیکھنے کا موقع ملا، ان کو مولانا عبدالماجد دریابادی مدظلہ العالی سے بڑا قلبی لگاؤ تھا، انکی ترجمہ کردہ "مناجات مقبول" کی تلاوت روزانہ کرتے، اسی کے ایک ورق پر حسب ذیل تحریر دیکھکر حیرت ہوئی،

۱۰ اپریل ۱۹۵۲ء - یکایک سونے کے وقت رات کو قرآنی آیت اللہ یتوفی الانفس حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا فیمسک التی قضی علیہا الموت ویرسل الاخری الی اجل مسمی، کا خیال آیا، عجیب بات ہے کہ آخر یہ فرمان دیا گیا ان فی ذلک لآیات لقوم یتفکرون۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ مسلمانوں میں سکرات موت کے متعلق طرح طرح کی روایتیں مشہور ہو گئی ہیں، حالانکہ اس نص قطعی میں صاف طور پر اعلان کر دیا گیا ہے کہ نیند جیسے آتی ہے، موت بھی اسی طرح آتی ہے، نیند آنے میں سونے والوں کی تکلیف کب ہوتی ہے، پھر موت میں تکلیف کا تصور عجیب ہے، ہمارے استاد مولانا فراہیؒ سکرۃ الموت کے لفظ سے نتیجہ نکالا کرتے تھے کہ عندالموت مرنے والے

پرنشہ کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، حضرت تھانوی نے امام غزالی کی ان روایتوں کی تنقید
کرائی تھی جن سے موت کے شدائد پر امام نے احیاء العلوم میں استدلال کیا ہے"

مولانا نے آیت مذکورہ سے جو استنباط کیا تھا، اسی کے مطابق ان کی موت ہوئی، جو بلا شبہ
ایک مومن اور ایک عارف کی موت کہی جاسکتی ہے، انھوں نے شاید چشم بینا سے اپنی موت کا منظر
پہلے ہی دیکھ لیا تھا،

مزار پر حاضری سے پہلے بعض اعزہ کے زنانخانے میں چلا گیا، تو وہاں عورتوں کو سوگوار اور
اشکبار پایا، اور وہ کہہ رہی تھیں کہ جو بیوائیں ان کے مقرر کیے ماہانہ وظیفے پر زندگی بسر کررہی تھیں
اب ان کے دن کیسے گزریں گے، پھر اس کی تفصیل معلوم ہوئی کہ وہ کس طرح خاموشی سے ناداروں
اور غریبوں کی مدد کیا کرتے تھے،

جب ان کے مزار کی طرف چلا تو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ فضل و کمال کے خاتمہ پر آنسو
بہانے، عالمانہ موشگافی اور نکتہ وری پر ماتم کرنے اور بہار کی علمی عظمت و فضیلت پر فاتحہ
پڑھنے جا رہا ہوں، اور جب تربت نظر آئی تو بے اختیار آنسو نکل پڑے کہ آہ! ایک منور چہرہ،
ایک لطیف جسم، ایک روشن ضمیر، ایک صاف طینت، ایک پاک دل، ایک پیکر محبت اور
ایک مخزن علم اس تودۂ خاک میں دفن ہے، مگر دل یہ کہہ رہا تھا کہ قبول و مغفرت کا تاج
ان کے سر پر رکھا جاچکا ہوگا، ان کے محبوب آم کے درختوں کی ہری ہری ڈالیاں ان کی
تربت پر سایہ فگن تھیں، میں نقش حرماں بنا ہوا تھا، اور وہ اپنی زندگی کی ساری رعنائیوں
سے نقش حیرت بنا رہے تھے، اور اقبال کا یہ شعر اچھی طرح ذہن نشین ہو رہا تھا،

جوہر انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں — آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

اور اقبال نے یہ شعر بھی شاید ان ہی جیسے بزرگوں کے لیے کہا ہے،

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام

اور وہ یقیناً اپنے "دلِ الفت نسب" "سینۂ توحید فضا" "نگہہ جلوہ پرست" اور "نفس صدق گزیں" کی وجہ سے "صاحب عشق" تھے، اور ان کو حیاتِ ابدی حاصل ہے،

اور جب گیلانی چھوڑ کر واپس جا رہا تھا تو ان کے یہ اشعار یاد آرہے تھے،

یاد آتی ہے مجھکو گیلانی مظہر لطف غوث سبحانی

مصدرِ رازہائے عرفانی مطلع جلوہ ہائے روحانی

منبع علم مخزنِ حکمت مرکز جاہ و عظمت و شوکت

گیلانی کی سرزمین میں ان کے آسودۂ خاک ہونے سے یہ اشعار کس قدر با معنی اور صحیح ہو گئے ہیں،

بزمِ صوفیہ

جس میں عہد تیموریہ سے پہلے کے صوفیہ کرام حضرت شیخ ابوالحسن علی ہجویریؒ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ، حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ حضرت شیخ صدر الدینؒ، حضرت بابا گنج شکرؒ حضرت شیخ فخر الدین عراقیؒ حضرت شیخ امیر حسینیؒ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ حضرت بو علی قلندر پانی پتیؒ حضرت شیخ فخر الدین عراقیؒ حضرت برہان الدین غریبؒ، حضرت ضیاء الدین نخشبیؒ، حضرت شرف الدین احمد منیریؒ حضرت جہانیان جہاں گشتؒ حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ، اور حضرت خواجہ گیسو درازؒ کے مستند حالات اور تعلیمات ایک بالکل نئے انداز میں پیش کی گئی ہیں، ان بزرگانِ دین نے اپنے عہد کے مذہب، تصوف، اخلاق، معاشرت اور سیاست کو کس طرح سنوارا، اسکی تفصیل اس کتاب میں ملاحظہ فرمایئے، قیمت: ستے ر

منیجر

یونانی منطق کے قدیم عربی تراجم

از جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے، ایل ایل بی، پی ٹی ایچ

فاضل مضمون نگار کو ریاضیات اور عقلی فنون سے خاص ذوق ہے، جس کو مسلمان عام طور سے فراموش کر چکے ہیں، اسی کے ساتھ وہ ایک صاحب نظر محقق بھی ہیں، انھوں نے اس مضمون میں پروفیسر پول کراوس کے ایک مقالہ پر جس کا ترجمہ گذشتہ مہینہ کے معارف میں شائع ہو چکا ہے، جیسی ناقدانہ اور تحقیقی نگاہ ڈالی ہے، اس سے اسکا اندازہ ہوگا۔ "م"

(۱) اعتذار:- پروفیسر فرنشکو جبرئیلی نے ۱۹۳۲ء میں "مولفات ابن المقفع" کے عنوان سے مجلہ دراسات الشرقیہ" میں ایک مقالہ شائع کیا تھا جس میں پروفیسر موصوف نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ارسطا طالیسی منطق کی کتابوں کے قدیم ترین ترجمے کی نسبت عبد اللہ بن المقفع کی جانب (جیسا کہ قاضی صاعد اندلسی نے طبقات الامم میں اور ان کی تقلید میں جمال الدین ابن القفطی اور ابن ابی اصیبعہ وغیرہ متاخرین مورخین نے لکھا ہے) صحیح نہیں ہے، لیکن انھوں نے اپنے خیال کی تائید میں کوئی دلیل نہیں دی، با ایں ہمہ اس غیر مدلل خیال سے انھوں نے یہ قیاس آرائی کی تھی :-

"اس لیے ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ ابن المقفع سریانی زبان جانتا تھا جس میں عموماً یونانی فلسفہ کے مختصرات اور تراجم لکھے جاتے تھے، رہا ان کتابوں کے پہلوی ترجموں کا وجود جیسا کہ اس سے قبل فرنش (Wenrich) نے گمان کیا تھا اور جس کی طرف

۲۳

عربی اور ایرانی تراجم نے بھی اشارہ کیا ہے، تو یہ ایسا مفروضہ ہے جس کی کافی دتائق سے تائید نہیں ہوتی۔"[۱]

سال بھر بعد ۱۹۳۴ء میں اسی رسالہ میں پروفیسر پول کراؤس (Paul Kraus.) نے اس مقالہ پر "حول ابن المقفع" کے عنوان سے اپنا تبصرہ شائع کیا، یہ تبصرہ دو حصوں میں منقسم تھا، پہلا حصہ "ابن المقفع کی جانب منسوب ارسطاطالیسی تراجم" کی بحث پر مشتمل ہے، اس حصے کو ایک مصری اہل قلم ڈاکٹر عبدالرحمن بدوی نے، دوسرے مستشرقین کے مقالات کے ساتھ عربی میں ترجمہ کرکے ۱۹۴۶ء میں "التراث الیونانی فی الحضارۃ الاسلامیہ" کے عنوان سے شائع کیا، میرے پیش نظر یہی عربی ترجمہ ہے[۲]، اس مقالہ میں پروفیسر پول کراؤس نے یہ خیال ظاہر کیا ہو کہ قدیم ارسطاطالیسی تراجم بعد کے اسلامی مورخین کی غلطی سے ابن المقفع کی جانب منسوب ہوگئے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے جوزپہ فرلانی (G. Furlani) کی کتاب کے خصوصیت سے حوالے دیے ہیں جس میں موخرالذکر نے ارسطاطالیسی منطق کے قدیم ترین ترجمے کے ایک مخطوطہ کا انکشاف کرایا ہے، جو بیروت کے سینٹ جوزف کالج میں کچھ عرصے پیشتر دریافت ہوا تھا، عام تاریخی مصادر کے علاوہ جو عربی و سریانی نیز مختلف یورپین زبانوں میں ہیں، پروفیسر موصوف نے فرلانی کی محولہ بالا کتاب کے اور خصوصیت سے اصل ترجمے کے ان اقتباسات کو سامنے رکھا ہے، جو اس نے (فرلانی نے) اپنی کتاب میں نقل کیے ہیں۔

بہرکیف اس مقالہ میں جو ایک جرمن مستشرق کے روایتی تبحر علمی کا آئینہ دار ہے، پروفیسر موصوف نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ عبداللہ بن المقفع کا مبینہ منطقی ترجمہ اور اسی طرح بیروت کا یہ مخطوطہ عبداللہ بن المقفع

---

[۱] التراث الیونانی فی الحضارۃ الاسلامیہ للدکتور عبدالرحمن البدوی ص ۱۰۱، آیندہ اختصار کے لیے اس کتاب کا حوالہ التراث الیونانی کے نام سے دیا جائیگا [۲] اس کا اردو ترجمہ مارچ کے معارف میں شائع ہوچکا ہے۔

کا ترجمہ کیا ہوا نہیں ہے، بلکہ اس کے بیٹے محمد بن عبداللہ بن المقفع کا ترجمہ کیا ہوا ہے، اور یہ ترجمہ موخر الذکر نے پہلوی زبان سے نہیں کیا تھا، بلکہ براہ راست سریانی یا غالباً یونانی سے کیا تھا،

بیروت کے مخطوطہ کے آخر میں ایک توقیع ہے، اس میں دو اور ترجموں کا ذکر ہے، ایک ابونوح کاتب نصرانی کا اور دوسرا سلمہ[1] صاحب بیت الحکمۃ کا، پروفیسر مذکور کا خیال ہے کہ

۱۔ اصل مخطوطہ محمد بن عبداللہ بن المقفع کا ترجمہ کیا ہوا ہے جس نے اسے المہدی (۱۵۸ھ - ۱۶۹) یا الہادی (۱۶۹ھ - ۱۷۰) کے زمانہ میں یحییٰ بن خالد البرمکی کے لیے کیا تھا،

۲۔ دوسرا ترجمہ جسے ابو نوح الکاتب النصرانی نے کیا تھا، وہ ہارون الرشید (۱۷۰ھ - ۱۹۲) کے عہد خلافت میں ہوا،

۳۔ تیسرا ترجمہ جسے سلم (سلما) صاحب بیت الحکمۃ نے کیا تھا، وہ اس نے بہت عرصے بعد مامون الرشید (۱۹۸ھ - ۲۱۸) کے عہد خلافت میں کیا،

میں جرمن مستشرقین کے تبحر علمی کا معترف ہوں، اس کے ساتھ عرب مورخین کے ساتھ بھی مجھے کورانہ عقیدت نہیں ہے، لیکن فاضل پروفیسر کے ساتھ حسن عقیدت کے باوجود میں کسی طرح خود کو ان کا ہمنوا نہ بنا سکا، سطور ذیل میں میں نے اپنے وجوہ اختلاف کو پیش کیا ہے،

(۱) منطق کے قدیم ترین مترجم کی شخصیت | منطق کے ساتھ مسلمان حکما، و فضلاء کو شروع ہی سے خاص شغف رہا ہے، چنانچہ جوں ہی اسلامی تاریخ میں علوم و فنون کی باقاعدہ تدوین شروع ہوئی، پہلے ارسطاطالیسی منطق کے ترجمے اور بعد میں مستقل کتابیں ظہور میں آنے لگیں،

علوم و فنون کی باقاعدہ تالیف و تصنیف کا سلسلہ عباسی خلافت کے آغاز سے شروع ہوتا ہے، پہلے دو خلفاء کا ابتدائی زمانہ اندرونی شورشوں کے دبانے اور عباسی حکومت کے استحکام میں گذرا، نفس زکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم کے قتل کے بعد ۱۴۵ھ میں ابوجعفر منصور کو اطمینان

[1] مخطوطہ میں اسی طرح سلمہ لکھا ہے [illegible]

سائنس لینے کا موقع ملا، منصور خود بھی علم و ہنر کا قدردان تھا، ادھر قوم کے حوصلے بھی بلند تھے۔ اساطین علما، دینیات کی اور اہل ادب لسانیات کی کتابوں کی تالیف و تصنیف میں مشغول تھے، اس کی تفصیل تاریخ التشریع الاسلامی اور تاریخ الادب العربی کے مورخوں کا منصب ہے، غالباً اس کا آغاز اموی دور ہی سے ہو چکا تھا، لیکن اپنے پیشرووں کے برخلاف عباسی خلفا نے یونان و ایران کے علوم کو عربی زبان میں منتقل کرنے کی بھی ہمت افزائی کی، حالات بھی اس کے سازگار تھے، امویوں نے کسی دینی جذبے یا "عرب کے سوز دروں" کے ماتحت نہیں بلکہ قومی عصبیت کے زیر اثر "عجم کے حسن طبیعت" کو فروغ پذیری کا موقع نہیں دیا، ان کے نوّے سالہ دورِ حکومت میں ایک تنہا مثال خالد بن یزید کی ملتی ہے، جس نے عربی میں یونانی زبانوں کے ترجمے کرائے، ابن الندیم کہتا ہے:

اصطفن القدیم ونقل لخالد بن	اصطفن قدیم: اس نے خالد بن معاویہ کے واسطے
یزید بن معاویة کتب الصنعة وغیرها[1]	کیمیا وغیرہ کی کتابوں کے ترجمے کیے،

لیکن اس ادبی تحریک کے پیچھے کسی علمی سرپرستی کا جذبہ کارفرما نہ تھا، بلکہ حصول دولت کا لالچ کام کر رہا تھا، ابن الندیم آگے چل کر الفہرست میں خالد بن یزید کے متعلق لکھتا ہے،

وهو اول من ترجم له کتب الطب والنجوم	خالد بن یزید پہلا شخص ہے جس کے لیے طب، نجوم اور کیمیا
[illegible] الکیمیا وکان جواداً یقال انه	کی کتابوں کے ترجمے کیے گئے، وہ بڑا سخی تھا، مشہور ہے
[illegible] قد جعلت اکثر شغلك فی طلب	کہ اس سے کہا گیا کہ آپ کیمیا کی تلاش میں بہت زیادہ
[illegible] فقال خالد: ما اطلب بذلك	سرگرداں رہتے ہیں، تو خالد نے کہا: اس تلاش سے میرا
الا ان اغنی اصحابی واخوانی[2]	مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے) [illegible]

لیکن عباسی خلافت کا آغاز ایک انقلابی تبدیلی کا پیش خیمہ ہے، یہ محض حکمران خاندانوں کی تبدیلی ہی نہیں تھی، بلکہ ایک ثقافتی انقلاب تھا، "عرب کے سوز دروں" پر "عجم کے حسن طبیعت" کے غلبہ کا آغاز تھا، اس ثقافتی انقلاب کے نتیجے میں مملکتی سرپرستی کے اندر غیر اسلامی و غیر عربی علوم کے ساتھ باقاعدہ اہتمام و اعتنا شروع ہوا، اور ابوجعفر منصور ہی کے عہد خلافت میں منطق کی کتابوں کا پہلی بار عربی میں ترجمہ ہوا، یہی نہیں بلکہ کلینی کی حسب ذیل روایت سے جو انھوں نے امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ[۱] سے کی ہے، یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دوسری صدی کے نصف اول سے پیشتر ہی تعلیم یافتہ طبقہ میں منطق کے ساتھ شغف اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ ائمۂ دین کو انھیں اس کے خلاف متنبہ کرنا پڑا،

ان الناس لا یزال بھم المنطق حتی	لوگ منطق میں مشغول ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ
یتکلموا فی اللہ فاذا سمعتم ذالک	ذات باری تعالیٰ کے باب میں قیل و قال کرنے
قولوا لا الہ الا الواحد الذی	لگتے ہیں، پس جب تم اسکو سنو تو کہو نہیں کوئی
لیس کمثلہ شئ[۲]	معبود اس اکیلے خدا کے سوا جسکے مانند کوئی چیز نہیں

بہرکیف ارسطاطالیسی منطق کی متداول کتابوں[۳] کا ترجمہ ابوجعفر منصور کے عہد میں شروع ہوا اور جس شخص نے اس کی بنیاد ڈالی وہ حسب تصریح قاضی ابوالقاسم صاعد اندلسی (المتوفی سنہ ۴۶۲ھ) مشہور کاتب عبد اللہ بن المقفع تھا، وہ طبقات الامم میں لکھتے ہیں،

فاما المنطق فاول من اشتھر بہ	رہا منطق تو جو شخص سب سے پہلے اس (کے ترجمے)
فی ھذہ الدولۃ عبد اللہ بن المقفع	کے لیے اس حکومت (خلافت عباسیہ) میں

۱؎ امام جعفر صادق کا سال وفات ۱۴۸ھ ہے ۲؎ اصول الکافی (مطبوعہ بمبئی) ص ۵۲ ۳؎ پانچویں صدی عیسوی سے آٹھویں صدی تک منطق ارسطو کی آٹھ کتابوں میں صرف تین کتابیں یعنی قاطیغوریاس، باری ارمینیاس اور انالوطیقا پڑھائی جاتی تھیں، ان سے پہلے فرفوریوس کی ایساغوجی پڑھائی جاتی تھی،

الخطیب الفارسی کاتب ابی جعفر المنصور فانه ترجم کتب رسطاطالیس المنطقیة الثلاثة التی فی صورة المنطق وهی کتاب قاطیغوریاس وکتاب باری ارمینیاس وکتاب انولوطیقا. وذکر انه لم یترجم منه الی وقته الا الکتاب الاول فقط. وترجم کذلک المدخل الی کتاب المنطق المعروف بالایساغوجی لفرفوریوس الصوری وعبر عما ترجم من ذلک بعبارة سهلة قریبة المأخذ[1]

. . . .

. . . .

. . . .

مشہور ہوا، وہ عبداللہ بن المقفع تھا جو مشہور ایرانی خطیب اور ابی جعفر منصور کا کاتب تھا، چنانچہ اس نے ارسطاطالیس کی منطق کی کتابوں میں سے تین کتابوں کا جو منطق کی صورت (Formal Logic) کے باب میں ہیں ترجمہ کیا یعنی کتاب قاطیغوریاس (کتاب المقولات) کتاب باری ارمینیاس (کتاب العبارۃ) اور کتاب انالوطیقا (کتاب القیاس) کا، اور کہا گیا ہے کہ اس کے زمانہ تک ان کتابوں میں سے سوا پہلی کتاب کے اور کوئی کتاب ترجمہ نہیں ہوئی، اور اسی طرح اس نے کتاب منطق کے مقدمے کو جو فرفوریوس صوری کے "ایساغوجی" کے نام سے مشہور ہے ترجمہ کیا اور ان میں سے جس کتاب کا بھی ترجمہ کیا وہ سلیس اور قریب الماخذ عبارت میں کیا،

اسی طرح قفطی نے "اخبار العلماء باخبار الحکماء" میں لکھا ہے:

عبد الله بن المقفع کان فاضلاً کاملاً وهو اول من اعتنی فی

عبداللہ بن المقفع فاضل و کامل تھا، وہ ملت اسلامیہ میں پہلا شخص ہے جس نے ابی جعفر منصور

---

[1] طبقات الامم ص ۴۹

الملة الاسلامية بترجمة الكتب المنطقية لابي جعفر المنصور وهو فارسي النسب الفاظه حكيمة ومقاصده من الخلل سليمة ترجم كتب ارسطوطاليس المنطقية الثلاثة وهي كتاب قاطيغورياس وكتاب باري ارمينياس وكتاب انالوطيقا ترجم ذلك بعبارة سهلة قريبة المأخذ[1]

کے لیے منطق کی کتابوں کے ترجمے کی طرف توجہ کی، وہ ایرانی النسل تھا۔ اسکے الفاظ حکیمانہ ہیں، اور اس کے مقاصد خلل اور کوتاہیوں سے پاک ہیں، اس نے ارسطو کی منطق کی تین کتابوں کا یعنی کتاب قاطیغوریاس، کتاب باری ارمینیاس اور کتاب انالوطیقا کا ترجمہ کیا، یہ ترجمہ سلیس اور قریب المأخذ عبارت میں کیا۔ . . . .

اسی طرح ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطباء میں لکھا ہے:

وكان عبد الله بن المقفع الخطيب فارسيا ايضاً وكان كاتب ابي جعفر المنصور وترجم ايضاً من كتب ارسطوطاليس كتاب قاطيغورياس وكتاب باري ارمينياس وكتاب انالوطيقا وترجم مع ذلك المدخل الى كتب المنطق المعروف بايساغوجي لفرفوريوس الصوري وعبارته في الترجمة عبارة

عبد اللہ بن المقفع بھی ایرانی خطیب تھا، وہ ابی جعفر المنصور کا کاتب تھا، اس نے ارسطو کی کتابوں میں سے کتاب قاطیغوریاس، کتاب باری ارمینیاس اور کتاب انالوطیقا کا ترجمہ کیا تھا، اور اس کے ساتھ منطق کی کتابوں کے مقدمے کا بھی جو فرفوریوس الصوری کی ایساغوجی کے نام مشہور ہے، اس کے ترجمے کی عبارت سلیس

---

[1] اخبار العلماء باخبار الحکماء (مصری ایڈیشن) ص ۱۴۸ - ۱۴۹

سہلۃ قریبۃ المأخذ[۱] اور قریبۃ الماخذ ہے،

فرانسکو جبریلی کے خیال میں عبد اللہ بن المقفع ۱۳۹ھ میں قتل کیا گیا[۲]، اور استاذ احمد امین کے خیال میں ۱۴۲ھ یا ۱۴۳ھ میں قتل کیا گیا[۳]، اس لیے اگر قاضی صاعد، قفطی اور ابن ابی اصیبعہ کی روایات صحیح ہیں، اور ان پر شک کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی تو یونانی منطق کی متداول کتابوں کا ترجمہ ۱۳۹ھ یا زیادہ سے زیادہ ۱۴۵ھ سے قبل ہو چکا تھا، اور چونکہ منصور ۱۳۶ھ میں خلیفہ ہوا اور قفطی نے لکھا ہے کہ عبد اللہ بن المقفع نے ابی جعفر المنصور کے لیے یہ ترجمہ کیا تھا[۴]، اس لیے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ منطق کی کتابوں کا یہ ترجمہ ۱۳۶ھ اور ۱۳۹ھ کے (یا زیادہ سے زیادہ ۱۳۶ھ اور ۱۴۵ھ) کے درمیان ہوا،

لیکن کیا یہ پہلا ترجمہ تھا؟

قاضی صاعد کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجودیکہ حکومت کی سرپرستی میں یہ پہلا ترجمہ تھا، لیکن اولیت کا شرف کسی اور مجہول الحال مترجم کو حاصل ہے، جس نے اس سے پہلے بھی "قاطیغوریاس" (کتاب المقولات) کا ترجمہ کیا تھا، جیسا کہ انھوں نے لکھا ہے،

لم یترجم منہ الی وقتنا الا کتاب	عبد اللہ بن المقفع کے زمانے سے پہلے [illegible] کتاب
الاول[۵]	قاطیغوریاس کے منطق کی کسی کتاب کا ترجمہ نہیں ہوا تھا،

اس طرح ہم فرض کر سکتے ہیں کہ منطق کا ترجمہ ۱۳۶ھ سے پہلے ہی ہونا شروع ہو گیا تھا، ممکن ہے دوسری صدی ہجری کے ربع اول میں ہو چکا ہو،

مگر ان افتراضات کے فرض کرنے میں یہ دقت ہے کہ ابن الندیم جو ان تینوں ماخذوں سے

۱؎ عیون الانباء فی طبقات الاطباء جلد اول ص ۳۰۸ ۲؎ التراث الیونانی ص ۷۰ ۳؎ ضحی الاسلام الجزء الاول ص [illegible]

۴؎ دیکھئے اوپر حاشیہ ۲؎ ۵؎ دیکھیے اوپر حاشیہ

کہیں زیادہ قدیم ہے۔ [الفہرست کا سنہ تالیف ۳۷۷ھ ہے] عبداللہ بن المقفع کے ذکر میں اسکی تصانیف کے ضمن میں ان منطقی کتابوں کے ترجمے کا حوالہ نہیں دیتا۔[1] حالانکہ اس نے فارسی زبان سے جو کتابیں ترجمہ کی تھیں ان کی تفصیل لکھی ہے، (ص ۱۷۲) یہی نہیں بلکہ پوری "الفہرست" میں اس کے ان تراجم کا ذکر نہیں ہے، مقالۂ سابعہ کے فن اول کے ضمن میں صرف قاطیغوریاس اور باری ارمینیاس کے ملخص نویسیوں کی فہرست میں ابن المقفع (نہ کہ عبداللہ بن المقفع) کا نام ملتا ہے۔ "الکلام علیٰ قاطیغوریاس" کے ضمن میں ابن الندیم کہتا ہے،

"ولهذا الكتاب مختصرات وجوامع مشجرة وغير مشجرة لجماعة منهم: ابن المقفع ....."[2]

اسی طرح "الکلام علیٰ باری ارمینیاس" کے عنوان کے نیچے لکھتا ہے:

"ومن المختصرات حنين، اسحٰق، ابن المقفع ....."[3]

لیکن "انالوطیقا" کے ضمن میں کسی ملخص نویس کا نام نہیں لیتا،

اسی طرح "اسماء النقلة من اللغات الى اللسان العربی" کے ضمن میں جہاں اس نے یونانی و سریانی سے عربی میں ترجمہ کرنے والوں کی فہرست دی ہے، عبداللہ بن المقفع کا نام نہیں دیا، البتہ "اسماء النقلة من الفارسی الى العربی" کے ضمن میں سب سے پہلے اس کا ذکر کیا ہے[4]، ظاہر ہے کہ منطق کی کتابوں کے تراجم یا تو براہ راست یونانی سے ہوئے یا سریانی سے، جبرئیلی اور پول کراؤس کا خیال ہے کہ یہ تراجم فارسی سے نہیں ہوئے، اپنے اس خیال کی تائید میں پروفیسر پول کراؤس نے جاحظ کی مندرجۂ ذیل عبارت کو پیش کرکے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ابن المقفع نے ارسطاطالیس کی منطقی کتابوں کا ترجمہ یونانی زبان سے عربی میں کیا تھا،

فمتی کان رحمه الله تعالیٰ ابن البطریق پس ابن البطریق، ابن ناعمہ، ابو قرہ، ابن فہر

---

[1] التراث الیونانی ص ۱۰۳ [2] الفہرست ص ۳۴۸ [3] ایضاً ص ۳۴۹ [4] ایضاً ص ۳۴۳

وابن ناعمہ وابو قرہ وابن فہر	ابن دہیلی اور ابن المقفع (جو ارسطاطالیسی منطق
وابن دہیلی وابن المقفع مثل	کے مترجمین ہیں) ارسطاطالیس کے برابر کہاں
ارسطاطالیس۔[1]	ہو سکتے ہیں (اسکے مراد و مقصود کو کہاں ادا کر سکتے ہیں)

لیکن ان شکوک کا حل ہو سکتا ہے:

پہلا شک یہ ہے کہ عبداللہ بن المقفع کو عموماً فارسی سے عربی میں ترجمہ کرنے والوں کی فہرست میں محسوب کیا جاتا ہے، اس لیے اگر اس نے منطقی کتابوں کا ترجمہ کیا ہوتا تو فارسی سے کیا ہوتا نہ کہ سریانی و یونانی سے، مگر وہ سریانی و یونانی کے مترجمین کی فہرست میں محسوب نہیں ہے، اور جاحظ کی محررۂ بالا عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن المقفع نے ان منطقی کتابوں کا ترجمہ یونانی سے عربی میں کیا تھا۔

مگر یہ فرض کرنے میں کوئی استبعاد نہیں ہے کہ عبداللہ بن المقفع نے ان کتابوں کا ترجمہ فارسی (پہلوی) سے کیا ہو، عباسی خلفا نے جس طرح ہیئت و نجوم کے ساتھ حسن عقیدت ساسانی حکمرانوں سے ورثہ میں پائی تھی، اسی طرح منطق کی اہمیت بھی وہیں سے حاصل کی تھی، اور قدیم فارسی (پہلوی) میں افلاطون وارسطو کی کتابیں نقل ہو چکی تھیں، اجتھیاس (Agathias) کہتا ہے کہ ارسطو اور افلاطون کی تصانیف خسرو انوشروان کے واسطے فارسی میں ترجمہ کی گئی تھیں[2] بعثت اسلام سے قبل جندیسابور کے مدرسہ میں لوگ فارسی زبان ہی میں تفلسف کیا کرتے تھے، اس لیے منطق و فلسفہ کی اہمیت ایران کے تعلیمیافتہ طبقے میں مسلم ہو چکی تھی، اور غالباً اسی وجہ سے بوعلی سینا کو فارسی زبان میں "دانش نامۂ علائی" تصنیف کرنے میں دقت محسوس نہیں ہوئی، کیونکہ تمام اصطلاحیں قدیم فارسی (پہلوی) میں موجود تھیں، غرض منطق و فلسفہ کی تعلیم ایران کے تعلیمیافتہ طبقے کے خمیر میں گندھی ہوئی تھی۔ عباسی خلافت کے قیام کے بعد (بلکہ اس سے پہلے بھی) یہی ایرانی النسل طبقہ کتابت کے

---

[1] کتاب الحیوان جلد اول ص ۳۰ [2] التراث الیونانی ص ۱۱۹

...دں پر فائز ہوا، اور اس نے ۔ ... جس طرح قدیم عجمی ادب کو عربی زبان میں منتقل کیا، فارسی ...ی) زبان میں غیر زبانوں سے جو کتابیں ترجمہ ہوئی تھیں، (مثلاً کلیلہ و دمنہ جسے برزویہ نے سنسکرت ...رجمہ کیا تھا) انھیں بھی عربی میں ترجمہ کیا[۱]، منطق و فلسفہ کی کتابیں بھی پہلوی میں ترجمہ کی جا چکی تھیں ...ن ہی کتابوں کو پڑھ کر عباسی دور کا طبقۂ کتاب منطق و فلسفہ میں کتابیں تصنیف کیا کرتا تھا، مثلاً

منصور بن طلحہ بن طاہر ایرانی النسل تھا، مگر اپنے تفلسف کی بنا پر "حکیم آل طاہر" کہلاتا تھا، او... ...میں اس کی تصانیف مشہور ہیں[۲]۔

سعید بن ہارون ایرانی النسل کاتب تھا، مگر "کتاب الحکمۃ" کا مصنف تھا[۳]،

علی بن عیسیٰ بن داؤد الجراح کے بیٹے ابوالقاسم عیسیٰ بن علی کے بارے میں ابن ندیم کہتا ہے:

"اوحد زمانہ فی المنطق والعلوم القدیمۃ[۴]۔"

طرح قدامہ بن جعفر کے متعلق کہتا ہے:

"وکان قدامہ احد البلغاء الفصحاء والفلاسفۃ الفضلاء وممن یشار الیہ فی علم المنطق[۵]۔"

کاتب تھے، اور ابن الندیم نے انھیں "کتاب" ہی کی فہرست میں ذکر کیا ہے، باایں ہمہ منطق و فلسفہ ید طولیٰ رکھتے تھے، حالانکہ فلسفی اور منطقی نہیں تھے، اسی طرح عبداللہ بن المقفع بھی باوجود پیشہ ...تبار سے کاتب ہونے کے منطق سے واقف تھا، اور اس نے منطق کی متداول کتابوں کو پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیا۔

دوسرا شک یہ ہے کہ ابن المقفع "الفہرست لابن الندیم" میں منطق کی پہلی دو کتابوں ...ریاس اور باری ارمینیاس) کے ملخص نگاروں میں محسوب ہے، مترجمین و ناقلین میں نہیں۔

---

[۱] اوپر حاشیہ ۲ ص ۲۸۱ [۲] الفہرست ص ۱۱۷ [۳] ایضاً ص ۱۷۴ [۴] ایضاً ص ۱۸۶ [۵] ایضاً ص ۱۸۸

۲۵

اس شک کے تین حل ہو سکتے ہیں،

یا تو لفظی ترجمہ کے بجائے ابن المقفع نے ان کتابوں کا آزاد ترجمہ کیا ہو، اور غیر ضروری تطویل و تفصیل کو نظر انداز کر دیا ہو اور اس طرح اس کے ترجمے میں نقل و ترجمہ کے بجائے اختصار و تلخیص کی شان پیدا ہو گئی ہو جس کی وجہ سے ابن الندیم کو اسے ملخص نویسوں کی فہرست میں لکھنا پڑا۔

یا عبد اللہ بن المقفع سے پہلے کسی اور نے عربی میں ترجمہ کیا ہو، اور اس نے اس کی تلخیص کی ہو، مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے،

یا خود ان کتابوں کے پہلوی مترجم ہی نے فارسی (پہلوی) میں ان کا ترجمہ بطور جوامع و مختصرات کے کیا ہو، اور ان ہی جوامع و مختصرات کا ترجمہ عبد اللہ بن المقفع نے عربی میں کیا ہو،

تیسرا شک یہ ہے کہ ابن الندیم نے عبد اللہ بن المقفع کے حال میں[1] اس کے منطقی تراجم کا ذکر نہیں کیا، اور قاطیغوریاس و باری ارمینیاس کے ملخص نویسوں کی فہرست میں صرف "ابن المقفع" کا نام لیا ہے نہ کہ عبد اللہ بن المقفع کا، پروفیسر بول کراؤس نے کہا ہے:

"ابن ندیم کی الفہرست میں ابن المقفع کے بارے میں ایک طویل فصل ہے جس میں مولف نے اس کی زندگی اور تالیفات کو بیان کیا ہے لیکن اس کی فلسفیانہ تصانیف کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں لکھا ہے، حالانکہ خصوصیت سے یہ کہا ہے کہ فارسی سے ترجمہ کرنے والوں میں ایک ابن المقفع بھی تھا، اور ان مترجمین میں سر فہرست اسی کا نام رکھا ہے[2] .... اور اس سے قبل ہم نے لکھا ہے کہ ابن الندیم نے اس فصل میں جو اس نے عبد اللہ بن المقفع پر لکھی ہے، اس کے یونانی تراجم کے باب میں ایک لفظ بھی نہیں کہا، حالانکہ یہ اہم مسئلہ ایسا نہ تھا جس سے ابن الندیم غفلت برتتا[3]"

---

[1] الفہرست ص ۱۷۲، [2] التراث الیونانی ص ۱۰۳، [3] ایضاً ص ۱۰۵

میرے خیال میں یہ شک بالکل بے بنیاد ہے، ابن الندیم کی عادت ہے کہ کسی مصنف کا تذکرہ بالاستیعاب ایک جگہ نہیں کرتا، کچھ حصہ ایک جگہ دیتا ہے اور کچھ حصہ دوسری جگہ، مثلاً خالد بن یزید کے یونانی سے عربی میں ترجمہ کرانے کا ذکر دو جگہ کیا ہے، ایک جگہ مترجمین و ناقلین کی فہرست میں کہتا ہے:

اصطفن القدیم ونقل لخالد بن یزید بن معاویہ کتب الصنعۃ وغیرھا[1]	اصطفن قدیم اس نے خالد بن یزید بن معاویہ کے لیے کتب کیمیا وغیرہ کے ترجمے کیے،

دوسری جگہ مقالہ عاشرہ میں "اخبار الکیمیائین والصنعویین" کے تحت میں اس کے کیمیا کے ساتھ شغف کی پوری تفصیل مع وجوہ و اسباب دیتا ہے[2]،

پھر ابن ندیم بھی انسان تھا، اگر قاضی صاعد سے چوک ہو سکتی ہے تو ابن الندیم بھی معصوم نہیں تھا، اس سے بھی چوک ہو سکتی ہے، اور یقیناً ہوئی ہے، (اگر اس کا نام چوک ہے) کیونکہ:

ا۔ ہم بالیقین جانتے ہیں کہ ابن المقفع نے (خواہ باپ ہو یا بیٹا) ارسطا طالیسی منطق کی کتب ثلاثہ کا بشمول انالوطیقائے اولیٰ ترجمہ کیا تھا، قاضی صاعد، قفطی اور ابن ابی اصیبعہ تینوں نے انالوطیقا کا نام لیا ہے[3]، بیروت کا نو دریافت مخطوطہ بھی انالوطیقا کے ترجمہ پر مشتمل ہے اور ورق نمبر ۲۵ پر صراحتہً لکھا ہوا ہے:

ثم کتاب انولوطیقا ولیس بعدہ من ھذہ الکتب الا کتاب انود الطبیعی[4]

مگر ابن الندیم نے "الکلام علی انا لوطیقا الاولیٰ" کے تحت میں ابن المقفع کا ذکر کسی عنوان سے نہیں کیا، نہ ناقلین و مترجمین کے سلسلے میں، نہ مفسرین کے، نہ ملخص نویسوں کے[5]۔

ب۔ مخطوطہ بیروت کی توقیع میں جس تیقن کے ساتھ ابن المقفع کے بعد دو اور مترجمین کا ذکر ہے، اس کے پیش نظر کوئی شک نہیں رہتا کہ ارسطو کی کتب ثلاثہ کا ترجمہ ابونوح الکاتب النصرانی

---

[1] الفہرست ص ۳۴۰ [2] الفہرست ص ۴۹۷ [3] دیکھیے اوپر کے حاشیے، [4] التراث الیونانی ص ۱۰۹

[5] الفہرست ص ۳۴۸

اور سلمہ (سلم) صاحب بیت الحکمۃ نے بھی کیا تھا، مخطوط کی توقیع حسب ذیل ہے

تمت الکتب الثلاثۃ من ترجمۃ محمد بن عبد اللہ المقفع
وقد ترجمھا بعد محمد ابو نوح الکاتب النصرانی ثم ترجمھا
بعد ابی نوح سلم الحرانی صاحب بیت الحکمۃ لیحیی بن خالد البرمکی [۱]

محمد بن عبد اللہ بن المقفع کی ترجمہ کردہ تینوں کتابیں ختم ہوئیں، اسکے بعد محمد ابو نوح کاتب نصرانی نے ترجمہ کیا، ابو نوح کے بعد مسلم الحرانی صاحب بیت الحکمۃ نے یحیی بن خالد برمکی کی۔

مگر ارسطو کی کتب منطقیہ کے ناقلین ومفسرین وغیرہم کی فہرست میں ان دونوں کا کوئی ذکر نہیں ہے، سلم صاحب بیت الحکمۃ "کا مستقلاً ذکر ابن الندیم نے تیسرے مقالے کے دوسرے فن میں کیا ہے [۲]
مگر اس کے منطقی تراجم کا ذکر نہیں کیا، یہی نہیں بلکہ اسکی ترجمہ کی خدمات کو فارسی کتابوں کے ترجمے میں منحصر کر دیا ہے،

ولہ نقول من الفارسی الی العربی [۳] فارسی سے عربی میں اس کے ترجمے ہیں،

حالانکہ خود ابن الندیم نے مامونی وفد (جسے مامون الرشید نے روم سے یونانی علوم کی کتابیں لانے کے واسطے بھیجا تھا) کی جو تفصیل دی ہے اس میں سلما صاحب بیت الحکمۃ کا نام بھی ہے [۴] جس کے معنی یہ ہیں کہ سلما یونانی زبان بھی جانتا تھا، اور یونانی کتابوں کا کامیابی سے ترجمہ کر کے خود کو خلیفہ مامون الرشید کے حسن انتخاب کا مستحق بنا چکا تھا،

ج۔ مسعودی کہتا ہے کہ عبد اللہ بن المقفع نے مانی، ابن دیصان اور مرقیون وغیرہ کی کتابیں فارسی سے عربی میں ترجمہ کی تھیں۔

"کتب مانی وابن دیصان ومرقیون مما نقلہ عبد اللہ بن المقفع وغیرہ و ترجمہ من الفارسیۃ والفہلویۃ الی العربیۃ" [۵]

مسعودی ابن الندیم سے زیادہ قدیم ہے اور ساتھ ہی قابل اعتماد بھی، اس لیے یہ یقینی امر ہے کہ عبد اللہ بن المقفع

---

۱ التراث الیونانی ص ۱۱۳، ۲ الفہرست ص ۳۴۷، ۳ الفہرست ۳۴۷، ۴ ایضاً ص ۳۳۹، ۵ مسعودی ج ۲ ص ۴،۱

نے الحاد و زندقہ کی تائید میں متعدد کتابیں لکھی تھیں، اور مانی و ابن دیصان وغیرہ کی کتابوں کا پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیا تھا، [1] باایں ہمہ الفہرست میں عبداللہ بن المقفع کی ان ملحدانہ تصانیف کا ذکر تک نہیں ہے،

واقعہ یہ ہے کہ "الفہرست" ان کتابوں کی فہرست ہے جن کی ابن الندیم کے زمانہ میں مانگ تھی، یا جن سے تعلیم یافتہ طبقہ متعارف تھا، نہ تو ابن الندیم اس التزام کا مدعی ہے کہ اسلامی تاریخ میں جو کتاب لکھی گئی وہ اس کا حال ضرور لکھے گا اور نہیں اس سے یہ توقع کرنا چاہیے، اس لیے اس استدلال میں کچھ زیادہ وزن نہیں ہے کہ اگر کسی کتاب کا ذکر "الفہرست" میں نہ ہو تو اسکے وجود ہی سے انکار کر دیا جائے یا کسی واقعہ کا اگر اس میں ذکر نہ ہو تو واقعہ ہوا ہی نہ ہو، پھر جس قسم کے تسامحات پر نا قابل پروفیسر نے اپنے استدلال کی بنیاد رکھی ہے، وہ سرے سے تسامحات ہی نہیں، صرف اجمال و تفصیل کی مثالیں ہیں، ایک ہی شخص کا ذکر ایک جگہ مجمل ہے، دوسری جگہ مفصل۔

چوتھا شک یہ ہے کہ ادیب شہیر عبداللہ بن المقفع جس نے کلیلہ و دمنہ کا عربی میں ترجمہ کیا وہ اس ابن المقفع سے قطعاً مختلف ہے جس نے ارسطاطالیسی منطق کی کتب ثلثہ کا ترجمہ کیا، چنانچہ پروفیسر موصوف کا کہنا ہے:

"اس صورت میں اس کا بہت زیادہ احتمال ہے کہ اس فصل میں جو اس نے عبداللہ بن المقفع کے متعلق لکھی ہے، اس چیز کا ذکر نہ کرنا اس کی دلیل ہے کہ وہ ارسطو کے مترجم اور ادیب مشہور کو ایک شخص نہیں سمجھتا۔" [2]

پروفیسر صاحب اپنے اس شبہہ کو زیادہ زوردار بنانے کے لیے آگے فرماتے ہیں:

اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ وہ ارسطو کی دو کتابوں (قاطیغوریاس اور باری ارمنیاس) کے مترجمین کی فہرست میں صرف "ابن المقفع" کا ذکر کرتا ہے، نہ کہ "عبداللہ بن المقفع" کا۔" [3]

---

[1] چنانچہ ابن خلکان نے مہدی کا قول نقل کیا ہے "ما وجدت کتاب زندقۃ الا واصلہ ابن المقفع" [2] التراث الیونانی ص ۱۰۵ [3] ایضاً

اور اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں۔

اس لیے ہمارے واسطے یہ فرض کرنا ضروری ہے کہ ہمارے سامنے دو مختلف شخص ہیں جو شاید آپس میں رشتہ دار تھے، اور ہر ایک "المقفع" کے عجیب غریب نام سے موسوم تھا، جو انکا خاندانی نام ہے۔[۱]

لیکن یہ مفروضہ بوجوہ ذیل، ناقابل تسلیم ہے:۔

۱۔ ہر چند کہ عبد اللہ بن المقفع کی کنیت ابو محمد تھی، اور غالباً اس کا ایک لڑکا بھی تھا جس کا نام "محمد" تھا، مگر اس "محمد بن عبد اللہ بن المقفع" کے حالاتِ زندگی سے ہم قطعاً ناآشنا ہیں، خود فاضل پروفیسر کو اعتراف ہے کہ

"چنانچہ الفہرست (ص ۱۱۸) میں ہے کہ اسلام لانے سے قبل اس کی کنیت ابو عمرو تھی اور بعد میں ابو محمد ہوئی اور ابن خلکان نے صراحۃً اس کے بیٹے محمد کا ذکر کیا ہے، البتہ ہم اس کی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔[۲]"

اس لیے جب ہمیں اس کی زندگی کے متعلق کچھ معلوم ہی نہیں تو اس قیاس آرائی کا حق کس طرح ہو سکتا ہے کہ

"اس لیے بہت ممکن ہو کہ یہ اس کا بیٹا ہو گا، جس نے خلیفہ منصور المتوفی ۱۵۸ھ کی خدمت کی تھی۔[۳]"

بالخصوص جب ثقہ مورخین کی تصریحات اس رائے کی تردید کر رہی ہوں،

ب۔ یہ یقینی ہے کہ کسی "ابن المقفع" نے ارسطاطالیسی منطق کی کچھ کتابوں کا ترجمہ کیا تھا، ابن الندیم کے علاوہ جس کا سالِ وفات غالباً ۳۸۰ھ ہے، الجاحظ بھی، جس کا سالِ وفات ۲۵۵ھ ہے کہتا ہے،

"فمتی کان رحمہ اللہ تعالیٰ ابن البطریق وابن ناعمہ وابوقرہ وابن فہر وابن وھیلی وابن المقفع مثل ارسطاطالیس۔[۴]"

---

[۱] التراث الیونانی ص ۵۰۱ [۲] ایضاً ص ۵۰۶ [۳] ایضاً ص ۵۰۷ [۴] کتاب الحیوان جلد اول ص ۳۰

اب الجاحظ سے سنیے کہ اس ابن المقفع کا مصداق کون ہے

وفی کتاب کلیلة و دمنة و کن کالنسر	کتاب کلیلہ و دمنہ میں ہے کہ ایسے گدھ کی طرح بن
حوله الجیف واتمکن کا لجیف حولها	جس کے چاروں طرف مردار ہو اور وہ مردار نہ بن
النسور، فاعترض علی توجمة ابن المقفع	جس کے چاروں طرف گدھ ہوں۔ ابن المقفع
بعض المتکلفین من فتیان الکتاب	کے اس ترجمہ پر نوجوان کاتبوں میں سے بعض تکلف
فقال انما کان ینبغی ان یقول ۵	کرنے والوں نے اعتراض کیا اور کہا کہ یوں کہنا چاہیے تھا۔۔۔

یعنی ابن المقفع وہی شخص ہے جو کلیلہ و دمنہ کا مترجم ہے۔ بالفاظ دیگر ارسطا طالیسی منطق کا مترجم ابن المقفع اور کلیلہ و دمنہ کا مترجم ابن المقفع شخص واحد ہیں۔

(باقی)

تابعین

علم و عمل اور مذہب و اخلاق میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور انکے تربیت یافتہ تابعین کرام رضی اللہ عنہم تھے، اور صحابہ کرام کے بعد ان ہی کی زندگی مسلمانوں کے لیے نمونۂ عمل ہے، اسلیے سیر الصحابہؓ کی تکمیل کے بعد دار المصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کیا ہے، اس میں حضرت عمر بن عبد العزیزؒ، حسن بصریؒ، حضرت اویس قرنیؒ، حضرت امام زین العابدینؒ، حضرت امام باقرؒ، حضرت امام جعفر صادقؒ، حضرت محمد بن حنفیہؒ، حضرت سعید بن مسیبؒ، حضرت سعید بن جبیرؒ، حضرت محمد بن سیرینؒ، حضرت ابن شہاب زہریؒ، امام ربیعہ رائیؒ، امام مکحول شامیؒ، قاضی شریحؒ وغیرہ ۹۶ اکابر تابعین کے سوانح، ان کے علمی، مذہبی، اخلاقی اور عملی مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے۔ (مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی)

ایران کے کتابخانے

از

جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب لکھنؤ یونیورسٹی

"ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر نذیر احمد صاحب گذشتہ سال ایران گئے تھے، کئی مہینہ وہاں قیام رہا۔ ناظرین معارف کے لئے وہ بہت سے علمی تحفے ساتھ لائے ہیں، جو بالاقساط آپ کی خدمت میں پیش ہوتے رہیں گے، پہلی قسط میں کتابخانہ مجلس شورای ملی تہران کے نوادر پیش کئے جاتے ہیں، امید ہے کہ اہل علم اس سے مستفید و مسرور ہوں گے" م

ایران کے مختلف حصوں میں چھوٹے بڑے شخصی و قومی کتابخانے پائے جاتے ہیں، لیکن ان میں بیشتر ایسے ہیں جن کی باقاعدہ فہرستیں نہیں ہیں، اس لئے اُن سے استفادہ مشکل ہے، ہو سکتا ہے اصفہان اور شیراز میں مجھے کوئی قابلِ ذکر خطی کتابوں کا کتابخانہ نہیں ملا، البتہ مشہد میں آستانۂ قدس رضوی کا کتابخانہ نہایت ہی قابلِ قدر اور اہم ہے، اس میں نوادر بڑی تعداد میں ہیں، تبریز میں بھی اچھے کتابخانے ہیں مگر بدقسمتی سے مجھے وہاں جانے کا اتفاق نہیں ہوا، البتہ تہران میں حسب ذیل اہم کتابخانے ہیں،

۱- کتابخانۂ مجلسِ شورائے ملی،

۲- کتابخانۂ مدرسۂ سپہ سالار و دانشکدۂ معقول و منقول،

۳- کتابخانۂ آقائے مشکاۃ

۴- کتابخانۂ ملی ملک متصل مسجد شاہ واقع محلہ بازار،

۵ - کتابخانۂ دانشگاہ ،

۶ - کتابخانۂ دانشکدۂ ادبیات ،

۷ - کتابخانۂ ملی ،

ان میں سے پہلے تین کتب خانوں کی مفصل فہرستیں شائع ہوگئی ہیں، اس لئے ان سے استفادہ آسان ہے، چوتھے کی قلمی فہرست موجود ہے جس کے مطالعہ کا پورا موقع ملا، اس لئے اس کے خصوصیات کی تفصیل بیان کیجا ئیگی، آستانۂ قدس رضوی (مشہد) کے کتابخانے کی مکمل فہرست پانچ جلدون میں شائع ہو چکی ہے، اس لئے اس کتبخانے کا تعارف کرانے مین بھی دشواری نہ ہوگی، باقی کتابخانون کے متعلق کچھ لکھنا نہایت دشوار ہے، اس لئے پانچ کتبخانوں کے حالات بالاقساط پیش کئے جائین گے،

کتابخانۂ مجلس شوریٰ | اس کتابخانے کا تعلق مجلس شوریٰ سے ہے، اور وہ مجلس ہی کی عمارت کے ایک حصے میں واقع ہے، کتابخانے کی اجمالی تاریخ یہ ہے کہ جن دنون جنگ بین الملکی کی وجہ سے مجلس شورائے ملی ایران کے کام معطل تھے، دو تین اہم اشخاص نے جو سیاست کے ساتھ علم و فرہنگ مین دستگاہ رکھتے تھے مرحوم کیخسرو شاہ رُخ (جو کاخِ بہارستان کے منتظم اور وہان کے امور کے متکفل تھے) سے مل کر یہ تجویز پیش کی کہ مجلس کے لئے ایک کتابخانہ قائم کیا جائے، اور اس کام کی ابتدا، اس طرح ہوئی کہ آقائے تقوی رئیس اوّل دیوان کشور کی رہنمائی مین حکیم مرزا ابوالحسن جلوہ کے کتابخانے کی دو سو جلدین خریدی گئین، اس کے بعد مخبر السلطنت آقائے مہدی علی ہدایت کے توسط سے تقریبًا ایک ہزار جلدین اعتصام السلطنت کے کتابخانے سے خرید کر ۱۳۰۲ھ مین کتابخانہ کا باقاعدہ قیام عمل مین آیا ۱۳۰۵ھ مین اس کی ایک فہرست شائع ہوئی جس میں ۳۵۰۰ مطبوعہ اور ۱۲۰۰ قلمی نسخے تھے، دس سال کے عرصہ یعنی ۱۳۱۱ھ مین کتابون کی تعداد تقریبًا بارہ ہزار ہوگئی جن مین ۸۰۰ نسخے قلمی کتابوں کے تھے، بہمن ماہ ۱۳۱۱ھ ہجری شمسی مین یوسف اعتصامی رئیس کتابخانہ (اعتصام الملک) نے ایک مفصل فہرست شائع کی جو ۴۰۰ صفحون پر مشتمل تھی

اس میں ۰۰۰، قلمی نسخوں کا کسی قدر تفصیلی بیان تھا، اس فہرست میں جلد اول کی ۲۱۷ قلمی کتابیں بھی شامل تھیں، اس طرح اگرچہ یہ دوسری فہرست ہے مگر قلمی نسخوں کی پہلی فہرست ہوئی، اس فہرست میں حسب ذیل ۲۹ عنوان قائم تھے:

عنوان	نسخے	عنوان	نسخے
مصاحف	۹ نسخے	طب	۴۰
ادعیہ واذکار	۱۲ ″	سیر و مناقب و تراجم احوال	۳۲
احادیث واخبار	۱۵ ″	اخلاق و نصائح و مواعظ	۲۰
فقہ	۱۷ ″	مجامیع	۵۲
تفسیر	۲۸ ″	عرفان و تصوف	۳۱
کلام	۲۳ ″	حکایات	۹
حکمت و فلسفہ	۴۳	جفر و فال	۷
ریاضی و نجوم و ہندسہ	۶۸	سفرنامہ	۱۲
تاریخ	۹۲	معرفۃ الاحجار و حیوان شناسی	۸
ادبیات	۴۳	ردود	۴
صرف و نحو و معانی و بیان	۱۱	صناعت	۲۳
دواوین و تذکرہ ہا	۱۳۹	مرقعات	۱۱
لغت	۳۱	کتب مختلفہ	۳۹

سنہ ۱۳۱۷ شمسی میں آقائے ابراہیم شرفی رئیس کتابخانہ کی کوشش سے صرف فارسی کی خطی کتابوں کی ایک دوسری فہرست شائع ہوئی، جو فہرست اول سے مفصل اور فنی اصول پر مرتب کی گئی تھی، اس کے جامع ابن یوسف شیرازی کا یہ کارنامہ قابل یادگار ہے، یہ تالیف ۱۵۸ صفحوں پر مشتمل ہے جس میں حسب ذیل

سات عنوان ہیں، آخر میں ۴ عنوانون کے ماتحت ایک انڈکس ہے، جو ۱۰ صفحوں پر مشتمل ہے، آخری عنوان ان تمام کتابوں کا حروفِ تہجی کے اعتبار سے ہے، جس کا اس فہرست میں تعارف کرایا گیا ہے،

		تا صفحہ	
۱-	تفسیر و کتب راجعۂ بقرآن کریم	تا صفحہ	۴۲
۲-	ادعیہ و اذکار	"	۵۶
۳-	احادیث و اخبار	"	۶۴
۴-	فقہ	"	۷۸
۵-	لغت	"	۱۲۲
۶-	بدیع، عروض، قافیہ، نحو، صرف، معما و غیرہ	"	۱۳۸
۷-	اشعار و تذکرہا و دیوانہا	"	۲۰۸

اس کتابخانے کی تیسری فہرست بھی تیار ہو چکی ہے جس کی ترتیب آقائے طباطبائی کے ہاتھون عمل میں آئی ہے، مگر اس کے چھپنے کی نوبت اب تک نہین آسکی ہے،

ذیل میں چند کتابون کا تعارف کرایا جاتا ہے،

فہرست اول | نمبر ۶۸ (ص ۳۰) رسالہ علم تجوید (فارسی) تالیف احمد بن حسین از اولاد بریر بن خضر ہمدانی، اس میں بارہ باب ہیں، اوراق ۳۱- تاریخ کتابت ۱۲۵۲ھ

۶۹ (ص ۳۲) کتاب الغرائب و العجائب (عربی)، تفسیر قرآن تالیف تاج القراء ابوالقاسم محمود بن حمزہ بن نصر، تالیف ۵۲۱ھ، کتابت ۹۲۰ھ مگر منقول عنہ ۶۷۵ھ کا نسخہ تھا، اوراق ۳۱۳،

۷۰ (ص ۳۳) الکشاف عن حقائق التنزیل (عربی) مجلد اول: تالیف مشہور مفسر جار اللہ ابوالقاسم محمود بن عمر زمخشری کی تفسیر (۴۶۷ - ۵۳۸ھ) اوراق ۳۹۵، سنہ کتابت ۸۸۲ھ کاتب عبدالمومن

ابن محمد بن الساک الحنفی نہایت عمدہ اور نفیس نسخہ ہے، اس کو سلطان محمد بن مراد خان (سلطان ترکی) نے خضر بن الفقیہ الیاس کو ہدیہ دیا تھا، جو بعد میں خضر کے لڑکے لطف اللہ کے پاس تھا، اول ورق پر اسکی تفصیل درج ہے، ان سطروں کے نیچے یہ عبارت ہے،

ھذا المجلد قد انتقل الی مع المجلد الثانی بالشراء الشرعی بعد وفاة المرحوم لطف اللہ المسطور من اختہ نفیسة بو کالة ابراھیم بن المرحوم ابن الشیخ جواد الذی کان مدرسا فی اسلامبول وسمرھا عبد اللہ بك الجزری بالف درھم عثمانی .... وانا الفقیر محمد علی الدفتر دار تومان تحریرا فی الیوم الخامس من شعبان سنة ثمان وسبعمائة

مگر تاریخ تملک یعنی ۷۰۸ھ غلط ہے کیونکہ مجلد دوم کے آخر میں سنہ کتابت ۸۶۰ھ صراحتہ درج ہے،

۱۷ - **الکشاف** (عربی) (ص ۳۴) تعداد اوراق ۳۱۰، مجلد چہارم، تاریخ کتابت ۶۶۶ھ

"شھر رمضان سنة ست وستین وستمائة علی ید الفقیر الی اللہ تعالی ...... الحسین بن العجمی الحلبی،

۱۸ - **الکشاف** (ص ۳۴) مجلد اول، تعداد اوراق ۲۲۳، تاریخ کتابت ۷۲۰ھ

تمت المجلدة الاولیٰ ...... یوم الثلثاء السابع والعشرین من ربیع الآخر الواقع فی المؤرخ لعشرین وسبعمائة علی ید العبد الضعیف الراجی رحمة ربہ اللطیف الحسن بن محمد بن علی بن اسفندیار الطبری" ایک جگہ اور ہے، فرغ من تحشیة المحتاج الی اللہ الحسن بن محمد عصر یوم السبت لسبع بقین من جمادی الاولیٰ الواقعة فی عشرین

وسبعمایة"

۵۔ "المختار من کتاب الاخبار" شرح و ترجمۂ قرآن مشتمل بر شانزدہ سورہ از فاتحہ تا النحل"
(فارسی) بہت نفیس و اہم نسخہ ہے شارح و مفسر کا نام معلوم نہیں
طرز تحریر کا اندازہ اس مثال سے ہو سکے گا۔

"واذ قلنا للملائکۃ اسجدوا لآدم فسجدوا الا ابلیس ابی و
استکبر وکان من الکافرین .... آوردہ اند کہ ابلیس وقتی بآدم رسید گفت
ای آدم بدانک ترا درسپید داوند ما را سیاہ نغرہ مشو کہ مثال ما ہمچنان ست کہ باغبانی
درختی باذام نشاند در باغ و باذام برآید ...... آن باذام را ببرزد و بفروشند، یکی را مشتری خداوند
شاذی باشد آن را باشکر آمیزد یکی را مشتری خداوند مصیبت آن باذام را سیاہ کند و بر سر توبت
ریزد اکنون تو آنی و ما این اما باید کی دانی کی باغبان یکی است و آب از یک جوی خوردہ ایم
ذوالنون مصری گفت در بادیہ بودم ابلیس را دیدم کی چہل روز سر بسجود نہادہ بود کہ برداشت
گفتم ای مسکین بعد از بیزاری و لعنت این ہمہ عبادت چیست گفت ای ذوالنون اگر
من از بندگی معزولم او از خداوندی معزول نیست عبداللہ تستری گفت ابلیس را در
بادیہ دیدم گفتم چرا سجود نکردی گفت ای سہل بگذار مرا اگر ست حضرت راہی باشد
گوی چون این بیچارہ ونمی خواہی بہانہ بردی چہ نہی ای سہل ہمین ساعت بر سر خاک
آدم بودم ہزار بار آنجا سجدہ بردم و خاک ... بر دیدہ نہادم عاقبت نداشتیدم کہ لا تقرب
فتستانزین (ختم)۔ کتابت ۷۰۰ اور ۷۵۰ کے درمیان ہوئی ہوگی۔

۶۔ "مفاتیح الاسرار و مصابیح الابرار" تفسیر قرآن تصنیف ابو الفتح محمد بن عبدالکریم شہرستانی
(عربی۔ ص ۳۹) صاحب کتاب الملل والنحل و نہایۃ الاقدام وغیرہ

شہرستانی کی تالیفوں میں اس کتاب کا نام نہیں ملتا "از قرار یکہ در پشت صفحۂ اول از خط مصنف نقل شدہ شہرستانی در ۵۳۸ھ این تفسیر ابتدا کردہ است این کتاب فقط مخصوص شرح سورۃ الفاتحہ و البقرہ است"

"تاریخ کتابت ۶۶۷ھ۔ کاتب محمد بن محمد زنجی ابراہیم بن محمد بن المؤید ابو المجامع الحموی الجوینی کے لئے یہ نسخہ لکھا گیا، اوراق = ۴۳۳۔

۹۳۔ **شرح طوالع الانوار** (عربی ص ۴۶) طوالع الانوار مؤلفہ قاضی بیضاوی (متوفی ۶۸۵ھ) کی شرح، شارح کا نام معلوم نہیں ہوا، سنہ کتابت ۸۴۴ھ، اوراق = ۱۷۰۔

۱۰۳۔ **مطالع الانظار** (عربی ص ۵۲) شرح طوالع۔ شارح ابو الثنا شمس الدین محمود بن عبد الرحمن بن احمد اصفہانی نے ابو المعالی محمد بن سنقر سیف الدین ابو الفتح قلاؤن کے لئے لکھی تھی، اوراق = ۲۰۳ تاریخ کتابت ۷۳۵ھ

۱۱۱۔ **التحصیل** (عربی ص ۵۵) منطق و طبیعیات میں ابو الحسن بہمنیار بن مرزبان آذر بائیجانی شاگرد ابن سینا صاحب کتاب مراتب الموجودات و کتاب البہجۃ و السعادۃ کی تصنیف ابن فندق بیہقی نے تتمہ صوان الحکمۃ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اس میں تین حصے ہیں حصہ اول منطق میں ہے باقی دو حصے ما بعد الطبیعہ وغیرہ پر مشتمل ہے، اوراق = ۱۵۴

۱۱۲۔ **ترجمہ مجمل الحکمۃ** (فارسی ص ۵۷) ترجمہ خلاصہ رسائل اخوان الصفا بفارسی از رسالہ اول منطقی تا باب ۱۳ در سبب پیدا آمدن معدنیات تاریخ کتابت ۷۶۶ھ اوراق = ۱۰۰، اخوان الصفا کے فارسی ترجمہ ۶۸۶ھ کا لکھا ہوا شمارہ ۹۰ کے ذیل میں بیان ہوا ہے۔

۱۱۴۔ **التلویحات** (عربی ص ۵۸) منطق و طبیعیات میں تالیف شہاب الدین سہروردی (قتل ۵۸۷ھ) وفات کے ۲۲ سال بعد کا نسخہ (نوشتہ بتاریخ ۶۰۹ھ) [illegible]

وسبعمایۃ"

۷۵ - المختار من کتاب الاخبار" شرح و ترجمۂ قرآن مشتمل بر شانزدہ سورہ از فاتحہ تا النحل" (فارسی) | بہت نفیس و اہم نسخہ ہے، شارح و مفسر کا نام معلوم نہیں،

طرز تحریر کا اندازہ اس مثال سے ہو سکے گا۔

"واذ قلنا للملائکۃ اسجدوا لآدم فسجدوا الا ابلیس ابی و استکبر و کان من الکافرین .... آوردہ اند کہ ابلیس وقتی بآدم رسید و گفت اے آدم بدانک ترا دو سے سپید دادند و ما را سیاہ غرہ مشو کہ مثال ما ہمچنان ست کہ باغبانی درختی بادام نشاند در باغ و بادام برآید ...... آن بادام را بہ زر بفروشند، یکے را مشتری خداوند شادی باشد آن را با شکر بیامیزد یکے را مشتری خداوند مصیبت آن بادام را سیاہ کند و بر تربت و ریزد اکنون تو آنی و ما این اما باید کی دانی کی باغبان یکے است و آب از یک جوی خوردہ ایم ذو النون مصری گفت در بادیہ بودم ابلیس را دیدم کی چہل روز سر بسجود نہادہ بود کہ بر داشت گفتم اے مسکین بعد از بیزاری و لعنت این ہمہ عبادت چیست گفت اے ذو النون اگر من از بندگی معزولم او از خداوندی معزول نیست ابلیس علیہ اللعنۃ گفت ابلیس را در بادیہ دیدم گفتم چرا سجود نکردی گفت اے سہل بگذار مرا اگر ست بحضرت مرا چی باشد گوے چون این بیچارہ نمی خواہی بہانہ بردی چہ نہی اے سہل ہمین ساعت بر سر خاک آدم بودم ہزار بار انجا سجدہ بردم و خاک تربدوی بر دیدہ نہادم عاقبت نداشنیدم کہ لا تتعب فلسنا نرید کے" کتابت ۷۰۰ اور ۷۵۰ کے درمیان ہوئی ہوگی۔

۷۶ - مفاتیح الاسرار و مصابیح الابرار (عربی ۔ ص ۳۹) | تفسیر قرآن تصنیف ابو الفتح محمد بن عبد الکریم شہرستانی صاحب کتاب الملل والنحل و نہایۃ الاقدام وغیرہ

شہرستانی کی تالیفوں میں اس کتاب کا نام نہیں ملتا "از قراریکہ در پشت صفحۂ اول از خط مصنف نقل شدہ شہرستانی در ۵۳۸ھ این تفسیر ابتدا کردہ است، این کتاب فقط مخصوص شرح سورۃ الفاتحہ والبقرہ است" تاریخ کتابت ۶۶۷ھ۔ کاتب محمد بن محمد زنجی، ابراہیم بن محمد بن المؤید ابوالمجامع الحموی الجوینی کے لئے یہ نسخہ لکھا گیا، اوراق = ۴۳۳۔

۹۳۔ شرح طوالع الانوار (عربی ص ۴۶) — طوالع الانوار مؤلفہ قاضی بیضاوی (متوفی ۶۸۵ھ) کی شرح۔ شارح کا نام معلوم نہیں ہوا، سنہ کتابت ۸۴۴ھ۔ اوراق = ۱۷۰۔

۱۰۳۔ مطالع الانظار (عربی ص ۵۷) — شرح طوالع۔ شارح ابوالثنا شمس الدین محمود بن عبدالرحمن بن احمد اصفہانی نے ابوالمعالی محمد بن سلطان سیف الدین ابوالفتح قلاوون کے لئے لکھی تھی۔ اوراق = ۲۱۳، تاریخ کتابت ۷۳۵ھ

۱۱۱۔ التحصیل (عربی ص ۹۸) منطق و طبیعیات میں ابوالحسن بہمنیار بن مرزبان آذربائجانی شاگرد ابن سینا صاحب کتاب مراتب موجودات و کتاب البہجۃ والسعادۃ کی تصنیف ابوالحسن بیہقی نے تتمہ صوان الحکمۃ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اس میں تین حصے ہیں حصہ اول منطق میں ہے، باقی دو حصے مابعد الطبیعہ وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ اوراق = ۱۵۴

۱۱۲۔ ترجمہ محک الحکمۃ (فارسی ص ۵۷) ترجمہ خلاصہ رسائل اخوان الصفاء بفارسی از رسالہ اول ارثماطیقی تا باب ۱۳ در سبب پیدا آمدن معدنیات۔ تاریخ کتابت ۶۶۶ھ، اوراق = [illegible]۔ اخوان الصفاء کا ایک فارسی ترجمہ ۶۷۰ھ کا لکھا ہوا شمارہ ۹۴ کے ذیل میں بیان ہوا ہے۔

۱۱۴۔ التلویحات (عربی ص ۸۵) منطق و طبیعیات میں تالیف شہاب الدین سہروردی (مقتول ۵۸۷ھ) وفات کے ۲۲ سال بعد کا نسخہ (نوشتہ تاریخ ۶۰۹ھ در بغداد [illegible] طبیعیہ روم)

بت اہم ہے، اوراق ۱۵۰ =

۱۱۷ - الجمع بین رأئی افلاطون و ارسطو (عربی ص ۵۹) — مقالہ محمد بن محمد بن طرخان ابو نصر فارابی متوفی ۳۳۹ھ، قفطی نے تاریخ الحکماء میں اس تالیف کا ذکر کیا ہے

نسخہ ناتمام عدۂ اوراق = ۶۴

۱۴۳ - الشفاء (عربی ص ۷۲) — ابن سینا کی "شفا" کا نہایت اہم نسخہ ہے، اس کا کاتب علی بن فتح اللہ المعدانی الاصفہانی الشہیر بالصابری ہے، سنہ کتابت ۱۰۸۴ھ اوراق = ۱۷۴

۱۴۹ - ارشاد اسطرلاب (فارسی - ص ۸۰) — تالیف ناصر الدین احمد بن محمد شیرازی ۵۰ باب ہیں، اوراق ۳۹ - نہایت قدیم نسخہ ہے، تاریخ کتابت ۷۰۳ھ

۱۵۱ - استیعاب الوجوہ الممکنۃ فی صنعۃ الاسطرلاب (عربی ص ۸۱) — تالیف ابو ریحان بیرونی، مشتمل بر جلد اول و دوائر، اس کے ساتھ ایک اور کتاب "منہج الطلاب فی عمل الاسطرلاب" شامل ہے، اس کا مؤلف ملک اشرف عمر بن ملک مظفر یوسف بن عمر، سلطان یمن ابراہیم بن محمود و اجلاد انوصلی جو اس فن کا استاد تھا، اُس نے اس کتاب پر تقریظ لکھی تھی، (۶۸۹ھ میں) تاریخ کتابت ۸۰۴ھ اوراق = ۱۴۴

۱۷۴ - رسائل در احکام نجوم (عربی ص ۹۴) — ادوار کواکب و بروج و اختیارات و استخراج کے بارے میں تالیف احمد بن محمد بن عبد الجلیل سجزی - محمد قزوینی نے حواشی چہار مقالہ میں اس کے نسخوں کی تفصیل دی ہے، (ص ۱۹۹ - ۲۰۱) اوراق ۱۱۹ - اس میں

۱۸۱ - زیج (فارسی ص ۹۰) — اول اور آخر سے ناقص ہے، مؤلف کا نام معلوم نہیں، لیکن جداول اوساط کواکب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جدول اول سال ۶۰۰ھ یزدگردی (۶۲۹ھ)

سے متعلق ہیں، آخر کتاب کے حاشیہ میں طبرک کے مراصد کے بارے میں یہ عبارت پڑھی جاتی ہے، "از آل بویہ فخر دولہ …… دری کہ او را رصد فرمود شیت کوہ طبرک را صد حامد بن خضر خجندی" حامد خضر خجندی ابو محمود منجم فخر الدولہ دیلمی کا معاصر ہے، جس نے آلت رصدی "سدس فخری" کو اس کے نام سے اختراع کیا تھا،

۱۸۳ - **زیج جامع سعیدی** (فارسی ص ۱۰۰) در تنقیح زیج ایلخانی خواجہ نصیر الدین طوسی، تالیف رکن الدین بن شرف الدین حسینی آملی - مولف اس طرح لکھتا ہے،

"چون بعد از مراجعت سفر ہندوستان در دار السلطنت ہرات از تصنیف پنجاہ باب سلطانی در کلیات اعمال و معرفت اصطرلاب فارغ شدہ بپایۂ سریر سلطنت حضرت با رفعت امیرزادۂ اعظم اعدل ابوالقاسم بابر بہادر خان خلد اللہ تعالیٰ ملکہ گذرانیدم و بعد از عنایت و مرحمت بسیار اجازت نمودیم بجانب سمرقند و حکایت رصد جدید در میان آمد"

یہ زیج سلطانی ابوسعید گورگان کے نام پر ۸۶۲ھ میں مرتب ہوئی، تاریخ کتابت ۸۶۹ھ اوراق = ۳۹ -

۱۸۴ - **الزیج السلطانی** (فارسی ص ۱۰۱) یہ زیج یا تو قطب الدین شیرازی متوفی ۷۱۰ھ یا شمس الدین بخارائی کی تالیف ہے، یہ نسخہ بہت قدیم ہے، اوراق ۲۴۳

۱۸۷ - **سر الاسرار فی حقیقۃ التسییر کیفیۃ الاستمرار** (عربی ص ۱۰۴) تالیف ابوالقاسم علی بن احمد بلخی معاصر سلطان محمود، اس کتاب کا موضوع تنجیم سلطان محمود غزنوی سے منسوب اگرچہ اس نسخہ پر کتابت کی تاریخ درج نہیں ہے، پھر بھی اہم نسخہ ہے، اوراق ۱۱۹ -

۱۹۴ - **شرح الملخص** (عربی ص ۱۰۶) "الملخص فی الہیئت" کا مؤلف محمود جغمینی خوارزمی [illegible] قاضی زادہ رومی اور مولوی عبد الحکیم نے اس کی شرح کی ہے، زیر بحث شرح کا مؤلف محمد بن محمد مشتہر بہ

ب ہی جس نے اپنے قلم سے یہ نسخہ قاضی القضاۃ کے لئے لکھا تھا، تاریخ تالیف ۔۔۔ اور تاریخ اتمام شرح

۔۔۔ بہت اہم نسخہ ہے، اوراق = ۸۰،

۱۹۶ - صور الکواکب (فارسی ص ۱۰۷،) مشہور منجم ابوالحسین عبدالرحمن بن عمر صوفی رازی (۲۹۱ھ - ۳۷۶ھ) کی تالیف صور الکواکب ہے، زیر نظر کتاب اسی

ترجمہ ہے جس کو مترجم نے اپنے بعض دوستوں کے اصرار سے فارسی کا جامہ پہنایا تھا، تاریخ کتابت

۔۔۔ عدہ اوراق ۲۱۳

۲۰۲ - کیہان شناخت (فارسی ص ۱۱۲) علم ہیئت کا اہم ترین رسالہ عین الزمان ابو علی حسن بن

قطان مروزی (۴۶۵ھ - ۵۴۸ھ) کی تالیف ہے، مؤلف رشید الدین وطواط کا ہم عصر تھا سبب

یف کے سلسلہ میں لکھتا ہے،

"چون کرامیش مردمان بہ ستارہ شناختن کہ او را علم نجوم گویند پیوستہ دیدم و بہا در وی بستہ

دیدم و کتابہاے کہ استادان ایں دانش ساختہ اند، از بہر نوآموزان ۔۔۔۔۔ بسیار دیدم سخن

دراز و زیادت از آنکہ فہم نوآموزان دریابد و سخن کوتاہ و کم از آن کہ بندہ باشد این چند سخن فراز

آوردم کوتاہ و آسان تا چون کسی خواہد کہ ازین ہنر بہرہ گیرد این پایہ را آسان تواند دریافتن"

ابوالحسن بیہقی نے تتمہ صوان الحکمۃ میں اور سیوطی نے طبقات اللغویین والنحاۃ میں مؤلف کے تفصیلی

ات کے ساتھ اس کتاب کا ذکر کیا ہے، "کیہان شناخت" تین فصلوں پر مشتمل ہے فصل اول در بیان

ال عالم علوی، فصل دوم در بیان عالم سفلی، اور فصل سوم در گذشتن روزگار،"

"تاریخ تالیف ۵۹۶ تا ۵۰۰ھ تاریخ کتابت نسخہ اصل ۵۰۷ تاریخ نقل این نسخہ ۱۳۲۴ھ

راق - ۶۷، اس نسخہ کی عبارت قابل غور ہے،

"کتاب کیہان شناخت لخزانۃ کتب الامیر الاسفہسالار الاجل

(معا

الکبیر العالم العادل المؤید المظفر المنصور حسام الدنیا والدین رکن

الاسلام والمسلمین .... الملوک والسلاطین سید الامراء ابی

الحسن علی بن عمر بن علی اطال اللہ بقائہ "

۲۱۰ - مجموعہ (عربی ص ۱۰۱) تین کتابوں پر مشتمل از مولفات محی الدین یحییٰ بن محمد بن ابی الشکر مہندس مغربی اندلسی (۱) المدخل مفید (۲) غنیۃ المستفید فی الحکم علی الموالید (۳) تحویل سنی العالم نہایت قدیم نسخہ ہے، تعداد اوراق ۳۰۹،

۲۱۳ - اکبر نامہ (فارسی ص ۱۴۲) ابو الفضل کے اکبر نامہ کا اچھا نسخہ ہے تاریخ کتابت ۱۰۲۳ھ، اوراق ۴۱۳،

۲۵۶ - روضۃ الطاہرین (فارسی ص ۱۴۲) عام تاریخ ہے، جو ابتدا سے لیکر صفویہ تک حالات پر مشتمل ہے اس کے مولف طاہر بن محمد حسین سبزواری نے اکبر شاہ کے نام معنون کیا ہے، نسخہ ناتمام اوراق ۴۰۰،

۲۷۸ - الامالی (عربی ص ۱۵۰) لفظ امالی املیہ کی جمع ہے اور لغت میں اقوال اور بیانات لکھنے کے معانی میں آتا ہے لیکن اصطلاح ادب میں ایسے مباحث و مسائل کو کہتے ہیں جن کو کوئی بڑا بحر عالم بیان کرتا ہے، اور حاضرین مجلس بغیر کسی بیشی کے اس کو لکھ لیتے ہیں، زیر نظر نسخہ امام علم الہدی سید مرتضیٰ اور ابو القاسم علی بن الحسین الموسوی (متوفی ۴۳۶ھ) پر مشتمل ہے، یہ نسخہ نہایت قدیم ہے، کتابت کا سنہ درج ہے، حیدر بن محمد یار بن الحسین الشبیتی نے ۵۸۹ھ کے ماہ صفر میں اس کو لکھا تھا،

۲۸۰ - ترجمہ کشکول (فارسی ص ۱۵۹) احمد شہید عاملی نے سلطان ابو عبد اللہ قطب شاہ کے حکم سے شیخ بہائی کے کشکول کو فارسی میں منتقل کیا تھا، تاریخ کتابت ۱۰۸۰ھ اوراق ۴۰۶،

۲۰۱ - التمثیل والمحاضرہ (ع ص ۱۵۹) تالیف ابو منصور ثعالبی (۳۵۰ - ۴۲۹) صاحب یتیمۃ الدہر

وغیرہ اس میں چار فصلیں ہیں (۱) در بحل ونمونۂ کتاب (۲) در اقوال طبقات مردم (۳) چیزہا سے کہ غالباً بانہا تمثیل می شود (۴) درفنون واغراض، یہ کتاب شمس المعالی قابوس وشمگیر کے نام لکھی گئی، تاریخ کتابت ۱۰۲۰ھ اوراق ۴۴

۲۹۴ - کتاب الصید والقنص | فن شکار پر ایک اہم تالیف ہے، مگر اس کے مؤلف کا تعین نہ ہو سکا، آغاز:
(عربی ص ۱۶۹)

"الحمد للہ الذی انشأ الموجودات بحکمتہ واخترع الاشیاء بقدرتہ خلق السموات والارض واللیل والنہار"

صفحۂ اول قلم جدید ہے، کتاب کرم خوردہ اور ۱۶ باب پر مشتمل ہے، ایک جگہ معتضد باللہ خلیفہ عباسی کے اشتیاق جنگ وشکار کو نقل کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف المعتضد باللہ عباسی (۲۷۹-۲۸۹) کا معاصر ہے، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف ابوبکر محمد بن یحییٰ صولی شطرنجی (متوفی ۳۳۶ھ) ادیب مشہور کا معاصر تھا،

یہ نسخہ شوال ۶۱۱ھ ہجری میں لکھا گیا، خط نسخ آمیختہ بہ ثلث ہے، کل اوراق کی تعداد ۲۴۸ ہے، نہایت نفیس وقابل مطالعہ ہے۔

۳۰۰ - مجمع البلاغہ (عربی ۱۵۱) فصیح جملوں اور بلیغ کلموں کے مترادفات سے متعلق ہے، مؤلف کا نام معلوم نہیں، بظاہر نایاب وروزگار نسخہ ہے، اس موضوع پر جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں ان سے متقدم ہے، اور شاید سب کی بنیاد اسی کتاب پر ہوگی، مثلاً عبدالرحمن بن عیسیٰ بن حماد ہمدانی کی تالیف الالفاظ الکتابیۃ، ابن سکیت کی کتاب الالفاظ المترادفۃ و تھذیب الالفاظ، ثعالبی کی فقہ اللغۃ اور شیخ ابراہیم یازجی کی نجعۃ الرائد فی المترادف والمتوارد، اس کتاب میں ۱۲ فصلین (حدیں) ہیں،

(۱) حدّ العقل وضدّہ، (۲) حدّ المنطق (۳) حدّ الاسماء والرفقۃ والاخلاق (۴) حدّ المال والرغبۃ فیہ (۵) حدّ العطاء والاستعطاء (۶) حدّ الحرب وارباتھا (۷) حدّ المودّۃ وانواعھا (۸) حدّ الحسن والقبح والشباب والشیب (۹) حدّ القرابۃ وشرف الابوۃ (۱۰) حدّ المطعوم (۱۱) حدّ النکاح والطلاق (۱۲) حدّ المشی و المفاوز (۱۳) حدّ التقوی والزھد (۱۴) حدّ السماء (۱۵) حدّ الحیوان (۱۶) حدّ فنون مختلفہ،

نسخہ کا پہلا حصہ غائب ہے، دوسرا صفحہ اس طرح شروع ہوتا ہے :-

"نفر انتخبتھا وما انتھیت الیہ من اعلام خبر اقتضبتھا وجمعتھا وما وجدت فی کلام البلغاء من لفظ یعد فی السحر الحلال والعذب الزلال" الخ "حدّ العقل" اس طرح شروع ہوتی ہے کہ

"عقل وحجول ومعقول وحجیٰ ونھیٌ وحصاۃ واصاۃ"

"یہ نسخہ ذی الحجہ ۳۰۵۵ھ کا ترجمہ ہے، اوراق ۱۵۶-

۳۱۰- الکافیۃ النحویۃ (عربی ص ۱۸۵) علم نحو کا یہ مختصر رسالہ جو المقدمۃ الکافیۃ فی النحو و کافیۃ ذوی الادب فی علوم کلام عرب کے نام سے بھی موسوم ہے جمال الدین ابو عمرو عثمان بن عمر مالکی معروف با بن حاجب متوفی ۶۴۶ھ کی تصنیف ہے، جس پر متعدد متبحر علمانے شرحیں اور حاشیے لکھے ہیں، زیر نظر نسخہ بہت نفیس اور اپنی قدامت و مذہب وغیرہ کے لحاظ سے بے نظیر ہے اس کا کاتب یاقوت مستعصمی ہے، اور سنہ کتابت ۶۹۰ھ، اوراق ۴۲،

۳۲۰- المصباح (عربی ص ۱۸۰) درعلم معانی وبیان، شرح سید شریف جرجانی (متوفی ۸۱۶ھ) بر قسمت سوم کتاب مفتاح العلوم سراج الدین سکاکی (متوفی ۶۲۶ھ) تاریخ

تالیف ۱۰۰۳ھ، تاریخ کتابت ۱۰۲۶ھ،

۲۲۷ - تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی (فارسی - ص ۱۹۱)	بتصریح براؤن یہ کتاب ۸۹۶ھ میں لکھی گئی لیکن اس نسخہ پر سال کتابت ۸۹۲ھ ہجری درج ہے، بہرحال

نہایت قدیم و اہم نسخہ ہے،

۲۲۸ - تیمور نامۂ ہاتفی (فارسی ص ۱۹۲)	ہاتفی کی وفات ۹۲۷ھ میں ہوئی اور یہ نسخہ ۹۵۷ھ کا ہے، اسی کا ایک دوسرا نسخہ دوسری جلد میں بشمارہ ۵۰۹ بیان ہوا ہے،
۲۲۴ - خلاصۃ الاشعار و زبدۃ الافکار (فارسی ص ۱۹۵)	میر تقی الدین محمد بن شرف الدین علی حسینی کاشانی کے اہم تذکرہ کا نہایت عمدہ نسخہ جو مصنف کی حیات ہی میں

سنہ ۱۰۱۲ھ میں لکھا گیا، دراصل نسخہ ہذا خاتمۂ خلاصۃ الاشعار کے جزو اول پر مشتمل ہے یعنی اس حصہ کی ۱۱۱۲ فصلوں میں سے صرف ۲ فصلیں اس میں ہیں، اوراق = ۶۱۴، (باقی)

جلوۂ صد رنگ

(جناب حبیب احمد صاحب صدیقی سکریٹری اترپردیش گورنمنٹ کا مجموعۂ کلام)

اس میں مصنف کے اگست ۱۹۴۸ء تک کا سارا کلام تاریخ وار آ گیا ہے، پہلے غزلیات ہیں جن کی تعداد ۹۰ ہے، اس کے بعد نظمیں ہیں، پہلی نظم گاندھی جی کی وفات پر ہے، پھر متفرق اشعار ہیں، اور ہر شعر حسن و عشق کی ایک مستقل روداد ہے،

پتہ

دار المصنفین - اعظم گڈھ

"منیجر"

اسلامی تصوّف کا نظری اور عملی پہلو

از جناب گوپی چند صاحب نارنگ ایم اے

اسلامی تصوف دراصل قلب وروح کے تزکیہ اور اخلاص فی العمل کا نام ہے، اس حیثیت سے وہ شریعت سے کوئی الگ چیز نہیں، بلکہ اسکی ظاہری تکمیل کے ساتھ اس کی معنوی تکمیل ہی کا نام تصوف ہے، اس کے علاوہ اور جو کچھ ہے وہ سب زوائد یا کیفیات ہیں، اس مضمون میں مضمون نگار نے دونوں کو خلط ملط کر دیا ہے، اور اسلامی تصوف کے اصلی ترجمان شیخ ابونصر سراج، شیخ علی ہجویری، شیخ ابوالقاسم قشیری، شیخ شہاب الدین سہروردی اور امام غزالی وغیرہ کی تصانیف کے بجائے سید امیر علی، ڈاکٹر عابد حسین، مارگریٹ اسمتھ نکلسن اور تاراچند کی کتابوں سے اسلامی تصوف کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جس سے اسکی اصلی شکل نظر نہیں آسکتی، تاہم وہ بھی ایک مسلک کا ترجمان ہے، اس لیے اس کو شائع کیا جاتا ہے۔ "م"

دنیا کے تقریباً ہر مذہب میں وجدانی اور ماورائی رجحان کم وبیش ضرور پایا جاتا ہے لیکن نسل اور افراد کی خصوصیات کی بنا پر اس رجحان کا رنگ ہر جگہ جدا ہے کہیں یہ عنصر مذہب کی تہوں میں نہاں ہے اور کہیں نمایاں، اسلامی تصوف کی انفرادی شان یہ ہے کہ اسلام کی حدوں میں رہتے ہوئے یہ بذات خود ایک مکمل اور باضابطہ نظام مذہب ہے، اسلامی تصوف سے مراد وہ ریاضت اور مجاہدات ہیں، جو قلب کے پردے ہٹائیں اور حقائق کا انکشاف کردیں، اس کی ابتدا زہد وتقویٰ سے ہوئی، اس زمانے میں قرآن کے ظاہری معنوں پر زور دیا جاتا تھا، اور شریعت کی پابندی سختی سے کی جاتی تھی، رفتہ رفتہ کچھ بیرونی اثرات سے اور

کچھ نئے تہذیبی اور تاریخی تقاضوں کی وجہ سے مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا جو قرآن کے مخفی معنوں پر زور دیتے ہوئے اس کی تاویل نئے ڈھنگ سے کرنے لگا، یہ لوگ ایک طرف شرعی پابندیوں کے اور دوسری طرف عقلی دلائل کے خلاف تھے[۱] اور مذہب کا سرچشمہ قلب و روح کو قرار دینے لگے، "باطنیت کے اس بڑھتے ہوئے رجحان نے خدا کی ماورائیت کے تصور سے ملکر بہت جلد سارے اسلام کو اپنے رنگ میں رنگ لیا، اسلام کی اسی بنیادی خصوصیت کو تصوف کہا جاتا ہے۔ تصوف نے اسلام کی دینی، عقلی اور شعوری تالیف میں خاص حصہ لیا ہے، مشرق میں اسلامی تصوف کے سب سے بڑے نمایندے امام غزالی (ف ۱۱۱۲ء) اور مغرب میں ابن طفیل[۲] (ف ۱۱۸۵ء) کو مانا جاتا ہے،

تصوف مسلمانوں کے نزدیک مذہب کے باطنی پہلو کا نام ہے، مذہب کے اصول خصوصاً توحید الٰہی کو تقلیداً اور اعتقاداً قبول کرنا عام لوگوں کے لیے کافی ہے، لیکن جو لوگ روحانی تکمیل کے خواہش مند ہیں، وہ اس مرحلے سے آگے بڑھ کر اس منزل پر پہنچنا چاہتے ہیں، جہاں توحید کا تصور ان کے لیے بدیہی مشاہدہ اور قلبی واردات بن جائے[۳]

اس منزل تک پہنچنے کے لیے جو لائحۂ عمل مرتب کیا گیا ہے، اس کی بنیاد ان چار اصولوں پر رکھی گئی ہے۔[۴]

(۱) حقیقت کے راز کو عقل کی مدد سے نہیں جان سکتے، صداقت کی تلاش کے لیے عقلی علم بیکار ہے، اس کے لیے حضوری علم چاہیے، جو منطق یا ریاضی کے اصولوں سے نہیں، بلکہ حسِ باطنی یا وجدان کے ذریعہ ممکن ہے،

---

۱ امیر علی Spirit of Islam [illegible] ۲ معارف: ابن طفیل تو فلسفی تھا، مغرب میں تصوف کے سب سے بڑے نمایندے حضرت شیخ محی الدین ابن عربی ہیں ۳ ڈاکٹر عابد حسین، ہندوستانی قومیت ص ۲۰۱

(۲) انسان اشرف المخلوقات ہے، وہ اگر باطن کی طرف رجوع کرے تو اسے احساس ہوگا کہ اس حقیقت کو جاننے کی تڑپ ہے، یہ وہ چنگاری ہے، جو "ابدی شعلہ" میں ضم ہوجانا چاہتی ہے، اس کا سراغ قلب میں ملتا ہے، اس لیے صوفی کو قلب کی طرف رجوع کرنا چاہیے، یہی وہ مقام ہے جہاں دیدار محبوب سے چشم باطن روشن ہوسکتی ہے،

(۳) معرفت کے لیے ریاضت اور مجاہدہ ضروری ہے، خود غرضی، لذتیت اور عیش کوشی سے روح ملوث ہوجاتی ہے، مادی لذتوں کے قید و بند سے آزاد ہوکر ہی حقیقت کو بے حجاب دیکھ سکتے ہیں،

(۴) خدا سے تعلق حب الٰہی کی بنا پر ہونا چاہیے، محبت ایک جذبہ ہے، اور معرفت کیفیت ہے، جذبہ سے کیفیت تک ایک قدم ہے، محبت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فرد محبوب کے جلوۂ حسن میں جذب ہوکر خود کو فراموش کر جاتا ہے، حب الٰہی صوفی کا ضابطہ ہے، وجدان اس کا مدعا ہے، اور معرفت اس کا منتہا ہے، بقول ہجویری محبت معرفت کی طرف لیجاتی ہے، اور معرفت، وصال محبوب[۱]

نظری پہلو صوفیوں کے مختلف گروہ اور سلسلے ہیں، اور ان سب کے اپنے اپنے جداگانہ نظام ہیں جو ایک دوسرے سے کم وبیش مختلف ہیں لیکن مقصد سب کا ایک ہی یعنی قلبی واردات کے ذریعے خدائے واحد کی معرفت حاصل کرنا بعض گروہوں میں اختلاف کی بنا پر تعریف توحید کا مسئلہ ہے، اس مسئلہ میں دو نظریے ہیں: وحدت وجود، اور وحدت شہود، تصوف میں روحانی تکمیل کی معراج وہ مقام ہے جہاں طالب مشاہدۂ حق میں اس قدر محو ہوتا ہے کہ اسے اپنی انفرادیت کا احساس نہیں رہتا، یہاں شاہد و مشہود کی دوئی مٹ جاتی ہے، اور صرف شہود ہی شہود باقی رہ جاتا ہے یہاں تک دونوں میں کوئی اختلاف نہیں، اختلاف اس کیفیت یا حال کی تعبیر سے پیدا ہوتا ہے

---

[۱] Medieval Islam, Grunebaum ص ۱۳۵

یعنی اسے تصورات کے ذریعے سمجھانے یا الفاظ کے ذریعے ظاہر کرنے کے دو مختلف نظریے ہیں پہلے گروہ کے صوفیہ اس "احساس وحدت کو حقیقی سمجھ کر اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وجود درحقیقت ایک ہی ہے یعنی ذات باری تعالیٰ کا، اس کے سوا جو کچھ بھی نظر آتا ہے، مثلاً انسان اور کل کائنات، وہ کچھ بھی نہیں اور اسی وجود مطلق کی محدود صورتوں کی نمود ہے۔... محدود کا تعینات کی قید سے آزاد ہو کر مطلق میں محو ہو جانا جو اسکے نمود انفرادی کی فنا اور وجود حقیقی کی بقا ہے، زندگی کا اعلیٰ مقصد اور صوفی کی جد وجہد کا منتہا سمجھا جاتا ہے[1]،

لیکن دوسرے گروہ کا بیان ہے کہ "شہودی وحدت، وجودی وحدت پر دلالت نہیں کرتی، اس میں شک نہیں کہ صوفی کو اجتماع خیال یا افراط محبت کی وجہ سے مشاہدے کے وقت یہی معلوم ہوتا ہے کہ شاہد و مشہود میں وجود کا فرق مٹ گیا ہے، مگر یہ مقام قلب معرفت کی آخری منزل نہیں بلکہ درمیانی منزل ہے، جو لوگ اس سے آگے بڑھنے میں کامیاب ہوتے ہیں، ان پر یہ حقیقت کھلتی ہے، کہ انسان اور خدا کا اتحاد وجودی نہیں بلکہ نسبتی ہے۔ خدا بہ حیثیت خالق کے مخلوق سے جدا ہے، مگر اپنے آپ کو مخلوق کے اندر ظاہر کرتا ہے، جیسے مصور اپنی ذات کو تصویر میں، یا شاعر شعر میں، خالق کا وجود حقیقی ہے، مخلوق کا اضافی، انسان کی انتہائی ترقی راہ معرفت میں یہ ہے کہ وہ اپنے خالق سے اسقدر قریب ہو جائے کہ فصل کا احساس نہ رہے، مگر خدا سے حقیقی وصل یعنی اتحاد ذات اسے کبھی حاصل نہیں ہو سکتا[2]،

ان میں سے پہلا نظریہ ہمہ اوست اور دوسرا ہمہ از اوست کہلاتا ہے، بقول ڈاکٹر عابد حسین ہمہ از اوست کا مذہب شریعت کے تصور سے اور واقعیت پسندانہ نقطۂ نظر سے قریب تر ہے، جبکہ ہمہ اوست یعنی وحدت وجود کا نظریہ شعرا کے تخیل اور عوام کے روحانی جذبہ کو زیادہ ترمتاثر کرتا ہے[3]، اور اس بنا پر کل عالم اسلام خصوصاً ایران اور ہندوستان میں زیادہ مقبول رہا ہے اور اب تک مقبول ہے۔

---

[1] ڈاکٹر عابد حسین ص ۴۰۳ [2] ایضاً ۴۰۴ [3] ایضاً

بعض انتہا پسند صوفی روح کے خدا میں ضم ہو جانے کے قائل بھی ہیں، تصوف کی زبان میں اسے حلول یا "اتحاد" کہتے ہیں، اس کے سب سے بڑے ترجمان منصور تھے لیکن شیخ سراج اور امام غزالی اس کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تصوف میں وصل اور وصلت کے الفاظ محض خدائی قرب کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں، فنا فی اللہ کا بھی یہ مطلب نہیں کہ روح ہستی مطلق میں ضم ہو جاتی ہے، غزالی کا بیان ہے کہ مشاہدۂ حق کے وقت روح حکم ربی سے عالم ملکوت سے برآمد ہوتی ہے، اور جسمانی وجود سے الگ ہو کر اصل منبع کی طرف رجوع کرتی ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون کا بھی یہی مطلب ہے[۱]،

عملی پہلو | تصوف کے نظری پہلو کی طرح اس کا عملی پہلو بھی کافی اہمیت رکھتا ہے، تصوف کے مبتدی کے لیے جن مقامات سے گذرنا لازمی ہے وہ یہ ہیں: (۱) توبہ (۲) ورع (۳) زہد (۴) فقر (۵) صبر (۶) توکل (۷) رضا۔ ایسے ہی صوفی کے لیے بھی مندرجۂ ذیل حال ضروری ہیں: (۱) مراقبہ (۲) قرب (۳) محبت (۴) خوف (۵) رجا (۶) شوق (۷) انس، (۸) اطمینان (۹) مشاہدہ، اور (۱۰) یقین ہے[۲]،

توبہ سے مشاہدہ تک صوفی کے سفر کے تین حصے کیے جا سکتے ہیں، اتباع شریعت، معرفت اور فنا[۳]، پہلی حالت کو مجاہدہ دوسری کو محاضرہ اور تیسری کو مشاہدہ بھی کہا جاتا ہے[۴]،

صوفی کا ضابطہ "ذکر" ہے، اس میں عبادت کے وہ طریقے بھی شامل ہیں جن سے وجد لانے میں مدد ملتی ہے، ذکر دو قسم کے ہیں، خفی اور جلی، ذکر میں ایک منزل ایسی آتی ہے جب طالب کا تعلق صرف نفس سے رہ جاتا ہے، جو اس کے اثنیا زمٹ جاتے ہیں،

---

۱ نکلسن Studies in Islamic Mysticism ص ۸۲ ۲ ڈاکٹر تارا چند Influence of Islam ص ۸۰ ۳ مارگریٹ سمتھ ص ۷-۹ ۴ امیر علی Spirit of Islam ص ۴۷۵ ۵ ... of Islam ص ۸/۱

اور باطن کی سماعت بیدار ہو جاتی ہے، اب زبان حال سے ذکر الٰہی کی ضرورت نہیں رہتی خفی طور پر ذکر اندر ہی اندر جاری رہتا ہے۔ یہاں تک طالب دین و دنیا سے بے خبر ہو جاتا ہے، قلب کی آنکھ کھلتی ہے، اور احقاق حق ہونے لگتا ہے، اس کے بعد طالب بیداری کے عالم میں وہ سب کچھ دیکھ لیتا ہے، جو محجوبیت کے عالم میں ممکن نہیں، اس منزل پر پہنچکر جو مشاہدہ ہوتا ہے، وہی حقایق علیا کا مشاہدہ کہلاتا ہے،

پیر یا شیخ کی ذات تصوف میں ایک رکن کی حیثیت رکھتی ہے، اس ہستی کے گرد صوفیوں کے سلسلے اور نظام بڑھتے اور پھیلتے رہے ہیں، پیر کے بغیر روحانی تکمیل ممکن ہی نہیں، وہ اپنے مریدں کا اخلاقی اور روحانی رہنما ہے، ہر پیر اپنے سلسلہ میں حکمراں کا مرتبہ رکھتا ہے، وہ عموماً صاحب حال اور کشف و کرامات ہوتا ہے، ان صفات کی بنا پر اسے خلیفۂ خدا بھی کہا جاتا ہے، صوفی پر واجب ہے کہ خدا سے بھی زیادہ اپنے پیر کا فرمانبردار ہو[1]، کیونکہ معرفت حق کی کڑی منزلیں بغیر اس کی اعانت اور رہنمائی کے طے نہیں ہو سکتی،

تصوف اسلام کی قوتِ ارتقا کا ضامن ہے، اس کا رخ کائنات کی طرف ہے، اسلام میں اب تصوف کا وہ اگلا ساز ور نہیں، پھر بھی مسلمانوں کے موجودہ مذہبی احساس کا تعلق نظریۂ وحدت وجود سے کافی گہرا ہے۔[2]

---

[1] ڈاکٹر تاراچند / ۸۱ [2] پروفیسر وان. Medieval Islam ص ۱۳۸

شعر العجم حصہ پنجم

(مؤلفہ مولانا شبلیؒ)

یہ شعر العجم کا پانچواں حصہ ہے، اس میں قصیدہ، غزل اور فارسی زبان کی عشقیہ، صوفیانہ، اخلاقی اور فلسفیانہ شاعری پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے، (جامع مولانا سید سلیمان ندوی)

منیجر

آثارِ علمیہ

مکاتیب مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

بنام

شاہ معین الدین احمد ندوی

گذشتہ نمبروں میں جو خطوط شائع ہوئے ہیں، وہ حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے آخری زمانے کے تھے، مگر بعض حیثیتوں سے اہم تھے، اس لیے ان کو پہلے شائع کر دیا گیا، اب اس نمبر سے سلسلہ وار شائع ہوں گے۔ ' م '

(۱۴)

دسینہ

برادرِ عزیز ادام اللہ سرورکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، کارڈ ملا، الحمدللہ مع الخیر ہوں، خربوزوں سے تو ہم لوگ قلیماً محروم ہیں اس لیے اس کا ذکر ہی بے سود ہے، آم البتہ ہیں، مگر بہت کم ہیں، تاہم قابلِ شکر ہیں، مٹھوا ہمارے ہاں آیا، اور اچھا آیا، باقی سب تھوڑے تھوڑے مٹھوا ہی پر ابھی تک گذارا ہے، آج کچھ دسہری اور سپیدے اور لنگڑے کے ٹوٹنے کی امید ہے، ثمر بہشت کے دانے اچھے آئے ہیں، مگر افسوس کہ پدر بزرگوار اوّل کی طرح مجھے " اس ثمر بہشت " سے محروم رہنا پڑے گا، یعنی اس سے پہلے ہی بہشت زار دیسنہ سے نکلنا پڑے گا،

شذرات میں غبار خاطر میں چند باتیں کھٹکتی ہیں، اصلاح کر دیجئے،

(۱) "زاغ و زغن" نکال دیجئے،

(۲) "سعی و محنت سے نہیں، بلکہ عطاء الوہیت ہے" کی جگہ "عطاء و موہبت سے ہے" بنا دیجئے،

(۳) اظہار و بیان کی فراوانی کی جگہ قوت اظہار و بیان کی فراوانی کر دیجئے۔

اب یہاں سے نکلنے کو پر تول رہا ہوں، سلیم کو بلایا ہے، اس کا انتظار ہے، کہیں جانے سے پہلے ایک دو روز کے لیے وہاں آنا چاہتا ہوں،

ظہر کی نماز میں مسجد جانا آموں کی کثرت خورش سے تکلیف دہ ہوتا ہے، تاہم بفضلہ تعالیٰ یہ تکلیف برداشت کیجاتی ہے، ورنہ آم خوردن چہ ضرور، بقیہ اوقات میں بحمد اللہ چلنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی، یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے،

والسلام

سید سلیمان، ۳ رجون ۱۹۴۶ء

(۱۵)

بذریعہ مشیر المہام تعلیمات
بھوپال

برادرم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

الحمد للہ خیریت ہے، معارف کے شذرات جاتے ہیں، اب آپ لوگ خود شذرات لکھکر مجھے بھیجیں، میں دو چار مہینے دیکھتا رہوں گا، پھر آپ لکھتے رہیں تاکہ ہر ماہ کی ذمہ داری میرے سر سے ہٹے، ذرا اس کا خیال رکھیے۔

یہاں سرکاری مہمان خانہ میں ہوں، بہترین موسم، بہترین منظر اور بڑا خوش آیند مستقبل ہے، مگر خدا جانتا ہے کہ ان سب سے بہتر شبلی منزل میری نگاہ میں ہے، اے کاش کہ مجھے وہاں سکون میسر آتا، اور خلاف مزاج حالات سے میں بچارہ سکتا، وہاں کا فقر یہاں کی شاہی سے بہتر ہے،

حب الوطن از ملک سلیمان خوشتر　　خار وطن از سنبل و ریحان خوشتر
یوسف کہ بہ مصر بادشاہی می کرد　　می گفت گدا بودن کنعان خوشتر

ایک ہزار تنخواہ، سو واری کا الاؤنس اور پانچ سو ماہوار سلسلۂ دار التصنیف کے لیے اور تمام دفاتر و محاکم شرعیہ اور تعلیمات شرقی کی امارت، اس جاہ و اعزاز سے نہ دل میں فرحت ہے اور نہ قلب میں انشراح، استاذ مرحوم نے اخیر زندگی میں مولانا حمید الدین صاحب کے نام ایک خط میں لکھا تھا،

مرا گر تو بگذاری اے نفس طامع　　بسے بادشاہی کنم در گدائی

بحمد اللہ تعالیٰ و بفضلہٖ طمع نفس سے خالی ہوں، مگر دل بعض کاموں کو چاہتا ہے، حق یہ ہے ایک دار التکمیل کا خیال ہے، جو مجھے یہاں لے آیا ہے، یہاں کے مدارس کی حالت اچھی نہیں، روپیہ کی کمی نہیں، مگر آدمیوں کی سخت کمی ہے، باہر سے چند آدمی شاید آ جائیں تو کچھ کام چلے،

اب آپ لوگ دار المصنفین کو اپنی زندگی کا کام سمجھکر استقلال کے ساتھ قائم رہیں اور یہ سمجھیں کہ عنقریب یہ ذمہ داری آپ صاحبوں ہی پر عائد ہوگی، اور بزرگوں کی اس امانت کو آپ ہی لوگوں کو قائم رکھنا ہے۔

کبھی کبھی خط تو لکھیں، دیکھیے معارف کا پایہ گرنے نہ پائے اور بھرتی کے مضامین اس میں جگہ نہ پائیں، اڈیٹر کو نظم ہو یا نثر اس کے ایک ایک حرف کو دیکھنا چاہیے تصحیح اور اصلاح اور کتابت ہر ایک کی نگرانی کرنی چاہیے،

اس وقت یہاں موسم بہت فرحت انگیز ہے گرمی اور اس جو ہندوستان میں اس موسم کے برکات ہیں یہاں نام کو نہیں، مچھر نہیں، البتہ دن کو آبادی میں کھیاں ہوتی ہیں،

میرے لیے شہر میں ایک بڑا مکان صاف ہو رہا ہے، خوش منظر ہے، مگر دل اپنے ویرانہ ہی کو چاہتا ہے،

والسلام

سید سلیمان، ۳ر جولائی ۱۹۴۶ء

(۱۶)

بھوپال

برادر عزیز حماک اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، آپ کا خط اور مضمون فتح افغانستان پہنچ گیا، دیکھوں گا، الحمد للہ خیریت ہے، معارف اس دفعہ اچھا لکھا گیا ہے، گو اغلاط ہیں، سرمد کی عبارت شاید آپ نے درست کر دی ہے، بہت اچھا کیا، اور اچھا ہوا، البتہ اس نمبر میں صرف مقالات ہی ہیں، ریاست صاحب سے کہدیجئے کہ وہ استفسارات لکھا کریں کہ تنوع رہے۔

صباح الدین صاحب کا خط آیا ہے، اپنے آپریشن کی بابت مشورہ پوچھا ہے، مشورہ مشکل ہے، میں لکھتا ہوں کہ یہاں چلے آئیں، یہاں سے پونہ قریب ہے، جہاں یہ آپریشن ہوتا ہے، اور یہاں کا موسم رانچی ہی کے قریب قریب ہے۔

مولوی وحید الرحمٰن[1] صاحب کا خط آیا ہے، ان کے مطالعہ کی بھی رہبری کیجئے، میں بھی ان کے خط کا جواب لکھ رہا ہوں،

ضرورت ہے کہ آپ تاریخ کے کوچہ سے اپنا قدم باہر نکالیں، اور دوسرے فنون کی طرف توجہ کریں،

۱۶ر جولائی سے میں نے دار القضا اور مدارس عربیہ کا چارج لے لیا، دار القضا میں زیادہ تر مقدمات نکاح و طلاق و خلع و تفریق اور ولایت اور کبھی کبھی قصاص کے ہوتے ہیں،

---

[1] معارف: ایک زیر تربیت رفیق۔

مدارس کی حالت بہت خراب ہے، دین اور مذہب کا تو نام نہیں، ادھر پوری توجہ کر رہا ہوں، رمضان میں یہاں بڑی رونق ہوتی ہے، محرم سونا گذرتا ہے، اور بہت سے بدعات محفوظ ہے،

والسلام

سید سلیمان ، ۲۴ جولائی ۱۹۳۶ء

(۱۷)

عزیز مکرم السلام علیکم

بے شبہ بہار کے سنگین واقعات کے بعد آپ کے شذرات کا وزن ہلکا پڑ جاتا ہے، بہرحال قلم میں سختی نہ آنی چاہیے،

میں تو دہلی و سہارنپور بخیریت گیا اور مع اہل عیال واپس آیا، بشیر صاحب سے ملاقات دہلی میں ہوئی تھی، آپ لوگوں کا فسخ ارادہ احتیاط کا تقاضا تھا، مگر واقعات دور سے زیادہ معلوم ہوتے ہیں،

ہائے اویس صاحب[1] کا صدمہ ایسے ہی دل کو ہے، جیسے کسی عزیز قریب کا ہو سکتا ہے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائیں،

مولانا عبد الباری صاحب کا مضمون "حکیم الامۃ اور سیاسیاتِ حاضرہ" جب ماجد صاحب دیکھ چکے ہیں، تو ٹھیک ہی ہوگا، میرے پاس نہ بھیجیں،

رفقا اور حکیم صاحب، نیاز صاحب، بشیر صاحب کو سلام کہہ دیں،

والسلام

سید سلیمان ، ۲۹ نومبر ۱۹۳۶ء

---

[1] دار المصنفین کے ہڈ کلرک تھے، اور اتنے قدیم تھے کہ گویا اس کے بانیوں میں تھے،

(۱۸)

بھوپال

برادر عزیز شاہ معین الدین صاحب شفاکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، آپ کا کارڈ ملا، آپ کی صحت کاملہ کے لیے دعا ہے، خیریت سے مطلع کرتے رہیے، رشید صدیقی صاحب کا خط آیا ہے، امید ہے کہ ایم اے کا پرچہ آپ نے بھیجدیا ہوگا، افغانستان والے مضمون کا ترجمہ کراکے آپ نے بھیجا اچھا کیا، کوئی رسید آئی ہو تو مطلع کیجئے گا، شذرات میں سیاسات پر اگر لکھیں تو بہت محتاط لکھیے گا، کیونکہ ان سب کی نسبت میری طرف ہوگی،

ایک کتاب جاتی ہے، اس پر حوصلہ افزا ریویو کر دیجئے،

یہاں بحمد اللہ خیریت اور امن ہے، پھر بھی انتظامات سے غفلت نہیں کی جارہی ہے، جامعہ کی جوبلی میں شرکت کا ارادہ نہ تھا، مگر بعض وجوہ سے ارادہ کر لیا ہے، امید ہے کہ ۵ا کی صبح کو پہنچوں، آپ آئے تو ملاقات ہوگی، انشاء اللہ تعالیٰ،

سراج احمد مرحوم کی وفات پر افسوس ہے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائیں،

نیاز صاحب، حکیم صاحب، ڈاکٹر صاحب اور رفقاء کو سلام کہدیجئے۔

معلوم نہیں صباح الدین صاحب کہاں ہیں، والسّلام

سید سلیمان ۸ر نومبر ۱۹۴۶ء

(۱۹)

بھوپال

برادر عزیز دفعکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، لفافہ ملا، حالات معلوم ہوئے، میں نے بھی ایک لفافہ لکھا تھا، جس میں چند خطوط اور بھی تھے، معلوم نہیں وہ ملا یا نہیں، مجھے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ

اس فتنہ میں آپ کا دامن پاک تھا، اور رہا، مجھے آپ سے یہی امید تھی، اور دعا ہے کہ میری توقعات اسی طرح آپ سے پوری ہوتی رہیں،

آپ شاید وطن جانا چاہتے ہیں، تو آپ جا سکتے ہیں، میرا ان دنوں آنا نہ ہوگا، اپنی خیریت اور کیفیت مرض سے لکھنؤ جاکر اپنے معالج کو دکھا کر مجھے ضرور مطلع کیجئے گا، ورنہ تعلق خاطر رہے گا، آپ کی صحت کاملہ کے لیے دلی دعا ہے،

بشیر صاحب کی خدمت میں ان تقریبوں کے موقع پر میری طرف سے بعد سلام مبارکباد پہنچا دیجئے،

کتبخانہ اور رفقا کی نگرانی کے لیے پہلے لفافہ میں لکھ چکا ہوں،

والسلام

سید سلیمان، ۳۰ دسمبر ۱۹۴۶ء

(۲۰)

بھوپال

برادر عزیز شفاکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، خط ملا، اللہ تعالیٰ آپ کو جلد شفا بخشیں، میرا ارادہ یہاں سے ۲۰ کی شام کو روانگی کا ہے، ۲۱ کی دوپہر کو وہاں پہنچوں گا، انشاء اللہ ۲۵ کو اعظم گڈھ کا قصد ہے، خدا کرے کہ اس عرصہ میں آپ اچھے ہو جائیں،

خانصاحب[1] کو بھی اس پروگرام کی اطلاع دیدیجئے،

صباح الدین صاحب نے پٹنہ اسپتال میں گلے کا آپریشن کرایا ہے، اب غالباً اسپتال سے باہر آچکے ہوں،

والسلام، سید سلیمان، ۱۲ فروری ۱۹۴۷ء

---

[1] مکتوب الیہ اس زمانہ میں بسلسلہ علاج دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مقیم تھا، خانصاحب سے مراد مولانا محمد عمران خانصاحب مہتمم دارالعلوم ہیں،

ادبیات

تدریسی اشارے

از جناب سید اختر علی تلہری

ہر نفس تجھکو ہے اندیشۂ انجام ابھی — عقل پختہ سہی سودا ہے ترا خام ابھی

کیف امروز کا محرم ہو تو ناداں کیونکر — تو نے بدلے ہی نہیں ہیں سحر و شام ابھی

عشق کے بادۂ رنگیں میں ذرا اسکو ڈبو — دیکھ سادہ ہے ترا جامۂ احرام ابھی

یوں شب و روز نہ تو دہر کے شکوے کرتا — تو نے فطرت کا سنا ہی نہیں پیغام ابھی

مصحفِ حال کے اک لفظ کی تفسیر کی — زندگی تیری ہے بے معنی و ناکام ابھی

سطوتِ عزم سے پھر چھا گئے آفاق پہ وہ — جن کو تو کہتا تھا خورشیدِ لبِ بام ابھی

قافلے والے کہیں سے ہیں کہیں جا پہنچے — بدنصیبی سے ہے تو مائلِ آرام ابھی

محفلِ عیش میں باتوں کے بنانے والے — امتحاں کا ترے آنے کو ہے ہنگام ابھی

اپنی بے بال و پری کا تو مداوا کر لے — مضطرب تو ہے عبث مرغِ تہ دام ابھی

تجھ سے کیا سلجھے گا الجھا ہوا دنیا کا نظام — تو ہے وابستۂ گیسوے دلآرام ابھی

حوصلوں میں ترے رفعت ہو کہاں سے پیدا — شوق ہے خام تو ہے ذوق ترا عام ابھی

طورِ عرفانِ حقیقت پہ تو پہنچے کیونکر — کعبۂ دل میں بھرے ہیں ترے اصنام ابھی

ساقیِ بزم کے بدلے ہوئے تیور پہ نہ جا — شوق صادق ہو تو ملتا ہے تجھے جام ابھی

تو ہو اور شانہ کشِ زلفِ حقیقت اختر — تجھ سے چھوٹا نہیں سر رشتۂ اوہام ابھی

مطبوعات جدیدہ

تدوین حدیث۔ از مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ، تقطیع بڑی ضخامت ۴۰۴ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد سے ۳۴ر پتہ: ادارہ مجلس علمی۔ میری ویدر روڈ کراچی،

انکار حدیث کے فتنہ کے جواب میں بکثرت مضامین اور مستقل کتابیں بھی لکھی گئیں، مگر وہ عموماً مناظرانہ طرز کی ہیں، کوئی ایسی جامع کتاب نہیں تھی جس میں مناظرانہ اعتراض وجواب کے بجائے تدوین حدیث کی تاریخ کو ایسے علمی اور محققانہ انداز میں پیش کیا گیا ہو جس سے منکرین حدیث کا جواب اور احادیث سے متعلق شکوک وشبہات کا ازالہ بھی ہو جائے، اور پڑھنے والے کو محض خوش عقیدگی کی بنا پر نہیں، بلکہ علمی و عقلی حیثیت سے، احادیث کی دینی اہمیت اور اس کی صحت کا پورا اذعان ویقین ہو جائے زیر نظر کتاب اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے، جن لوگوں کو مصنف مرحوم کے طرز تحریر سے واقفیت ہے، ان کو اس کا اندازہ ہو گا کہ ان کا ذہن اتنا نکتہ آفریں اور قلم اتنا رواں تھا کہ جس موضوع پر بھی لکھتے تھے، اس کے ہر پہلو پر معلومات کا انبار لگا دیتے تھے اور اپنی ذہانت سے بحث ونظر کے ایسے ایسے گوشے پیدا کرتے تھے جن کی جانب عام طور سے ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات بخاری کے ابواب کی طرح ان مباحث کا تعلق موضوع سے اس قدر دقیق ہو جاتا ہے کہ ان دونوں میں ربط پیدا کرنا دشوار ہو جاتا ہے، یہ خصوصیات اس کتاب میں بھی ہیں، اور اس میں بڑی بسط وشرح کے ساتھ احادیث نبوی کی دینی اہمیت، اس کی صحت اور اس کی تدوین کی تاریخ پر بحث کی گئی ہے، اور اس کی صحت واستناد کے

مذہبی، علمی، تاریخی اور عقلی جس قدر پہلو اور دلائل بھی ہو سکتے ہیں سب پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، جس سے یہ پوری طرح ظاہر ہو جاتا ہے کہ نہ صرف عقیدہ اور مذہبی نقطۂ نظر بلکہ خالص علمی و عقلی حیثیت سے بھی احادیث نبویؐ دنیا کا مستند ترین اخباری ذخیرہ ہے، اور صحت و استناد میں کوئی تاریخ بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، مصنف علام نے اپنے مدعا کے ثبوت کے لیے جو گوناگوں اور شاخ در شاخ مباحث پیدا کیے ہیں، ان کا اندازہ کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، اور جو بحثیں بظاہر موضوع سے غیر متعلق معلوم ہوتی ہیں وہ بھی فائدہ سے خالی نہیں ہیں اور ان سے احادیث نبویؐ کے متعلق نہایت مفید معلومات حاصل ہوتے ہیں، اردو میں تدوین حدیث کے موضوع پر یہ پہلی جامع کتاب ہے، اگر اس میں احادیث کے رد و قبول کے اصول و شرائط اور فن جرح و تعدیل پر بحث ہوتی تو یہ کتاب اور زیادہ جامع اور مفید ہو جاتی،

نعمت کبریٰ۔ مولفہ جناب مولانا سید شاہ عون احمد صاحب پھلواروی تقطیع اوسط، ضخامت ۴۰ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸ر پتہ: دار الاشاعت خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف، ضلع پٹنہ

انبیائے کرام علیہم السلام خصوصاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کا مسئلہ اہل سنت کا متفقہ عقیدہ ہے یعنی اس عالم آب و گل سے پردہ فرمانے کے بعد حضور انورؐ اسی طرح قبر انور میں جسمانی حیات کے ساتھ تشریف فرما ہیں، جس طرح پہلے اس دنیا میں تھے، اردو میں اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں تھی، یہ کتاب لکھ کر مصنف نے یہ کمی پوری کی ہے، اس میں انھوں نے اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر قرآن مجید، تفاسیر و احادیث نبوی اور ائمہ سلف کے اقوال سے حیات النبی کے دلائل جمع کر دیے ہیں، اور جن بعض آیات و احادیث سے بظاہر اس کے متعلق شکوک پیدا ہوتے ہیں، محدثین و مفسرین ہی کے اقوال سے ان کا ازالہ کیا ہے، اس میں ضمناً عام

انبیاء علیہم السلام اور شہداے کرام کی موت و حیات کا مسئلہ، ان کی موت کی نوعیت اور اس سے مراد عام حیات بعد الموت اور انبیاء کی حیات بعد الموت میں فرق، حیات جسمانی و حیات روحانی، عالم برزخ وغیرہ کے مسائل بھی زیر بحث آگئے ہیں، جس سے اس مسئلہ میں کسی شک و شبہہ کی گنجایش نہیں رہتی، جن لوگوں کو اس سے دلچسپی ہو، ان کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے،

لغاتُ القرآن ۔ مؤلفہ مولانا شہید الدین صاحب مرحوم تقطیع اوسط، ضخامت ۴۱۴ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد للعہ پتہ: نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ، کراچی،

لغات قرآنی پر اردو میں کئی کتابیں ہیں، مولانا زین العابدین سجاد میرٹھی نے قاموس القرآن کے نام سے ایک مختصر لغت لکھی ہے، جو مکتبہ علمیہ میرٹھ سے شائع ہوئی ہے، مولانا عبد الرشید نعمانی نے لغات القرآن کے نام سے ایک مبسوط لغت مرتب کی ہے، جو چار جلدوں میں ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئی ہے، نور محمد کارخانہ تجارت کتب نے یہ نئی لغت شائع کی ہے، اس میں حروف تہجی کی ترتیب سے قرآنی لغات کے معنی اردو میں لکھے گئے ہیں اور کہیں کہیں ان کی تشریح بھی کی گئی ہے، مگر یہ اسقدر مختصر ہے کہ صرف طلبہ کے کام کی ہے،

خاصان خدا کی نماز ۔ مرتبہ جناب مولانا ابو محمد امام الدین صاحب رامنگری تقطیع چھوٹی، ضخامت ۴۸ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۱۲ نئے پیسے پتہ مکتبہ تحفظ ملت، رامنگر بنارس

نماز کی تکمیل کے لیے جس طرح ظاہری ارکان کی صحت شرط ہے، اسی طرح باطنی کیفیت یعنی خشوع و خضوع اور حضور قلب بھی ضروری ہے، اس کے بغیر نماز جسد بے روح رہتی ہے، چنانچہ علماء و اخیار امت کی نمازیں باطنی کیفیت سے معمور رہتی تھیں، اس کتاب میں لائق مصنف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابۂ کرام، تابعین عظام اور دوسرے صلحاء و

اخیار امت کی نمازوں کے باطنی کوائف مثلاً نماز کے لیے ان کا ذوق وشوق، اجماع، اہتمام، خضوع و خشوع اور حضور قلب و استغراق وغیرہ کے واقعات کو موثر انداز میں بیان کیا ہے جس سے نماز کی اصل روح ظاہر ہو جاتی ہے۔

تفسیر حقانی دو جزء تقطیع بڑی ضخامت بالترتیب ۸۰، ۱۱۲ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت تحریر نہیں، پتہ: کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند

مولانا عبد الحق حقانی دہلوی کی تفسیر اردو کی مشہور تفسیروں میں ہے، یہ عرصہ سے نایاب تھی، کتب خانہ نعیمیہ دیوبند نے اس کو دوبارہ شائع کرنا شروع کیا ہے، فی الحال اس کے دو حصے شائع ہیں، پہلا حصہ سورہ فاتحہ اور دوسرا پہلے پارہ کے ربع اول کی تفسیر پر مشتمل ہے، جن لوگوں کو اس کے مطالعہ کا شوق ہو انکو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے،

حقائق و معارف مرتبہ جناب مفتی عبد الرحمن صاحب، تقطیع چھوٹی ضخامت ۔۔۔ صفحات، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد [illegible] پتہ: ادارہ نشر المعارف چوک ملتان شہر

اب تک مصنف کی صرف نثری تصانیف نظر سے گذری تھیں، اب معلوم ہوا کہ وہ نظم کا بھی ستھرا ذوق رکھتے ہیں، چنانچہ انھوں نے حقائق و معارف کے نام سے اردو کے منتخب اخلاقی حکیمانہ عارفانہ اشعار کا یہ مجموعہ مرتب کیا ہے، اس میں دس عنوانات کے ماتحت اس دور کے بہت سے شعراء کے حکیمانہ اور سبق آموز اشعار مرتب طریقہ سے جمع کئے گئے ہیں، اس انتخاب میں اشعار کے ظاہری [illegible] کے بجائے ان کے معنوی حسن [illegible] وسبق آموزی کا زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے [illegible] [illegible] [illegible] سے [illegible] [illegible] طوفان [illegible]

[illegible] میں [illegible] انتخاب قابل قدر ہے

م

مکتبہ دار المصنفین

سلسلۂ سیرۃ النبی

حصہ اول: ولادت سے فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ؎ ٭ ؍

حصہ دوم: وفات، اخلاق و عادات کا مفصل بیان، ؎ ؍

حصہ سوم: معجزہ کی حقیقت و قرآن مجید کی روشنی میں بحث و تبصرہ ؍

حصہ چہارم: تبلیغ نبوی کے اصول، عقائد اسلام پر مفصل و حکیمانہ بحث ؍

حصہ پنجم: فرائض خمسہ پر سیر حاصل بحث ؍

حصہ ششم: اسلامی اخلاقی تعلیمات، اسلامی فضائل و آداب کی تفصیل ؍

(سلسلۂ سیر الصحابہؓ)

خلفائے راشدینؓ: خلفائے راشدین کے ذاتی حالات و فضائل ؍

مہاجرین جلد اول: حضرات عشرہ مبشرہ اور بقیہ صحابہ کے حالات و فضائل ؍

مہاجرین جلد دوم: فتح مکہ سے پہلے کے صحابہ کرام کے حالات ؍

سیر الانصار اول: انصار کرام کے فضائل و کمالات ؍

دوم: بقیہ انصار کرام کے حالات زندگی ؍

صحابہ ششم: حضرت حسینؓ، امیر معاویہؓ اور عبد اللہ بن زبیرؓ کے مفصل حالات ؍

صحابہ ہفتم: بعد کے صحابہ کرام کے سوانح حالات ؍

سیر الصحابیات: ازواج مطہرات، بنات طاہرات اور عام صحابیات کے حالات ؍

اسوۂ صحابہؓ اول: صحابہ کرام کے عقائد، عبادات و اخلاق کی تفصیل ؍

" دوم: صحابہ کرام کے سیاسی و انتظامی کارناموں کی تفصیل ؍

اسوۂ صحابیات: صحابیات کے مذہبی، اخلاقی اور علمی و عملی کارناموں کا مرقع ؍

اہل کتاب صحابہؓ و تابعینؒ: یہودی و نصرانی صحابہؓ کے حالات ؍

الفاروق: حضرت فاروق اعظمؓ کی لائف اور عراق و شام، مصر و ایران کی فتح کے تفصیلی حالات ؍

سیرت عائشہؓ: حضرت عائشہؓ کے حالات زندگی ؍

سیرت عمر بن عبد العزیزؒ: عمر ثانی حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے سوانح حیات اور انکے مجددانہ کارنامے ؍

(سلسلۂ تاریخ اسلام)

تاریخ اسلام حصہ اول: (عہد رسالت، خلافت راشدہ) ؍

" دوم: بنی امیہ دمشق کی صد سالہ تاریخ ؍

" سوم: ابو العباس سفاح سے متقی للہ ۳۳۲ھ تک خلافت عباسیہ کی تاریخ ؍

" چہارم: خلیفہ مستعصم باللہ تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی تاریخ اور عباسیوں کے تمدنی کارناموں کی تفصیل ؍

حکمائے اسلام

حصہ اول و دوم

یوں تو اردو میں مشاہیر حکمائے اسلام کے حالات میں الگ الگ متعدد کتابیں موجود ہیں، الغزالی، امام رازی، ابن رشد تو اسی ادارہ کی کتابیں ہیں لیکن کوئی ایسی جامع کتاب نہیں تھی جس میں ان سب کے حالات یکجا کر دیے گئے ہوں، یہ کتاب اسی کمی کو پورا کرنے کیلیے لکھی گئی ہے، جس میں ان کے حالات و سوانح کے ساتھ ان کی ہر قسم کی مذہبی، اخلاقی اور فلسفیانہ خدمات کو نمایاں کیا گیا ہے، اس کے دو حصے ہیں، پہلے حصہ میں یعقوب کندی، ابو نصر فارابی، محمد بن زکریا رازی، ابن مسکویہ، ابو ریحان بیرونی، امام غزالی، ابو البرکات بغدادی کے حالات اور ان کے فلسفیانہ مسائل کی تشریح ہے، اور دوسرے میں ابن باجہ، ابن طفیل، ابن رشد، امام رازی مغلوں اور تاتاریوں کے عہد کے حکما، حکمائے متاخرین، خاندانِ فرنگی محل، خاندانِ خیر آباد اور مختلف خاندانوں کے حکما، مثلاً ملا نظام الدین، مولانا عبد العلی بحر العلوم، مولانا فضل حق خیر آبادی، ملا محمود جونپوری، ملا محب اللہ بہاری وغیرہ کے حالات اور انکے نظریات و خیالات کی تشریح، اور انھوں نے اپنے علم و فلسفہ سے اسلام کی جو عظیم الشان خدمات انجام دیں، ان کی تفصیل ہے، مولفہ مولانا عبد السلام ندوی مرحوم، قیمت حصہ اول معہ دوم ۔۔۔

اقبال کامل

مشہور حکیم و فلسفی شاعر ڈاکٹر اقبال کے مفصل سوانح حیات، ان کے فلسفہ و شاعری پر تبصرہ اور انکی شاعری کے اہم موضوعوں یعنی فلسفہ خودی فلسفہ بیخودی اور نظام اخلاق وغیرہ کی تشریح

مرتبہ مولانا عبد السلام ندوی مرحوم، قیمت: ۔۔۔

(طابع و ناشر صدیق احمد)

مئی سنہ ۱۹[illegible]ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

تاریخ دعوت و عزیمت

یعنی عالم اسلام کی اصلاحی و تجدیدی کوششوں کا تاریخی جائزہ، نامور مصلحین اور ممتاز اصحاب دعوت و عزیمت کا مفصل تعارف، ان کے علمی و عملی کارناموں کی رُوداد، اور انکے اثرات و نتائج کا تذکرہ، اسمیں پہلے مصنف کے قلم سے پیش لفظ ہے، اسکے بعد مقدمہ، جسمیں اصلاح و تجدید کی ضرورت اور تاریخ اسلام میں انکا تسلسل دکھایا گیا ہے، پھر اصل کتاب شروع ہوتی ہے جو مولانا جلال الدین رومی کی اصلاحی و تجدیدی کوششوں کی تفصیل پر جاکر ختم ہوتی ہے، قیمت : ے ر

مرتبہ مولانا ابوالحسن علی ندوی

مآل و مشیت

اس میں حیات انسانی کے دو بنیادی تصوروں : مآل و مشیت کی فلسفیانہ تحلیل کیگئی ہے، یہ وہی ۱۹۵۵ء کی بہترین کتاب ہے جسپر اسکے لائق مصنف جناب چودھری ظفر حسین خاں صاحب کو حکومت ہند کیطرف سے پانچہزار کا انعام ملا ہے، یہ تو موضوع کے اعتبار سے خالص فلسفیانہ اور بہت خشک ہے لیکن مصنف کے انشا پردازانہ اسلوب تحریر نے اسکو بہت دلچسپ اور دلآویز بنا دیا ہے، ان ہی کے قلم سے فرانس کے مشہور انقلابی مفکر روسو کی ایک شاہکار کا اردو ترجمہ اسی اسلوب و طرز انشا میں ادارہ کیطرف سے اس سے پہلے شائع ہو چکا ہے،

قیمت عہ ر

جلد ۷۹ ماہ شوال المکرم ۱۳۷۶ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۵۷ء نمبر ۵

فہرست مضامین

شذرات	شاہ معین احمد ندوی	۱-۳۲۲

مقالات

مولانا خرم علی بلہوری اور ان کی علمی خدمات کا تفصیلی جائزہ	مولانا عبد الحلیم صاحب چشتی، فاضل دیوبند	۳۴۲-۳۲۵
کیا منصوص اسلامی احکام کو بھی اجتہاد کے ذریعہ بدلا جاسکتا ہے ؟	جناب مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دار المصنفین	۳۶۵-۳۴۳
یونانی منطق کے قدیم تراجم	جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے ایل ایل بی، پی ایچ ڈی	۳۷۹-۳۶۶
ایران کے کتاب خانے	جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مسلم یونیورسٹی	۳۹۲-۳۷۷

آثار علمیہ

مکاتیب مولانا سید سلیمان ندوی بنام شاہ معین الدین احمد ندوی		۳۹۶-۳۹۳
مطبوعات جدیدہ		۳۹۹-۳۹۷

پروفیسر اجمل خاں صاحب نے کئی سال ہوئے "مختصر سیرت قرآنیہ" کے نام سے ایک سیرت لکھی تھی جسکا مقصد کلام مجید کی نزولی ترتیب کی روشنی میں سیرت نبوی کا مطالعہ ہے۔ اس حد تک تو کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ اس سے قرآن مجید کی نزولی ترتیب کا فتنہ نہ پیدا ہونے پائے، آج سے چند سال پہلے بھی بعض حلقوں کی جانب سے اس قسم کی تحریک ہوئی تھی، مگر خود بخود دب گئی، جن لوگوں کے دماغ میں اس قسم کے خیالات آتے ہیں، ان کو غور کرنا چاہیے کہ خود حضرت علیؓ جنھوں نے قرآن مجید کو نزولی ترتیب پر مرتب کیا تھا، یعنی قرآن کو اختلافات سے بچانے کے لیے اپنے زمانہ میں بھی اپنے مرتب کردہ مصحف کو رائج نہیں کیا، بلکہ عہد صدیقی ہی کے مرتب کردہ مصحف کو جس پر امت کا اتفاق ہو چکا تھا، قائم و برقرار رکھا، حتی کہ شیعوں نے بھی کبھی اس کی کوشش نہیں کی، باقی جو شخص نزولی ترتیب کے مطابق قرآن مجید یا اس کی روشنی میں سیرت نبوی کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے، تو وہ کرسکتا ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔

اس کتاب کی ایک بڑا قابل اعتراض پہلو وحی الٰہی کی غلط تعبیر ہے۔ مصنف نے اسکی جو تعبیریں کی ہیں وہ نہ صرف مسلمانوں کے مسلمہ عقیدے کے خلاف ہیں، بلکہ ان میں تضاد بھی ہے، چنانچہ انھوں نے کہیں تو وحی الٰہی کو فکر نبوی سے اور کہیں پیغمبر کے ضمیر کی آواز سے تعبیر کیا ہے۔ اور کہیں اس معنی میں قرآن مجید کو وحی مانا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر خدا کی جانب سے جو خیالات طاری ہوتے تھے، انکو آپ اپنے الفاظ میں بیان کر دیتے تھے، یعنی معنی منجانب اللہ ہوتے تھے، اور الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے، یہ سب تعبیریں غلط ہیں، پہلی دونوں تعبیروں کی غلطی تو کھلی ہوئی ہے کہ اس صورت میں قرآن مجید

کلام الٰہی نہیں رہتا، بلکہ کلام نبوی بنجاتا ہے جس کو کوئی مسلمان بھی نہیں مانتا، تیسری تعبیر اس لیے صحیح نہیں ہے کہ اس صورت میں وحی اور الہام اور پیغمبر اور صاحب الہام میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا اور الہام ایک ظنی چیز ہے، اور وحی قطعی اور یقینی، دوسرے کلام مجید کے وحی ہونے کے مسلمہ معنی یہ ہیں کہ وہ لفظاً اور معناً دونوں اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، جو فرشتہ کے ذریعہ آپ پر نازل ہوا، اس پر بکثرت آیات قرآنی شاہد ہیں، اس مسئلہ پر حضرت سید صاحبؒ کا مفصل مضمون بھی معارف میں نکل چکا ہے، اسی لیے یہ مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ ہے۔

ہم کو امید ہے کہ مصنف بھی اس متفقہ عقیدے کو متزلزل کرنے کی کوشش نہ کریں گے، مسلمانوں میں یونہی عقائد کا اختلاف کیا کم ہے کہ اس میں ایک اختلاف کا اور اضافہ کیا جائے، اور مصنف کا مقصد تو اتحاد فرق بلکہ وحدت ادیان بھی ہے، اس لیے ان پر یہ فرض اور بھی زیادہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اور مسلمانوں کے متفقہ عقیدہ میں اختلاف نہ پیدا کریں،

مولانا شبلی مرحوم مئی ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے تھے، اس حساب سے اس مہینہ ان کی پیدائش پر ایک صدی پوری ہو گئی، اس لیے بعض حلقوں کی جانب سے ان کی صد سالہ یادگار منانے کی تحریک کی جارہی ہے، اور صدق جدید، ہماری زبان اور نوائے ادب وغیرہ نے بھی اسکی تائید کی ہے، اگرچہ اس قسم کی یادگار منانا محض ایک رسمی چیز ہے، مگر اس سے ایک فائدہ بھی ہے کہ اس بہانہ سے ایک علمی تقریب ہو جاتی ہے اور صاحب یادگار کے متعلق اور عام علمی موضوعوں پر مفید مقالات کا ایک مجموعہ تیار ہو جاتا ہے، اسلیے ہمارے ذہن میں بھی یہ خیال آیا تھا کہ اس درمیان میں تجویز سامنے آگئی، اسکی سادہ اور آسان شکل تو یہ ہے کہ اس یادگار میں معارف کا ایک خاص نمبر نکال دیا جائے، دوسری صورت یہ ہے کہ دارالمصنفین میں اہل علم کا اجتماع کیا جائے، اور علمی موضوعوں پر مقالات پڑھے جائیں اور انکا مجموعہ شائع کیا جائے، گو اس صورت میں مصارف زیادہ ہوں گے لیکن تقریب کے شایان شان یہی صورت بہتر ہوگی، مگر آجکل دارالمصنفین کی مالی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ اس تقریب کے مصارف کا بار برداشت کر سکے، اگر علامہ شبلی کے صاحب ثروت عقیدتمند اور دارالمصنفین کے قدردان اسکا سامان کر دیں تو البتہ ممکن ہے، ورنہ حسب

دار المصنفین کے مالی حالات اسکی اجازت دینگے اسوقت یادگار منائی جائیگی، یہ ضروری نہیں ہو کہ عمدی پوری ہونے کے ساتھ ہی منائی جائے، ہم کو اس بارہ میں دوسرے معاصرین کے مشورے اور تجویز کا انتظار ہے،

مئی کے فاران میں حضرت سید صاحبؒ کے کسی عقیدتمند کے قلم سے حیات سلیمانی کی تالیف اور انکے متعلق دوسرے کاموں کی جانب توجہ دلائی گئی ہی، اور ان کا اجمالی نقشہ بھی پیش کیا گیا ہی، صدق جدید میں اسی قسم کی ایک تجویز کے جواب میں مارچ کے معارف میں ان امور کے متعلق ہم پوری تفصیل لکھ چکے ہیں، غالباً یہ پرچہ مضمون نگار کی نظر سے نہیں گذرا، ورنہ اس مضمون کی ضرورت نہ پیش آتی، انھوں نے علامہ شبلی کے تلامذہ کے ہاتھوں انکے علمی و ادبی آثار اور حیات شبلی کی ترتیب تالیف و اشاعت کا جو حوالہ دیا ہی، اسکے متعلق گذارش ہی کہ حضرت سید صاحبؒ کے متعلق بھی یہ سب کام پیش نظر ہیں جو انشاء اللہ رفتہ رفتہ ہوں گے، مضمون نگار کو یہ بھی غور کرنا چاہئے تھا کہ یہ کام علامہ شبلی مرحوم کی وفات کے کتنے دنوں بعد انجام پائے، اور ابھی سید صاحبؒ کی وفات پر کے دن گذرے ہیں کہ اسکو تاخیر پر محمول کیا جائے، انشاء اللہ سب کام ہونگے مگر اسمیں کچھ عرصہ لگے گا، تاہم مضمون نگار کے مفید مشوروں کے ہم شکر گذار ہیں، اس سے یہ فائدہ بہرحال ہوتا ہی کہ ان کاموں کیجانب سے غفلت نہیں ہونے پاتی،

تھوڑے دن ہوئے دمشق کے مشہور ادارے المجمع العلمی نے دار المصنفین کو کچھ کتابیں ہدیۃً بھیجی ہیں، ان میں سے بعض اہم اور پڑھنے کے لائق ہیں، معارف میں انکا تذکرہ دینا اسلیے مناسب معلوم ہوا کہ جن شائقین کو اسکا ذوق ہو وہ منگا سکیں (۱) المهرجان الالفی لابی العلاء المعری یعنی ابو العلاء معری کی ہزار سالہ جوبلی کی روداد جو دمشق میں چند سال ہوئے منائی گئی تھی، اسمیں وہ مقالات بھی ہیں جو جوبلی کے موقع پر پڑھے گئے تھے (۲) رسالۃ الملائکہ، یہ معری کا ایک نایاب رسالہ ہے جو جوبلی کی یادگار میں شائع کیا گیا ہی، اسکے بعض اجزا پہلے بھی شائع ہو چکے تھے، مگر مکمل رسالہ پہلی مرتبہ شائع ہوا ہی (۳) البیزرہ، یہ کتاب فاطمی خلیفہ عزیز باللہ کی تصنیف ہی، اسکو شکار کا اتنا شوق تھا کہ شکاری خلیفہ اس کا لقب ہو گیا تھا، اس نے شکاری پرندوں باز اور بحری وغیرہ کے اقسام، انکی پرورش اور علاج وغیرہ پر یہ کتاب لکھی تھی، موضوع کی جدت کے لحاظ سے کتاب دلچسپ اور لائق مطالعہ ہی (۴) محاضرات المجمع العلمی، یہ ان خطبات اور مقالات کا مجموعہ ہے جو مشاہیر فضلا اور اہل علم نے المجمع العلمی میں پڑھے تھے، یہ تین ضخیم جلدوں میں ہیں، انکے علاوہ بعض دواوین اور چھوٹی چھوٹی کتابیں ہیں جو چنداں اہم نہیں ہیں،

مقالات

مولانا خرم علی بلہوری اور ان کی علمی خدمات کا تفصیلی جائزہ

از
مولانا محمد عبد الحلیم صاحب چشتی، فاضل دیوبند

ہندوستان کے آخری دور کے جن علماء نے مسلمانوں کی مذہبی اصلاح کے لیے انتھک کوششیں کیں، حدیث کا چرچا کیا، اور نکھری ہوئی توحید کی دعوت دی، ان میں مولانا خرم علی بلہوری کا نام بہت ممتاز ہے۔

نام اور تخلص | خرم علی نام اور خرم تخلص تھا، مضافات کانپور کے قصبہ بلہور کے فیض نامی محلہ میں پیدا ہوئے، جہاں شرفاء کے چند گھرانے آباد تھے، اور اسی قصبہ کے نسبت سے بلہوری مشہور ہوئے۔

تعلیم و تربیت | آپ نے ابتدائی تعلیم گھر پر پائی، اور اس کے بعد لکھنؤ چلے گئے، لکھنؤ اس زمانہ میں علوم و فنون کا مرکز تھا، یہاں ابتدائی کتابیں اساتذۂ وقت سے پڑھیں اور علوم عقلیہ اور نقلیہ کی تحصیل مرزا حسن علی صغیر محدث لکھنوی سے کی اور آپ ہی کے حلقۂ درس سے حدیث کی سند لی، چنانچہ موصوف کا بیان ہے

"میں نے اپنے استاذ مرزا حسن علی (صغیر) محدث سے سنا وہ اپنے اساتذہ سے نقل کرتے

تھے کہ ممنوع وہ سیاہ خضاب ہے جو وسمہ کے سوا اور چیزوں سے ہو۔[۱]"

اسی طرح موصوف نے مولانا نور لکھنوی سے بھی حدیث کا سماع کیا تھا، چنانچہ "تحفۃ الاخیار ترجمہ مشارق الانوار" کا جو نسخہ مطبع انوار محمدی لکھنؤ سے ۱۳۰۱ھ میں شائع ہوا تھا، اس کے آخر میں مولانا خرم علی کا نہایت مختصر سا تذکرہ بھی مذکور ہے، اس میں ہے:

"آپ نے مولوی نور صاحب اور مرزا حسن علی صاحب محدث سے علم حدیث حاصل کیا تھا۔"

مولانا نور لکھنوی اپنے وقت کے شیخ الحدیث اور اتقیاے روزگار میں سے تھے۔ "ارشاد رحمانی" میں موصوف کے متعلق مولانا فضل رحمان گنج مراد آبادی کا یہ بیان منقول ہے:

"ایک مرتبہ مولوی نور صاحب اور مولانا انوار صاحب لکھنوی اور شاہ عبد العزیز صاحب اور شاہ عبد القادر رحمہم اللہ کا ذکر آیا، کسی کی نسبت ارشاد ہوا کہ صلحاے وقت سے تھے کسی کی نسبت فرمایا ذاکر و شاغل تھے۔[۲]"

پھر دہلی جا کر جیسا کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کا بیان ہے،[۳] شاہ عبد العزیز دہلویؒ کے حلقۂ درس حدیث میں شریک ہو کر حدیث کی سند لی، پھر وطن آئے، لیکن زیادہ عرصہ قیام نہیں رہا، اور جلد ہی اپنے ننہیال قصبۂ آسیون (جو اناؤ کے مضافات میں ہے) میں منتقل ہو گئے، اور محلہ قاضیانہ میں حکیم اسحاق کی حویلی کے صدر دروازہ کی بالائی منزل میں رہنے لگے، اور یہیں درس و تدریس اور وعظ و تبلیغ کا شغل اختیار کیا۔

عادات و اخلاق | آپ نہایت پرہیزگار، متواضع، با اخلاق اور درویش سیرت بزرگ تھے، چھوٹی

---

[۱] "غایۃ الاوطار ترجمہ درمختار" طبع نولکشور ۱۹۲۵ء ج ۴ ص ۲۶۸ [۲] "ارشاد رحمانی و فضل یزدانی" از محمد علی مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۱۱ھ ص ۳۰، افسوس! اس سے زیادہ موصوف کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں۔
[۳] ملاحظہ ہو موصوف کا مضمون "ہندوستان میں علم حدیث" معارف جلد ۲۲ شمارہ نمبرہ

چھوٹی باتوں میں بھی شریعت کا بڑا خیال رکھتے اور نہایت سختی سے اس پر عمل کرتے تھے، چھوٹوں پر شفقت فرماتے اور اساتذہ اور بزرگوں کا بڑا احترام کرتے تھے۔

مولانا کا مسلک اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ موصوف ابتدا میں روش عام کے مطابق پکے حنفی تھے لیکن بعد میں تقلید سے آزاد ہو گئے یا نہیں، اس میں اختلاف ہے، امام خان ابو یحییٰ صاحب نوشہروی کا خیال ہے کہ اخیر عمر میں حدیث کی طرف میلان ہوا، اور تقلید سے آزاد ہو گئے، اور اسی پر خاتمہ ہوا، چنانچہ لکھتے ہیں:

"ابتداءً روش عام کے مطابق غالی مقلد اور بقول صاحب تذکرہ علماء ہند منع قرأت، فاتحہ خلف الامام پر رسالہ لکھا، مگر جب قسمت نے پلٹا کھایا اور مولانا اسماعیل شہیدؒ کی مصاحبت نصیب ہوئی تو اتباع سنت دامن گیر تقلید کا رنگ شوخ ہوتا گیا، اور اسی پر خاتمہ ہوا۔"[۱]

لیکن مولانا خرم علیؒ کی کتابوں کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ آخر دم تک فقہ حنفی پر عامل اور تقلید کے قائل رہے، چنانچہ اپنی آخری اور مشہور تالیف "غایۃ الاوطار ترجمہ درمختار" میں مسائل شتیٰ کے عنوان کے تحت خضاب کی بحث میں لکھتے ہیں:

"اور ہم حنفیوں کا مذہب یہ ہے کہ حنا اور وسمہ کا رنگ خوب ہے۔"[۲]

حضرت سید احمد شہیدؒ سے بیعت اور خلافت مولانا خرم علی سنت کے متبع، طریقت کے شیدا اور توحید کے بڑے دلدادہ تھے، یہی وجہ ہے کہ جب حضرت سید احمد شہیدؒ لکھنؤ وارد ہوئے تو آپ نے سید صاحبؒ کے دست حق پر بیعت کی، اور بڑی جلدی مدارج کمال کو طے کر لیا، سید صاحبؒ

---

[۱] "ہندوستان میں علم حدیث بطریق تالیف و علوم حدیث" معارف جلد ۶۰ دسمبر ۱۹۴۷ء

[۲] غایۃ الاوطار، طبع نولکشور، ج ۴ ص ۴۹۴

آپ کو خلافت سے سرفراز فرمایا، چنانچہ محمد جعفر تھانیسری نے "تواریخ عجیبہ" میں جہاں صاحبؒ کے خلفاء کو نام بنام گنایا ہے، وہاں مولانا خرم علی کا نام بھی ہے[1]۔

چونکہ مولانا خرم علی رسم و رواج اور بدعت کے ابتدا ہی سے سخت مخالف تھے، سید بریلویؒ سے بیعت کے بعد یہ شراب اور بھی دو آتشہ ہو گئی، چنانچہ مولوی رحمان علی "تذکرۂ علمائے ہند" میں لکھتے ہیں:

"ہموارہ در قلع بدعت و احیاے سنت می کوشید"

سید صاحبؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے کے بعد مولانا خرم علیؒ کے تعلقات سید صاحبؒ کے رفقاء سے عموماً اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ سے خصوصاً بڑے اچھے ہو گئے تھے، چنانچہ آپ نے بھی اسمٰعیل شہیدؒ کے طرز پر رد بدعت اور احیاے سنت کے لیے بڑی کوشش کی اور "تقویۃ الایمان" کے طرز پر "نصیحۃ المسلمین" لکھی، مگر اس میں توازن قائم رکھا اور اعتدال کی راہ اختیار کی، وہی کہی جو شاہ اسماعیل شہیدؒ کہتے تھے، طرز بیان بھی سادہ اور دلنشین اختیار کیا مگر اعتدال سے ذرہ برابر انحراف نہ ہو سکا اور یہی آپ کا بڑا کمال ہے۔

جب سید صاحبؒ نے جہاد کی دعوت دی اور سکھوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا، اسی زمانہ میں آپ نے ایک نہایت ہمت آفریں نظم لکھی، جو رسالہ جہادیہ کے نام سے مشہور رہی، جہاد میں شرکت کے لیے روانگی | مولانا خرم علی جہاد میں شرکت کے لیے اپنے ساتھ کم و بیش سو مجاہد[2]

---

[1] تواریخ عجیبہ موسوم بہ سوانح احمدی، مطبع فاروقی دہلی ۱۳۰۹ھ ص ۱۸۵ [2] بلہور کے بعض لوگوں کی زبانی سنا ہے کہ مولانا خرم علی بلہوری جب تعلیم سے فارغ ہو کر وطن لوٹے، اسی زمانہ میں ان کی بہن کی شادی ہوئی، والدہ ماجدہ شادی میں پوری رسمیں کرنا چاہتی تھیں، آپ نے سمجھایا، مگر وہ رسمیں کرنے پر مصر رہیں، آپ کو اسقدر ناگوار ہوا کہ اسی زمانہ میں بلہور سے اپنے ننہال قصبہ رسول آ گئے اور پھر کبھی بلہور نہیں گئے۔

کا ایک قافلہ ہندوستان سے لیکر سرحد پہنچے تھے، سید صاحبؒ جب دورۂ سوات سے فارغ ہوکر پنجتار پہنچے، اس وقت ہندوستان سے جو قافلے آئے، ان میں مولانا خرم علی بلہوریؒ کا قافلہ بھی تھا، چنانچہ مولوی رحیم بخش "اسلام کی دسویں کتاب" میں لکھتے ہیں:

(سید صاحبؒ) "فتحیاب ہوکر پنجتار کو لوٹ آئے اور راہ میں خبر سنی کہ ہندوستان سے قافلۂ احمد علی ہمشیرہ زادۂ سید صاحبؒ اور قافلہ مولوی مظہر علی عظیم آبادی اور قافلۂ مولوی خرم علی اور قافلۂ محمد علی رامپوری اور قافلۂ مولوی محبوب علی دہلوی آیا، یہ لوگ قریباً چھ سو آدمی کے تھے، لیکن مولوی محبوب علی دہلوی تیز مزاج تھے، بن نہ آئی اس لیے دہلی کو واپس تشریف لائے"[1]

منشی محمد جعفر تھانیسری کا خیال ہے کہ موصوف بھی ان لوگوں میں سے تھے جو کبیدہ خاطر ہوکر جہاد سے واپس گئے تھے، چنانچہ "تواریخ عجیبہ" میں لکھتے ہیں:

"مولوی خرم علی بلہوری صاحب نصیحۃ المسلمین ان کی اور بھی تصانیف ہیں، رسالہ جہادیہ بھی ان ہی کی تصانیف سے ہے، افسوس ہے کہ یہ بزرگ با اہتمام ادصاف قبل از معرکۂ بالاکوٹ رنجیدہ ہوکر ہندوستان کو لوٹ آئے تھے"[2]

لیکن مولانا غلام رسول مہر کو موصوف کے اس بیان سے اختلاف ہے، چنانچہ "جماعت مجاہدین" (طبع لاہور ص ۲۹۴) میں لکھتے ہیں:

"مشہور ہے کہ سید صاحبؒ کے ساتھ جہاد کے لیے گئے تھے، وہاں سے واپس آگئے، اور غالباً سید صاحبؒ نے انھیں دعوت و تبلیغ کے لیے مقرر کر دیا"

---

[1] اسلام کی دسویں کتاب الملقب بہ تاریخ لب لباب" مطبع مختاری لاہور ۱۳۰۱ھ ص ۲۳۲

[2] "تواریخ عجیبہ" مطبع فاروقی دہلی ۱۳۰۸ھ ص ۱۰۵

ہمارا بھی یہی خیال ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ منشی محمد جعفر تھانیسری کا تذکرہ بالا بیان کسی غلط فہمی پر مبنی تھا، کیونکہ مولانا خرم علیؒ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں سے تھے، آپ کے حالات کے مطالعہ اور سید صاحبؒ کی مردم شناسی کے پیش نظر یہی بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ سید صاحبؒ نے موصوف کو دعوت و تبلیغ کے واسطے ہندوستان واپس بھیج دیا تھا، دراصل سید صاحب کا یہی بڑا کمال تھا کہ وہ ہر شخص سے اس کی صلاحیت اور منصب کے مطابق کام لیتے تھے۔

آپ ہندوستان تشریف لائے، ادھر بالاکوٹ کا معرکہ پیش آیا، اور سید صاحب شہید ہوگئے۔ بظاہر تحریک کا خاتمہ ہوگیا، لیکن سید صاحب کے خلفاء نے جہاد سے منہ نہ موڑا اور اس تحریک کو زندہ رکھنے کے لئے اور قوم و ملت ... کی صلاح اور فلاح کے لیے جو مناسب سمجھا بروئے کار لائے، بعض نے جہاد بالسیف ہی کے لیے خفیہ کوششیں جاری رکھیں، اور بعض نے جہاد باللسان اور جہاد بالقلم کی راہ اختیار کی، اور تصنیف و تالیف اور وعظ و تبلیغ سے اس دعوت کو قائم رکھنے اور دین کو توہمات اور شرک و بدعت سے پاک کرنے کے لیے تادم مرگ جد وجہد کی۔

مولانا مسعود عالم ندوی "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" میں لکھتے ہیں:

"سید صاحبؒ کے دست مبارک پر بے شمار علماء نے جہاد و اصلاح کی بیعت کی، ایک اچھی خاصی تعداد سرحد کے معرکوں میں کام آئی، دوسروں نے شرک و بدعت کے مٹانے میں بڑی نمایاں خدمتیں انجام دیں، اور بلاشبہ آج اسلامی ہند میں جو کچھ صحیح الخیالی اور اتباع سنت کا جذبہ پایا جاتا ہے وہ ان ہی ارباب صدق و صفا کی کوششوں کا مرہون منت ہے۔"[1]

---

[1] "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" مولفہ مولانا مسعود عالم ندوی، مکتبہ ملیہ، راولپنڈی ص ۵۲

مولانا خرم علی معرکۂ بالاکوٹ کے بعد دعوت و اصلاح کی غرض سے مستقل طور پر تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے، چنانچہ بعض کتابوں کا ترجمہ مسلمانوں کی اصلاح اور ترویج سنت کی غرض سے کیا، اور بعض کا احباب کے اصرار سے اور بعض کا اہل مطابع کی فرمایش پر، اخیر عمر میں نواب ذوالفقار علی رئیس باندا نے اپنے یہاں بلایا تھا، اور ان ہی کی فرمایش سے فقہ کی عظیم الشان کتاب در المختار کا ترجمہ شروع کیا تھا،

وہابیت کا الزام | بعض علماء نے ان مصلحین کو غلط فہمی کی بنا پر محمد بن عبد الوہاب نجدیؒ کا ہم مسلک اور ہم عقیدہ سمجھا، اور بعض نے عناد کی وجہ سے محض اپنی شہرت اور ناموری کی خاطر ان پر بے بنیاد الزامات لگائے تاکہ یہ لوگ بدنام ہوں اور تحریک دعوت و اصلاح بھی کامیاب نہ ہو سکے، چنانچہ ان مصلحین کے متعلق مشہور کرایا کہ یہ بزرگوں کے قائل نہیں، نذر نیاز کے منکر ہیں، انہیں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت نہیں، حضور کی عظمت کے قائل نہیں، ان کے اعتقادات سلف صالحین کے خلاف ہیں، ان کا تعلق محمد بن عبد الوہاب نجدی سے ہے، اور یہ وہابی ہیں، غدر کے بعد برطانوی حکومت نے اس اختلاف سے پورا پورا فائدہ اٹھایا، اور ان کے خلاف اسی حربے کو استعمال کیا، جو سب سے زیادہ کارگر ثابت ہوا، چنانچہ سادہ لوح مسلمان ہی نہیں بلکہ ان کا اچھا خاصہ پڑھا لکھا طبقہ بھی اس پروپیگنڈے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا،

اس موقع پر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہندوستان میں وہابیت کا کوئی متعین مفہوم اور اس کی کوئی واضح تعریف نہ تھی، بلکہ محض ایک پروپیگنڈا تھا، یہی وجہ ہے کہ ہر جگہ اور ہر زمانہ میں اس کا مفہوم بدلتا رہا ہے، اور وہابی ہر جگہ جدا جدا معنی میں استعمال ہوا ہے، چنانچہ نواب صدیق حسن خاں "روضۃ الخصیب" میں لکھتے ہیں:

"پس اہل بدعت تقویۃ الایمان و نصیحۃ المسلمین و کتاب توحید و اقتضاء الصراط المستقیم

وامثال ایں رسائل جہاد را کتب مذہب وہابیہ نامیدہ اند، انصاف باید کرد کہ دریں رسائل جہاد کجا است آنچہ ہست بسوے مراتب تقویٰ و طہارت و ہدایت و ارشاد

چشم بد اندیش کہ برکندہ باد عیب نماید ہنرش در نظر

طرفہ آنکہ تہمت وہابیت در ہر شہر و ہر قطر رنگ دیگر دارد، در دکن وہابی کسے ست کہ مسکرات را مثل سیندھی تارک باشد، و در بمبئی وہابی کسے ست کہ یا شیخ عبد القادر شیئاً للہ نگوید، و در اودھ وہابی کسے ست کہ تقلید مذاہب مروجہ نماید و در دہلی کسے ست کہ گور پرستی ہی پرستد و در بدایوں کسے ست کہ معتقد بدعات مشائخ نیست و در حرمین شریفین کسے ست کہ ہم عقیدہ اہل نجد باشد"[1]

مولانا خرم علیؒ کے ابتدائی دور ہی میں یہ اعتراض اتنے عام ہو گئے تھے کہ موصوف کو اپنی تالیفات میں اس کی تردید کرنی پڑی، چنانچہ نصیحۃ المسلمین میں فرماتے ہیں:

بیانِ شرک سن کہتے ہیں مردک کہ منکر ہیں بزرگوں کے بلاشک
ارے لوگو! زباں اپنی کو روکو بزرگوں سے نہیں انکار ہم کو
خدا لعنت کرے اس روسیہ پر کہ جس کے دل میں ہو بغض پیمبر
جسے ہو بغض آلِ مصطفےٰ کا خدا اس کو کرے دوزخ کا کندا
جسے اصحاب حضرتؐ سے ہو انکار رہے ہر دم خدا کی اس پہ پھٹکار
جسے کچھ بغض ہووے اولیا سے ہمیشہ ابر لعنت اس پہ برسے
اب اتنا اور بھی سن رکھیے حضرت جو حق پر نا چلے اس پر بھی لعنت
ہمارا کام سمجھانا ہے یارو اب آگے چاہو تم مانو نہ مانو

---

[1] الروض الخصیب من تزکیۃ القلب المنیب" مفید عام اکبر آباد ۱۲۹۵ھ ص ۱۸۸

تو اپنے حال میں کچھ سوچ خرم زباں اب بند کر واللہ اعلم[1]

مولانا خرم علیؒ اولیاء اللہ کے بڑے عقیدتمند تھے۔ چنانچہ "شفاء العلیل" کے خاتمہ پر لکھتے ہیں:

حق تعالیٰ میری جھول چوک اور کج فہمی کو بہ برکت ارواح طیبۂ اولیاء کرام رضی اللہ عنہم کے معاف کرے اور ان حضرات کے نور باطنی سے میرے ظلمتکدۂ دل کو نورانی فرمائے، آمین"[2]

اسی طرح آپ کو رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑی عقیدت اور بے حد محبت تھی، جس پر ان کے حسب ذیل اشعار شاہد ہیں،

یا رسول اللہ یا خیر البشر لیجیے مجھ رو سیہ کی اب خبر
خود بدولت کے ترحم کے سوا اب کوئی صورت نہیں آتی نظر[3]

اسی طرح تحفۃ الاخیار کے خاتمہ پر ایک نہایت درد بھری نظم لکھی ہے جس کا آخری شعر یہ ہے:

یا رب اس عاجز کی دعا کر قبول خاتمہ بالخیر بحق رسول

شعر وسخن کا ذوق | مولانا کو شعر وسخن کا بھی ذوق تھا، کبھی کبھی خود بھی شعر کہتے اور خرم تخلص کرتے تھے، مگر شعر ان کا مشغلہ نہ تھا، بلکہ جو کچھ لکھتے تھے وہ ضرورت سے مجبور اور حالات سے متاثر ہو کر لکھتے تھے، اسی لیے وہ مقبول بھی ہوتا تھا، البتہ ابتدائی دور کی زبان صاف نہیں اور نہ اس میں چنداں شعریت ہے، مگر قبولیت اس کو بھی حاصل رہی ہے۔ بعد میں جو نصیحت آمیز نظمیں کہی ہیں، ان کی زبان بہت صاف اور رواں ہے، یہی وجہ ہے کہ انھیں قبول عام

---

[1] نصیحۃ المسلمین، مطبع احمدی امو جان ص ۴۴۲ [2] شفاء العلیل ترجمہ قول الجمیل، مطبع درخشانی ۱۸۶۱ء ص ۱۲۶

[3] تحفۃ الاخیار، ترجمہ مشارق الانوار، مطبع انوار محمدی لکھنؤ سنہ ۱۳۰۱ھ ص ۴۹۴

اور شہرت دوام حاصل رہا ہے،

تصانیف اور تالیفات (۱) **نصیحۃ المسلمین**، تقطیع خورد، صفحات ۵۲، مطبوعہ ٹائپ کلکتہ، یہ ۱۲۳۸ھ ۱۸۲۳ء کی تصنیف ہے۔ اس رسالہ میں شرک و بدعت کی حقیقت اور اس کی قباحت کو قرآن اور حدیث کی روشنی میں نہایت وضاحت سے سمجھایا گیا ہے، مولف نے وجہ تالیف اور ترتیب رسالہ کو ابتدا میں یوں بیان کیا ہے۔

"بعد سب کے سنا چاہیے کہ اب ہندوستان میں عجب ایک بلا پھیل گئی ہے کہ امت محمدی میں بہت لوگ شرک میں گرفتار ہیں، لیکن اکثر مسلمان بیچارے بسبب بے علمی اور ناواقفی کے لاچار ہیں تو اس واسطے بندۂ عاجز خرم علی کے دل میں آیا کہ اس شرک کی برائی قرآن شریف سے ثابت کیجئے اور ہر آیت کا ترجمہ ہندی زبان میں صاف صاف بیان کریئے[1] تا ہر ایک کو فائدہ عام ہو۔ جو مسلمان بھائی کہ عربی نہیں جانتے اس کو

---

[1] اس جملہ سے یہ بات واضح ہوتی ہو کہ موصوف نے نصیحۃ المسلمین دراصل اردو ہی میں تصنیف کی ہے،

نصیحۃ المسلمین کا ایک فارسی مخطوطہ اسلامیہ کالج پٹنہ ورمیں بھی محفوظ ہی جس سے دھوکا ہوتا ہے کہ شاید موصوف نے یہ کتاب پہلے فارسی میں لکھی ہو اور پھر اس کو اردو کا جامہ پہنایا ہو، لیکن ایسا نہیں کیونکہ اس کا کوئی ثبوت مخطوطہ سے نہیں ملتا، اس کے برخلاف ایسے شواہد موجود ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نصیحۃ المسلمین کے بعد کسی عالم نے اس کو فارسی کا جامہ پہنایا ہے، وہ شواہد حسب ذیل ہیں:

(۱) کتاب کا سرورق موجود نہیں،

(۲) فارسی مخطوطہ میں خرم کا املا واؤ کے ساتھ خورم ہے، ظاہر ہے کہ اگر موصوف کی لکھی ہوئی ہوتی یا آپ ہی کا کیا ہوا ترجمہ ہوتا تو خرم کا املا واؤ معدولہ کے ساتھ نہ ہوتا، کیونکہ موصوف کی تمام تصنیفات اور تالیفات میں خرم کا املا بلا واؤ ہے۔ (باقی حاشیہ ص ۳۴۵ پر)

سمجھکر شرک کی آفت سے بچیں، اور اپنے پیغمبر کی راہ کو اختیار کریں، اور جو لوگ کہ اس کو بھی نہ سمجھیں اور نہ مانیں تو اپنا سر کھا دیں، قبر میں آپ ہی معلوم ہوگا بسنہ لکھے۔ بارے الحمد للہ کہ ۱۲۳۸ھ میں یہ رسالہ بن چکا اور اس کا نام نصیحۃ المسلمین رکھا اور سب مطلب اس کا پانچ فصلوں میں لکھا"[1]

حاشیہ ص ۳۳۴) (۳) بعض اشعار کا املا بھی اس طرح لکھا ہو جس سے بعض شعر خارج الوزن ہو جاتے ہیں،

(۴) فارسی مخطوطے میں سال تصنیف بھی وہ مندرج ہو جو اصل تصنیف کا ہو۔ یہ بھی اسی امر کی دلیل ہے کہ یہ اردو سے منتقل ہوا ہے،

(۵) یہ بعینہ نصیحۃ المسلمین کا فارسی ترجمہ نہیں ہو، بلکہ مترجم نے مطالب کتاب کو سامنے رکھکر یہ اپنے الفاظ میں ادا کیا ہے، اس لیے آزاد ترجمہ ہے، لفظی ترجمہ نہیں،

(۶) اردو نظم کا ترجمہ بھی پورا نہیں ہے،

(۷) مخطوطات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مترجم ترجمہ پر نظر ثانی بھی نہیں کر سکے،

(۸) خاتمۃ الکتاب بھی نہیں ہے جس سے سنہ کتابت اور کاتب کا نام معلوم ہو سکتا،

ان شواہد اور مولانا خرم علی بلہوری کے اس جملہ "اور ہر آیت کا ترجمہ ہندی زبان میں صاف صاف کیے" (فرمائی تھی) سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ مصنف نے "نصیحۃ المسلمین" دراصل اردو ہی میں تصنیف کی اب ہم فارسی مخطوطہ سے کچھ عبارت ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں اور اس کے سامنے دوسرے کالم میں اردو کی عبارت بھی لکھتے ہیں جس سے ناظرین کو اس امر کا خود اندازہ ہو سکے گا،

(فارسی)	(اردو)
لہذا بندۂ عاجز خرم علی را عزم جزم برین	اس واسطے بندۂ عاجز خرم علی کے دل میں آیا کہ
شد کہ بدی قباحت شرک را از آیات قرآن مجید	اس شرک کی برائی قرآن شریف سے ثابت کیجئے

(باقی ص ۳۳۶ پر)

[1] نصیحۃ المسلمین مطبع احمدی امرجان ص ۲ و ۳ ؏ صحیح "خرم" ہے،

یہ کتاب شاہ اسمعیل شہیدؒ کی "تقویۃ الایمان" کے بعد شرک و بدعت میں سب سے پہلی تصنیف ہے، اس میں وہی باتیں ہیں جو تقویۃ الایمان میں ہیں لیکن مختصر اور مکمل، انداز بیان نہایت متین اور سلجھا ہوا، کتاب کے آخر میں ان ہی مطالب کا خلاصہ نظم میں بھی کر دیا ہے، جس نے اس کتاب کو اور بھی دلکش بنا دیا ہے،

(بقیہ حاشیہ ص ۳۲۵) بوجہ احسن ثابت کنم و زیر ہر آیت
ترجمہ آں از زبان فارسی صاف صاف بیان نمایم
تا ہر مسلمان فارسی خواں فوائد معانی ایں آیات را
فہمیدہ الخ ....

(سال تصنیف)

یکہزار و دو صد و سی و ہشت

(نظم فارسی)

خدا فرمودہ در قرآن مفسر
بمن محتاج اند پیر و پیغمبر[1]
بغیر از من کسے را نیست طاقت
برآوردن شما را ذرہ حاجت
چو خود محتاج باشند[2] دیگرے را
از ایشاں خواستن حاجت چہ معنی
نداند وز غیرش خواستن کام
ہمیں را شرک شد لے دوستانام
ز قرآں شد ہمیں مضمون محقق
کہ ہرگز می نبخشد شرک مطلق

اور ہر آیت کا ترجمہ ہندی زبان میں صاف صاف
بیان کریے، تا ہر ایک کو فائدہ عام ہو، اور جو مسلمان
بھائی کہ عربی زبان نہیں جانتے اس کو سمجھ کر شرک
کی آفت سے بچیں،
الحمد للہ کہ سنہ بارہ سو اڑتیس ہجری میں یہ رسالہ بن چکا،

(نظم اردو)

خدا فرما چکا قرآں کے اندر
مرے محتاج ہیں پیر و پیمبر
نہیں طاقت سوا میرے کسی میں
کہ کام آئے تمھارے بے کسی میں
جو خود محتاج ہوئے دوسرے کا
بھلا اس سے مدد کا مانگنا کیا؟
خدا سے اور بزرگوں سے بھی کہنا
یہی ہے شرک یارو اس سے بچنا
خبر قرآں میں ہے یہ محقق
نہ بخشے گا خدا شرک کو مطلق

(باقی ص ۳۲۷)

---

[1] یہاں صحیح "پیمبر" ہے [2] یہاں صحیح "باشد" ہے

یہی وجہ ہے کہ بہت مقبول ہوئی، اور بڑی کثرت سے چھپی، پہلے پڑھے لکھے خاندانوں میں اس نظم کا بڑا چرچا رہتا تھا، بڑی بوڑھیاں اس کو بڑے شوق سے پڑھتی تھیں، چنانچہ محی الدین قادری زور لکھتے ہیں: "یہ نظم راقم الحروف کے بچپن میں بہت مقبول تھی، اور اسکی ابیات اکثر بوڑھی خواتین کو یاد تھیں"[۱]

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۶) معاذ اللہ کسے را کو نہ بخشد
مقرر در جہنم پاش لغزد

اگر ایمان بر قرآن دارید
چرا اندر دنیا زیر آرید

شما را ایں رسوم بد کہ آموخت
محمدؐ کے چراغ شرک افروخت

بلے شیطان سوء آل آدم
نشان خود می دہد راہ جہنم

کسے را بت پرستی می نماید

. . . .

غرض ایں ہر دو را از حق جدا کرد
ز راہش بردہ در دوزخ رہا کرد

اب آگے فارسی شعر نہیں ہیں۔

معاذ اللہ جسے اس نے نہ بخشا
مقرر وہ جہنم میں پڑے گا

اگر قرآن کو سچ جانتے ہو
تو پھر تم منتیں کیوں مانتے ہو

تمھیں یہ طور بد کس نے سکھایا
محمدؐ نے کہاں ہے یہ بتایا

ہے شیطاں دشمن اولاد آدم
سکھاتا ہے وہی راہ جہنم

کسی کو بت پرستی ہے سکھاتا
کسی کو ہے وہ قبروں پر جھکاتا

غرض اللہ سے دونوں کو روکا
بھلا کر راہ جا خندق میں جھوکا

نصیحۃ المسلمین کے ان اشعار کی تضمین مولانا محمد انوار اللہ حیدر آبادی المتوفی ۱۳۳۶ھ نے کی تھی۔[۲]

[۱] تذکرہ اردو مخطوطات، مرتبہ سید محی الدین قادری زور، اعظم اسٹیم پریس حیدر آباد دکن ۱۹۴۳ء ج ۱ ص ۱۷۹

[۲] موصوف کے تذکرہ کے لیے ملاحظہ ہو "دکن میں اردو" مولفہ نصیر الدین ہاشمی مطبوعہ لاہور ۱۹۵۲ء ص ۶۰۷

اس نظم کے چند شعر یہ ہیں:

مسلمانوں ذرا سوچو تو دل میں ۔۔۔ پھنسے ہو کس طرح تم آب و گل میں

بہت غفلت میں سوئے اب تو جاگو ۔۔۔ خدا کے ہوتے بندوں سے نہ مانگو

وہ مالک ہے سب آگے اس کے لاچار ۔۔۔ نہیں ہے کوئی اس کے گھر کا مختار

وہ کیا ہے جو نہیں ہوتا خدا سے ۔۔۔ جسے تم مانگتے ہو اولیا سے

بقیہ اشعار سابق میں گزر چکے ہیں،

بقیہ حاشیہ ص۳۴۲) اور اس کا نام "خدا کی قدرت" رکھا تھا، یہ بظاہر ان اشعار کی شرح معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں مولانا خرم علی کے اشعار کی تردید ہے، چنانچہ مولوی انوار اللہ مرحوم نے اس نظم میں استعانت اولیاء وغیرہ کو جائز قرار دیا ہے، باوجود کوشش وہ نظم ہم کو دستیاب نہ ہو سکی، لیکن اس نظم کی حقیقت اور اس کے مطالب کا خلاصہ اس اعلان سے ہو سکتا ہے جو مفاتیح الاعلام[۵] کی فہرست افادۂ انوار کے ساتھ موصوف کی تصنیفات کے تحت نقل کیا گیا ہے، وھو ھذا

"خدا کی قدرت (نظم اردو) صفحات ۸ تقطیع متوسط مطبوعہ مجلس اشاعۃ العلوم حیدرآباد دکن، یہ رسالہ تضمین اشعار مولوی خرم علی صاحب مرحوم ہے، جس میں مرحوم نے پردۂ نظم توحید میں حضرت نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام اور اولیاء اللہ رضوان اللہ تعالیٰ عنہم سے استمداد کی ممانعت اور تحذیر کی تھی، حضرت مولانا ممدوح نے ان ہی اشعار کی تضمین و تطبیق کے لحاظ سے جواز استمداد کا ثبوت دیا ہے، گو بظاہر مرحوم کے اشعار کی شرح ہے لیکن باطن میں منکرین استمداد کا جواب مدلل ہے، جو مفید دکار آمد اہل سنت و جماعت ہے"

حکیم عبد الودود دلسیر[؟] نے مولانا خرم علی کی اس نظم پر مسدس کہا جس میں ان ہی اشعار کی

۵ مفاتیح الاعلام مطبوعہ محمود پریس حیدرآباد دکن ج ۱ ص ۱

نصیحۃ المسلمین" ہی وہ کتاب ہے جس نے موصوف کو اردو لکھنے والوں میں بڑا ممتاز مقام عطا کیا ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ سید صاحبؒ کے خلفا نے جہاں اسلام کی صحیح ترجمانی کی وہاں انھوں نے اردو زبان کو بھی بڑی ترقی دی، چنانچہ غدر سے پیشتر عام طور پر فارسی لکھنے کا رواج تھا، ان بندگان خدا نے اسلام کی ترجمانی کے لیے جو زبان اختیار کی وہ اردو تھی، وہ اردو ہی میں وعظ کہتے اور اسی میں مذہبی عنوانات پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھتے تھے، اور روزمرہ کی نہایت سادہ زبان استعمال کرتے تھے، گو یہ زبان پرانے طرز کی ہے، مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۸) شرح لکھی ہے، اور در پردہ مولانا انوار اللہ مرحوم کے اشعار کا جواب لکھا ہے، یہ نظم جو در اصل جواب الجواب ہے، ہم کو دستیاب ہوگئی ہے، لیکن طویل زیادہ ہے اس لیے قلم انداز کی جاتی ہے

نصیحۃ المسلمین اپنے ابتدائی دور ہی میں اتنی مقبول ہوگئی تھی کہ سید احمد شہیدؒ کے کسی غیر مقلد بنگالی مرید نے اردو میں اس کا رد لکھا، اور اس کا نام "تنبیہ المضلین" رکھا، یہ کتاب نثر میں ہے، مگر ابتدا میں حمد و نعت نظم میں ہے، اور خاتمہ بھی ایک نظم پر ہے، اس کتاب کا ایک مخطوطہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے، چنانچہ بلوم ہارٹ کا بیان ہے،

"تنبیہ المضلین" (اس کا آغاز یوں ہے)

فصل اول حمد اور (۲) نعت اور (۳) سبب تصنیف کتاب کا،

معلم اور عالم تو ہے یا رب	جہاں میں ہر سکھایا تیرے سب[1]
ولائے بے تیرے تکا نہ ڈولے[2]	بلائے بن تیرے کوئی نہ بولے
زبان کو خاک سے تونے بنایا	پھر اس کو بات کرنا بھی سکھایا

[1] مصرعہ ثانی یوں ہونا چاہیے: جہاں میں ہے سکھایا تو نے ہی سب [2] یہ شعر یوں ہونا چاہیے،

[2] ولائے بن ترے تکا نہ ڈولے بلائے بن ترے کوئی نہ بولے

احکامات الٰہی کے لیے جتنی سادہ اور سہل زبان لکھی جا سکتی تھی، ان بزرگوں نے لکھی، بلکہ بعض کی زبان تو ایسی صاف و سادہ ہے جو آج بھی سہل ممتنع سے کم نہیں، ان اردو لکھنے والوں میں مولانا خرم علی کا نام بھی بہت ممتاز ہے، اور اس حقیقت کا اعتراف اردو زبان کے تاریخ نگاروں کو بھی کرنا پڑا ہے، رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو میں لکھتے ہیں:

"مولوی اسماعیل صاحب کا مشہور رسالہ تقویۃ الایمان اور نیز دیگر مریدان مولوی سید احمد کی تصانیف مثلاً ترغیب جہاد، ہدایت المومنین

(بقیہ حاشیہ ص ۳۳۹) اس رسالہ کا مصنف مذہبی مصلح سید احمد بریلوی کا پیرو ہے، جو شاہ عبد العزیز دہلویؒ کے مرید اور شاگرد تھے، اس میں اس نے وہابی نظریہ کی تائید کی ہے کہ (بغیر مجتہدین کی تقلید کے) ہر شخص کو قرآن سے استنباط مسائل میں اجتہاد کا حق حاصل ہے، اور نیز یہ کتاب مولوی خرم علی بلہوری کی تصنیف نصیحۃ المسلمین (۱۲۳۸ھ / ۱۸۲۲ء) کا جواب ہے۔"

یہ کتاب نثر میں ہے، جس کے شروع میں حمد باری تعالیٰ میں ایک نظم ہے، اور اس کا خاتمہ بھی ایک نظم پر ہے، مصنف نے اپنے دلائل اور براہین کی تائید میں نصوص قرآنی پیش کی ہیں جو خط نسخ میں لکھی ہوئی ہیں، اور خاتمہ پر یہ شعر ہیں:

نہ جاؤں گا کبھی اب مدرسہ میں | نہ شیطان کے پڑوں گا وسوسہ میں
گذشتہ سب گنہ اب معاف کر تو | دے اس عجز پہ الطاف کر تو[1]"[2]

"تنبیہ المغفلین" سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں بنگال کے اندر اردو عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی،

[1] مصرعہ ثانی یوں ہونا چاہیے: دلے اس عجز پہ الطاف کر تو،
[2] کیٹلاگ آف ہندوستانی سنسکرپٹ مطبوعہ لندن ص ۷

نصیحۃ المومنین[1]، موضع الکبائر والبدعات، مائۃ مسائل وغیرہ۔ یہ سب اسی زمانہ کی کتابیں ہیں جو دراصل اشاعت دین کی غرض سے لکھی گئی تھیں، جن سے زبان اردو کو بھی ضرور تقویت پہنچی۔[2]

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

"ایک بہت بڑی تحریک جو ہرچند ادبی نوعیت نہیں رکھتی مگر اس سے بلاشبہ نثر اردو کو بہت فائدہ پہنچا، اور اس کی تقویت کا باعث ہوئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اشاعت مذہب و ہدایت کی صورت میں رونما ہوئی جس کی وجہ سے تبلیغ دین کی غرض سے مختلف کتب و رسائل عوام الناس کے فائدے کے واسطے صاف اور سہل زبان میں لکھے گئے۔"[3]

---

[1] اس کتاب کا صحیح نام نصیحۃ المسلمین ہے، نصیحۃ المومنین نہیں، رام بابو سکسینہ اور بعد کے مصنفین کا نصیحۃ المومنین لکھنا لغزش قلم ہے،

بلومہارٹ (Blumhardt) نے کیٹلاگ آف ہندوستانی مینسکرپٹ مطبوعہ لندن ۱۹۲۶ء (ص ۸۳ میں) اگرچہ نصیحۃ المومنین کا نام ملتیہ بھی لکھا ہے اور اس کا ایک مخطوطہ بھی انڈیا آفس میں موجود ہے، مگر یہ کوئی مستقل اور علاحدہ تصنیف نہیں ہے، بلکہ کاتب نے نصیحۃ المسلمین کی آخری نظم ہی کو نصیحۃ المومنین کا نام دیدیا ہے، چنانچہ بلومہارٹ لکھتا ہے:

"نصیحۃ المومنین" یہ شرک اور بے دینی کے خلاف ایک نظم ہے، یہ نظم اور مثنوی مولوی خرم علی بلہوری کی ہے، اور ان ہی کی کتاب "نصیحۃ المسلمین" جو ۱۲۴۳ھ کی تصنیف ہے، سے ماخوذ ہے،

اور اس کا پہلا شعر یہ ہے: خدا فرما چکا قرآں کے اندر مرے محتاج ہیں پیرو پیمبر

اور آخری شعر یہ ہے: تو اپنے حال میں کچھ سوچ خرم زباں اب بند کر واللہ اعلم

[2] تاریخ ادب اردو مترجمہ مرزا محمد عسکری، طبع سوم نولکشور، حصہ نثر باب ۵، ص ۵

[3] ایضاً ملاحظہ ہو کتاب مذکور ص ۳۲

رسالہ نصیحۃ المسلمین کی زبان اگرچہ سادہ ہے لیکن جملوں کی ساخت اور انداز بیان میں قدامت ہے[1]

بلوم ہارٹ کا بیان ہے:

"یہ کتاب سب سے پہلے ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۸ء میں کلکتہ سے چھپی، اور پھر اس کے دوسرے ایڈیشن دہلی، مدراس اور میرٹھ سے شائع ہوئے ہیں"[2]

لکھنؤ میں بھی متعدد بار چھپی ہے، چنانچہ مطبع مصطفائی سے بھی ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء میں متوسط تقطیع پر چھپی ہے، اس نسخہ پر سلطان المطابع کی مہر بھی ہے، یہ نسخہ کپتان مقبول الدولہ بہادر محمد مہدی علی خاں کی نگرانی میں نہایت آب و تاب سے شائع ہوا تھا صحت کے لحاظ سے بے نظیر ہے، ایک نسخہ مطبع احمدی (موہان) کا طبع شدہ میرے والد منشی محمد عبد الرحیم خاں خرم چودھری کے پاس تھا، جو اب راقم السطور کے پاس ہے، یہ بھی بہت صحیح نسخہ ہے، نصیحۃ المسلمین ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء میں مطبع مصطفائی کانپور سے چھپی تھی، اس کے بعد پھر متعدد مطابع سے شائع ہوتی رہی ہے، (باقی)

---

[1] راقم نے اس رسالہ کی زبان کو ذرا بدلے بغیر انداز بیان ڈھال دیا ہے، نیز اس میں ذیلی عنوانات قائم کیے، تعلیقات پر مختصر نوٹ لکھے ہیں اور تشریح طلب امور کی وضاحت کی ہے، جس سے اس کی افادیت اور بڑھ گئی ہے، انشاء اللہ عنقریب اصح المطابع کارخانہ تجارت کتب، کراچی کی طرف سے شائع ہو جائے گی،

[2] کیٹلاگ آف ہندوستانی مینسکرپٹ (فہرست مخطوطات اردو برٹش میوزیم) طبع لندن ۱۹۲۶ء ص ۰۰

کیا متفقہ اسلامی احکام کو بھی اجتہاد کے ذریعہ بدلا جا سکتا ہے؟

(کیا کتاب و سنت، فقہا اور خلفائے راشدینؓ کے فیصلوں سے اس کا ثبوت ملتا ہے؟)

از جناب مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دار المصنفین

جن اسلامی ملکوں میں مکمل اسلامی دستور کو دوبارہ نافذ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، وہاں پڑھے لکھے مسلمانوں کے ایک حلقہ کے سامنے یہ سوال بڑی سنجیدگی سے درپیش ہے کہ جن سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل[1] میں کتاب و سنت کی صریح ہدایات موجود ہیں، ان کو من و عن تسلیم کر لیا جائے یا مصالح و حالات کے اعتبار سے ان میں ترمیم، اضافہ یا تخصیص پیدا کی جائے۔

تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ یہ کہتا ہے کہ کتاب و سنت کے تمام احکام ابدی اور دائمی ہیں، ان میں کسی ترمیم و اضافہ کی قطعی گنجایش نہیں ہے، اسلامی دستور کے نفاذ کے معنی یہ ہیں کہ اسلام نے عقائد، عبادات اور اخلاق کی طرح سیاسیات، معاشرت اور معاشیات کے سلسلہ میں حرام و حلال کی جو حدیں مقرر کر دی ہیں ان سے باہر قدم نہ نکالا جائے، اگر حالات ان حدود کا ساتھ نہ دیں تو اسلامی احکام کو حالات کے موافق بنانے کے بجائے خود حالات و ماحول کو ان کے موافق بنانے کی کوشش کی جائے، کیونکہ اگر ان میں ترمیم و اضافہ کر دیا جائے تو

---

[1] اصل سوال ان ہی شعبوں کے بارے میں ہے، ورنہ اسلامی عقائد، و عبادات اور اخلاق کے بارے میں تبدیلی کا کوئی سوال سنجیدہ طبقہ میں نہیں ہے، جو لوگ ان شعبوں میں بھی تبدیلی کرنا چاہتے ہیں ان کو سرے سے اسلام ہی سے دشمنی ہے

اسلامی دستور کے مکمل اور دائمی ہونے کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ اور جہاں بالکل مجبوری آپیش آجائے یا جن مسائل میں صراحۃً کوئی ہدایت موجود نہ ہو وہاں کتاب وسنت کے اصولی احکام میں استنباط و اجتہاد کیا جائے، استنباط و اجتہاد کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کتاب وسنت کے اصولی احکام کو پس پشت ڈال دیا جائے، اور ان کے صریح احکام کے منشا کے خلاف کوئی ترمیم یا اضافہ کیا جائے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی احکام میں جو لچک اور وسعت موجود ہے اس سے فائدہ اٹھا کر پیش آمدہ مسائل کی دشواری کو رفع کرنے کی کوشش کی جائے،

اس کے برخلاف تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا طبقہ جس میں زیادہ تر جدید تعلیم یافتہ اور کچھ روشن خیال علما شامل ہیں، یہ کہتا ہے کہ اسلام نے سیاست، معیشت اور معاشرت میں جو حدیں مقرر کی ہیں، ان کو حالات اور ماحول کے تقاضے کے تحت بدلا اور توڑا جاسکتا ہے، اس لیے کہ سیاست، معیشت اور معاشرت کے مسائل میں ہمیشہ ارتقاء ہوتا رہتا ہے، اس لیے اس ارتقاء کا ساتھ دینا ضروری ہے، ورنہ اسلامی ممالک معاشی، معاشرتی اور سیاسی بدحالی میں مبتلا ہو جائیں گے، اور ظاہر ہے کہ یہ بات اسلامی دستور کی روح کے منافی ہے،

اس حلقہ میں کچھ لوگ تو واقعی اخلاص سے یہی رائے رکھتے ہیں، مگر ان میں بیشتر یا تو مغربی نظام کی مرعوبیت کی بنا پر ایسا کہتے ہیں، یا پھر اپنی کم علمی اور آزاد روی کی وجہ سے ایسا چاہتے ہیں، یہ حلقہ اپنی رائے کو مدلل بنانے اور قوی ثابت کرنے کے لیے قرآن وحدیث اور فقہ کی کتابوں سے کچھ دلائل بھی پیش کرتا ہے، اور ... مزید وزنی بنانے کے لیے خلفائے راشدینؓ کے ان فیصلوں کو پیش کرتا ہے جو بظاہر کتاب وسنت کے احکام کے خلاف نظر آتے ہیں،

مثلاً حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خمس میں اہل بیت کو مقررہ حصہ نہیں دیا، یا فدک کی جائداد اہل بیتؓ کے سپرد نہیں کی، حالانکہ عہد نبویؐ میں یہ دونوں چیزیں ان کے لیے مخصوص تھیں،

حضرت عمرؓ کے مشورہ سے حضرت صدیقؓ نے مؤلفۃ القلوب کی امداد بند کر دی، جو ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں ملتی تھی، اور جس کا ذکر قرآن میں بھی ہے، یا حضرت عمرؓ نے قطع ید کا حکم منسوخ کر دیا یا ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقوں کو طلاق بائن قرار دیا یا امہات اولاد کی خرید فروخت بند کر دی یا سواد عراق کی زمین فوجیوں میں تقسیم کرنے کے بجائے۔ ۔ ۔ ۔ رفاہ عام کے لیے مخصوص کر دی، یا شراب کی حد اسّی کوڑے مقرر کی، وغیرہ وغیرہ،

اس بات میں تو مسلمانوں کے کسی گروہ کو اختلاف نہیں ہے کہ موجودہ دور میں جس ملک میں بھی اسلامی دستور نافذ ہوگا وہاں نظام سیاست و معیشت کا ڈھانچہ بدل دینے کے بعد بھی کچھ ایسے معاشی اور تمدنی مسائل ضرور باقی رہیں گے، جنکو فوراً بدل دینے میں یا تو نظام حکومت میں خلل پڑے گا، یا کم از کم ان کے بدلنے میں دیر لگے گی، ظاہر ہے کہ ان میں جو صورت بھی ہوگی ان مسائل میں اسلامی دستور کے نافذین کو اجتہاد سے کام لینا پڑے گا، اسی طرح موجودہ نظام جمہوریت میں بہت سے معاشی مسائل کا جو حل سوچا گیا ہے، اور جس پر عمل درآمد بھی ہو رہا ہے، ان میں اگر تھوڑی سی تبدیلی کر کے ان کو حلال یہ حرام کی قید کا پابند کر دیا جائے تو اسلامی نظام معیشت کے موافق بنایا جا سکتا ہے، مثال کے طور پر جمہوری ملکوں کے مزدوروں کے حقوق و تحفظ کے قانون میں اگر تھوڑی سی تبدیلی کر دی جائے تو ان کو اسلامی قانون اجرت کے مطابق بنایا جا سکتا ہے لیکن سودی تجارت، فارن ایکسچینج، بینکنگ وغیرہ اور اس سے بڑھکر انفرادی اور اجتماعی آزادی کے سلسلہ میں حکومت کے دائرۂ اختیار کی تعیین میں بھی اجتہاد کی ضرورت ضرور پیش آئے گی،

مثال کے طور پر موجودہ دور میں رسل و رسائل کے سارے ذرائع حکومت کے ہاتھ میں ہوتے ہیں، خواہ وہ حکومت جمہوری ہو یا اشتراکی یا شخصی، اب اگر کہیں اسلامی دستور نافذ

نا ہے تو اسلامی حکومت کو اس پہ غور کرنا ہوگا کہ .... اسلامی تشریحات، اور
د نبوی اور عہد صحابہ کے تعامل کے پیش نظر رسل و رسائل کے ذرائع کو افراد کے ہاتھوں میں
ے دیا جائے یا .... اجتماعی مفاد کے پیش نظر ان کو حکومت کے اختیار ہی میں رہنے
یا جائے، اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ امریکہ میں ابھی پچھلے سال بس ٹرانسپورٹ کا جتنا حصہ حکومت
کے اختیار میں تھا، وہ بھی انفرادی ملکیت میں دے دیا گیا ہے، اور ہر سال اس طرح کچھ نہ کچھ چیزیں
حکومت کے ہاتھوں سے نکال کر انفرادی ملکیت میں دیدی جاتی ہیں، چنانچہ امریکہ کی تمام بڑی
بڑی صنعتیں حکومت کے بجائے افراد کے ہاتھ میں ہیں،

میرے خیال میں اس بارے میں پہلے گروہ کو بھی کوئی اختلاف نہیں ہوگا، کہ بنیادی ضروریات
پیدا کرنے والے ذرائع اور عاملین کو کم از کم موجودہ حالت میں کچھ دنوں تک حکومت کے قانونی
نگرانی میں رہنا چاہیے جس کی گنجائش کتاب وسنت میں موجود ہے، اصل اختلاف یہاں سے
شروع ہوتا ہے کہ موجودہ نظام میں جو چیزیں صراحۃً اسلامی تعلیم کے خلاف ہیں، مثلاً موجودہ تجارت
میں سود، سٹے بازی، ذخیرہ اندوزی، مستقبل کے سودے، یا سودی بینکنگ وغیرہ، یا سیاسی مسائل
میں طریقۂ انتخاب، عورتوں اور غیر مسلموں کی نظام حکومت میں شرکت، یا معاشرتی مسائل میں
نکاح و طلاق کے سلسلہ میں حکومت کی مداخلت وغیرہ، یہ اور اس طرح کے اور بہت سے مسائل
میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کو جوں کا توں باقی رہنے دیا جائے، اور جو اسلامی احکام ان کے
خلاف پڑتے ہیں، ان میں تبدیلی کر دی جائے، یا یہ کہ ان مسائل کی صورت ہی کو آہستہ آہستہ بدلنے
کی کوشش کی جائے، اور جہاں غیر معمولی حرج واقع ہوتا ہو، ان کو جس حد تک ممکن ہو اسلامی روح
سے قریب لاکر کچھ دنوں تک اسی حال پر چھوڑ دیا جائے، اور جب تجربہ سے یہ بات واضح ہو جائے
کہ ان کو اسلامی روح کے بالکل مطابق کر دینے میں معاشی یا معاشرتی فساد رونما ہونے کے بجائے

صلاح پیدا ہوگی، تو پھر ان کو بدل دیا جائے ورنہ جوں کا توں رہنے دیا جائے،

مثال کے طور پر یہ مسئلہ کہ ایک مرد بیک وقت متعدد عورتوں کو اپنے حبالۂ عقد میں لا سکتا ہے یا نہیں، یا عورتوں کو مردوں کے دوش بدوش اسمبلیوں میں نمایندگی دیجائے یا نہیں؟ اس بارے میں دوسرا گروہ تو یہ کہتا ہے کہ قانوناً ایک مرد کو بیک وقت دو یا اس سے زیادہ عورتوں سے نکاح کرنا ممنوع قرار دیا جائے، اسی طرح بغیر کسی قید کے مردوں کی طرح عورتوں کو بھی آبادی کے تناسب سے دستور ساز اسمبلیوں اور پارلیمنٹوں میں نمایندگی دیجائے، کیونکہ مصلحت اور موجودہ تمدن کا یہی اقتضا ہے، اس کے برخلاف پہلا گروہ یہ کہتا ہے کہ اس بارے میں اسلامی احکام کو پس پشت ڈالنے اور اس میں بے وجہ اجتہاد کرنے اور نئے قوانین بنانے کی قطعی ضرورت نہیں ہے، اس کے بغیر نہ تو معاشرت میں کوئی خلل واقع ہوتا ہے اور نہ سیاست میں، بلکہ جن ممالک میں عورتوں کو نمایندگی دی گئی ہے اور شادی پر پابندی لگائی گئی ہے، ان ممالک میں جنسی جرائم اور معاشرتی تباہ حالی کے واقعات اتنے زیادہ ہوگئے ہیں کہ خود وہاں کی حکومتیں اب اپنے معاشرتی قانون پر نظر ثانی کر رہی ہیں، خود پاکستان میں جس کثرت سے جنسی جرائم ہو رہے ہیں، ان کے پیش نظر یہ اقدام اس کی معاشرت کو اور زیادہ تباہ کرکے رکھ دے گا،

اجتہاد جو لوگ اسلامی احکام میں اپنی خواہش یا موجودہ تمدن سے مرعوبیت کی بنا پر تبدیلی کرنا چاہتے ہیں، وہ اجتہاد کی ایک نئی تعریف کرتے ہیں، پاکستان میں عائلی کمیشن نے جو اپنی رپورٹ پیش کی تھی، اس میں اجتہاد کی یہ تعریف کی ہے:

> "لفظ اجتہاد کے معنی کوشش کرنے کے ہیں اور اسلامی قانون کی اصطلاح میں اس کا مفہوم کسی قانونی مسئلہ پر آزادانہ رائے قائم کرنا ہے۔"

پھر آگے اجماع پر خط نسخ پھیرتے ہوئے ارکان کمیشن تحریر فرماتے ہیں:

"جس طرح سائنس میں ہے، اسی طرح قانون کی تاریخ میں بھی یہ بات ہے کہ بعض اوقات کسی خاص دور کے تمام مجتہدین کا کسی بات پر اجماع اس کی صحت اور صداقت کی کوئی ضمانت نہیں ہے"۔

اگر یہ حضرات اسلامی شریعت کی اصطلاح اجتہاد اور اجماع وغیرہ کا نام لیے بغیر ایک نئے اجتہاد و اجماع کی تعریف کرتے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن جب یہ اسلام کا ٹھپہ لگا کر کوئی غیر اسلامی چیز عوام کے سامنے لاتے ہیں تو ہم کو کچھ نہ کچھ بولنا ہی پڑتا ہے، کیونکہ یہ اسلام کی معنوی تحریف ہے۔

ایک طرف اجتہاد کی یہ نئی اسلامی تعریف ملاحظہ کیجئے، دوسری طرف اسلامی قانون کے ماہرین کی تعریف ملاحظہ کیجئے، آمدی الاحکام میں لکھتے ہیں:

لفظ اجتہاد مخصوص ہے اس انتہائی کوشش کے لیے جو کسی امر شرعی کے بارے میں یہ گمان حاصل کرنے کے لیے صرف کی جائے کہ یہ شرع کے موافق ہے۔ (ج ۴ ص ۲۱۸)

دونوں کی تعریفیں ملاحظہ کیجئے اور فیصلہ کیجئے کہ کیا آزادانہ رائے قائم کرنے کا نام اجتہاد ہے، یا شریعت کی موافقت کا۔ اسی بنا پر بعض فقہا نے قیاس و اجتہاد کے بارے میں یہ تصریح کر دی ہے کہ یہ مآخذ شریعت نہیں ہے، بلکہ مآخذ شریعت تو کتاب و سنت ہیں، یہ محض مظہر ہے، نور الانوار کے مصنف لکھتے ہیں

ھو ابانة فاختیر لفظ الابانة	قیاس و اجتہاد اظہار حقیقت کا نام ہے
و القیاس مظھر لا مثبت	یہ لفظ قصداً اس لیے استعمال کیا گیا ہے تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ قیاس مظہر ہے مثبت نہیں ہے۔

(ص ۲۴۰)

ان تعریفوں کو بھی جانے دیجئے، خود قرآن کی تصریحات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ... خلفائے راشدین کے ان فیصلوں پر ایک نظر ڈالیے جن سے پتہ چلتا ہے کہ اجتہاد اسلامی احکام

میں آزادانہ رائے قائم کرنے اور ان میں تبدیلی کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ پیش آمدہ مسائل کو کتاب و سنت کے معنا پر پیش کرنے اور ان کو منشا کے مطابق بنانے کے ہیں، قرآن نے تو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ منصب نہیں عطا کیا ہے کہ آپ کسی امر خداوندی میں تبدیلی کریں،

فاحکم بینھم بما انزل اللہ ولا تتبع اھواءھم عما جاءک من الحق (مائدہ)

ان کے معاملات کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق کرو اور ان کی خواہش کا اتباع اس حق سے ہٹ کر نہ کرو جو تمھارے پاس آیا ہے۔

یہ حکم قرآن میں بار بار دیا گیا ہے، چنانچہ اس آیت کو ختم کرکے دوسری آیت کی ابتدا اسی حکم سے کی گئی ہے۔

آپ نے کسی وجہ سے شہد اپنے اوپر حرام کرلی تھی جس پر قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی،

یا ایھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک

اے نبی، وہ چیز تم حرام کیوں کرتے ہو جس کو خدا نے تمھارے لئے حلال کیا ہے،

اس کے بجائے خدا نے آپ کا یہ منصب مقرر فرمایا ہے۔

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس (نحل)

ہم نے قرآن تم پر نازل کیا کہ لوگوں کے سامنے اس کی وضاحت کردو۔

یعنی خدا نے آپ کو یہ منصب دیا ہے کہ آپ خدا کے منشا کی تشریح و تفسیر کریں، اب آپ جو تشریح و تفسیر کریں گے، وہ امت کے لئے واجب الاتباع ہوگی، آپ کی تشریح و تفسیر کے مقابلہ میں امت کے کسی فرد کی تشریح و تفسیر کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی، چنانچہ امت کے افراد کو یہ حکم دیا گیا کہ

ما اتاکم الرسول فخذوہ وما

رسول تم کو جو حکم دیں ان پر عمل کرو اور

نھاکم عنہ فانتھوا (حشر)   جن باتوں سے روک دیں رک جاؤ۔

کتاب اللہ کے منشا کے سلسلہ میں آپ نے جو قولی یا عملی تفسیر و توضیح کی ہے یا اس کی روشنی میں جو فیصلے کیے ہیں، امت کو اپنے اجتماعی معاملات میں ان کو بھی ماخذ و منبع قرار دینا فرض ہے، اگر اہل ایمان اپنے اجتماعی معاملات میں ان کو ماخذ اور منبع نہ بنایا تو یہ بات انکے ایمان کے منافی ہوگی،

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى	تمھارے رب کی قسم یہ لوگ اس وقت تک
يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ	مومن نہ ہوں گے جب تک آپس کے جھگڑے
لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا	میں آپ کو حکم نہ بنالیں اور آپ جو فیصلہ
مِمَّا قَضَيْتَ (نساء)	کریں اسکے بارے میں اپنے دل میں کوئی تنگی

قرآن کی ان ہی تشریحات کی روشنی میں امت مسلمہ نے کتاب اللہ کے بعد سنت رسول اللہ کو بھی ماخذ و منبع احکام قرار دیا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم امراء کو جب اسلامی مملکت کے مختلف حصوں میں بھیجتے تھے تو ان سے یہ دریافت کرتے تھے کہ لوگوں کے اجتماعی معاملات کے فیصلے کیسے کروگے، چنانچہ حضرت معاذ فرماتے ہیں کہ جب میں یمن جانے لگا تو آپ نے یہ سوال کیا۔ میں نے جواب دیا کہ کتاب اللہ سے فیصلہ کروں گا، پھر آپ نے پوچھا کہ اگر کوئی حکم کتاب اللہ میں نہ ملے تو جواب دیا کہ ۔۔۔۔ سنت رسول اللہ میں تلاش کروں گا، پھر آپ نے دریافت فرمایا کہ اگر سنت رسول اللہ میں بھی نہ ملے، تو کہا کہ پھر میں اجتہاد کروں گا، اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ رسول کے قاصد نے حق پالیا،

خلفائے راشدین جن کے چند فیصلوں کو توڑ مروڑ کر اپنے مقصد کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے، ان کے فیصلے اور اقوال آگے نقل کیے جائیں گے، جن سے معلوم ہوگا کہ ان کے اجتہاد کا دائرہ کہاں سے شروع ہوتا تھا، یہاں ہم حضرت عمرؓ کا وہ فرمان نقل کرتے ہیں جو انھوں نے

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو بھیجا تھا جس سے فقہا نے سیکڑوں مسئلے مستنبط کیے ہیں، آپ نے ان کو بہت سی باتوں کے ساتھ یہ ہدایت بھی کی تھی کہ

جو مسائل ایسے پیش آئیں جن کا حکم کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے نہ معلوم ہو، ان میں بڑی سمجھداری سے کام لینا، اور جو امور پہلے سے ثابت شدہ ہیں، ان پر ان نئے مسائل کو پیش کرنا اور ان کے امثال و نظائر کو سامنے رکھنا، پھر جب کسی نتیجہ پر پہنچ جانا تو فیصلہ دیتے وقت یہ بات ذہن میں تازہ رکھنا کہ وہی فیصلہ کرنا جو خدا کو پسند اور حق کے قریب ہو۔"

ان تفصیلات کے بعد یہ کہنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے کہ "اسلامی قانون کی اصطلاح میں آزادانہ رائے قائم کرنے کا نام اجتہاد ہے۔"

مصلحت | ان ہی سے بعض لوگ تمدنی ضروریات اور زمانہ کی مصلحتوں کو بھی آڑ بنا کر اسلامی احکام میں تبدیلی کرنے کا دعظ کہتے ہیں، لیکن ان کو معلوم نہیں کہ اسلام میں مصلحت اور ضرورت کے بھی حدود مقرر ہیں، ہر کس و ناکس کی ضرورت اور ہر تمدنی مصلحت کی بنا پر ان میں تبدیلی نہیں کی جا سکتی، البتہ اگر کسی ملک کے باشندوں کی اکثریت کے کسی اسلامی حکم پر عمل کرنے میں جان و مال کا نقصان ہوتا ہو تو یقیناً اس اسلامی حکم میں تخصیص کی جا سکتی ہے، مگر تبدیلی نہیں،

امام شاطبی نے ایسے ہی لوگوں کو جواب دیتے ہوئے لکھا ہے

وان مصالح انما اعتبرت من	(ج ۲ ص ۳۲)	مصلحتیں وہی معتبر ہیں جو ان مقاصد کو
حیث وضعها الشارع کذالک		پورا کرتی ہوں جن کے لیے شارع نے
لا من حیث ادراک المکلف		ان کو رکھا ہے نہ یہ کہ ہر شخص کی مصلحت،

اب اگر کسی فرد یا حکومت کی مصلحت متقاضی ہو کہ وہ سود کھانے اور زنا کو رواج دے، سٹے بازی

اور جھوٹ کو فروغ دے تو شریعت میں اس کی اجازت کسی وقت بھی نہیں دی جا سکتی ۔ ۔ ۔

. . . .

حال ہی میں ایک مصری عالم ڈاکٹر صبحی محمصانی کی کتاب تاریخ الفلسفۃ التشریعیۃ الاسلامیہ چھپ کر آئی ہے جس کا اردو ترجمہ بھی لاہور سے شائع ہوگیا ہے ، وہ اگرچہ عالمانہ کتاب ہے اور محنت اور دیدہ ریزی سے لکھی گئی ہے ، اسکے باوجود اس کتاب میں ان لوگوں کے لیے اچھا خاصا مواد ہے جو اپنے آزادانہ اجتہاد کے ذریعہ اسلامی احکام پر خط نسخ پھیرنا چاہتے ہیں ، خاص طور پر اولیات عمر پر جو کچھ لکھا گیا ہے ، وہ ان لوگوں کے لیے بڑا قیمتی مواد ہے ،

اسی طرح پاکستان میں اہل قرآن حضرات اور ادارۂ ثقافت کے فضلا برابر ایسی کتابیں اور مضامین شائع کر رہے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات جدید مجتہدین کی خواہشات کی تکمیل کے لیے علمی دلائل اور نقلی ثبوت فراہم کر رہے ہیں ، چنانچہ حال ہی میں مولانا حنیف صاحب ندوی نے ایک کتاب "اجتہاد" لکھی ہے جس میں ان ہی باتوں کا اعادہ کیا گیا ہے جو ڈاکٹر محمصانی نے اپنی کتاب میں لکھی ہیں ، اسی طرح مولانا جعفر شاہ صاحب پھلواروی نے ثقافت (جنوری ۱۹۵۷ء) میں "فقہ جدید کی ضرورت" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے ، اس میں بھی ان ہی دلائل کا اعادہ کیا ہے ، اور اولیات عمر کے ساتھ چند اور مسائل کو بھی خلفائے راشدین کی طرف منسوب کرکے بڑی وضاحت سے یہ فرمایا ہے کہ "اسلامی احکام میں ہمیشہ تبدیلی ہوئی ہے اور آئندہ بھی ہوگی"

مولانا حنیف صاحب نے شروع میں اسلامی مآخذ کی تشریح کی ہے ، اور کتاب اللہ ، سنت رسول اللہ اور اجماع کی تشریح کے سلسلہ میں بڑی حد تک اعتدال قائم رکھا ہے لیکن اجتہاد کی تشریح میں اعتدال کو قلم پر قابو نہیں رہا ہے ، ایک طرف وہ فقہا کی تجددیت پسندی پر

بڑھے ہیں، اور اس کے خطرناک نتائج سے امت مسلمہ کو آگاہ کیا ہے، دوسری طرف یہ قیمتی مشورہ بھی
امت کو دیا ہے کہ تمام اسلامی احکام کو دو حصوں میں تقسیم کر دینا چاہیے، ایک تعبدی، دوسرا
غیر تعبدی، یا ایک بنیادی، دوسرا فروعی، پھر یہ مشورہ دیتے ہیں کہ تمام اسلامی احکام کی
بنیاد دو ستونوں پر ہے، ایک عدل اور ایک احسان، اس لیے ان ہی ستونوں پر تمام اسلامی
احکام کی بنیاد رکھی جائے، چنانچہ زمین کے تمام معاملات مثلاً مزارعت، مساقات وغیرہ کو
غیر تعبدی یا خالص دنیاوی قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"آنحضرت صلعم نے اگر بٹائی وغیرہ سے متعلق بعض ہدایات دی ہیں تو ان سے اس بات
پر استدلال کرنا کہ اسلام کے نزدیک عملی چیز ملکیت ہی، قطعاً غلط اور غیر حکیمانہ استدلال ہے
غور فرمائیے کہ اسلام کو اس سے آخر کیا دلچسپی ہو سکتی ہے کہ معاشرۂ انسانی نے وقت
کی سیاسی و اقتصادی مجبوریوں کی بنا پر ملکیت کا کیا تصور قائم کیا ہے اور کن شرائط
کے تحت جائز قرار دیا ہے۔" (ص ۱۶۳)

گویا مولانا کے نزدیک زمین سے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو ارشادات ہیں، یا
آپ کا خود زمین کے سلسلہ میں جو تعامل رہا ہے، اس کا تعلق نہ تو اسلام کے بنیادی مسائل سے ہے
اور نہ ملکیت سے، بلکہ یہ غیر تعبدی مسئلہ ہے، اس میں جو مقصود آدمی چاہے قائم کر لے، اور جو چاہے
عمل کرے، لیکن عرض یہ ہے کہ اگر زمین کی ملکیت اسلام کا کوئی بنیادی مسئلہ نہیں ہے تو پھر قرآن
نے جو یہ حکم دیا ہے کہ زمین کی پیداوار سے خدا کی راہ میں خرچ کرو، اور اس کا حق ادا کرو تو اس کے
کیا معنی ہوں گے، جب ملکیت ہی نہ ہو گی تو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کیا کر سکیں گے، اور
کونسا حق دیں گے۔

وانفقوا من طیبات ما کسبتم   اور خرچ کرو اپنی اچھی کمائی سے اور

مما اخرجنا لکم من الارض (البقرہ) — جو ہم نے زمین سے تمہیں عطا کیا ہے،
کلوا من ثمرہ اذا اثمر واتوا حقہ — ان کی پیداوار کھاؤ اور اس کا حق کٹنے
یوم حصادہ (انعام) — کے وقت دے دو،

ان جملوں سے پہلے ہر طرح کی زمینی پیداوار کا ذکر کرکے یہ حکم دیا گیا ہے،

پھر قرآن و حدیث میں وراثت کے مسئلہ کی جو اتنی لمبی تفصیل کی گئی ہے تو کیا یہ وراثت کی بغیر ملکیت کے بھی ممکن ہے، مولانا کے مشورہ کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد غیر تعبدی یا دنیاوی مشورہ قرار دیا جائے، لیکن قرآن کے ان صریح احکام کے بارے میں کیا فرمائیں گے، فقہائے امت نے ان احکام کی روشنی میں جو ہزاروں مسئلے ملکیت کے سلسلہ میں مستنبط کیے ہیں، ان سب کو کیا دریا برد کر دیا جائے، مولانا کے ارشاد کے مطابق محض عبادات میں روزہ اور نماز تو تعبدی قرار پا سکتے ہیں لیکن اس کے علاوہ زکوٰۃ اور حج وغیرہ حکومت کی مرضی پر ہوگا جب وہ چاہے ان کو ادا کرا دے اور جب چاہے ان سے روک دے،

پھر اس سلسلہ میں خلفائے راشدین اور خاص طور پر حضرت عمرؓ کے اس طرز عمل کو جو انھوں نے سواد عراق کے سلسلہ میں اختیار کیا تھا، پیش کیا جاتا ہے، اگر یہ حضرات اس کے مالہٗ ما علیہ پر غور کرتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ یہ مسئلہ اسقاط ملکیت کی دلیل نہیں بلکہ اثبات ملکیت کی دلیل ہے، حضرت عمرؓ اگر اس مسئلہ کو بنیادی نہ سمجھتے تو پھر ان کو ...... پوری زمین فوراً بحق سرکار ضبط کر لینا چاہیے تھا، تمام فوجیوں سے مشورہ کرنے، ان سے اجازت لینے، صحابہ کے سامنے بہت سے سیاسی اور ملی مصالح کو پیش کرنے، اور نہ مطمئن ہونے والوں کو قرآن سے دلیل دینے کی ضرورت نہ پیش آتی، اس مسئلہ کی پوری تحقیق آگے آرہی ہے،

مولانا نے فقہ کی جس تعبدی، غیر تعبدی اصطلاح سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے،

وہ ان ہی فقہا کی وضع کردہ ہے جن کی "حرفیت پسندی" سے ان کو چڑ ہے، مگر تعبدی و غیر تعبدی کی اصطلاح کا استعمال یہ حرفیت پسند فقہا ان معنوں میں نہیں کرتے، جن میں مولانا نے استعمال کیا ہے، بلکہ یہ اصطلاح فقہا نے ایک قانونی فرق واضح کرنے کے لیے وضع کی ہے، ...... وہ فرق یہ ہے کہ بعض عبادتیں مقصود بالذات ہوتی ہیں، اور بعض عبادتیں عبادت ہونے کے ساتھ دوسری عبادت کا ذریعہ و وسیلہ ہوتی ہیں، جو عبادتیں بذات خود عبادت ہوتی ہیں وہ بغیر نیت کے درست نہیں ہوتیں لیکن جو وسیلہ ہوتی ہیں وہ نیت کے بغیر بھی درست ہو جاتی ہیں، مثلاً نماز بذات خود عبادت ہے، اس میں نیت شرط ہے، لیکن وضو عبادت تو ہے، مگر یہ دوسری عبادت کا ذریعہ و وسیلہ ہے، اس لیے اس میں نیت شرط نہیں ہے، چنانچہ فقہا اسی فرق کو واضح کرنے کے لیے نماز کو تعبدی، اور وضو کو غیر تعبدی کہتے ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلام میں نماز کی اہمیت تو ہے اور وضو کی نہیں ہے، اور اگر کوئی بغیر وضو نماز پڑھ لے تو اس کی نماز ہو جائے گی، ایسا ہرگز نہیں ہے،

غور کیجئے کہ فقہا یہ اصطلاح کس معنی میں استعمال کرتے ہیں، اور مولانا اس سے یہ فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں کہ نماز و روزہ کے علاوہ تمام احکام کو غیر تعبدی قرار دیکر انکی اہمیت اسلام میں کم کر دی جائے، کلمۃ حق ارید بہا الباطل اسی کو کہتے ہیں،

آخر میں مولانا جدید اسلامی فقہ کی خصوصیت پر کلام کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

"دو لفظوں میں اگر ہم یہ کہیں کہ عدل و احسان اسلامی فقہ کی بنیادی قدریں ہیں، اور یہی دو محور ہیں جس کے گرد اس کا پورا نظام تفصیلات گھومتا ہے، تو اس میں ذرہ بھی مبالغہ نہ ہوگا" (ص ۱۸۳)

"عدل و احسان" کا لحاظ اسلامی فقہ میں ہمیشہ کیا گیا ہے، اور آیندہ بھی کیا جائیگا

لیکن یہ عدل و احسان بجائے خود کوئی ماخذ احکام اور منبع شریعت نہیں ہیں، بلکہ ان کی حیثیت بالکل اضافی ہے یعنی یہ اسی وقت قابل اعتبار قرار پا سکتے ہیں، جب ان کے اوپر کتاب و سنت کی مہر ثبت ہو، ورنہ پھر دنیا کی ہر حکومت کا نظام اسلامی نظام قرار پائیگا، اس لیے کہ ان سب کا دعویٰ یہ ہے کہ انھوں نے عدل و احسان کے تحت ہی اپنا نظام حکومت ترتیب دیا ہے،

اگر عدل و احسان کا وہی بے قید مطلب لیا جائے جو موصوف نے لیا ہے، تو پھر دنیا کے کسی معاملہ میں حتیٰ کہ عبادات میں بھی کتاب و سنت کی ہدایت کی ضرورت باقی نہیں رہتی، حالانکہ قرآن کی جس آیت میں عدل و احسان کا ذکر ہے اس میں ایتاء ذی القربیٰ اور ینہیٰ عن الفحشاء والمنکر کا بھی ذکر ہے، تو عدل و احسان کے ساتھ معروف و منکر کو بھی کیوں معیار نقد نہ بنایا جائے، اور پھر احسان و عدل کا ذکر تو قرآن میں دو چار جگہ ہے، لیکن حق و باطل کا ذکر سیکڑوں جگہ ہوا ہے، تو احسان و عدل کے بجائے حق و باطل کو کیوں نہ معیار قرار دیا جائے، اور یہ دونوں ہی معیار نہیں ہیں، قرآن کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں ان دونوں لفظوں کا استعمال کثرت سے ملے گا، اور حضرت عمرؓ کا جو فرمان نقل کیا گیا اس میں سب سے زیادہ تاکید حق اختیار کرنے اور باطل ترک کرنے کی ہے،

پھر اس سے قطع نظر یہ لفظ عدل و احسان سے زیادہ جامع ہے کہ اسلام صرف اختیار و اثبات ہی نہیں، بلکہ ترک اور نفی بھی ہے، اور احسان و عدل میں صرف اس کا ایک یعنی اثبات پہلو نمایاں ہوتا ہے، اور حق و باطل اور معروف و منکر میں دونوں پہلو ہیں، وجہ ہے کہ مذکورہ آیت عدل و احسان کے ساتھ ...... فحشاء و منکر کی نفی بھی کر دی گئی ہے، ایک مسلمان سے دن رات میں کئی بار اس نفی و اثبات کا اقرار کرایا جاتا ہے، اشہد ان لا الٰہ الا اللہ

وہ آیات قرآنی جن سے تبدیلی احکام پر استدلال کیا جاتا ہے	جن آیات سے اسلامی احکام کی تبدیلی پر استدلال کیا جاتا ہے وہ یہ ہیں:

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (بقرہ)	اللہ احکام میں آسانی چاہتا ہے، دشواری اور تنگی نہیں
وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (حج)	اس نے دین کے سلسلہ میں تمھارے لیے کوئی تنگی نہیں رکھی ہے۔
مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ (مائدہ)	اللہ یہ نہیں چاہتا کہ تم کو کسی دشواری میں ڈالے، بلکہ ان احکام کے ذریعہ وہ تم کو پاک صاف کرنا چاہتا ہے۔
لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (بقرہ)	اللہ ہر شخص کو اس کی طاقت و قدرت بھر تکلیف دیتا ہے۔

وہ احادیث نبوی جن سے تبدیلی احکام پر استدلال کیا جاتا ہے	جو احادیث تبدیلی احکام کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ بعثت بالحنفية السمحة	میں آسان دین حنیفی (ابراہیمی) دیکر بھیجا گیا ہوں
۲۔ وما خير بين شيئين الا اختار ايسرهما ما لم يكن اثما	آپ کو دو چیزوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کا اختیار دیا جاتا تھا تو آپ ان میں آسان تر کو اختیار فرماتے تھے ۔ ۔ ۔ جب کہ آسان تر کا انتخاب گناہ نہ ہو
۳۔ لا ضرر ولا ضرار	اسلام میں نہ تو تکلیف پہنچانا ہے اور نہ خود تکلیف اٹھانا ہے۔

ان آیات قرآنی اور احادیث نبوی میں بلاشبہہ آسانی، سہولت اور رخصت دی گئی ہے، لیکن ان سے جو لوگ تبدیلی احکام پر استدلال کرتے ہیں وہ حق بات کہکر ایک باطل معنی نکالتے ہیں،

غور کیجئے پہلی آیت میں یسر وعسر کا جو تذکرہ کیا گیا ہے، وہ مطلقاً نہیں، بلکہ ایک مہینے کے روزے کے احکام دینے کے بعد یہ کہا گیا ہے کہ تم میں سے جو لوگ سفر میں ہوں یا مریض ہوں ان کے لیے یہ سہولت دی گئی ہے کہ جب وہ سفر ختم کریں یا تندرست ہو جائیں تو ان کی قضا دوسرے دنوں میں کرلیں، اس حکم دینے کے بعد یہ کہا گیا ہے کہ خدا نے احکام کی بجا آوری میں دشواری نہیں، بلکہ سہولت دے رکھی ہے،

ایک حکم کو کسی مجبوری کی وجہ سے دوسرے وقت میں بجالانے کی آسانی کا جو حکم دیا گیا ہے، اس سے کسی حکم ہی کے منسوخ کر دینے پر استدلال کرنا قرآن کے ساتھ تلعب نہیں تو اور کیا ہے،

دوسری آیت کے سیاق وسباق پر غور فرمائیے، پوری آیت یہ ہے:

یاایھاالذین اٰمنوا ارکعوا واسجدوا واعبدوا ربکم وافعلوا الخیر لعلکم تفلحون وجاھدوا فی اللہ حق جہادہ ھواجتباکم	اے ایمان والو رکوع اور سجدے کیا کرو (یعنی نماز) اور خدا کی اطاعت کرتے رہو اور ہر طرح کے بھلے کام کرتے رہو امید ہے کہ تم فلاح پاؤگے، اور خدا کی راہ میں جہاد کرتے رہو، جیسا کہ جہاد کا حق ہے، ان کاموں کے لیے [illegible]

اتنے احکام کے ذکر کے بعد یہ کہا گیا ہے،

وماجعل علیکم فی الدین من حرج	دین کے معاملہ میں کوئی دشواری نہیں ہے،

پھر مذکورہ احکام ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ آیت کے سیاق میں پھر ملت ابراہیمی کا تذکرہ ہے، اس کے بعد یہ کہا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم ہی نے تمھارا نام اطاعت گذار (مسلم) رکھا ہے پھر شہادت حق کی ذمہ داری

مذکرہ ہے، اس کے بعد کچھ احکام دینے کے بعد پھر یہ کہا گیا ہے کہ خدا تمھارا والی اور مددگار ہے۔

غور فرمایئے، یہ ٹکڑا کتنے احکام کے ضمن میں لایا گیا ہے، اور ان احکام میں صرف نماز، روزہ ہی نہیں بلکہ جہاد اور شہادت حق کی ذمہ داری اور اعتصام باللہ کا تذکرہ بھی ہے، اس ضمن میں یہ بات بھی واضح کر دی گئی ہے کہ امت محمدیہ کی بعثت ان امور کی بجا آوری ہی کے لیے ہوئی ہے،

اس درمیان میں وماجعل علیکم فی الدین من حرج کے ٹکڑے کے لانے کا مقصد، اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ جو احکام تم کو دیئے گئے ہیں، ان میں اگر تم کو کوئی دشواری اور تنگی محسوس ہوتی ہے تو خدا کا مقصد تم کو دشواری اور تنگی میں ڈالنا نہیں ہے، بلکہ یہ سب احکام تمھاری فلاح و سعادت ہی کے لیے دیئے گئے ہیں، اگر تم کو ان کی بجا آوری میں کوئی دقت یا دشواری محسوس ہوتی ہے، تو گھبرا کر خدا کا دامن ہاتھ سے چھوڑو نہیں، وہ تمھاری مدد و نصرت کے لیے موجود ہے

بالکل اسی طرح تیسری آیت کے سیاق و سباق میں بھی تحریم و تحلیل کے تحت احکام دیئے گئے یہ کہا گیا ہے، ان احکام کے دینے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ خدا تعالیٰ تم کو کسی دشواری میں ڈالے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ تم کو پاک و صاف کرے۔

"حرج" کا لفظ جس پر استدلال کی ساری بنیاد ہے، اس کی تفسیر ملاحظہ ہو:

ایک شخص نے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے دریافت کیا کہ "حرج" کے کیا معنی ہیں، انھوں نے کہا کہ تم عرب نہیں ہو کہ اس کے معنی پوچھتے ہو، پھر قبیلہ ہذیل کے کسی آدمی کو بلوایا، اور اس سے پوچھا "ما الحرج" حرج کے کیا معنی ہوتے ہیں، وہ بولا:

الحرج من الشجر ما لیس له مخرج — وہ جھاڑی جس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہو

لغت کے ماہر زجاج کہتے ہیں، غیر معمولی تنگی کو حرج کہتے ہیں، الحرج اضیق [illegible] اصل میں اس جھاڑی کو جس میں کوئی جانور آ جائے نکلے حرج کہتے تھے، اسی سے حرج کے معنی تنگی و [illegible]

بھی ہیں، کیونکہ آدمی گناہ کرکے رحمت خداوندی کا دروازہ اپنے اوپر بند کرلیتا ہے، قرآن نے اس معنی میں بھی حرج کا لفظ استعمال کیا ہے،

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ "حرج" کے دو مفہوم ہیں، ایک یہ کہ اسلامی احکام میں خدا نے کوئی ایسی دشواری اور تنگی نہیں رکھی ہے جس کو بندہ سہار نہ سکے، یا اس کو اس کی بجا آوری میں کوئی طبعی عذر یا دقت ہو، تو اس کے لیے کوئی راہ نہ نکال دی گئی ہو، دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اگر تبقاضائے بشریت آدمی سے کوئی گناہ صادر ہوجائے تو وہ ہمیشہ کے لیے ناپاک اور رحمت خداوندی سے محروم نہیں ہوجاتا، بلکہ خدا نے اس کے لیے ایسی سبیل پیدا کردی ہے کہ وہ پھر پاک ہونا چاہے اور رحمت خداوندی کا دروازہ اپنے اوپر وا کرنا چاہے تو کرسکتا ہے،

معلوم نہیں اس جملہ کا یہ مفہوم لوگوں نے کہاں سے نکال لیا کہ جس حکم پر عمل کرنے میں دقت محسوس ہو، یا کوئی معمولی نقصان ہو، یا موجودہ تمدن میں اس کو برا سمجھا جاتا ہو تو اس کو منسوخ یا محدود کردیا جائے، امام شاطبی نے اسی خیال کے لوگوں کو خطاب کرکے کہا تھا کہ

ماھو من الحرج مقصوداً الرفع (ج ۲ ص ۱۰۷) — دین میں حرج نہ ہونے کا مطلب شرعی احکام کو منسوخ کردینا یا اٹھا دینا نہیں ہے،

اوپر جو احادیث نقل کی گئی ہیں، اگر ان کو بھی قرآن کی ان آیات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے تو پھر ان سے بھی یہ مفہوم قطعی نہیں نکالا جاسکتا کہ جہاں کوئی دقت اور دشواری محسوس ہو بس فوراً وہ حکم بالائے طاق رکھ دیا جائے، چنانچہ اس حدیث میں جہاں یہ ذکر ہے کہ آپ آسان تر پہلو اختیار کرتے تھے، یہ قید بھی لگی ہوئی ہے

مالم یکن اثماً۔ جب اس آسان پہلو میں کوئی گناہ نہ ہو تب آپ اسے اختیار فرماتے ورا اگر اس میں گناہ ہو تو

فان کان فکان ابعد الناس — اگر وہ گناہ کا کام ہوتا تھا تو وہ آپ سب سے زیادہ دور رہنے والے تھے

امام شاطبی کے زمانہ میں یعنی آٹھویں صدی[1] میں کچھ لوگوں نے ان کے سامنے یہ خیال ظاہر کیا کہ اسلام کے اندر جو رخصتیں دی گئی ہیں، ان سب کو جمع کرکے ان ہی پر کیوں نہ عمل کیا جائے، موجودہ دور کے مجتہدین کی طرح انھوں نے بھی اپنی دلیل میں قرآن کی وہی آیات اور احادیث پیش کیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے، اور ان کو پیش کرنے کے بعد پھر یہ کہا کہ

کل ذالک ینافی شرع الشاق الثقیل (ج ۱ ص ۸۳) — ان تمام آیات و احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ شریعت کا قانون مشقت، دشواری اور تنگی کے منافی ہے۔

امام شاطبی ان کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں (امام شاطبی کی کتاب کے اقتباسات قصداً اس لیے نقل کیے جا رہے ہیں کہ ڈاکٹر محمصانی نے امام شاطبی کی عبارتوں سے کافی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے)

والجواب عن ھذا ما تقدم وھو ایضاً مؤد الی ایجاب اسقاط التکلیف جملۃ فان التکالیف کلھا شاقۃ ثقیلۃ ولذالک سمیت تکلیفاً[2] من الکلفۃ وھی المشقۃ فاذا کانت المشقۃ حیث لحقت فی التکلیف تقتضی الرفع بھذہ الدلائل لزم ذالک فی الطھارات والصلوات والزکوٰۃ والحج والجھاد وغیر ذالک — اس کا جواب جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، اگر ان آیات و احادیث کا وہی مفہوم ہے جو تم لوگ بیان کرتے ہو تو پھر اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ آیات و احادیث اسلامی احکام کو سرے سے ساقط کر دینے ہی پر ابھارتی ہیں کیونکہ اگر دشواری و مشقت ہی کی وجہ سے احکام ساقط ہوں گے تو شریعت کے ہر حکم میں کچھ نہ کچھ دشواری اور مشقت ہے اور اسی مشقت ہی کی وجہ سے تو احکام اسلامی کو "تکالیف شرعیہ" کہا جاتا ہے۔ کیونکہ تکلیف کلفت سے مشتق ہے جو مشقت کا دوسرا نام ہے۔

---

[1] ان کی وفات ۷۹۰ھ میں ہوئی ہے۔ [2] تکلیف کا مفہوم سمجھنے کے لیے لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا کو سامنے رکھا جائے۔

ولا یقف عند حد الا اذا لم یبق علی العبد تکلیف وهذا محال فما ادی الیه مثله فان رفع الشریعة مع فرض وضعها محال (جلد ۲ ص ۸۳)

اگر ہر تکلیف و مشقت جو کسی اسلامی حکم کی بجاآوری میں پیش آئے اس کو ان دلائل کے ذریعہ منسوخ کر دیا جائے تو پھر اس سے لازم آئیگا کہ طہارت، نماز، زکوۃ، حج اور سب سے بڑھ کر جہاد اور اس کے علاوہ تمام احکام شرعیہ کو ساقط کر دیا جائے، یہانتک کہ بندے کے اوپر کوئی شرعی پابندی باقی ہی نہ رہے، کیونکہ سب میں تکلیف و مشقت ہے، یہ انتہائی غلط اور محال بات ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک طرف شریعت بندوں کے لیے قانون بھی مقرر کرے اور دوسری طرف اسکو خود ہی ساقط بھی کر دے۔

پھر وہ دوسری جگہ دشواری، تکلیف اور مشقت کو بہانہ بنانے والوں کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

وان سمیت کلفة فاحوال الانسان کلها کلفة فی هذه الدار فی اکله وشربه وسائر تصرفاته ولکن جعل له قدرة علیها بحیث تکون تلک التصرفات تحت قهره لا ان یکون هو تحت قهر التصرفات[1]

اگر اس معنی میں شرعی احکام کو مشقت طلب کہا جائے تو پھر اس دنیا میں انسان کے سارے کام ہی مشقت طلب ہیں، کھانے پینے اور دوسرے تمام تصرفات میں تکلیف و مشقت ہے لیکن اس تکلیف و مشقت کے باوجود خدا نے انسان کو اس سے عہدہ برآ ہونے کی قدرت دی ہے تاکہ یہ تصرفات اسکے سامنے مغلوب ہیں نہ یہ کہ وہ خود ان تصرفات سے مغلوب ہو جائے۔

---

[1] ایضاً ج ۲ ص ۸۳، یہاں لوگوں کو خاص طور پر غور کرنا چاہیے جو حالات سے مغلوب ہو کر اسلامی احکام میں ترمیم کرنا چاہتے ہیں۔

فكذلك التكاليف فعلى هذا ينبغي ان يفهم التكليف وما تضمن من المشقة

اسی کے اوپر شرعی تکالیف اور انکی دشواریوں کو قیاس کرنا چاہیے یعنی یہ کہ انسان کو اسکے اوپر قابو پانے کی کوشش کرنی چاہیے نہ کہ انکے سامنے مغلوب ہو جانا چاہیے

واذا تقرر هذا فما تضمن التكليف الثابت على العباد من المشقة المعتادة ليس بمقصود الطلب للشارع من جهة نفس المشقة بل من جهة ما في ذلك من المصالح العائدة على المكلف[1]

اور جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ جو قابل برداشت مشقتیں بندوں پر شریعت نے ڈالی ہیں، اس سے شارع کا مقصود ان کو دشواریوں میں ڈالنا نہیں ہے، بلکہ ان کے مصالح کے پیش نظر ہی ان کو یہ تکلیفیں دی گئی ہیں۔

البتہ کوئی ایسی دشواری یا کوئی ایسی مشکل پیش آجائے جس کا اثر عام طور پر بندوں کے جان و مال یا انکی عزت و آبرو پر پڑتا ہو تو اس کو رفع کیا جا سکتا ہے، جس طرح بھوک سے مرنے والے کے لیے مردار کھانے کی اجازت ہے لیکن اس کو سد رمق سے زیادہ کھانے کی اجازت نہیں ہے، لیکن چند آدمی بیٹھکر فرضی طور پر کسی امر کے بارے میں یہ کہدیں کہ یہ دقت طلب ہے تو اس کا کوئی اعتماد نہیں ہے، بلکہ پہلے اس دشواری کو پیش آجانا چاہیے، پھر اس پر غور کیا جائیگا، فرضی دشواریوں کا کوئی اعتبار نہیں، قاضی ابن عربی لکھتے ہیں:

واذا كان الحرج في نازلة عامة في الناس فانه يسقط واذا كان خاصاً لم يعتبر (شاطبی ج ۲ ص ۱۰۶)

وہ دشواری جو عمومی ہو، اس کو رفع کیا جا سکتا ہے، اور اگر خاص ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں

اب جو لوگ ان آیات و احادیث سے موجودہ دور کی تمدنی ضرورتوں کے لیے جو [illegible]

---

[1] الموافقات جلد ۲ ص ۸۱۳

،، بلکہ معصیتیں ہیں، جواز کی شکلیں نکالتے ہیں، اور غیر اسلامی طرز معیشت، معاشرت
لو امور مسلمہ مان کر اسلامی احکام کو توڑ مروڑ کے ان کے مطابق بنانا چاہتے ہیں، یا ان کو
النا چاہتے ہیں، ان کے لیے ان آیات و احادیث سے قطعی کوئی گنجایش نہیں نکلتی،
رآن و حدیث کو اپنی خواہش کا تابع نہ بنائیں، اور ان آیات و احادیث کو ان کے
ق سے کاٹ کر اور اسلام کے حرام و حلال اور معروف و منکر کے مقرر کردہ حدود سے
بھنے کی کوشش نہ کریں، ورنہ پھر قرآن سے ہر برائی کو ثابت کرنا آسان ہے، کاش یہ لوگ
د اللہ بن مسعودؓ کی اس نصیحت کو سامنے رکھکر اسلامی احکام پر غور کرتے تو وہ اپنے اوپر
تے اور قرآن و حدیث کو بھی قطع برید سے محفوظ رکھتے، انھوں نے خیر القرون اور بعد کے
وگوں کے طرز عمل کے فرق کو واضح کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ

تم ایسے زمانہ میں ہو جس میں لوگ اپنی خواہشات کو اعمال و احکام کا تابع رکھتے ہیں لیکن
یکن ایک زمانہ ایسا بھی آئیگا جب لوگ اعمال و احکام کو اپنی خواہشات کا تابع بنالیں گے۔" (موافقات ج ۲ ص ۱۷۸)

وپر ذکر آچکا ہے کہ اسلام میں اجتہاد کی اجازت صرف ان امور میں دی گئی ہے جن میں کتاب و سنت
، ہدایت موجود نہیں ہے، لیکن ان امور میں جن کا صراحۃً ذکر قرآن و حدیث میں موجود ہے،
یں ایک شخص کو کیا پوری امت کو بھی تبدیلی کا حق حاصل نہیں ہے، مگر جدید مجتہدین
ہے ہیں کہ اپنے آزادانہ اجتہاد کا نشانہ ان امور کو بنارہے ہیں جو کتاب و سنت
پوری امت کے تعامل سے ثابت ہیں، مثلاً ایک مرد کو بیک وقت چار عورتوں
شادی کرنے کی اجازت قرآن سے، سنت متواترہ سے اور پوری امت کے تعامل
ثابت ہے، لیکن یہاں ایسا قانون بنانے کی کوشش کی جارہی ہے جس کی رو سے
لام کے اس دیے ہوئے حق کو مرد سے چھین لیا جائے، حالانکہ مشہور مفسر صحابی حضرت

ابن عباسؓ کے شاگرد عکرمہ "حرج" جس پر ان مجتہدین کے استدلال کی بنیاد ہے، کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے تھے، خدا نے ہمیں ایک ہی عورت سے شادی کرنے پر مجبور نہیں کیا، بلکہ اس نے چار تک کی اجازت دی"۔

غور کیجئے کہ جس آیت سے یہ حضرات ازالۂ احکام پر استدلال کرتے ہیں، اسلاف ان آیات سے اثباتِ احکام کا کام لیتے تھے، اسی کا نام ہے احکام کو اپنی خواہش کا تابع بنانا، (باقی)

سلسلہ تجدیداتِ اشرفیہ

جامع المجددین - اس میں ہر طرح کی دینی و دنیوی فلاح و صلاح کی سب سے آسان اور کارگر تدبیریں بتائی گئی ہیں، جن پر ہر مسلمان عمل کر سکتا ہے۔ قیمت صہ

تصوف و سلوک - اس میں بتایا گیا ہے کہ حقیقی تصوف در اصل کمال اسلام اور کمال ایمان کا نام ہے، قیمت مجلد صہ

تبلیغ و تعلیم خیرامۃ بننے کے لیے تعلیمی و تبلیغی تجدیدات و تدبیرات کا جامع و مکمل نظام، قیمت مجلد سے ہ

تجدید معاشیات: رزق و معاش کا مسئلہ، اسلامی و ایمانی تعلیمات کی روشنی میں، قیمت صہ (مرتبہ مولانا عبد الباری ندوی)

حکیم الامت: علامہ تھانویؒ کے آخری ۱۵ سالہ حصہ زندگی کا ایک مرقع، (از مولانا عبد الماجد دریابادی) قیمت ۵ روپے

پتہ: دار المصنفین، اعظم گڈھ — منیجر

یونانی منطق کے قدیم تراجم

از

جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری - ایم - اے - ایل - ایل - بی - بی - ٹی - ایچ

(۲)

مگر سب سے زیادہ دقت ان تراجم کے ایک بوسیدہ مخطوطہ کے دریافت ہونے سے پیدا ہوگئی ہے، سینٹ جوزف کالج بیروت میں ان قدیم تراجم کا ایک مخطوطہ دریافت ہوا ہے، جس کا نمبر ۳۳۸ ہے، اور جو ۲۵۵ اوراق پر مشتمل ہے، تقریباً تیس سال ہوئے، ۱۹۲۶ء میں جوزپہ فرلانی (G. Furlani) نے اس کتاب کا تعارف کرایا تھا، اس مخطوطہ کے آخر میں حسب ذیل توقیع ہے،

"تمت کتب الثلاثة من ترجمة محمّد بن عبد الله المقفع وقد ترجمها بعد محمد ابو نوح الکتاب النصرانی، ثم ترجمها بعد ابی نوح سلمة الحرانی صاحب بیت الحکمة لیحیی بن خالد برمکی لبیت الاربعة کلها قبل هولاء المترجمین الذین تکسانی الملکانی النصرانی"[1]

توقیع کی اس ظاہری عبارت سے، پروفیسر پول کراؤس کا دعویٰ ثابت ہو جاتا ہے کہ ارسطا طالیسی منطق کا قدیم ترین مترجم عبد اللہ بن المقفع کا بیٹا محمد بن عبد اللہ بن المقفع تھا اور یہ کہ اس کے سلسلہ میں قاضی صاعد اندلسی سے چوک ہوئی ہے، اس ثبوت کا جائزہ تو بعد میں لیا جائے گا، لیکن اس مخطوطہ سے

---

[1] التراث الیونانی ص ۱۰۱

بند باتوں کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

اوّلاً جاحظ اور ابن الندیم کا یہ کہنا صحیح ہے کہ ارسطاطالیسی منطق کا مترجم ابن المقفع ہے۔[1]

ثانیاً جاحظ کے اس قول میں کہ ابن المقفع ارسطاطالیسی منطق کا مترجم ہے، اور ابن الندیم کی اس تصریح میں کہ وہ اس کا خلاصہ نویس ہے تضاد پایا جاتا ہے کیونکہ فرلانی (Furlani) جس نے اس مخطوطہ کا گہرا مطالعہ کیا ہے اپنے تعارفی مضمون میں لکھتا ہے کہ یحییٰ النحوی (John Grammaticus) اور سرجیوس راس عینی کی شروح ارسطاطالیس اس مخطوطہ کے درمیان مقابلہ کرنے کے بعد تینوں میں قریبی مشابہت معلوم ہوتی ہے۔ ہاں مخطوطہ کے جزء "ایساغوجی" کے متعلق جو پہلے بیس اوراق پر مشتمل ہے فرلانی کا خیال ہے کہ یہ ترجمہ قدماء کے دور آخر کی شروح کے مشابہ ہے مگر اس کے بارے میں بھی پروفیسر پول کراؤس کہتے ہیں کہ

"یہ بھی ممکن ہے کہ یحییٰ النحوی کی شرح ایساغوجی اس جزء اوّل (ایساغوجی) کی اساس ہو"[2]

بہرکیف ان تراجم کی اساس کسی کی شروح پر کیوں نہ ہو، ان پر ترجمہ (آزاد ترجمہ) کا بھی اطلاق ہو سکتا ہے، اور تلخیص کا بھی، اس لئے نہ تو جاحظ کا یہ قول کہ

فمتی کان رحمہ اللہ ...... ابن المقفع مثل ارسطاطالیس

حقیقت سے بعید ہے اور نہ ابن الندیم کا کہ

"ولہذا الکتاب مختصرات ...... لجماعۃ فیہم ابن المقفع"

ثالثاً کتاب کی ساخت اور اس کا خاتمہ اس بات کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ یہ ترجمہ کم از کم فارابی کے زمانہ سے پہلے ہوا ہے[3]۔ کتاب کا عام انداز اس طرز تعلیم کے مطابق ہے، جو فلسفیانہ مدارس میں تیسری صدی ہجری کے ربع ثالث تک مروج تھا، اور جس کے خلاف سب سے پہلے فارابی نے بغاوت کی، اس کی تفصیل یہ ہے:

---

[1] دیکھئے اوپر حاشیہ نمبر ۱۶، ۱۹ [2] التراث الیونانی ص ۱۰۱ [3] بلکہ جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے دوسری صدی ہجری کے ختم ہونے سے بھی پہلے۔

ارسطو کی منطقی تصانیف اُس کے جانشینوں نے آٹھ کتابوں میں مرتب کی تھیں جن کے نام یہ ہیں:-

۱- قاطیغوریاس (Categories) یا کتاب المقولات

۲- باری ارمینیاس (Propositions) یا کتاب العبارۃ

۳- انالوطیقا یا انالوطیقا اولی (Prior Analytics) یا کتاب القیاس

۴- ابودیقطیقا یا انالوطیقا ثانیہ (Posterior Analytics - Appodictics) یا کتاب البرہان

۵- طوبیقا (Topicas) یا کتاب الجدل

۶- سوفسطیقا، (Sophistics) یا کتاب الحکمۃ المموہہ

۷- ریطوریقا (Rhetorics) یا کتاب الخطابہ

۸- ابوطیقا، (Poetics) یا کتاب الشعر

تیسری صدی عیسوی میں فرفوریوس الصوری (۲۳۲ - ۳۰۴) (Porphyry of Tyre) نے ان کتابوں کی تسہیل و تقریب کے لئے ایک مدخل (مقدمہ) لکھا، جو قرون وسطیٰ میں (Introduction to the Categories -) کہلاتا تھا، اور جسے مسلمان مورخین و منطقیین ایساغوجی (Isagoge) کہتے تھے، اس طرح اب آٹھ کے بجائے منطق کی نو کتابیں ہوگئیں، اسی وجہ سے حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں لکھا ہے۔

ایساغوجی .... وھو باب من الابواب التسعۃ للمنطق، ایساغوجی .... اور وہ منطق کے نو ابواب میں سے ایک باب ہے،

بہرحال ارسطو کے بعد سے فرفوریوس کے زمانہ تک ارسطاطالیسی منطق کی آٹھ کتابیں اور اُس کے بعد سے یحیٰ نعصب کے ظہور میں آنے تک "ابواب تسعہ" (آٹھ ارسطو کی کتابیں اور نویں فرفوریوس کی

ایساغوجی) مدارس فلسفیہ میں زیر درس ہیں لیکن مسیحی تعصب نے اس نصاب تعلیم پر نظر ثانی کی، اور یہ فیصلہ کیا کہ صرف کتاب القیاس کی فصل ختم (اشکال وجودیہ) تک کی اجازت دی جائے، کیونکہ اس سے نصرانی مذہب کی تائید و نصرت میں مدد ملتی تھی، اور اس کے بعد کی تعلیم ممنوع قرار دی گئی، کیونکہ اس سے نصرانیت کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ تھا، اور چونکہ اب تعلیم و ترجمہ کا کام عموماً مسیحی علماء کے ہاتھ میں رہ گیا تھا، لہذا یہ قرار داد ایک مسلمہ رسم بن گئی، اور فارابی المتوفی ۳۳۹ھ کے زمانہ تک تمام فلسفی مدارس کا معمول بہ رہی، چنانچہ ابن ابی اُصیبعہ نے خود فارابی سے نقل کیا ہے۔

وجری الامر علی ذلك الی ان	اور برابر یہ طریقہ جاری رہا، یہاں تک کہ
جاءت النصرانیة فبطل التعلیم	نصرانیت کا زمانہ آیا، اور روما سے تو تعلیم کا
من رومیة وبقی بالاسکندریة	خاتمہ ہوگیا، البتہ اسکندریہ میں فلسفے کی تعلیم
الی ان نظر ملك النصرانیة فی	ہوتی رہی، یہاں تک کہ نصرانیوں کے بادشاہ
ذلك واجتمعت الاساقفة و	نے اس کے متعلق غور و خوض کیا۔ تمام مذہبی
تشاوروا فیما یترك من هذا التعلیم	پیشوا جمع ہوئے، اور مشورہ کیا، کہ اس تعلیم
وما یبطل فرأوا ان یعلم من	سے کتنا حصہ باقی رکھا جائے، اور کتنا
کتب المنطق الی آخر الاشکال	متروک کر دیا جائے، پس یہ رائے قرار پائی
الوجودیة ولا یعلم ما بعده لانهم	کہ منطق کی کتابوں میں سے "اشکال وجودیہ"
راؤا ان فی ذلك ضررًا علی	کے اختتام تک تعلیم دی جائے، اور اس کے
النصرانیة وان فیما اطلقوا	بعد کے مباحث نہ پڑھائے جائیں کیونکہ اُن
تعلیمه ما یستعان به علی نصرة	کی رائے میں اس سے نصرانیت کو نقصان
دینهم فبقی الظاهر من التعلیم	پہونچنے کا اندیشہ تھا، اور جس حصے کی تعلیم

هذا المقدار وما نظر من الباقي مستوراً الى ان كان الاسلام بعده بمدة طويلة[51]

کی اجازت دی تھی، ایسا تھا جس سے اُن کے دین کی تائید میں مدد مل سکتی تھی پس منطق کی تعلیم میں سے صرف اتنا ہی حصہ متداول رہا، اور باقی حصہ گوشۂ گمنامی میں پڑا رہا، یہاں تک کہ عرصۂ دراز کے بعد اسلام آیا،

لیکن اسلام کی بعثت کے فوراً بعد ہی اس رسم میں تبدیلی نہیں ہوئی، مدرسۂ فلسفہ اسکندریہ کے قریب عہد حضرت عمر بن عبدالعزیز اسکندریہ سے انطاکیہ منتقل ہوا، وہاں سے متوکل باللہ (۲۳۲-۲۴۷) کے زمانہ میں حرّان میں اور حرّان سے معتضد باللہ (۲۷۹-۲۸۹) کے زمانہ میں بغداد میں منتقل ہوا، فارابی کی تعلیم کا زمانہ تھا، مگر رسم قدیم اب بھی بدستور باقی تھی، چنانچہ اس تفصیل کے بعد فارابی کہتا ہے۔

وكان الذي يتعلم في ذلك الوقت الى آخر الاشكال الوجودية[52]

اور اس وقت صرف اشکال وجودیہ کے خاتمہ تک تعلیم ہوتی تھی،

اس کے بعد کی منطقی تعلیم ممنوع تھی اور "الجزء الذی لا یقراء" کہلاتی تھی، فارابی کہتا ہے

وكان يسمى ما بعد الاشكال الوجودية "الجزء الذي لا يقراء"[53]

اور اشکال وجودیہ کے بعد کا حصہ "الجزء الذی لا یقرأ" ممنوع التعلیم کہلاتا تھا،

فارابی کی اس روایت کی تصدیق ڈاکٹر مارکس مایرہوف (Dr. Max Meyerhof) نے یونان
اور اشٹینشنیڈر کے شبہات کی وجہ لکھتے ہیں کہ انالوطیقا ([illegible]) اس منطق کے سریانی ترجمہ حاشیہ

---

[51] طبقات الاطبا جلد ثانی ص ۱۳۵ [52] ایضاً [53] ایضاً

تحلیلات اولی (انالوطیقا) کی ساتویں فصل (اشکال وجودیہ) پر ختم ہو جاتے ہیں، نیز پانچویں صدی عیسوی کے نصف سے جب سے کہ نسطوری ترجمہ کی تحریک کا آغاز ہوا، (یعنی پروبوس انطاکی کے زمانہ سے) تحلیلات اولی (انالوطیقا و کتاب القیاس) کے سوا نہ اور کچھ ترجمہ ہوا، نہ کسی اور کتاب کی تفسیر لکھی گئی، یہی انداز بعینہٖ (Monophysites) فرقے کے علما مثلاً جورجیوس اسقف العرب وغیرہ کا بھی رہا، وہ بھی اس جزء کے علاوہ نہ کسی اور چیز کی شرح کرتے ہیں نہ ترجمہ۔[1]

اسی رسم پر فارابی کے زمانہ تک مسلمان مترجمین و مفسرین نے عمل کیا، چنانچہ ابن الندیم نے قاطیغوریاس باری ارمینیاس، اور انالوطیقا اولی کے مترجمین و مفسرین میں متعدد مسلمان حکما کا نام لیا ہے، مگر بعد کی پانچ کتابوں کا یہ حال نہیں ہے، ابودیقطیقا (کتاب البرہان) کو متی بن یونان نے (جو فارابی کا معاصر تھا) طوبیقا (کتاب جدل) اور سوفسطیقا (کتاب الحکمۃ المموہہ) کو یحییٰ بن عدی نے ریطوریقا (کتاب الخطابہ) کو ابراہیم ابن عبداللہ نے اور بوطیقا (کتاب الشعر) کو ابو بشر متی بن یونان اور یحییٰ بن عدی نے عربی میں ترجمہ کیا، اور یہ سب ناقلین و مترجمین یا فارابی کے معاصر ہیں، یا اس سے متاخر۔

خود ابوبکر محمد بن زکریا الرازی المتوفی سنہ ۳۱۰ھ (جو فارابی کا معاصر ہے) کی تصانیف میں ان تین کتابوں (اور ایساغوجی) کے علاوہ بقیہ پانچ کتابوں میں سے کسی اور کتاب کا ترجمہ یا تفسیر نہیں ملتی، ابن ابی اصیبعہ نے اس کی مصنفات کی طول طویل فہرست میں منطق کی صرف چار کتابیں گنائی ہیں:

ا۔ کتاب ایساغوجی وھو المدخل الی المنطق (۲) جمل معانی قاطیغوریاس، (۳) جمل معانی باری ارمینیاس (۴) جمل معانی انالوطیقا الاولی الی تمام القیاسات الحملیہ۔[2]

یہ بھی واضح رہے کہ ارسطالیسی منطق کی تفاسیر میں ہم الکندی سے پہلے کسی مسلمان منطقی کا نام نہیں پاتے، اس لئے یقین کیا جا سکتا ہے کہ کم از کم الکندی (۱۸۰ - ۲۶۰ھ) کے زمانہ تک عام رسم یہی تھی کہ صرف

---

[1] التراث الیونانی ص ۴۴ - ۴۵ - [2] طبقات الاطباء جلد اول ص ۳۱۵

انہی چار کتابوں پر اکتفا کیا جاتا تھا، اور بیروت کے مخطوطہ کی جو تفاصیل فرلانی نے بیان کی ہیں، اُس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ یہ نو دریافت مخطوطہ اسی رسم کے ساتھ ہم آہنگ ہے، چنانچہ مخطوطہ کے آخر میں توقیع سے قبل حسب ذیل عبارت ہے،

ثم کتاب انولوطیقا ولیس بعدہٗ
من ھذہ الکتب الا کتاب انود
الطیبقی ولم یمنعنا من استقرائہ
الا ما قد منا فی صدر الکتاب
جماعًا رائینا کافیًا عن التفید[1]

کتاب انولوطیقا ختم ہوگئی، اور اس کے بعد
اُن ارسطا طالیسی منطق کی کتابوں میں
کتاب انودیقطیقی (کتاب البرہان) کے
سوا کوئی نہیں، اور ہمیں اس کے پورا کرنے
سے صرف اسی اجماع نے روکا ہے جو ہم نے
آغاز کتاب میں بیان کیا ہے، اور جس کی
وضاحت کی ضرورت نہیں ہے،

لہذا یقینی ہے کہ یہ ترجمہ فارابی بلکہ الکندی (۱۸۰ - ۲۵۰) کے زمانہ سے پہلے مرتب ہوچکا تھا، دوسری صدی ہجری کے اختتام سے کہیں پہلے ہوچکا تھا،

رابعًا مخطوطۂ بیروت ابن المقفع کے علاوہ اور مترجمین ابونوح الکاتب النصرانی اور سلما صاحب بیت الحکمۃ کا نام بھی بتاتا ہے مگر اُن مترجمین ذاتلین کا نام نہیں لیتا جنھیں ابن ندیم نے الکلام علی قاطیغوریاس الکلام علی باری ارمینیاس اور الکلام علی انالوطیقا الاولی کے ضمن میں بیان کیا ہے، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جب وہ اصل جس سے یہ مخطوطہ منقول ہے لکھی گئی تھی، اس وقت تک ابونوح اور سلما کے علاوہ کسی اور مترجم کا ترجمہ وجود میں نہیں آیا تھا، اسی طرح جاحظ نے جن مترجمین ارسطا طالیس کے نام دیے ہیں[2]، اس مخطوطہ کی اصل اُن سے بھی پہلے لکھی گئی تھی،

---

[1] التراث الیونانی صفحہ ۱۰۹ - [2] کتاب الحیوان جلد اول ص ۳۰ -

ان ملحوظات کے بعد اصل مسئلہ کو لیجئے مخطوطہ کے آخر میں جو توقیع ہے اُس سے پروفیسر پول کراؤس نے اپنے خیال کی تائید کی ہے کہ قدیم ترین مترجم عبداللہ بن المقفع کا بیٹا محمد بن عبداللہ بن المقفع" تھا اور یہ کہ اس کے نام کے ثبت میں قاضی صاعد اندلسی سے چوک ہوئی ہے،

قاضی صاعد جمال الدین ابن القفطی اور ابن ابی اُصیبعہ عبداللہ بن المقفع (مترجم کلیلہ و دمنہ) کو اس ترجمہ کا مترجم بتاتے ہیں، ابن ابی اصیبعہ کا ماخذ قاضی صاعد کے علاوہ غالباً قفطی بھی ہے، مگر معلوم نہیں قفطی کا ماخذ قاضی صاعد ہے، یا اس کے علاوہ اور کوئی۔ اگر قفطی کا ماخذ قاضی صاعد کی طبقات الامم کے علاوہ اور کچھ ہے، تو وہ وازاد ماخذ اس نظریے کی تائید کرتے ہیں کہ اولین مترجم عبداللہ بن المقفع تھا اور اگر قفطی کا ماخذ بھی طبقات الامم ہے تو کم از کم فلسفیانہ تصانیف کی تاریخ کے باب میں قاضی صاعد کی ایک مسلمہ حیثیت ہے، اور باآسانی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان سے اس باب میں تسامح ہوا ہے اور اولیت کا شرف بیٹے کے بجائے باپ کو دیدیا ہے، رہی توقیع کی عبارت تو وہ حسب ذیل ہے،

"تمت کتب الثلاثة من ترجمة محمد بن عبد الله المقفع وقد ترجمها بعد محمد ابو نوح الکاتب النصرانی. ثم ترجمها بعد ابی نوح سلمة الحرانی صاحب بیت الحکمة لیحیٰی بن خالد برمکی لیت الا رد یۃ کلها قبل هؤلاء الترجمتین الذین تکسانی الملکانی النصرانی"

اس عبارت کے ملاحظہ کے بعد فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کہاں تک اعتماد کے لائق ہے، ہمیں کسی مصنف کی تکذیب و تغلیط کا تو حق نہیں ہے مگر کاتبوں پر بھی غیر مشروط اعتماد نہیں کیا جا سکتا، خود فاضل پروفیسر کو احساس ہے کہ اس کتاب میں جا بجا کتابت کی غلطیاں ہیں مثلاً خط کشیدہ الفاظ یقیناً غلط ہیں، ان میں سے نمبر ا تا نمبر ۳ کی تصحیح تو پروفیسر موصوف نے "الکتب" "الکاتب" "البرمکی" اور الکتب سے کردی ہے، مگر "الذین تکسانی الملکانی النصرانی" اس درجہ مہمل ہے کہ

اس کی اصلاح بھی مایوس عنہ سمجھ کر چھوڑ دی۔

۲- اس توقیع سے پہلے جہاں کتاب انالوطیقا ختم ہوئی ہے، مرقوم ہے،

تم کتاب انولوطیقا و لیس بعدہ من ھذہ الکتب الا کتاب

افودالطبیعی ......"

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرلانی افوداطبیعی کو "اسمع الطبیعی" سمجھا حالانکہ جیسا کہ پروفیسر پول کراؤس کی رائے ہے لفظ "حقیقی (Apodictice) ہے۔

۳- مایوس عنہ عبارت سے پہلے کی توقیع کی عبارت بھی جیسا کہ فاضل پروفیسر نے خود فرمایا ہے، مستقیم المعنی نہیں ہے، بالخصوص "قبل ھولاء المترجمین" کا توقیع کی عبارت میں کوئی محل ہی نہیں ہے الا یہ کہ توقیع میں کچھ عبارت کا اور اضافہ کیا جائے،

غرض توقیع کی عبارت پر غیر مشروط اعتماد نہیں کیا جا سکتا خصوصاً جب وہ متعدد ثقات کی تصریحات سے متصادم ہو۔ لہذا فاضل پروفیسر کی تقلید میں عبارت کے اندر میں بھی ذرا سی تبدیلی کی تجویز کرتا ہوں، پروفیسر موصوف نے تو اتنی بڑی عبارت "وقد ترجم محمد بن عبد اللہ المقفع" کا اضافہ کیا تھا، میری تجویز محض اتنی ہے کہ "محمد" سے پہلے "ابی" بڑھا دیا جائے، اور "بن" کو عبداللہ سے پہلے کے بجائے بعد میں لکھ دیا جائے۔ نیز اگر "الذین نکسانی الملکانی النصرانی کی تصحیح سے قبل ھولاء المترجمین کو بامعنی بنایا جا سکے تو اس موخر الذکر فقرہ کو بامعنی بنانے کے لیے شروع کے الفاظ فاضل پروفیسر کی تقلید میں "یحییٰ بن خالد البرمکی" سے پہلے کے بجائے بعد میں بڑھا دیے جائیں، اس طرح توقیع کی عبارت حسب ذیل ہو جائے گی،

"تمت الکتب الثلاثۃ من ترجمۃ ابی محمد عبد اللہ بن المقفع وقد ترجمھا بعد ابی محمد، ابو نوح الکاتب النصرانی، ثم ترجمھا بعد ابی نوح

سلمة الحرانی صاحب بیت الحکمة لیحیٰ بن خالد البرمکی و قد ترجم ابو

محمد عبد اللہ بن المقفع الکتب الاربعة کلھا قبل ھؤلاء الترجمتین

الذین تکسانی الملکانی النصرانی"

اس طرح جو مسئلہ فاضل پروفیسر نے اٹھایا تھا کہ ارسطاطالیسی منطق کا اوّلین عربی مترجم کون ہے؟ عبد اللہ بن المقفع یا محمد بن عبد اللہ المقفع باحسن وجوہ حل ہوگیا، یعنی مترجم ادیب شہیر ابو محمد عبد اللہ بن المقفع ہے، چنانچہ الفہرست لابن الندیم میں عبد اللہ بن المقفع کی کنیت جس سے وہ بعد میں مشہور ہوا، ابو محمد ہی ہے ابن الندیم کہتا ہے،

" وھو عبد اللہ بن المقفع ویکنی قبل اسلامہ ابا عمرو فلما اسلم

اکتنی بابی محمد،

میری مجوزہ اصلاح سے غالباً الفہرست، کتاب الحیوان، البیان والتبیین، طبقات الامم، اخبار العلماء باخبار الحکماء اور طبقات الاطباء سبھی میں تطبیق ہو جاتی ہے، اور اس کے بعد یہ مفروضہ تراشنے کی ضرورت نہیں رہتی کہ

" اس کا ایک بیٹا محمد تھا، جو ابو جعفر منصور خلیفہ عباسی کا کاتب رہا ہوگا، اور اسی نے

یہ تراجم کئے ہوں گے،

حالانکہ خود فاضل پروفیسر کو اعتراف ہے کہ

" ہم اس کی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے"[۵]

اس صورت میں ایک مجہول الحال شخص کو محض ظن و تخمین کی بنا پر اتنے اہم کام کی اوّلیت کا شرف دینا مناسب نہیں ہے جبکہ اس سے ثقات مورخین کی تکذیب ہوتی ہو،

---

[۵] التراث الیونانی ص ۱۰۲،

لیکن جو امر پروفیسر موصوف کو قاضی صاعد کا قول ماننے میں مانع ہے، وہ غالباً یہی ہے کہ ابن الندیم
اس باب میں الجاحظ کے بعد قدیم ترین ماخذ ہے کہیں یہ نہیں لکھا کہ اُس نے منطق و فلسفہ کی کتابوں کا
ترجمہ کیا تھا، پروفیسر صاحب فرماتے ہیں؛

"ابن ندیم کی الفہرست میں ابن المقفع کے بارے میں ایک طویل فصل ہے جس میں مولف نے
اُس کی زندگی اور تالیفات کو بیان کیا ہے لیکن اس کی فلسفیانہ تصانیف کے متعلق ایک لفظ
بھی نہیں لکھا ہے، حالانکہ خصوصیت سے یہ کہا ہے کہ فارسی سے عربی میں ترجمہ کرنے والوں
میں ایک ابن المقفع تھا، اور ان مترجمین میں سرفہرست اسی کا نام رکھا ہے"[1]

اس شک کا جواب اوپر بالتفصیل دیا جا چکا ہے لیکن اگر بات محض اتنی ہی ہے، اور اس تصدیق سے
عبداللہ بن المقفع نے منطق کی کتابوں کے عربی میں ترجمے کئے تھے" یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ قاضی ابوالقاسم
صاعد اندلسی کی روایت مذکورہ طبقات الامم ناقابل اعتماد نہیں ہے، تو الفہرست سے بھی اس کی تصریح
ہو سکتی ہے، ابن الندیم ساتویں مقالے کے پہلے فن کی تیسری حکایت کے آخر میں کہتا ہے،

وقد کانت الفرس نقلت	اہل فارس نے قدیم زمانے میں منطق اور طب
فی القدیم شیئاً من کتب المنطق	کی بعض کتابوں کو فارسی (پہلوی) میں ترجمہ
والطب الی اللغۃ الفارسیۃ فنقل	کیا تھا، ان (پہلوی تراجم) کو عبداللہ بن
ذالک الی العربی عبداللہ بن المقفع	المقفع وغیرہ نے عربی میں ترجمہ کیا،

ابن الندیم کی اس غیر مبہم تصریح کے بعد اس بارے میں کوئی تردد نہ رہنا چاہئے کہ

۱۔ عبداللہ بن المقفع (المقتول ۱۳۹ھ) ہی نے منطق کی کتابوں کو سب سے پہلے عربی میں ترجمہ کیا (باستثنائے طیموس)

۲۔ قاضی صاعد اندلسی کی روایت حرف بحرف صحیح ہے اور

۳۔ بیروت کا مخطوطہ بھی عبداللہ بن المقفع مترجم کلیلہ و دمنہ کا ترجمہ کیا ہوا ہے (باقی آئندہ)

از

جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مسلم یونیورسٹی

(۳)

(۳۴۵) **دیوان ابیوردی** (عربی ص ۲۰۵) مشتمل بر مقطعات ابوالمظفر محمد بن ابی العباس احمد بن محمد قرشی اموی ابیوردی خراسانی متوفی ۵۰۷ھ یا ۵۵۷ھ، یہ نسخہ سنہ ۵۶۶ھ کا ترقیمہ ہے، آخر کتاب میں ابوسعید احمد بن مسعود بن مفتی بخاری کی لکھی ہوئی یہ تحریر ملتی ہے کہ ۵۶۳ھ میں ابوحامد محمود بن محمد مکی خجندی کو اجازت دی تھی کہ "عراقیات" و "نجدیات" ابیوردی کو جس طرح اس سے پڑھا تھا، اس سے روایت کرے، اور اہل نقل کی شرائط بجا لائے، اوراق = ۵۵۔

(۳۴۶) **دیوان حافظ** (فارسی ص ۲۱۳) دیوان حافظ متوفی ۷۹۲ھ کا یہ نسخہ سلطان علی مشہدی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، یہ مشہور کاتب سلطان حسین بایقرا و میر علی شیر نوائی سے متعلق تھا، اور فن خوشنویسی میں بیحد ممتاز تھا، سنہ کتابت ۹۰۱ھ؛

۳۴۷۔ **ایضاً**۔ حافظ کے دیوان کا یہ نفیس نسخہ سلطان محمد نور نے دار السلطنت ہرات میں لکھا تھا،

۴۰۰۔ **دیوان ناصر خسرو** (فارسی ص ۲۲۷)۔ ناصر خسرو (متوفی ۴۸۱ھ یا ۴۸۱ھ) کا بہترین قدیم نسخہ جس پر یہ عبارت درج ہے:

"دیوان افصح الشعرا سید ناصر خسرو برسم مطالعۃ السلطان السلاطین ملک العرب والعجم سلطان محمد خان ابن سلطان مراد ملک خلد اللہ ملکہ"

۴۰۳۔ **سفینۂ خوشگو** (فارسی ص ۲۲۵)۔ بندرا بن داس خوشگو کا تذکرہ بڑا اہم ہے ۱۲۲۵ھ میں شوشتر کے ایک سیلاب میں پانی میں بہتا جا رہا تھا، دری شاعر نے اس کو پانی سے نکال لیا اور نئے سرے سے ترتیب دے کر اس پر ایک مقدمہ لکھا، ایران کے مختلف کتاب خانوں میں اسی نسخے کی مختلف نقلیں پائی جاتی ہیں۔

۴۶۴۔ **دستور اللغۃ** (عربی و فارسی ص ۲۴۲)۔ تالیف ابو عبد اللہ حسین بدیع الزماں نطنزی (متوفی ۴۹۹ھ) یہ نسخہ بہت قدیم ہے، طرز تحریر اور خط سے چھٹی صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

۴۷۱۔ **فرہنگ رشیدی** (فارسی ص ۲۷۶)۔ عبد الرشید تتوی کی تالیف کا یہ نسخہ ۱۰۶۷ھ کا لکھا ہوا ہے، اس کتاب کی تکمیل ۱۰۶۴ھ میں ہوئی، بہت اہم نسخہ ہے۔

۴۸۵۔ **مقدمۃ الادب** (عربی ص ۲۸۳)۔ علامہ جار اللہ زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ) نے لغت کی یہ کتاب ابو المظفر اتسز بن خوارزم شاہ کے لیے لکھی تھی، تاریخ کتابت ۸۷۲ھ۔

عدد اوراق: ۱۵۵

۴۸۶۔ **ایضاً**۔ اس لغت کے مجلد دوم کا ایک نسخہ ۶۰۹ھ کا ترجمہ کاتب اسرائیل ابن خلیل، عدد اوراق: ۱۸۵

۴۹۷۔ **تقویم الابدان فی تدبیر الانسان** (ترجمہ فارسی ص ۲۹۱)۔ طب کی اس مشہور کتاب کا مولف یحییٰ بن عیسیٰ بن جزلہ طبیب معروف ہے کسی مترجم نے دنادار بیگ کیخسرو

کے حکم سے اس کو فارسی میں منتقل کیا، تاریخ ترجمہ سنہ ۷۴۳ھ، تاریخ کتابت سنہ ۸۷۲ھ، کاتب محمد

ابن حاجی حسن،

۵۱۱۔ **شرح قرشی** (عربی ص ۲۹۹)۔ شیخ الرئیس ابو علی بن سینا کی شہرۂ آفاق تصنیف

"القانون" کی بہتوں نے شرحیں لکھیں۔ زیر نظر شرح کا مولف علاء الدین ابو الحسن علی کی

قرشی، معروف با بن نفیس (متوفی سنہ ۶۸۷ھ یا سنہ ۶۶۹ھ) ہے، یہ نسخہ مجلد سوم پر مشتمل ہے،

جس کی کتابت روز جمعہ، محرم سنہ ۷۳۶ھ میں مرحوم شہید خواجہ رشید الدین کی خانقاہ تبریز

میں ہوئی، ورق = ۲۳۸

۵۱۲۔ **شرح نفیسی** (عربی ص ۳۰۰) نفیس طبیب کی شرح کتاب الموجز تالیف

علاء الدین قرشی معروف با بن نفیس۔ یہ شرح سنہ ۸۴۱ھ میں تمام ہوئی، اور نسخہ ہذا سنہ ۹۱۱ھ

کا تر قیمہ ہے، ورق = ۲۳۶

۵۱۶۔ **القانون فی الطب** (عربی ص ۳۰۳) ابن سینا کے قانون کے مجلد اول

پر مشتمل ہے، سنہ کتابت سنہ ۶۱۶ھ ہے، اور کاتب نے اس نسخہ کا مقابلہ خود ابن سینا کے

لکھے ہوئے نسخہ سے کیا تھا، اور مولانا نصیر الدین طوسی کے سامنے پڑھا تھا، اوراق = ۲۳۸

۵۱۷۔ **ایضاً**۔ کتاب چہارم کے کچھ حصے پر مشتمل ہے، یہ نسخہ نہایت قدیم ہے، سنہ ۴۲۱ھ

میں یہ نسخہ محمد بن علی بن الموفق کی ملک میں تھا، اس کا کاتب عبد الحمید بن عثمان طبیب

نیشاپوری ہے، اوراق = ۱۴۶

۵۱۹۔ **کتاب طبی** (فارسی ص ۳۰۴) مجہول الاسم، صفحہ اول ناقص ہے، مولف کمال

ابن نور بن کمال، جس نے یہ کتاب شاہ طہماسپ صفوی کے نام لکھی تھی، مقدمہ چہار مقالہ

اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے، کتابت کی تاریخ سنہ ۹۷۴ھ اور تعداد اوراق ۴۴۶ ہے، اسی

مؤلف کا ایک اور رسالہ اسی موضوع پر شاہ طہماسپ کے نام معنون ہے، جو شمارہ ۵۰۴ میں بیان ہوا ہے،

۵۲۱- مجموعہ (عربی ص ۳۰۵) حکیم جالینوس کے حسب ذیل نو حصوں پر مشتمل ہے،

(۱) کتاب فرق الطب (۲) کتاب الصناعۃ الصغیرہ (۳) کتاب النبض للمتعلمین (۴) المقالۃ الاولیٰ من کتاب الی اغلوقن فی التأتی لشفاء الامراض (۵) المقالۃ الثانی من کتاب فوق، (۶) فی الاسطقسات علی رأی ابقراط (۷) المقالۃ من کتاب فی المزاج (۸) المقالۃ الثانیہ (۹) المقالۃ الثالثۃ،

نہایت قدیم نسخہ ہے۔ ہر ایک حصے کے آخر میں ایک مختصر جملہ لکھا ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۶۹۲ھ میں محمد بن عبد السلام نے ان حصوں کا مقابلہ و تصحیح کی ہے، جزو سوم کے آخر میں سنہ ۷۰۶ھ کی تحریر موجود ہے۔ شمارۂ اوراق ۲۹۹،

۵۲۲- المختصر در طب (عربی ص ۳۰۷) تالیف علی بن محمد بن عبد اللہ متطبب ایزدی، یہ کتاب سنہ ۹۵۰ھ میں مکمل ہوئی اور سنہ ۹۶۷ھ میں خود مولف نے اس نسخہ کو مکمل کیا، جیسا کہ اس عبارت سے ظاہر ہے،

"وقد فرغت من تالیفی ھذا المسمی بالمختصر وکتابتہ ..... فی جبل قریۃ کما سمیت احدی قری بلدۃ ابرقوہ من توابع شیراز فی زمان ملک یقال لہ نیمور گورگان" عدد اوراق = ۱۳۲

۵۲۸- المنہج (عربی ص ۳۱۱)۔ مفرد ادویہ، ان کے خواص اور علاج کے بارے میں ہے، مولف کا نام معلوم نہ ہو سکا، ان میں حسب ذیل ۱۲ جدول ہیں:

(۱) الادویہ (۲) الماہیۃ (۳) النوع (۴) الاختیار (۵) المزاج (۶) القوۃ

(۷) منفعتہ فی اعضاء الراس (۸) منفعتہ فی آلات النفس (۹) منفعتہ فی اعضاء الغذا (۱۰) منفعتہ فی جمیع البدن (۱۱) کیفیتہ استعمالہ (۱۲) کمیتہ ما یستعمل منہ (۱۳) مضرتہ (۱۴) اصلاحہ (۱۵) بدلہ (۱۶) عدد الادویہ۔

بہت نفیس و قدیم نسخہ ہے، آخر ورق پر دوسرے قلم سے بعد میں ۱۱۷۸ھ کی ایک تحریر ملتی ہے، اس سے ظاہر ہے کہ یہ نسخہ اس سے قبل کا ہے، اوراق = ۱۴۳

۵۳۸۔ **ترجمہ وفیات الاعیان** (فارسی ص ۳۱۸)۔ ابن خلکان کی وفیات الاعیان کا ترجمہ کبیر ابن اویس لطیفی مشہور بقاضی زادہ نے عثمانی بادشاہ سلطان سلیم خاں کے لئے فارسی میں کیا تھا، جس سال یہ ترجمہ ختم ہوا یعنی ۹۲۶ھ اس سال کا یہ نسخہ ہے، اس لئے بہت اہم ہے، اوراق = ۲۴۹

۵۸۱۔ **کیمیاے سعادت** (فارسی ص ۳۴۳)۔ امام غزالی (۴۵۰ھ - ۵۰۵ھ) کی شہرۂ آفاق کتاب کا اہم نسخہ ہے، ورق اول پر یہ تحریر ہے:

"ومن ذالک العبد الخالص لمولاہ سلطان محمد قطب شاہ بلغہ الی غایۃ مایتمناہ فی دار السلطنتہ حیدرآباد ... فی تاریخ اواخر شہر ربیع الاول سنۃ اثنی وثلاثین بعد الف من الہجریۃ"

اس کے نیچے مہر ہے جس کا سجع یہ ہے:

نقش نگین دولت حیدر صفدر مرا ہر سلیمان زعون گشتہ میسر مرا

اسی طرح وہیں یہ الفاظ بھی ہیں: "العبد سلطان محمد قطب شاہ"

آخر کتاب پر طغرائی شکل میں خط ثلث میں سلطان محمد شاہ کا دستخط ہے، اس کے نیچے بھی کئی مہریں ہیں، ایک میں "شاہ عالمگیر" پڑھا جاتا ہے، ان تحریروں سے اندازہ ہوا کہ

بشاہی ملک میں رہا ہے، اوراق = ۴۲۲ ۵،

۵۸۲- **کیمیائے سعادت** (فارسی)۔ امام غزالی کی کتاب کا یہ نسخہ نہایت قدیم ہے، سال کتابت ۶۶۹ھ ہے، اوراق ۱۷۹، کاتب حسین بن حسین الرواری،

۵۹۱- **ینبوع الاسرار فی نصائح الابرار** (فارسی ص ۸۴۴)۔ تالیف حسین بن حسن کاشانی معروف بحسین خوارزمی۔ اخلاق کی یہ کتاب دو مقالہ اور بیس ابواب پر مشتمل ہے، مولف کی وفات کے ۲۵ سال بعد ۸۹۱ھ میں یہ نسخہ تحریر ہوا، ورق = ۳۰۱،

۵۹۴- **مجموعہ** (عربی ص ۱۵۰۳)۔ یہ مجموعہ حسب ذیل چھ رسالوں پر مشتمل ہے:

(۱) مواقع النجوم، تالیف محی الدین بن العربی (متوفی ۶۳۸ھ) سنہ تالیف ۶۰۶ھ تاریخ کتابت ۶۵۳ھ

واتفق تحریر هذه النسخة یوم السبت وقت الضحی فی محرم سنة ثلث وخمسین وستمائة بقریة جوشقان علی یدی صاحبها العبد الفقیر الی رحمة الملك الکبیر محمود بن علی بن ابی بکر بن احمد بن ابی المظفر الجوشقانی الاسفراینی۔

(۲) کتاب القریة ابن عربی،

(۳) اللوامع الغیبیة در معنی روح ابو عبداللہ عمر بکری سہروردی،

(۴) جواب مسائل ائمہ خراسان

(۵) مکتوب با امام فخر رازی،

(۶) رسالہ امام سعد حموی با بن العربی وچند مکتوب دیگر،

تاریخ کتابت ۶۵۳ھ، عدۂ اوراق = ۱۱۸ نہایت اہم نسخہ ہے،

۵۹۸۔ مجموعہ (عربی ص ۳۵۵) مشتمل بر ہفت رسالہ:۔

۱۔ فوائح الجمال، تالیف شیخ نجم الدین کبریٰ (مقتول ۶۱۸ھ) تاریخ کتابت ۷۰۹ھ

۲۔ رسالۃ الہائم

۳۔ تحفۃ البررۃ فی المسائل العشرہ، تالیف احمد بن علی بن جندب بن نصر

۴۔ رسالہ در عشق و عقل نگارش شیخ نجم الدین رازی صاحب مرصاد العباد، اس کی تاریخ کتابت ۷۰۴ھ ہے۔

۵۔ سہ مکتوب فارسی و عربی مجد الدین بغدادی و محمود عراقی

۶۔ کتاب التعرف لمذہب التصوف، تالیف ابوبکر بن اسحاق کلاباذی (نسخہ ناتمام)

۷۔ رسالہ ماہیۃ الصلوٰۃ، تالیف ابن سینا، تاریخ کتابت ۷۰۹ھ، تعداد اوراق = ۲۴۵

یہ مجموعہ بھی نہایت درجہ اہم و بیش قیمت ہے۔

۵۹۹ مجموعہ (عربی ص ۳۵۶) ۔ یہ بارہ رسالوں پر مشتمل ہے جن میں پہلا منطق پر ہے جس کی کتابت نوح بن یوسف بن علی سیرافی کے ہاتھ دل محرم ۵۷۰ھ میں ہوئی، دوسرا المسائل الحکمیہ، تالیف ابن سینا، تاریخ کتابت ۵۷۰ھ۔ تیسرا رسالہ شیخ الرئیس، چوتھا جواب ابی سعید احمد بن علی، اس کا کاتب بھی سیرافی ہے۔ پانچواں مخارج الحروف شیخ الرئیس کا ہے، تاریخ کتابت ۵۶۹ھ۔

اور کسی حصے پر تاریخ کتابت درج نہیں۔ نہایت اہم اور قدیم مجموعہ ہے، اوراق ۱۴۴

۶۲۱۔ مجموعہ (فارسی ص ۲۷۶)، ۲۳ کتابوں اور رسالوں پر مشتمل یہ مجموعہ ہے، جزو پنجم رسالہ در باب شکار ہے، اور جس کے مؤلف حسین حسنی طبسی ملقب بہ نصیر جو ان سے سلطان ابراہیم قطب شاہ کے لیے ۹۶۰ھ میں تالیف کیا تھا، جزو دہم تحفۃ شاہیہ جس

، مامون کے عہد میں صالح بن بہلہ ہندی طبیب کا ذکر آیا ہے، جزو شانزدہم، منتخب

ے سعادت ہے جس کا انتخاب بابا افضل کاشانی نے کیا تھا،

۶۳۰۔ مجموعہ (عربی ص ۳۸۸)۔ شامل ۱۵ کتاب و رسالہ جن میں جزو ہفتم خواجہ نصیر طوسی

ید الاعتقاد ہے۔ اس کے صفحہ اول کی پشت پر حسب ذیل عبارت خود خواجہ نصیر کی لکھی ہوئی ہے:

قرء علی ھذا الکتاب وھو کتاب تجرید الاعتقاد صاحبہ قرائۃ

مستوضح لمبانیہ وقواعدہ مستشرح لمعانیہ ومقاصدہ وکتب مولف

الکتاب محمد بن الحسن الطوسی اعانہ اللہ علی مراضیہ ووفقہ لطا عتہ

وغفر لہ خطایاہ وعفا عنہ ۔۔۔ ذالک بمدینۃ السلام بغداد ۔۔۔

الخامس والعشرون من ربیع الاول سنۃ تسع وستین وستمایۃ ھلالیۃ ھجریۃ

جزو ۱۲، کشف المراد فی شرح تجرید، تالیف علامہ حلی (متوفی ۷۲۶ھ) صفحہ اول پر

ب ذیل عبارت بخط مولف موجود ہے،

کتاب کشف المراد فی شرح تجرید الاعتقاد املاء العبد الفقیر الی اللہ

حسن بن یوسف بن مطھر غفر اللہ لہ

اس کے نیچے علامہ حلی کے لڑکے کا دستخط ہے۔ اور آخر میں پھر علامہ حلی کا خط ہے،

کتب العبد الفقیر الی اللہ تعالی حسن بن یوسف بن مطھر مصنف الکتاب الخ

اس لحاظ سے یہ مجموعہ اہم ہے۔

۶۳۳۔ مجموعہ (فارسی و عربی ص ۳۹۴)۔ یہ مختلف حکایات و نوادر و منتخبات نظم و نثر

مل ہے۔ اس کا کاتب ابوالفضل محمد بن محمود بن علی بن سدید ہے، اور سنہ کتابت ۸۵۵ھ ہے۔

۶۳۴۔ مجموعہ (عربی ص ۳۹۵) یہ مجموعہ فارابی، ابوسلیمان سجزی، ابن سینا، ارسطو،

ابوعلی مسکویہ، یعقوب اسحاق کندی، امام غزالی، عمر خیام اور چند مصنفین کے ۴۲ چھوٹے رسالوں پر مشتمل ہے، اس کا جزو ۲۲ عمر خیام کے رسالہ فی الوجود سے متعلق ہے، اور کافی اہم ہے۔

۶۴۰- **مجموعہ** (فارسی ص ۴۰۶)۔ یہ ۱۷ رسائل کا مجموعہ ہے جس میں عمر خیام کا رسالہ کلیات حکمت کے متعلق بہت اہم ہے، اس کو مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے اپنی تالیف خیام کے ساتھ چھاپ دیا ہے مگر جو نسخہ ان کے پاس تھا، وہ ناقص تھا،

۶۷۲- **مرصاد العباد** (فارسی ص ۴۲۶)۔ شیخ نجم الدین رازی کی یہ اہم تصنیف کئی بار چھپ چکی ہے، مگر یہ نسخہ کافی اہم ہے، اس لیے کہ اس کی تاریخ تصنیف سنہ ۶۲۰ھ اور یہ نسخہ سنہ ۶۹۰ھ میں لکھا گیا ہے،

۷۳۴- **مجموعہ** (عربی ص ۴۶۶)۔ اس مجموعہ میں تین رسالے ہیں جن میں تیسرا رسالہ بیون برہمن ہند اس طرح شروع ہوتا ہے:

"لما قدم بیون البرهمی من الهند زائراً بیت المقدس الشریف"

۷۵۵- **تسلیۃ الاخوان** (فارسی ص ۴۷۴)۔ عطا ملک جوینی صاحب جہانکشای جوینی کی یہ تالیف نہایت نادر ہے، اس کا ایک نسخہ کتابخانۂ ملی پاریس میں بھی ہے جس کی اطلاع تاریخ جہانکشا کے مقدمہ میں مرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی نے دی ہے، اوراق = ۳۴

۱۷۷- **شرح الاسماء الحسنیٰ** (عربی ص ۵۸۴)۔ خدا کے ناموں کے خواص میں یہ کتاب عبدالعزیز بن نصیر نے لکھی تھی، یہ نسخہ مولف کتاب ہی کا لکھا ہوا ہے۔

فہرست جلد دوم | **تفسیر آیۃ الکرسی** (فارسی ص ۱۶) دسویں صدی ہجری میں کسی عالم نے یہ تفسیر لکھی ہے، نسخہ زیر نظر سنہ ۹۶۲ھ کا رقمیہ ہے، کسی دوسرے نسخے سے مقابلہ بھی کیا گیا ہے، مولف کی نظر سے بھی یہ نسخہ گزرا ہے، دوسرے اور تیسرے ورق پر مولف کے ہاتھ کا حاشیہ بھی ہے،

ہ کی پشت پر ایک یادداشت عبدالرشید کے دستخط کی ہے، اور ۱۰۳۶ھ بھی درج ہے
سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط عبدالرشید تتوی مولف فرہنگ رشیدی کا ہوگا، شمارہ
ق = ۲۳

۸۱۱۔ **تفسیر ابوالفتوح** (فارسی ص ۲۴) ابوالفتوح رازی کی اہم فارسی تفسیر
محمد قزوینی کے اہتمام سے شائع بھی ہو چکی ہے۔ یہ نسخہ اگرچہ ۱۰۵۰ھ کا لکھا ہوا ہے،
س کا اصل نسخہ ۶۱۵ھ کا تھا جو ۱۰۰۰ھ میں قاضی نوراللہ شوستری کے زیر مطالعہ
چکا تھا، اسی نسخہ کا ایک جزو اس نسخے سے منقول ہے، جو ۱۰۸۷ھ میں کتاب خانہ
انۂ قدس رضویہ مشہد میں وقف ہوا تھا، اس تفسیر کا سنہ تالیف ۵۵۶ھ کے
یب ہوگا، اور اسی سنہ کا لکھا ہوا ایک نسخہ کتابخانہ آستانہ میں محفوظ ہے۔

۸۱۷۔ **المبسوط فی قرات السبع** (عربی و فارسی ص ۳۰)۔ اس کتاب کا مولف
مد بن محمود بن محمد بن احمد بن علی شریف سمرقندی (ہمدانی الاصل) متخلص بحافظ ہے، اس کا
نا سید ابوالقاسم محمد بن یوسف الحسینی مدنی سمرقندی (مولف کتب زیادہ) تھا۔ زیر نظر
خہ ۸۶۵ھ اور ۸۶۹ھ کا نوشتہ ہے، کل اوراق ۱۱۹ ہیں، اس کا ایک نسخہ ۱۰۱۹ھ)
تابخانہ مشہد میں بھی ہے (ج ۲ ص ۲۳۴)

۸۸۱۔ **شرح معمیات** (فارسی ص ۱۲۸) شرح معمیات میر حسین[1] کا مولف محمد
بن علی نوبذاکی ہے، جو دسویں صدی ہجری میں گذرا ہے، یہ نسخہ ۹۴۷ھ میں خود مولف کی حیات
یں لکھا گیا ہے، اوراق ۱۱۷،

۸۸۵۔ **منتخب حلل مطرز در معما و لغز** (فارسی ص ۱۳۶)۔ اس کا مولف شرف الدین

---

[1] میر حسین بن محمد حسینی نیشاپوری متوفی ۹۰۴ھ (کشف الظنون ج ۲ ص ۴۶۰)

علی یزدی (متوفی ۸۵۸ھ) صاحب ظفرنامہ تیموری ہے، منتخب خلل مطرز کو ابراہیم سلطان کے نام پر لکھا ہے، زیرغور نسخہ ۸۷۷ھ کا ہے اور ۹۲۵ھ کی یادداشت بھی ہے، اوراق ۱۸۱

۸۹۷- **تذکرۂ اسحٰق** (فارسی ۱۵۲) اسحاق بیگ متخلص بہ عذری لطف علی آذر مولف آتشکدہ کا چھوٹا بھائی تھا، یہ تذکرہ آتشکدہ کی نئی ترتیب ہے، زیرنظر نسخہ ۱۲۱۷ھ کا رقیمہ ہے، اوراق ۲۰۰ ہیں۔

۹۲۱ - ۹۲۳ **خمسہ امیر خسرو** / **" نظامی** / **" خواجو** } متن خمسہ نظامی، حاشیہ خمسۂ امیر خسرو، و خمسۂ خواجو (فقط روضۃ الانوار و ہمای و ہمایوں) بخط نستعلیق روح اللہ بن علی بن عماد الاسلام جمال الاسلامی سال ۸۲۴ھ عنوان بخط ثلث محمود بن محمد،

۹۴۲- **دیوان ارسلان** (فارسی ص ۲۱۶) قاسم مشہدی متخلص بارسلان (متوفی ۹۹۵ھ) ہندوستان آیا تھا، اور اکبر کے نوازشات سے بہرہ یاب ہوا تھا، اس کے دیوان کا یہ نسخہ مولف کے زمانہ کا ہے، امکان اس کا بھی ہے کہ خود مولف کے ہاتھ کا ہو، اوراق ۴۳

آغاز: ساقی زعکس می شدہ روشن ضمیر ما :: جامی بدہ کہ عارف جام است پیر ما

۹۴۶- **دیوان الفت اصفہانی** (فارسی ص ۲۲۳) اس کو خود شاعر نے ۱۲۹۹ھ میں لکھا ہے، اوراق ۱۶۶

۹۵۲- **دیوان اوجی نطنزی** (ص ۲۳۳)، اوجی (متوفی ۱۰۲۰ھ) کا یہ دیوان ۱۰۴۲ھ میں عبدالرشید خطاط (خواہرزادۂ میر عماد) نے لکھا تھا، اوراق ۵۰

۹۵۷- **دیوان محسن تاثیر** (ص ۲۳۸) یہ نسخہ شاعر کی وفات یعنی ۱۱۲۹ھ کے قبل تحریر ہوا، اوراق ۴۳۰

۹۶۴- **دیوان حاجی ابرقوہی** (ص ۱۰۱) دسویں صدی ہجری کا ایک شاعر تھا، جو ابرقوہ (بفاصلہ ۲۲ فرسخ بسمت شمال شرقی) کا باشندہ تھا، دیوان سے ظاہر ہوتا ہے کہ تاجر پیشہ تھا، اور بعد میں ہندوستان چلا آیا تھا، اور یہاں کے بادشاہوں کی مدح کی، محمد قلی قطب شاہ کی مدحیہ قصیدہ میں لکھتا ہے:

شہا در دکن بندہ سی سال گشتم ز حکم قضا و با مر الٰہی

اپنی مثنوی ناظر و منظور میں اپنے ہندوستان جانے کا واقعہ بیان کیا ہے، حاجی نے اپنا دیوان ہندوستان کے خوانین میں سے ایک خان مسمی بہ مصطفیٰ خاں کے اشارہ سے مدون کیا تھا،

دیوان کا یہ نسخہ بڑے عمدہ نستعلیق خط میں ہے، اور ۹۷۳ھ کے بعد تحریر ہوا ہے، بعض اوراق درمیان سے غائب ہو چکے ہیں، اوراق = ۱۱۰

۹۶۵- ۹۶۹ **دیوان حافظ** (ص ۲۵۴) - ایک نسخہ ۸۵۵ھ کا اور دوسرا ۹۵۰ھ کا ترقیمہ ہے، آخر الذکر سلطان علی مشہدی کا خط ہے،

۹۷۰- **دیوان خاقانی** (۲۷۱) دیوان خاقانی کا یہ نہایت قدیم نسخہ ہے، گمان غالب یہی ہے کہ خود شاعر کی حیات میں یعنی اواخر قرن ششم کا نوشتہ ہو، اوراق ۲۶۵،

۹۷۳- **دیوان حمید ہمدانی** (ص ۲۶۵) - یہ صفوی عہد کا شاعر تھا، نسخہ زیر نظر ۱۱۲۸ھ کا ترقیمہ ہے، ممکن ہو کہ خود شاعر کی زندگی ہی میں تحریر ہوا ہو، اوراق ۹۵

۹۸۶- **دیوان رفیع الدین لبنانی** (ص ۲۸۵)، رفیع الدین قرن ششم کا قابل ذکر شاعر تھا، اس کے معاصرین میں جمال الدین اصفہانی تھا، دونوں کے ممدوح رکن الدین

قاضی اصفہان و صدر الدین خجندی رئیس شافعیۂ اصفہان تھے، دیوان کا یہ نسخہ نایاب ہے

اور ۱۰۰۰۰ بیت پر مشتمل ہوگا، اوراق ۸۴

۹۸۰- دیوان روح الامین | روح الامین (۹۸۱ھ۔ ۱۰۴۷ھ) ۲۹ سال

میر جملہ اصفہانی (ص ۲۸۹) | کی عمر میں ہندوستان چلا آیا اور عہد جہانگیری

و شاہجہانی میں مقرب بارگاہ رہا، دیوان کا یہ نسخہ غزلیات پر مشتمل ہے، اوراق ۴۴

۹۹۴- دیوان سلمان ساوجی (ص ۳۰۰) یہ نسخہ ۸۵۸ھ کے قریب تحریر ہوا، اوراق ۲۵۴

۱۰۰۷- دیوان صائب تبریزی (ص ۳۲۴) یہ نسخہ خود صائب کے ہاتھ کا ہے،

ملک الشعرا محمد تقی بہار کے اس سلسلے کے ملاحظات قابل غور ہیں، اوراق ۴۰

۱۰۱۸- دیوان طالب آملی (ص ۳۴۱) طالب آملی ملک الشعراے عہد جہانگیری

کے دیوان کا یہ نسخہ ۱۰۴۱ھ کا نوشتہ ہے، اوراق ۲۵۱

۱۰۲۶- دیوان عرفی (ص ۳۵۰) عرفی کے دیوان کا یہ کامل نسخہ ہے جس کو سراجا

اصفہانی نے خان خاناں کے حکم سے مرتب کیا تھا، اس پر عبد الباقی نہاوندی صاحب مآثر رحیمی نے

دیباچہ لکھا تھا، یہ دیباچہ بھی اس نسخہ کے ساتھ ملحق ہے، نسخہ خوش خط ضرور ہے مگر اغلاط بھی ہیں

دیباچے کے بعض صفحے کرم خوردہ ہیں اور درمیان سے بھی چند ورق غائب ہیں، اس ترتیب کا

ایک نسخہ پروفیسر محمد شفیع (پنجاب) کے پاس بھی ہے، اس میں بھی عبد الباقی نہاوندی کا دیباچہ

شامل ہے، اوراق ۴۱۰

۱۰۲۸- دیوان عصمت (ص ۳۵۴) عصمت بخارائی (متوفی ۸۴۰ھ) کے دیوان

کا یہ نسخہ نہایت عمدہ خط نستعلیق میں جلال غیاث فرح اللہ کے ہاتھ کا ہے، بظاہر قرن نہم

کے وسط میں تحریر ہوا ہوگا۔

۱۰۳۰۔ **دیوان عماد فقیہ** (ص ۵۹) عماد فقیہ کرمانی کا یہ نسخہ غالباً اواخر قرن ہشتم کا ہے،
مدرسہ سپہ سالار میں ۷۹۱ھ میں لکھا گیا ہے نہایت نفیس نسخہ ہے، اوراق ۲۱۲

۱۰۳۵۔ **دیوان فانی** (ص ۲۶۷) امیر علی شیر نوائی (۸۴۴ھ-۹۰۶ھ) کے
دیوان کا یہ نسخہ ۹۰۱ھ اور ۹۰۶ھ کے درمیان لکھا گیا ہے، اوراق ۱۷۶،

۱۰۴۹۔ **دیوان کمال اسمٰعیل** (ص ۳۰۸) خلاق المعانی کمال اصفہانی (مقتول ۶۳۵ھ)
کے دیوان کا یہ نسخہ ۷۲۵ھ کا ہے، اس کے بعض اوراق کچھ بعد کے ہیں، اوراق ۳۵۲،

۱۰۹۵۔ **ستۂ داعی**
۱۰۹۶۔ **قدسیات** } (ص ۴۶۴) نظام الدین محمود حسینی شیرازی مشہور بہ "شاہ داعی الی اللہ" (یکی از عرفاے قرن نہم ہجری) کے
دیوان (ستہ) اور قدسیات کے یہ نسخے کافی اہم ہیں، داعی نے ۸۷۰ھ میں وفات پائی ہے،
ان کا مزار شیراز کے جنوب مغرب میں ابھی تک مرجع خلائق ہے، شمارہ اوراق دیوان: ۱۵۵،

۱۱۲۷۔ **شرح قصیدہ بردہ** (ص ۵۲۴) قصیدہ بردہ جو الکواکب الدریہ فی مدح
خیر البریہ کے نام سے موسوم ہے، شرف الدین ابو عبد اللہ محمد بن سعید بوصیری کی تصنیف ہے،
(۶۰۸ھ-۶۹۶ھ) اس کی غیر معمولی شہرت کی بنا پر بہت سے لوگوں نے اس کی شرحیں
کی ہیں، زیر غور نسخہ بھی قصیدہ بردہ کی شرح ہے، شارح محمد بن نصیر مشہور بہ شمس امام ہے،
اس کا کاتب برہان عبد اللہ موذن اور سال کتابت ۸۸۲ھ ہے، ایک دوسرے کاتب
نے ۸۹۲ھ میں حاشیہ میں ہر بیت کا دوسری طرح پر ترجمہ دیا ہے،

یہ نسخہ خاصا قدیم ہے، قیاس ہے کہ خود شارح کی حیات میں تحریر ہوا ہے، اوراق ۲۳۴

۱۱۳۱۔ **کلیات اہلی** (ص ۵۳۶) اہلی شیرازی (متوفی ۹۴۲ھ) کے دیوان کا یہ نسخہ
عجب نہیں کہ مولف کی نظر سے گذرا ہو، اور ص ۵۹۱، ص ۶۶۸ کے حواشی اسی کے ہاتھ کے ہوں،

۱۱۴۶- **بوستان** (ص ۹۰ ۵)۔ بوستان سعدی کا یہ نسخہ میر عماد خطاط نے اعتقاد خاں کی فرمائش پر لکھا تھا، اوراق ۲۰۵

۱۱۷۱- **لیلیٰ و مجنون مثالی** (ص ۶۳۶)۔ مثالی کاشانی نے بقول سام مرزا خمسہ نظامی کا جواب لکھنا چاہا تھا، مگر کامیاب نہ ہو سکا، صرف لیلیٰ و مجنوں مثنوی کو ۸۹۷ھ میں تمام کیا، زیر بحث نسخہ ۹۰۴ھ میں خود مولف نے لکھا ہے، آخری عبارت یہ ہے:

"سوّدہ العبد مثالی الکاشانی فی منتصف شہر رمضان المبارک سنہ اربع وتسع مائیۃ"۔

گلہائے پریشاں

آراستہ الیاس احمد (ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج)، ضخامت کتاب ۵۰۸ صفحات، تقطیع بڑی، قیمت ۷ روپیہ ۵۰ نئے پیسے، ملنے کا پتہ: کتابستان، الہ آباد،

"گلہائے پریشاں" فارسی اور اردو شعراء کے چوٹی کے کلام کا بے مثل گلدستہ ہے، آغاز عشق سے انجام عشق تک جتنے مراحل پیش آتے ہیں، ان کے متعلق سرخیاں قائم کی گئی ہیں، اور چیدہ چیدہ متحد المضامین اشعار ہر سرخی کے تحت میں تقدم اور تاخر کے لحاظ سے درج ہیں، مراحل محبت کی سرخیوں کے علاوہ خمریات، مذہبیات، اخلاقیات وغیرہ کے متعلق بکثرت سرخیاں ہیں، اگر کسی شعر کے متعلق کوئی لطیفہ ہے تو وہ بھی درج کر دیا گیا ہے، اساتذہ سابق کی تیس تصویریں بھی کتاب میں شامل ہیں، اردو ادب میں یہ کتاب ایک دلکش و دلفریب اضافہ ہے، اہل ذوق ملاحظہ فرمائیں،

ع شنیدہ کے بود مانند دیدہ

آثارِ علمیہ

مکاتیب مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

بنام

شاہ معین الدین احمد ندوی

(۲۱)

برادرم شاہ معین الدین صاحب ندوی، دعاے خیر

السلام علیکم و رحمۃ اللہ - آپ کے دو کارڈ ملے، بہتر ہے یہ شذرات آیندہ دیدیجئے گا،

تاریخ اسلام جلد اول واپس جا رہی ہے آپنے اس کی تصحیح نہیں کی، اس کی جلد تصحیح کرلیں، اسی لیے میں نے کہا تھا کہ کتابوں کی تصحیحات پہلے سے تیار کرلیا کیجئے، عین وقت پر دشواری ہوتی ہے،

مولوی ظفر احمد صاحب کے دو مضمون جاتے ہیں آپ یکایک کرکے دیجئے، ایک نظم تجمد صاحب کی ہے،

معارف کا جو پرچہ اس سے پہلے شائع ہوا تھا، وہ اچھا لکھا اور چھپا تھا، مگر یہ پرچہ تو پھر خراب لکھا اور چھپا ہے، آپ گذشتہ پرچہ کو سامنے رکھ کر مطالبہ کیجئے کہ ایسا لکھا جائے اور چھاپا جائے،

آپ کا مضمون افغانستان جاتا ہے، تذکرۃ الحفاظ ہی کی دوسری یا تیسری جلد میں ایک محدث کا نام ہے جنھوں نے کابل میں اسلام کی اشاعت کی، آپ تذکرۃ الحفاظ نکال کر دیکھئے ٹائیٹل یا جلد کے خالی صفحوں پر اپنی عادت کے مطابق غالباً میں نے حوالہ نوٹ کر دیا ہے، اس مضمون کو اور مولوی ابوظفر صاحب والے سندھ کے مضمون کو اسلم صاحب کو دیجئے کہ ترجمہ کر دیں، افسوس کہ صباح الدین صاحب بیمار ہیں، کون ان کو انگریزی کرے، اسی بیچارہ کے بھروسہ ایسے ایسے کاموں کو لے لیتا تھا۔

آپ کے لیے تاریخ یمینی مع شرح جو عتبی کے نام سے مشہور ہے اور یمین الدولہ محمود غزنوی کی مقفیٰ تاریخ ہے ایک صاحب سے بمبئی میں لے لی ہے، مولوی عبد السلام صاحب "الانسان الکامل" ڈھونڈ رہے تھے، یہاں نسخہ ملا، وہ ان کے لیے لیا ہے، ریل کی معرفت بھیجوں گا، برادرم اسلم کا وہاں ہونا مشکوک معلوم ہوتا ہے، شاید پٹنہ گئے ہوں، اسی لیے ان کو خط نہیں لکھا، مولوی ناظم صاحب بھی معلوم نہیں ہیں یا گئے؟ ہوں تو بعد سلام کہہ دیجئے کہ ان کو جواب اطمینان سے دوں گا۔

والسلام

سید سلیمان ۲ اپریل ۱۹۴۲ء

(۳۲)

برادر عزیز اعزکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ کا کارڈ ملا، میں اس سفر میں جو لکھنؤ اور اعظم گڈھ کا ہوا تھا، شاید تداخل موسم یا کھانے کی بے احتیاطی سے بیمار سا ہو گیا، اور ایک ماہ تک اس کا سلسلہ جاری رہا، کل تو درد گردہ کی بھی کچھ کھٹک ہو گئی تھی، مگر اللہ تعالیٰ نے خیر فرمائی اور آج بالکل اچھا اپنے کو محسوس کرتا ہوں، بلکہ کل بذریعہ کار اندور کا عزم رکھتا ہوں، وہاں مسلمان غالب

کی طرف سے دعوت ہے، کل صبح جاؤں گا اور پرسوں واپس آجاؤں گا،

ہندوستان کی سیاست کا اثر ہر ریاست پر پڑ رہا ہے، یہاں بھی کچھ پبلک نمایندے وزارت کی مسند پر بٹھائے جائیں گے، چنانچہ تعلیمات و داخلیہ جو پہلے شعیب قریشی کے سپرد تھا، سردست تو مدار المہام کے سپرد ہوگیا ہے، جو ہندو ہے، اور شعیب صاحب وزارت سیاسیہ میں چلے گئے اب دیکھنا یہ ہے کہ کون ان کی جگہ پر آتا ہے، اور اس کے تعلقات میرے ساتھ کیسے قائم ہوتے ہیں، بہرحال مجھے تو ابھی چند ماہ گذارنے ہیں، والامر بید اللہ تعالیٰ۔

غالباً مولوی مسعود علی صاحب وطن چلے گئے ہوں، اور کئی ماہ کے لیے گئے ہیں، اس زمانہ میں نگرانی کا کام معلوم نہیں کس کے سپرد کر گئے؟

مولوی وحید احمد نے لکھا ہے کہ وہ آپ کے زیر نگرانی مطالعہ کا کام کر رہے ہیں، مولوی مسعود علی صاحب کے خط سے معلوم ہوا تھا کہ وہ اور آپ بھی ان سے غیر مطمئن ہیں، صورت حال سے مطلع فرمائیں، اور اپنی رائے لکھیں،

بحمد اللہ یہاں خیریت ہے، بجز اس کے کہ کھانے کو نہیں ملتا، اب اس مہینہ سے ایک ثلث گیہوں، ایک ثلث چنا اور ایک ثلث جوار کا حکم ہوا ہے،

دار المصنفین کے حالات سے گاہ گاہ مطلع کرتے رہیں، والسلام

سید سلیمان، ۲؍ اپریل ۱۹۴۷ء

(۲۳)

برادر عزیز السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا لفافہ مع کاغذات ملا، گورنمنٹ آف انڈیا کا جواب تیار کیا جا رہا ہے، جس امر کے لیے آپ نے لکھا ہے، مجھے اس سے اتفاق ہے، بشرطیکہ صاحب موصوف منظم و باقاعدہ

اختیار کرنے کی کوشش کریں، مولوی صاحب کو میں بھی لکھوں گا،

حیدرآباد کے جواب میں کہیں کہیں غلطیاں رہ گئیں، مولانا حمید الدین صاحب نظام کالج کے پرنسپل نہیں، بلکہ دار العلوم کے پرنسپل تھے۔

الحمد للہ خیریت ہے، اب ایک تہائی گیہوں، ایک تہائی بونٹ اور ایک تہائی جوار کا راشن ہوا ہے، یہاں پبلک وزراء، انٹریم گورنمنٹ بھوپال کے مقرر ہوئے ہیں، دیکھئے کیسا کام کرتے ہیں،

دار المصنفین کے احوال سے مطلع کرتے رہیے، برادرم اکلم سے سلام کہدیجئے، خیریت ہے،

والسلام، سید سلیمان، ۱۶ ر اپریل ۱۹۴۷ء

(۲۴)

برادرم زاد کم توفیقاً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ یاد ہوگا کہ جاڑوں میں، آپ کو فتح سندھ وافغانستان کا مضمون بھیجا تھا کہ اس کو انڈین ہسٹری کانگریس میں بھیج دیں، آپ نے مجھے لکھا تھا کہ آپ نے نیاز صاحب سے انگریزی ترجمہ کرا کے بھیجدیا ہے، غالباً دلی کے پتہ سے آپ نے بھیجا تھا، رجسٹری کی رسید آپ کے پاس ہوگی، اس کے نشان سے ڈاکخانہ کو لکھیے، وہ رجسٹری مکتوب الیہ کو نہیں پہنچی، جیسا کہ اس مرسلہ انگریزی خط سے آپ کو معلوم ہوگا، دیکھئے۔ اگر اس کی نقل آپ کے پاس ہو تو صاف یا ٹائپ کرا کے دوبارہ ان کے پاس اس کو الہ آباد کے پتہ سے بھیجدیجئے، تاکید جانئے، ٹائپ کی اجرت دفتر سے دلوا دیجئے گا۔

مولوی ابو الجلال صاحب کے متعلق مولوی مسعود علی صاحب کا بھی خط آیا ہے، بہتر یہ ہے کہ آپ انھیں رکھ لیں، میں ارکان کو لکھوں گا،

الحمد للہ خیریت ہے، برادرم اسلم سلمہٗ واپس آگئے ہوں گے، سلام کہئے، علی حسن اب تک نہیں آیا، سلیم کے آج کل آنے کی خبر ہے،

والسلام

سید سلیمان، ۲۲ اپریل ۱۹۴۷ء

(۲۵)

عزیزم سلمکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم۔ الحمد للہ کہ خیریت ہے، اس وقت ملک کے خونی مناظر سے دل خون ہے، اللہ تعالیٰ رحم فرمائے، بحمد اللہ کہ یہاں پر امن و امان ہے، دعا کیجئے کہ وہاں بھی ہو، حج کے راستے اسوقت تک بند ہیں، نہ دہلی جا سکتے، نہ سہارنپور اور نہ کراچی، اور ہمارے ٹکٹ کراچی سے ہیں، سید حسین کو بھی ابھی تک رخصت نہیں مل سکی، اس لیے نا امیدی بڑھتی جاتی ہے،

الحمد للہ کہ آپ مع الخیر واپس آگئے، اسلم اور صباح الدین کو خط لکھے تھے، جواب نہیں آیا، مولوی مسعود علی صاحب کے نام ہسبتڑی بھیجی تھی، رسید کی اطلاع نہیں ملی، اس میں ایک چک بھی تھا

اس زمانہ میں میرے چند مضامین چھپے ہیں، ایک مقدمہ مولانا الیاس صاحب رحمہ اللہ کے سوانح کے جدید اڈیشن پر، دوسرا مکتبۂ دین و دانش پٹنہ سے اسلامی سیاسیات پر، یہ وہ مضمون ہے جو پہلے مسلسل معارف میں چھپا تھا، تیسرا مضمون مولانا عمادی پر لکھا ہے جس کو اڈیٹر کے نام بھیجوں گا وفیات میں چھپے گا، ان دونوں مذکورہ مقدموں کو ان کتابوں سے لیکر معارف کے مقالات میں چھپوا دیجئے کہ یادگار رہے،

خیال ہے کہ ملک کی بد امنی اور بے اطمینانی کا اثر دار المصنفین اور معارف پر ضرور پڑا ہوگا رفقا کو سلام کہہ دیجئے، برادرم اسلم کو بھی سلام کہہ دیجئے اور خط دکھا دیجئے، سہارنپور میں خیریت ہے کل خط آیا تھا۔

والسلام سید سلیمان، ۱۳ ستمبر ۴۷ء

مطبوعات جدیدہ

ارمغان علمی - مرتبہ ڈاکٹر سید عبداللہ پروفیسر اردو پنجاب یونیورسٹی، تقطیع بڑی ضخامت ۱۶ ۵ صفحات، کاغذ اعلیٰ، ٹائپ خوبصورت، قیمت ۵۰ عہ، پتہ: مجلس ارمغان علمی لاہور

پروفیسر ڈاکٹر محمد شفیع سابق پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور کے علمی کارنامے اہل علم میں تعارف سے مستغنی ہیں، ان کی پوری زندگی علم وفن کی خدمت اور علمی وتحقیقی کاموں میں گذری، انکے کارنامے کسی طرح فضلائے مغرب کے کارناموں سے کم نہیں، انھوں نے بہت سے فاضلانہ مقالات لکھے، اور عربی وفارسی کی متعدد اہم اور نایاب کتابوں کو تصحیح وتحشیہ کے ساتھ شائع کیا، اور اپنے تلامذہ میں تحقیقی کام کرنے والوں کی ایک جماعت پیدا کر دی، ان کے تلامذہ نے ان کے علمی کارناموں کے اعتراف میں علمی ومحققانہ مضامین کا یہ مجموعہ ارمغان علمی کے نام سے استاد کی خدمت میں پیش کیا ہے جو ہندوستان وپاکستان اور مشرق ومغرب کے نامور علماء کے مضامین پر مشتمل ہے، یہ مضامین اردو، انگریزی، عربی، فارسی، فرنچ وغیرہ مختلف زبانوں کے ہیں، ان کی فہرست یہ ہے، اردو کے مضامین روضۃ السلاطین، قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی عربی زبان کی اہمیت، استاذ محمد المامون ارزنجانی، اکبری دربار میں جین سادھو، ڈاکٹر بنارسی داس، ہندوستان کے علما اور ان کی عربی تصانیف، ڈاکٹر زبید احمد، آٹھویں صدی ہجری کے اندلسی شعرا کا ایک تذکرہ، مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی، ذال معجمہ فارسی میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، استاد بزرگ میری نظر میں، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نجیب اللہ

جرباذقانی ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، پرنسپل شفیع کے چند علمی مکتوبات، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ کعبہ شریف، ڈاکٹر غلام یزدانی، فیضی کا نظریہ شعر، ڈاکٹر وحید قریشی، تاریخ طاہری جبا ہاشمی، فارسی کے حسب ذیل مقالات ہیں، فارسی زبان کا ایک قدیم ترین نسخہ آقائے عبد تاریخچہ ہلال و ستارہ آقائے عبدالحئی حبیبی، نوآموزوں کی تعلیم قرآن ڈاکٹر علی اصغر حکمت، نسب امیر تیمور ڈاکٹر احمد زکی ولیدی طوغان، فارسی اشعار کے قدیم ترین مجموعے، پروفیسر قدیم ترین فارسی کا موجود نمونہ، آقائے ڈاکٹر مہدی بیانی، عربی کے حسب ذیل مضامین ہیں اسلام اور تہذیب جدید میں انسانی ضمیر استاد عبدالوہاب حمودہ، قرون وسطی میں مسلمانوں کے زوال کے اسباب، استاد احمد سید، ہمارا اسلامی ورثہ اور جدید فنون کی تولید میں ان کی اور ان سے استفادہ، استاد عباس خضر، اسلام اور انسانی تہذیب، انگریزی کے مضامین ہیں، آقا رعنا مصور، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، الغزالی اور مسائل تعلیم، پروفیسر محمد ابراہیم یمن کی تلاش کا مختصر جائزہ، ڈاکٹر احمد فخری، معتزلہ کی تحریک کے متعلق کچھ غیر مطبوعہ رسا پروفیسر فاک، بغاوت نورپور اور محاصرہ تاراگڑھ، ڈاکٹر کوثر، شمس تبریز ملتانی پروفیسر ابو اسلامی تعلیم میں ایم جعفر، ابن سینا کا ایک رسالہ روح پر، ڈاکٹر صغیر حسن معصومی، تیمو ترکمانی جنگ، پروفیسر منورسکی، خسرو اور ابن بطوطہ، ڈاکٹر وحید مرزا، ہرن منارہ شیخ پو احمد، بانی، رشید وطواط کے سوانح اور اس کی علمی سرگرمیاں، ڈاکٹر سخاء اللہ، اسلام سے پہلے کی عربوں کی طب، ڈاکٹر زبیر صدیقی، اقبال اور آزاد خیالی، ڈاکٹر رضی الدین۔ ان کے علاوہ پروفیسر عدنان، پروفیسر ارسلان، پروفیسر اوٹو اسپیز، اور پروفیسر عثمان توران کے دوسری مغربی زبانوں میں مضامین ہیں، ان پر تفصیلی تبصرہ طویل ہوگا، بیشتر مضامین محققا ہیں، اور فائدہ سے تو کوئی بھی خالی نہیں، کتاب کے شروع میں فاضل مرتب کے قلم سے پروفیسر

شفیع کے حالات اور ان کے علمی خدمات کی مختصر فہرست ہے، اس طرح یہ مجموعہ اصحاب علم کے لیے واقعی ایک علمی ارمغان کی حیثیت رکھتا ہے،

تجرید صحیح بخاری } مترجمہ مولانا ابو الفتح صاحب عزیزی تقطیع بڑی، ضخامت ۲۰۰
ترجمہ اردو } صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ۸؎ ،

پتہ: محمد سعید اینڈ سنز ناشران و تاجران کتب، قرآن محل مقابل مولوی مسافر خانہ کراچی،

محمد سعید اینڈ سنز تاجران کتب کراچی نے حدیث کی مشہور کتابوں کے اردو ترجمے کا مفید سلسلہ شروع کیا ہے، اور اب تک کئی کتابوں کے ترجمے شائع کر چکے ہیں، مذکورہ بالا کتاب علامہ حسین بن مبارک زبیدی کی تجرید بخاری کا ترجمہ ہے، جسے علامہ زبیدی نے سہولت اور افادہ عام کے لیے صحیح بخاری کی مکررات اور ان کی اسناد حذف کر کے کیا تھا، ترجمہ صاف اور سلیس ہے، کتاب کے شروع میں امام بخاری کے مختصر حالات اور صحیح بخاری کے رواۃ کا تعارف اور ان کی مرویات کی تعداد کی تفصیل ہے، اردو داں شائقین حدیث کو اس کتاب کے مطالعہ سے فائدہ اٹھانا چاہیے،

حیدر آباد کے بڑے لوگ۔ جناب سید غلام پنجتن تمشاد، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۰۵ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت عہ، پتہ: سب رس کتاب گھر خیرت آباد حیدر آباد دکن،

اس کتاب میں مرحوم حیدر آباد دکن کے ایسی پندرہ شخصیتوں کے حالات ہیں جنھوں نے نمایاں ملکی، قومی، سیاسی یا علمی کام انجام دیے ہیں، مثلاً افسر الملک، سر امین جنگ، آغا علی سالار جنگ، سید علی بلگرامی، سروجنی نائیڈو، مہاراجہ کشن پرشاد، کیشو راؤ، اور راجہ چندو لال وغیرہ کتاب دلچسپ ہے، اور اس سے ان شخصیتوں کے حالات کے ساتھ حیدر آباد کے بہت تاریخی، سیاسی اور سماجی حالات بھی معلوم ہوتے ہیں،

"م"

فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف - اعظم گڈھ

مقام اشاعت	دار المصنفین، اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت	ماہانہ
نام پرنٹر	صدیق احمد
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین، اعظم گڈھ
نام پبلشر	" "
قومیت	....
پتہ	دار المصنفین، اعظم گڈھ
نام اڈیٹر	شاہ معین الدین احمد ندوی
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین، اعظم گڈھ
نام و پتہ مالک رسالہ	" "

میں صدیق احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں

صدیق احمد

۹ مئی ۱۹۵۷ء

مکتبۂ دار المصنفین

سلسلۂ سیرۃ النبی ﷺ

...ادت سے فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات

...ت، اخلاق و عادات کا مفصل بیان،

...کی حقیقت اور قرآن مجید کی روشنی میں بحث و تبصرہ

...بیغ نبوی کے اصول، عقائد اسلام پر مفصل و حکیمانہ بحث

...ائض خمسہ پر سیر حاصل بحث

...لامی اخلاقی تعلیمات، اسلامی فضائل و آداب

...صیل

سلسلۂ سیر الصحابہ

...ن: خلفائے راشدین کے ذاتی حالات و فضائل

...ول: حضرات عشرہ مبشرہ اور بقیہ صحابہ کے حالات و فضائل

...دوم: فتح مکہ سے پہلے کے صحابہ کرام کے حالات

...ول: انصار کرام کے فضائل و کمالات

...وم: بقیہ انصار کرام کے حالات زندگی

...تم: حضرات حسین، امیر معاویہ اور عبد اللہ بن زبیر کے مفصل حالات

...جلد ہفتم: فتح مکہ کے بعد صحابہ کرام کے سوانح حالات

سیر الصحابیات: ازواج مطہرات، بنات طاہرات اور عام صحابیات کے حالات

اسوۂ صحابہ اول: صحابۂ کرام کے عقائد، عبادات و اخلاق کی تفصیل

" دوم: صحابۂ کرام کے سیاسی و انتظامی کارناموں کی تفصیل

اسوۂ صحابیات: صحابیات کے مذہبی، اخلاقی اور علمی و عملی کارناموں کا مرقع

اہل کتاب صحابہ و تابعین: یہودی و نصرانی صحابہ کے حالات

الفاروق: حضرت فاروق اعظم کی لائف اور عراق و شام، مصر سے ایران کی فتح کے تفصیلی حالات

سیرت عائشہ: حضرت عائشہ کے حالات زندگی

سیرت عمر بن عبد العزیز: عمر ثانی حضرت عمر بن عبد العزیز کے سوانح حیات اور انکے مجددانہ کارنامے

سلسلۂ تاریخ اسلام

تاریخ اسلام حصہ اول: (عہد رسالت، خلافت راشدہ)

" دوم: بنی امیہ دمشق کی صد سالہ تاریخ

" سوم: ابو العباس سفاح سے متقی اللہ ۱۳۲ھ تا ۳۳۳ھ تک خلافت عباسیہ کی تاریخ

" چہارم: خلیفہ مستعصم باللہ تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی تاریخ اور عباسیوں کے تمدنی کارناموں کی تفصیل

حکمائے اسلام

حصہ اول و دوم

یوں تو اردو میں مشاہیر حکمائے اسلام کے حالات میں الگ الگ متعدد کتابیں موجود ہیں، الغزالی، امام رازی، ابن رشد تو اسی دار المصنفین کی کتابیں ہیں، لیکن کوئی ایسی جامع کتاب نہ تھی، جس میں ان سب کے حالات یکجا کر دیے گئے ہوں، یہ کتاب اسی کمی کو پورا کرنے کیلئے لکھی گئی ہے، جس میں ان کے حالات و سوانح کے ساتھ ان کی ہر قسم کی مذہبی، اخلاقی اور فلسفیانہ خدمات کو نمایاں کیا گیا ہو، اس کے دو حصے ہیں، پہلے حصہ میں یعقوب کندی، ابونصر فارابی، محمد بن زکریا رازی، ابن مسکویہ، ابوریحان بیرونی، امام غزالی، ابوالبرکات بغدادی کے حالات اور ان کے فلسفیانہ مسائل کی تشریح ہے، اور دوسرے میں ابن باجہ، ابن طفیل، ابن رشد، امام رازی، مغلوں اور تاتاریوں کے عہد کے حکما، حکمائے متاخرین، خاندان فرنگی محل، خاندان خیرآباد اور مختلف خاندانوں کے حکما، مثلاً ملا نظام الدین، مولانا عبد العلی بحر العلوم، مولانا فضل حق خیرآبادی، ملا محمود جونپوری، ملا محب اللہ بہاری وغیرہ کے حالات اور انکے نظریات و خیالات کی تشریح، اور انھوں نے اپنے علم و فلسفہ سے اسلام کی جو عظیم الشان خدمات انجام دیں، ان کی تفصیل ہے، مولفہ مولانا عبد السلام ندوی مرحوم، قیمت حصہ اول [illegible] دوم [illegible]

اقبال کامل

مشہور حکیم و فلسفی شاعر ڈاکٹر اقبال کے مفصل سوانح حیات، ان کے فلسفہ و شاعری پر تبصرہ اور انکی شاعری کے اہم موضوعوں یعنی فلسفہ خودی، فلسفہ بیخودی، نظام اخلاق وغیرہ کی تشریح، مرتبہ مولانا عبد السلام ندوی مرحوم، قیمت [illegible]

جلد ۷۹ نمبر ۔۔۔ جون ۱۹۵۷ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ

مجلس ادارت

(۱) جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی

(۲) جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی

(۳) شاہ معین الدین احمد ندوی

(۴) سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے

تاریخ دعوت و عزیمت

یعنی عالم اسلام کی اصلاحی و تجدیدی کوششوں کا تاریخی جائزہ، نامور مصلحین اور ممتاز اصحاب دعوت و عزیمت کا مفصل تذکرہ، ان کے علمی و عملی کارناموں کی روداد، اور ان کے اثرات و نتائج کا تذکرہ، اسمیں پہلے مصنف کے قلم سے پیش لفظ ہے، اسکے بعد مقدمہ، جسمیں اصلاح و تجدید کی ضرورت اور تاریخ اسلام میں ان کا تسلسل دکھایا گیا ہے، پھر اصل کتاب شروع ہوتی ہے جو مولانا جلال الدین رومی کی اصلاحی و تجدیدی کوششوں کی تفصیل پر جاکر ختم ہوتی ہے، قیمت : ۔

مرتبہ مولانا ابو الحسن علی ندوی

مآل و مشیت

اس میں حیات انسانی کے دو بنیادی تصورّن : مآل و مشیت کی فلسفیانہ تحلیل کیگئی ہے، یہ دنیا کی بہترین کتاب ہے جسپر اسکے لائق مصنف جناب جبرا لو ظفر حسین خاں صاحب کو حکومت ہند کیطرف سے پانچہزار کا انعام ملا ہے، یہ تو موضوع کے اعتبار سے خالص فلسفیانہ اور بہت خشک لیکن مصنف کے انشا پردازانہ اسلوب تحریر نے اسکو بہت دلچسپ اور دلآویز بنا دیا ہے، ان ہی کے قلم سے فرانس کے مشہور انقلابی ادیب روسو کی کتاب کا اردو ترجمہ اسی اسلوب و طرز انشا میں ادارہ کیطرف سے اس سے پہلے شائع ہو چکا ہے،

قیمت ۱۲

جلد ۹ ماہ ذی قعدہ ۱۳۷۶ھ مطابق ماہ جون ۱۹۵۷ء نمبر ۶

مضامین

شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۴۰۲-۴۰۴

مقالات

کیا متفقہ اسلامی احکام کو بھی اجتہاد کے ذریعہ بدلا جا سکتا ہے۔	جناب مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دارالمصنفین	۴۰۵-۴۲۲
یونانی منطق کے قدیم عربی تراجم،	جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے ایل ایل بی، بی ٹی، ایچ،	۴۲۳-۴۴۲
مولانا خرم علی بلہوری اور اُن کی علمی خدمات کا تفصیلی جائزہ،	جناب مولانا عبد الحلیم صاحب چشتی فاضل دیوبند	۴۴۳-۴۵۸
اقبال کا پیغامِ عمل	جناب مرزا صفدر علی ایم اے لکچرار ورنگل کالج جامعہ عثمانیہ،	۴۵۹-۴۷۱

آثارِ علمیّہ

مکاتیب مولینا سید سلیمان ندوی بنام شاہ معین الدین احمد ندوی،	۴۷۲-۴۷۶

مطبوعاتِ جدیدہ	"م"	۴۷۷-۴۸۰

جماعت اسلامی کے عقائد و خیالات اور ان کے اور اکابر دیو بند کے اختلاف کے بارہ میں ہمارے
آتے رہتے ہیں لیکن معارف اس قسم کے اختلافی معاملات میں نہیں پڑتا اس لئے ہم نے عمداً اس مسئلہ پر نہیں لکھا
مہینہ رسالہ دار العلوم اور برہان میں دیو بند کے دو نامور علما مولانا محمد طیب صاحب اور مولانا سعید احمد
اس مسئلہ کے متعلق لکھیں ان دونوں کا مقصد اس ناگوار اختلاف کو ختم کرنا ہے خصوصاً مولانا سعید احمد
مسئلہ کو پیش کیا ہے اور جن پہلوؤں کی جانب توجہ دلائی ہے وہ کسی حیثیت سے بھی نظر انداز کرنے کے لائق
علمائے کرام اس پر غور فرمائیں کہ اس مضر اختلاف کا کسی طرح خاتمہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دور عجیب ساری دنیا اور خاص طور سے مسلمانوں کے لئے بڑے ابتلا و آزمائش
خیالات بدل رہے ہیں، فکر و نظریات پر ایک نئی دنیا تعمیر ہو رہی ہے، مذہب، اخلاق، سیاست [illegible]
نئے نئے نظریات اور گوناگوں پیچیدہ مسائل پیدا ہو گئے ہیں جن کے حل پر دنیا کا امن و امان اور انسانیت کی
نظام مقبول ہوگا جو ان مسائل کا حل پیش کر سکیگا اس لئے جو نئی تحریک بھی اٹھتی ہے اس کا دعویٰ لیکر اٹھتی ہے
اب تک کوئی تحریک اور کوئی نظام اس کا حل نہ پیش کر سکا، بلکہ پیچیدگیوں میں اضافہ ہی ہوتا

اسلام کا دعویٰ ہے کہ وہ انسانوں کیلئے سب سے جامع اور بہتر نظام زندگی ہے اور ابد تک کے
اور مادی و روحانی ضروریات کا کفیل ہے اور آئندہ جس قسم کے مسائل بھی پیدا ہوں گے سب کا حل اس میں
وہ بالکل سچا ہے مگر اس کا عملی ثبوت دینا ہر شخص کے بس کی بات نہیں، اس کام کو وہی لوگ انجام دے سکتے
مہارت کے ساتھ اس زمانہ کے حالات و رجحانات اور مسائل و تحریکات سے بھی پوری واقفیت رکھتے ہوں
کہ وقتی چیز نہیں ہر دور کے خاص مسائل اور اس کے مطابق خاص علم کلام ہوتا ہے اور اس دور کے متکلمین

کرسکتے ہیں، تاریخ اسلام میں ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا ہے، اور آیندہ بھی یہی ہوگا،

ہماری غفلت سے آج حال یہ ہوگیا ہے کہ دوسری قوموں کا کیا ذکر خود مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ تک اسلام کی تعلیمات اور اسکی خوبیوں سے بے خبر ہے، اس ناواقفیت کی بنا پر نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو اسلام سے کوئی علاقہ نہیں رہ گیا تھا، اگر اس میں کچھ طلب تھی اور اس کے دماغ میں مذہب، اخلاق وغیرہ کے متعلق جو شکوک اور سوالات پیدا ہوتے تھے اُن کا جواب نہ پاکر وہ اپنی تشفی کیلئے ہر سراب کے پیچھے دوڑتا تھا، اور اس کا بڑا حصہ لادینی تحریکات کا شکار ہو رہا تھا، جماعت اسلامی ان حالات کا مقابلہ کر رہی ہے، اُس نے مذہب اسلام، اور اس دور کے مذہبی، اخلاقی، علمی، تعلیمی، سیاسی و معاشی اور معاشرتی مسائل وغیرہ کے متعلق اردو انگریزی اور ہندی میں ایسا مکمل اسلامی لٹریچر مہیا کر دیا ہے جو تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہن کو اپیل کرتا ہے، اس نے ایک طرف ان میں ایمان و عمل کی روح پیدا کر دی ہے اور آج وہ طبقہ جس کو اسلام سے محض برائے نام تعلق رہ گیا تھا بلکہ اس نام سے بھی شرماتا تھا عملاً مسلمان بن گیا ہے، اور اس میں دینی و ملی غیرت و حمیت پیدا ہوگئی ہے، جس کا مشاہدہ ہر جگہ کیا جا سکتا ہے، دوسری طرف غیر مسلموں کے سامنے اسلام کی صحیح اور دلکش تصویر آگئی ہے،

جدید طبقہ کی طلب کو جماعت اسلامی پورا کر رہی ہے، اس لئے اس کا اثر برابر بڑھتا جاتا ہے، جس کو کوئی قوت نہیں روک سکتی، بلکہ اُس کے اثرات دینی مدارس تک پہنچ گئے ہیں، جس سے خود دارالعلوم دیوبند بھی محفوظ نہیں ہے، اس کے طلبہ کی اچھی خاصی جماعت اس سے متاثر ہے، اور اس کے بعض علما تک جماعت اسلامی کے کاموں کو تحسین کی نظر سے دیکھتے ہیں، خود برہان کی تحریر اس کی شاہد ہے، برہان ندوۃ المصنفین کا رسالہ ہے جس کے ارکان میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مفتی عتیق الرحمٰن، اور مولانا حفظ الرحمٰن جیسے علمائے دیوبند ہیں، خود مولانا طیب صاحب کا رویہ بھی جماعت کے ساتھ نسبتہً نرم اور مصالحانہ رہا ہے، یہ اس کا ثبوت ہے کہ وہ علمائے دیوبند جو زمانہ کے حالات سے باخبر ہیں، جماعت اسلامی کے مخالف نہیں ہیں،

اس تحریر کا یہ مقصد نہیں ہے کہ اس زمانہ میں جماعت اسلامی ہی صحیح دینی خدمت انجام دے رہی ہے یا وہ نقائص سے بالکل پاک ہے، جو جماعتیں کسی حیثیت سے بھی دینی کام کر رہی ہیں، ان سب کے خدمات

لائقِ تحسین ہیں، بلکہ بعض دوسری جماعتوں کے کام جماعتِ اسلامی کے کاموں سے بھی زیادہ اہم اور مفید ہیں، اللہ تعالیٰ ان سب کے خدمات قبول فرمائے، جماعتِ اسلامی کی بعض خامیوں سے بھی انکار نہیں، اس کے قلم و زبان کی بے باکی کی شکایت بالکل بجا ہے، اس کے بعض انتہا پسند اور پرجوش کارکنوں کے قلم اور زبان سے ایسی تحریریں اور مدعیانہ باتیں نکل جاتی ہیں، جو ہر شخص کی نگاہ میں کھٹکتی ہیں، انہی سے اُن کے متعلق بدگمانی پیدا ہوتی ہے، مگر اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ جو جماعت بھی اس قسم کے اصلاحی کام کرتی ہے، اس سے اس قسم کی بے عنوانی اور الفاظ کی بے احتیاطی ہو ہی جاتی ہے جس کی بناء پر تاریخِ اسلام کے بہت سے اکابر کو موردِ طعن بننا پڑا، دوسرے اس کے لکھنے والے اکثر نوجوان ہیں، جن کو جذبات اور قلم پر قابو نہیں ہے، مگر تجربہ کے ساتھ یہ خامی دور ہو جاتی ہے، تاہم اس قسم کی خامیاں یقیناً قابلِ اصلاح ہیں، باقی جزوی اور فروعی اختلاف لائقِ التفات نہیں

اس کے علاوہ اگر اُن کے عقائد و خیالات میں کوئی اور چیز بھی قابلِ اعتراض نظر آئے تو دوستانہ اور ہمدردانہ تفہیم سے اس کی اصلاح ہو سکتی ہے، محض مخالفت سے ضد پیدا ہوتی ہے، ہندوستان کی جماعتِ اسلامی کے امیر سنجیدہ اور سلجھے ہوئے آدمی ہیں، اُن کا قلم اور زبان دونوں محتاط ہیں، اگر اُن کو معقولیت کے ساتھ کسی خامی کی طرف توجہ دلائی جائے، تو یقین ہے کہ وہ ضرور اس کو قبول کریں گے، خود راقم کو اس کا ذاتی تجربہ ہے، لیکن کسی فروعی اختلاف کی بناء پر جماعت کے اچھے کاموں کو بھی نظر انداز کر دینا اور اس کو یکسر مطعون قرار دینا صحیح نہیں ہے،

لا یجرمنکم شنآن قوم الا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوی،

سب سے بڑا اعتراض جماعتِ اسلامی کے دستور کی دفعہ ۳ پر کیا جاتا ہے، اگرچہ دونوں فریق اس کی مختلف تعبیر کرتے ہیں، جماعتِ اسلامی جو تعبیر کرتی ہے، اس پر کسی اعتراض کی گنجائش نہیں ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ کسی تحریر کی تعبیر و ترجمانی کا زیادہ حق صاحبِ تحریر ہی کو ہوتا ہے، جماعتِ اسلامی کی تعبیر سے اختلاف کا سب سے بڑا اور بنیادی سبب ختم ہو جاتا ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ اس ناگوار اور تکلیف دہ اختلاف کو بالکل ختم کر دیا جائے، جس سے ایک مفید دینی کام اور علماء کے وقار دونوں کو صدمہ پہنچا ہے اور دونوں میں دین کا نقصان ہے

مقالات

کیا متفقہ اسلامی احکام کو بھی اجتہاد کے ذریعہ بدلا جا سکتا ہے؟

(کیا کتاب سنت، فقہا و خلفائے راشدین کے فیصلوں سے اس کا ثبوت ملتا ہے؟)

از جناب مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دارالمصنفین

(۲)

فقہا کے اصول | احکام کی تعمیل میں جو تخفیفیں، رعایتیں اور وسعتیں قرآن وسنت میں دی گئی ہیں ان کے پیش نظر فقہا نے متعدد اصول وضع کر دیے ہیں، تاکہ جن احکام میں بھی ان کی مماثلت پائی جائے، ان پر ان کا انطباق آسانی سے کیا جا سکے، مگر جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے، ان اصولوں کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اسلامی احکام ہی پر خط نسخ پھیر دیا جائے یا متفقہ اسلامی احکام کو ان کا نشانہ بنایا جائے،

ڈاکٹر محمصانی نے مجلۃ الاحکام سے تقریباً ان تمام اصولوں کو اپنی کتاب میں نقل کر دیا ہے جن سے اس سلسلہ میں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ مثلاً

۱- الضرورات تبیح المحذورات — ضرورتیں ممنوع چیزوں کو بھی مباح کر دیتی ہیں،

۲- المشقۃ تجلب التیسیر — دشواری آسانی لاتی ہے،

۳۔ الضرر یزال تکلیف دور کی جانی چاہیے،

۴۔ الضرر یدفع بقدر الامکان حتی المقدر تکلیف دور کی جائے گی،

(۵) الاصل فی الشئ الاباحۃ ہر چیز میں اصلاً اباحت ہے

ان اصولوں سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ ضرورت و مصلحت اور دشواری کے وقت ان محرمات کو بھی حلال قرار دیا جا سکتا ہے، جن کو کتاب و سنت میں حرام کیا گیا ہے، یا ان حلال چیزوں کو بھی حرام کیا جا سکتا ہے، جو ان میں ہمیشہ کے لیے حلال کی گئی ہیں، بظاہر ان اصولوں سے اس نتیجہ کی تائید ہوتی ہے، اس لیے بہت سے لوگ اس دھوکہ میں پڑ جاتے ہیں کہ واقعی اسلام کے متفقہ احکام میں اجتہاد کے ذریعہ ہمیشہ تبدیلی کی گئی ہے، اس لیے اس زمانہ میں بھی اگر کیجائے تو کوئی مضائقہ نہیں، مگر ان اصولوں کو جن فقہا نے وضع کیا ہے انھوں نے اس سے نہ تو یہ نتیجہ کبھی نکالا تھا . . . . اور نہ ان کے ذہن میں کبھی یہ بات آئی تھی کہ وہ ان اجتہادی اصولوں کے ذریعہ کتاب و سنت کے کسی حکم کو منسوخ کر دیں، یا ان کی حرام و حلال کی مقرر کردہ قیدوں کو توڑ دیں، بلکہ . . . . انھوں نے ان کی جو تشریحات کی ہیں وہ اس کے بالکل برعکس ہیں، جو ہمارے جدید فقہا کرتے ہیں، اس لیے ہم ان کی تشریحات کو یہاں پیش کر دیتے ہیں تاکہ ان پر غلط فہمیوں کے جو پردے ڈال دیے گئے ہیں وہ ہٹ جائیں

مثلاً پہلی اصل یعنی الضرورات تبیح المحذورات کو لیجئے، اس اصول کے تحت بعض ممنوعات کے جواز کی اجازت دی گئی ہے لیکن اس وقت جب کسی کی جان یا مال یا عزت و آبرو خطرے میں ہو، یہ اصل قرآن کی اس آیت سے ماخوذ ہے جس میں مضطر کو حرام یا مردار کھانے کی اجازت دی گئی ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ قید بھی لگا دی گئی ہے کہ غیر باغ ولا عاد، یعنی نہ تو لذت

کے لیے کھائے اور نہ ضرورت سے زیادہ، امام سرخسی نے امام محمد کی کتاب السیر الکبیر کی شرح میں اس اصول کو اس موقع کے لیے استعمال کیا ہے، جہاں غیر معمولی نقصان کا خدشہ ہو،

جو گھوڑے حکومت کی طرف سے مجاہدین کو جہاد کی غرض سے دیے جاتے ہیں اور وہ ان ہی کی نگرانی میں رہتے ہیں، ان کو وہ اپنی ذاتی ضرورت یا خود گھوڑے ہی کی کسی ضرورت کے لیے استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اس سلسلہ میں امام محمد نے لکھا ہے کہ اپنی ذاتی ضرورت کیلیے تو وہ استعمال نہیں کر سکتے، البتہ اگر ان کو یہ معلوم ہو کہ گھوڑے کا چارہ اس بستی سے باہر ارزاں ملتا ہے تو اگر وہ مقام قریب ہو تو سوار ہو کر اس پر جا سکتے ہیں، لیکن اگر وہ مقام دور ہو تو یہ بھی جائز نہیں ہے۔ البتہ جب قریب میں چارہ مل سکتا ہی نہ ہو تو وہ اس پر سوار ہو کر دور بھی جا سکتے ہیں،

فلا باس بان یرکبہ الی ذالک	تو اس صورت میں کوئی حرج نہیں ہے کہ
الموضع یحمل علیہ علفہ	وہ سوار ہو کر اس مقام تک جائے اور
(ج ۴ ص ۲۷۹)	اس کا چارہ لاد کر لائے،

امام محمد نے سواری کی جو اجازت دی ہے، اس کی تشریح کرتے ہوئے امام سرخسی لکھتے ہیں:

لان ھذا الموضع الضرورۃ	یہ موقع ایک واقعی ضرورت کا ہے اور واقعی
والضرورات تبیح المحذورات	ضرورتوں میں ممنوع باتیں مباح ہو جاتی ہیں،

مقصد یہ ہے کہ میدان جہاد کے علاوہ ان گھوڑوں پر سواری ممنوع ہے، مگر اس ضرورت شدیدہ کی بنا پر جہاد کے علاوہ بھی سوار ہونے کی اجازت دی گئی ہے،

غور کیجیے کہ اسلامی حکومت کے ایک گھوڑے کے استعمال میں اتنی قیود لگائی گئی ہیں پھر ذاتی استعمال کے لیے نہیں بلکہ خود اس گھوڑے ہی کے سامان بقا کے حاصل کرنے کے لیے

اور پھر اجازت دیتے ہوئے بھی یہ تنبیہ کر دی گئی ہے کہ یہ ضرورت حرام کو حلال تو نہیں کر سکتی لیکن مباح کر سکتی ہے، وہ بھی اس وقت تک کے لیے جب تک وہ ضرورت باقی ہے، ورنہ اصل حرمت اپنی جگہ پر علی حالہ باقی رہے گی، اور ضرورت کے رفع ہوتے ہی وہ پھر لوٹ آئے گی،

جو لوگ اس اصل کو اپنی خواہش نفس کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں ان کے بارے میں امام شاطبی لکھتے ہیں:

"یہ لوگ اس اصل کی آڑ میں اپنی کسی خواہش کی تکمیل چاہتے ہیں، حالانکہ انسان کی جو واقعی ضرورتیں ہیں ان کا ذکر تو شریعت نے خود ہی کر دیا ہے۔"

انھوں نے اس کے بعد امام مازری کا جو مشہور مالکی عالم ہیں، یہ فتویٰ نقل کیا ہے کہ قحط کے زمانہ میں کچھ غربا نے صاحب ثروت لوگوں سے کہا کہ آپ لوگ ہم کو اس وقت غلہ ادھار دے دیں، فصل کٹنے پر ہم اس کی قیمت ادا کر دیں گے، لیکن جب قیمت کی ادائگی کا وقت آیا تو ان لوگوں نے کہا کہ ہمارے پاس غلہ ہے، اس لیے غلہ کے بدلے غلہ ہی واپس کرینگے۔ چنانچہ قرض خواہوں نے اس خیال سے کہ کہیں ان کا غلہ مارا نہ جائے، اسے قبول کر لیا اگرچہ اس میں انکا نقصان تھا، کیونکہ قیمت اگر ملتی تو زیادہ ملتی اسلیے کہ انھوں نے غلہ گرانی کے زمانہ میں فروخت کیا تھا، جب امام مازری سے اس بارے میں پوچھا گیا کہ الضرورات تبیح المحذورات کے تحت غلہ کی قیمت کے بدلے غلہ ہی لینا کیوں نہ مباح کر دیا جائے، تو انھوں نے جواب دیا کہ اگر تمھارا مقصود یہ ہے کہ مستقلاً اس کی اجازت دے دیجائے، تو یہ ایک مفسدہ ہے جس کی اجازت نہیں دی جا سکتی، البتہ اگر اس کی ادائگی کی کوئی دوسری صورت نہ ہو تو پھر مشتری سے غلہ لینے کی یہ صورت ہے کہ اس سے غلہ لیکر دوسرا بدوں کی موجودگی میں فروخت کیا جائے اور اس سے جو قیمت ملے اس سے بائع کی رقم ادا کر دیجائے اور جو بچ رہے وہ مشتری کو دیدیجائے،

بظاہر اس میں غربا کا فائدہ تھا کہ ان کو غلہ کے بدلہ غلہ ہی دینا پڑتا، مگر امام مازری

نے اس کی اجازت اس لیے نہیں دی کہ یہ معاملہ ایک فریب کا معاملہ تھا کہ وعدہ تو قیمت کا کیا جائے اور دیجائے جنس، ظاہر ہے کہ جن معاملات میں دھوکا و فریب ہو ان کو اسلام میں مستقلاً مباح نہیں کیا جا سکتا، اس کے علاوہ بعض دوسرے مفاسد بھی تھے،

غور فرمایئے کہ الضرورات تبیح المحذورات کا استعمال فقہا کس موقع کے لیے کرتے تھے، اگر مطلقاً ہر ضرورت کے تحت ممنوعات کو مباح کرنے کے لیے یہ اصل بنائی گئی ہوتی تو پھر امام مادری کو اس کی اجازت ضرور دیدینی چاہیے تھی،

شیخ زین العابدین نے الاشباہ والنظائر میں ان واقعات پر بڑی مفصل بحث کی ہے، وہ الضرورات تبیح المحذورات اور الضرر یزال کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ اصول حدیث نبوی لا ضرر ولا ضرار سے ماخوذ ہے[1]، اور ان سے فقہ کے بہت سے احکام مستنبط ہوتے ہیں، مثلاً کوئی مال لیکر واپس کرنا چاہے، یا کسی چیز میں عیب نکل آئے تو ان دونوں صورتوں میں چونکہ مشتری کا نقصان ہے، اس لیے اس کو مال واپس کرنے کی اجازت دی گئی ہے، پڑوسی کی تکلیف کو رفع کرنے کے لیے شفعہ کی اور ایک مضطر کو حرام کھانے کی اجازت دی گئی ہے، اسی کے تحت جنگ میں جب دشمن کا غلبہ ہو رہا ہو تو اسلحے برباد کر دینے کی اجازت دی گئی ہے، حالانکہ اسلام کسی چیز کو عام حالت میں برباد کر دینا جائز نہیں سمجھتا لیکن چونکہ یہاں جان و مال کا خطرہ لاحق ہے، اس لیے اس کی اجازت دی گئی ہے، مگر یہ اجازت بھی مطلقاً نہیں بلکہ اس قید کے ساتھ دی گئی ہے،

ما ابیح للضرورۃ یتقدر	جو چیز کسی ضرورت کے تحت مباح کیجائے گی
بقدرھا وما جاز بعذر	وہ بس ضرورت ہی بھر مباح ہوگی،
یطل بزوالہ (ص۹۴)	جو چیز کسی عذر کی وجہ سے جائز کی جائیگی

---

[1] مصنف نے قرآن کی آیت کا ذکر نہیں کیا، مگر اضطرار والی آیت اور قرآن کے اس ٹکڑے سے یہ دونوں اصول مستنبط ہیں، لا تظلمون ولا تظلمون

.... اس کا جواز عذر کے زائل ہونے کے بعد

(۵۹) ختم ہو جائے گا

(۲) المشقة تجلب التيسير دشواری آسانی لاتی ہے

اصول فقہ کا یہ دوسرا اصول ہے، جسے جدید مجتہدین اپنے استدلال میں پیش کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ جب کسی اسلامی حکم میں کوئی مشقت، دشواری یا معاشی نقصان ہو تو اس اصول کے تحت اس کو منسوخ کرکے یا اس میں مناسب ترمیم کرکے آسانی پیدا کرنی چاہیے، مثلاً سودی لین دین یا سودی تجارت اور سودی بینکنگ کو ترک کر دیا جائے، تو پھر ملک میں معاشی بدحالی پھیل جائےگی، اور افراد و حکومت کا کروروں روپے کا نقصان ہوگا، اس لیے اس دشواری اور نقصان کو رفع کرنے کی یہی ایک صورت ہے کہ ملک کے معاشی کاروبار کو اسلام کے معاشی احکام کی قیود سے آزاد کیا جائے، یا ایک مرد جب بیک وقت متعدد عورتوں سے شادی کرتا ہے تو مرد کو خواہ تکلیف ہو یا نہ ہو، عورت کو ضرور تکلیف و ذلت ہوتی ہے، اس لیے اسکو تکلیف و ذلت سے بچانے کے لیے آسان صورت یہ ہے کہ اسلام کے قانون نکاح ہی میں ترمیم کر دی جائے لیکن اگر ہر مشقت و دشواری آسانی پیدا کرنے کا سبب ہو تو جیسا کہ امام شاطبی نے لکھا ہے کہ شریعت کے ہر حکم میں کوئی نہ کوئی مشقت فرد کے لیے یا اجتماع کے لیے موجود ہے، تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ تمام تکلیفات شرعیہ کو ساقط کر دیا جائے۔

پھر پیش آمد، دشواری پر اس حیثیت سے غور کرنا بھی ضروری ہے کہ جن دقتوں اور دشواریوں اور نقصانات کی بنا پر ایک حرام چیز کو حلال اور حلال چیز کو حرام کیا جا رہا ہے۔۔۔ وہ نزول قرآن کے وقت اور عہد نبوت ہی میں موجود تھیں یا نہیں، کیا جس وقت سود کی حرمت کا حکم نازل ہوا، اور آپ نے حجۃ الوداع میں یہ اعلان کیا کہ جاہلیت

کا سارا سود ساقط ہے"، تو قریشی ساہوکاروں کا ہزاروں، لاکھوں روپے کا نقصان نہیں ہوا تھا؟
حتیٰ کہ آپ نے سب سے پہلے اپنے چچا کے سودی روپیوں کے بارے میں فرمایا کہ میں اس کو معاف
کرتا ہوں، کیا اس سے حضرت عباسؓ کا جنکا سودی کاروبار کافی پھیلا ہوا تھا، ہزاروں روپئے
کا نقصان نہیں ہوا ہوگا، یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ مکہ اور مکہ کے آس پاس کی بیشتر آبادی کے لئے
قریش ہی کی تجارت اور سودی لین دین کے ذریعہ معاش کا سامان مہیا ہوتا تھا، مکہ میں قریش
کی حیثیت اس وقت وہی تھی جو موجودہ دور میں کسی حکومت کی ہوتی ہے، مگر ان تمام نقصانات
کو برداشت کرکے یہ حکم نافذ کیا گیا، لیکن ان نقصانات کے نتائج فائدے کی شکل
میں رونما ہوئے، اس وقت اس کی تفصیل کا موقع نہیں ہے،

اسی طرح قرآن نے جس وقت چار شادیوں کی اجازت دی اور اس حکم کے ماتحت خود نبی صلی اللہ
علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ نے کئی کئی شادیاں کیں تو کیا اس وقت عورتوں کو تکلیف اور ذلت
برداشت نہیں کرنا پڑی تھی، کیا اس وقت معاشرتی فساد کے رونما ہونے کا اندیشہ نہیں تھا،
مگر اس کی اصلاح کے لیے اسلامی شریعت نے خلع و طلاق کی اجازت تو دی، لیکن اصل حکم
کو منسوخ کرنے کا خیال پیدا نہیں ہوا، چار شادی کی اجازت بجائے خود ایک بہت بڑی معاشرتی
فساد یعنی زنا اور دوسرے جنسی جرائم کو روکنے کے لیے دی گئی تھی، اور اس اجازت کے بعد
یہ فساد مٹا بھی، چنانچہ عرب میں جہاں فواحش و بدکاریاں علی الاعلان ہوتی تھیں اور ہر گھر
معاشرتی فساد کا سرچشمہ تھا، وہاں اسلام کی اس اجازت کے بعد تیس چالیس برس کے درمیان
یعنی پورے عہد نبوی اور عہد خلافت راشدہ میں مشکل سے دو چار جنسی جرائم کے واقعات ہوئے،
مگر اس دور میں جن ملکوں میں ایک سے زیادہ شادی کرنے پر پابندی ہے، وہاں کے جنسی جرائم
کی فہرست پر نگاہ ڈالی جائے تو اندازہ ہوگا کہ وہاں کی معاشرت کتنی گندہ ہو چکی ہے، مغربی

تمدن کی نقالی نے لوگوں کے سوچنے کے انداز کو کتنا بدل دیا ہے کہ زنا اور محرکات زنا کیلئے تو کھلی آزادی ہو اور جو چیز ان کو ختم کرنے والی ہو اس پر پابندی عائد کیجائے،

غرض یہ کہ عقلی اور تجربی دونوں حیثیت سے بھی ان کا یہ کہنا غلط ہے کہ اسلامی احکام کی پابندی معاشرتی یا معاشی دشواری اور نقصان کا سبب ہے، اور اگر کوئی دشواری یا نقصان ہو بھی تو اسلامی شریعت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ اسکا کوئی حکم بدل دیا جائے،

جو لوگ المشقۃ تجلب التیسیر سے تبدیلی احکام پر استدلال کرتے ہیں یا تو ان کو اصول فقہ کے اس اصول کے ما لہٗ ما علیہ کی خبر نہیں ہے، یا خبر ہوتے ہوئے دوسروں کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں،

اصول فقہ کا یہ اصول قرآن کی آیت یرید اللہ بکم الیسر و لا یرید بکم العسر سے ماخوذ ہے، اوپر اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ یہ آیت ازالۂ احکام کے لیے نہیں بلکہ اتباع احکام میں آسانی پیدا کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے، بالکل اسی طرح یہ اصول بھی احکام کی تبدیلی کے لیے نہیں بلکہ انکے اتباع میں سہولت پیدا کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے، شریعت میں انسان کی طبعی و تمدنی ضرورتوں کے پیش نظر جو سہولتیں دیگئی ہیں، ان ہی سہولتوں کے اظہار کے لیے فقہا نے یہ اصول وضع کیا ہے، چنانچہ فقہا نے کتاب و سنت کے تمام احکام کا تتبع کر کے لکھا ہے کہ سات اسباب کی بنا پر احکام کی بجاآوری میں سہولتیں دی گئی ہیں،

(۱) سفر، یعنی سفر میں بعض احکام کی بجاآوری میں جو سہولت دی گئی ہے، اس کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ لمبا سفر ہو اس میں نماز قصر کرنے، جماعت ترک کرنے اور روزہ چھوڑنے کی اجازت دی گئی ہے، دوسری یہ کہ دو چار میل کا سفر ہو اس میں قصر کی اجازت تو نہیں دیگئی ہے، مگر جماعت چھوڑنے کی اجازت دیگئی ہے، اب اگر کوئی دو چار میل کے تفریحی سفر میں بھی

تکلیف محسوس کرے، یا روزہ چھوڑ دے یا نماز قصر کرنے لگے، یا اس کے لیے کوئی قانون وضع کرے تو اس کو اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی،

(۲) مرض، یعنی مرض کی حالت میں بھی بعض اسلامی حکم کو موخر کیا گیا ہے، اور بعض ممنوع چیز کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے، مثلاً اگر کوئی شخص کھڑے ہو کر یا بیٹھکر نماز نہیں پڑھ سکتا تو لیٹ کر پڑھے، وضو کے بجائے تیمم کرے، اگر نجاست کے دور کرنے پر قادر نہ ہو تو نجاست ہی کی حالت میں نماز پڑھ لے، اسی طرح شرمگاہ کا کھولنا حرام ہے، مگر ضرورت کے وقت طبیب کو دکھا سکتا ہے، سنکھیا کا کھانا حرام ہے، مگر دوا اس کا استعمال کیا جا سکتا ہے

(۳) اکراہ یعنی کسی کو مجبور کر کے کوئی حرام کام کرا لیا جائے، لیکن ہر مجبوری شریعت میں معتبر نہیں ہے، بلکہ وہ مجبوری معتبر ہے جس میں جان، مال یا عزت و آبرو کو خطرہ لاحق ہو مثلاً اگر قتل کی دھمکی دے کر جھوٹ بلوا لیا جائے تو شریعت میں یہ فعل قابل ملامت نہیں ٹھہریگا

(۴) نسیان، یعنی بھول کر غلط کام کر بیٹھے، مثلاً روزہ میں بھول کر پانی پی لے، کوئی دوسرے کی چیز غلطی سے اپنی سمجھکر استعمال کرنے تو اس پر ملامت نہیں کیجائے گی لیکن نسیان کی بعض صورتیں ایسی بھی ہیں جن میں اس کو غلطی کا کفارہ ادا کرنا پڑے گا، مثلاً احرام کی حالت میں مردوں کے لیے سلا ہوا کپڑا پہننا حرام ہے، اب اگر کوئی سلا ہوا کپڑا بھولکر پہن لے تو یہ جرم شمار کیا جائے گا، اور اس کے بدلے میں اس کو ایک قربانی کرنا پڑے گی،

(۵) جہل، یعنی آدمی جس بات کو نہ جانتا ہو، اس میں جانتے تک رعایت کیجائے گی، بشرطیکہ وہ اپنی جہالت دور کرنے کی کوشش بھی کر رہا ہو، مثلاً کسی کو نماز پڑھنا نہیں آتی، نہ اسکو دعائیں یاد ہیں اور نہ ظاہری ارکان ادا کرنے کا سلیقہ رکھتا ہے، مگر مسجد میں آکر نمازیوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے، اور لوگوں سے پوچھ کر نماز کی دعائیں بھی یاد کرتا ہے تو اس کو قانوناً نمازی

شمار کیا جائیگا اور اس کو نہ ملامت کی جائے گی اور نہ سزا دی جائے گی،

(۶) عام ابتلا یعنی وہ ناجائز چیزیں جن سے آدمی بالکل بچ ہی نہ سکتا ہو، مثلاً عموماً راستوں، گلیوں اور سڑکوں وغیرہ پر جانوروں کے پاخانے پیشاب اور دوسری گندگیاں پڑ جاتی ہیں، گو عام حالت میں گلیوں اور سڑکوں سے گذرتے وقت چھینٹیں وغیرہ نہیں پڑتیں، مگر بارش کے زمانہ میں جو شخص بھی گذرے گا، اس کے کپڑوں پر گندہ چھینٹیں ضرور پڑیں گی، چونکہ یہ ایک عام ابتلا ہے جس سے بچنا انتہائی دشوار ہے، اس لیے اگر کوئی شخص کپڑے پر ان چھینٹوں کی موجودگی میں بھی نماز پڑھے گا تو اس کی نماز ہو جائے گی، البتہ اگر چوتھائی سے زیادہ اس کا کپڑا اس میں ڈوب گیا ہے تو اس کو کپڑا بدلنا ہوگا،

اسی طرح اگر کوئی شخص بازار میں سودا خریدنے کے لیے جاتا ہے اور اس کی نظر اچانک کسی غیر محرم عورت پر پڑ جاتی ہے تو اس کی پہلی اچانک نظر معاف ہے، کیونکہ اس میں وہ بالکل بے لبس ہے، اس لیے اس کو ہم فاسق اور گناہ گار نہیں کہہ سکتے، لیکن اگر وہ بلا ضرورت بازار جاتا ہے یا بار بار زنا بالعین کا ارتکاب کرتا ہے، تو ہم اس کو فاسق کہیں گے، اور اسلامی حکومت ایسے شخص کو سزا دے گی،

اسی طرح اسلام میں خرید و فروخت کا اصلی طریقہ تو یہ ہے کہ سودا بھی سامنے ہو اور قیمت بھی اسی وقت دیدی جائے، لیکن چونکہ ادھار خرید و فروخت ایک ناگزیر تمدنی ضرورت ہے، اس لیے اس کی اجازت دے دی گئی ہے،

(۷) نقص یعنی کسی شخص میں کوئی فطری یا طبعی کمی ہو جس کی وجہ سے وہ شرعی حکم کی تعمیل میں معذور ہو، تو اس صورت میں وہ شخص قابل عفو ہوگا، مثلاً پاگل بچے، مجبور یا مسافروں اور عورتوں پر جماعت کی پابندی ضروری نہیں، کیونکہ فطری اور طبعی طور پر ان دونوں کے لیے

یہ پابندی مشقت طلب ہوگی ۔

غرض یہ کہ شرعی احکام کی بجا آوری میں انسان کو جو طبعی یا تمدنی عوارض پیش آجاتے ہیں ، شریعت میں ان کی رعایتیں موجود ہیں ۔ المشقۃ تجلب التیسیر کا اصول ان ہی حالات کے لیے ہے ، شریعت میں جو آسانیاں اور تخفیفیں دی گئی ہیں ، ان کے سلسلہ میں چند باتیں اور ملحوظ رکھنی چاہئیں ،

(۱) سب سے پہلی بات یہ ہے کہ فقہا نے جو رعایتیں اور سہولتیں دی ہیں ، وہ خود ان کی وضع کردہ نہیں ہیں ، بلکہ وہ سب کتاب و سنت کے اصولی احکام کے تحت دی گئی ہیں ، فقہا نے صرف یہ کیا ہے کہ ان کے سامنے جو نئی صورتیں پیش آئیں ، انھوں نے کتاب و سنت کے اصولی احکام کے تحت ان کو ان پر قیاس کیا ، اس میں ان سے غلطیاں بھی ہوئیں ، مگر کوئی غلطی ایسی نہیں رہی کہ اس پر دوسرے فقیہ نے متنبہ نہ کر دیا ہو ،

(۲) دوسری بات یہ کہ جو آسانیاں اور تخفیفیں دی گئی ہیں ، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی مشقت و دقت کی وجہ سے کسی حرام چیز کے استعمال کی اور کسی حلال چیز کے ترک کی مستقل صورت پیدا کی گئی ہے ، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ان ان صورتوں میں اگر عارضی طور پر کوئی شخص کسی حرام چیز کا ارتکاب کرے یا کوئی حلال چیز ترک کر دے تو اتنی دیر تک جب تک کہ وہ عارض موجود ہے ، اس کو گناہ گار ، قابل ملامت اور سزا کا مستحق قرار نہیں دیا جا سکتا ، ورنہ حرام اپنی جگہ پر حرام اور حلال اپنی جگہ پر حلال ہی باقی رہے گا

(۳) تیسری یہ کہ دقتیں اور مشقتیں دو طرح کی ہوتی ہیں ، ایک وہ جن میں کوئی شرعی حکم موخر کیا جا سکتا ہے ، یا ایک کے بجائے دوسری صورت اختیار کی جا سکتی ہے ، جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے ،

دوسری وہ مشقتیں اور دقتیں جن کو بہر صورت برداشت کرنا ہی پڑے گا، مثلاً سردی کے زمانہ میں وضو کرنا، گرمی میں روزے رکھنا، حج کے لیے سفر کی زحمت اٹھانا، روپئے خرچ کرنا، جہاد کے لیے صعوبت برداشت کرنا، جان و مال کو خطرے میں ڈالنا، حرام ذریعۂ رزق کو چھوڑنا، قاتل سے قصاص لینا، زانی کو رجم کرنا، چور کا ہاتھ کاٹنا، باغیوں کی سرکوبی کرنا وغیرہ وغیرہ، ان احکام کی بجاآوری میں اگر اس زمانہ میں کچھ لوگوں کو دقتیں محسوس ہوتی ہیں تو جس زمانہ میں یہ احکام نافذ کیے گئے اس زمانہ میں بھی لوگوں نے دقتیں محسوس کی تھیں، مگر جن دنیوی و اخروی فوائد کے پیش نظر ان احکام کو نافذ کیا گیا تھا، ان ہی فوائد کے پیش نظر آج بھی ان کو نافذ کیا جانا چاہیے، اگر کسی کو اسلامی احکام میں مشقت محسوس ہوتی ہے، تو وہ اس دائرہ سے نکل تو سکتا ہے، مگر اس کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اس میں رہتے ہوئے ہر اس اسلامی حکم میں ترمیم شروع کر دے، جو اس کے خواہش نفس کے خلاف ہو، اور جس میں اسکی آسان پسند طبیعت دشواری محسوس کرتی ہو یہی وجہ ہے کہ فقہا نے المشقۃ تجلب التیسیر کو چند اور اصولوں سے مقید کر دیا ہے،

المشقۃ والحرج انما یعتبر	مشقت اور تنگی کا اعتبار وہاں کیا جائے گا
فی موضع لا نص فیہ واما مع	جہاں کتاب و سنت کی کوئی ہدایت موجود نہ ہو
النص بخلافہ فلا یعتبر	لیکن مشقت و حرج کے تقاضے کے خلاف
. . . .	کتاب و سنت کا تقاضا ہو تو پھر اس مشقت
. . . .	کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائیگا،

اسی طرح عموم بلوی کے بارے میں عام طور پر یہ خیال ہے کہ جو برائی بھی عام ہو جائے اور اس میں عام لوگ مبتلا ہو جائیں تو پھر وہ برائی برائی نہیں رہتی، اس غلط فہمی کو بھی فقہا نے

دور کر دیا ہے، امام صاحب کا یہ قول اصول فقہ کی کتابوں میں منقول ہے کہ

ولا اعتبار عندہ بالبلوی امام صاحب کے نزدیک جہاں نص موجود ہو

فی موضع النص وہاں عام ابتلا کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا،

مقصد یہ ہے کہ اگر کتاب و سنت کی حرام کردہ کسی چیز کو عام طور پر حلال سمجھ لیا جائے، یا ان کی حلال کردہ کسی بات کو حرام قرار دیدیا جائے، اور عام طور پر لوگ اس میں مبتلا ہو جائیں تو اس عام ابتلا کا کوئی اعتبار نہیں، بلکہ کتاب و سنت میں جو چیزیں حرام ہیں وہ حرام ہی رہیں گی، اور جو حلال ہیں وہ حلال ہی رہیں گی،

(۳) الضرر یزال کوئی تکلیف یا نقصان لاحق ہو تو اس کو زائل کیا جائے،

مذکورہ دونوں اصولوں کی طرح یہ اصول بھی قرآن و حدیث کی ہدایات ہی سے ماخوذ ہے، اسکا مفہوم یہ ہے کہ اگر کسی حکم شرعی کی انجام دہی میں غیر معمولی مالی یا جسمانی تکلیف یا نقصان واقع ہوتا ہو تو حتی الامکان اس کو نقصان سے بچانے کی کوشش کی جائیگی، ایک بیمار شخص اگر وضو کرکے نماز پڑھتا ہے تو اس کے مرض میں شدت پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے، اس لیے اسکو تیمم کی اجازت دی گئی ہے، اگر ایک شخص ریل سے اتر کر نماز پڑھتا ہے تو اس کے سامان کے چوری ہو جانے کا اندیشہ ہے، ایسی صورت میں اس کو ریل کے اندر ہی نماز پڑھنے کی اجازت دی گئی ہے، خواہ بیٹھکر پڑھنا اور رکوع و سجدہ اشارہ سے کرنا پڑے،

غرض یہ کہ فقہ کا یہ اصول اس حقیقت کے اظہار کے لیے وضع کیا گیا ہے کہ اسلامی شریعت کے احکام انسانی ذہن کی پیداوار نہیں ہیں جس میں انسان کی فطرت کا پورا پورا لحاظ کیا گیا ہو، بلکہ یہ احکام اس خلاقِ فطرت نے دیے ہیں، جو انسان کی فطری کمزوریوں، اس کی تکلیفوں اور اس کے جسمانی و روحانی نقصانات سے پورے طور پر واقف ہے۔

وہ کسی بندے کو تکلیف نقصان میں ڈالنا نہیں چاہتا، بلکہ اس سے بچاتا ہے، لیکن اگر اس کے کسی حکم کی بجاآوری میں کوئی تکلیف ومشقت یا نقصان نظر آتا ہے تو اس تکلیف ومشقت اور نقصان ہی میں بجانے کتنے اجتماعی اور انفرادی فوائد پوشیدہ ہوتے ہیں، ایک شخص حج کا سفر کرتا ہے، اس میں جسمانی تکلیف بھی اٹھاتا ہے، اور اپنی گاڑھی کمائی کا پیسہ بھی لگاتا ہے، مگر اس جسمانی تکلیف کے اٹھانے اور اپنی دولت خرچ کرنے پر وہ اس لیے مجبور ہوتا ہے کہ اس میں بے شمار انفرادی و اجتماعی، مادی و روحانی فوائد مضمر ہیں، اسی طرح زکوٰۃ، روزہ، نماز اور جہاد وغیرہ کو سمجھنا چاہیے،

اب جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کسی شرعی حکم کی تعمیل میں ان کو کوئی تکالیف یا نقصان ہوتا ہے تو اس کو ساقط کر دینا چاہیے تو اس کی کوئی گنجایش نہیں نکلتی، اسی لیے فقہار نے اس اصول کی وضاحت کرتے ہوئے یہ لکھدیا ہے کہ نہ تو نقصان کی تلافی دوسرے نقصان سے کیجا سکتی ہے، اور نہ ہر عمرو بکر کے نقصان کا لحاظ کیا جائے گا، بلکہ مخصوص افراد کے نقصان سے اگر عام لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے، تو مخصوص افراد کو اس نقصان کو برداشت کرنا پڑے گا،

يتحمل الضرر الخاص لاجل دفع الضرر العام — عام نقصان سے بچنے کے لیے خاص نقصان کو برداشت کرنا پڑے گا،

یعنی اگر سودی کاروبار کے جاری رکھنے میں کچھ لوگوں کا نقصان واقع ہوتا ہے یا حکومت کو کچھ دقتیں پیش آتی ہیں، تو اس نقصان کو دوسرے طریقہ سے پورا کرنا چاہیے، اس کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ اس نقصان کی تلافی سودی کاروبار جاری کرکے کیجائے، کیونکہ سودی کاروبار کا جاری رہنا نہ رہنے کے مقابلہ میں معاشرہ و حکومت دونوں کے لیے مادی اور اخلاقی دونوں حیثیت سے زیادہ مضر اور نتیجہ کے اعتبار سے نقصان دہ ہے،

اسی طرح اگر کسی معاملہ میں چند افراد کا نقصان ہوتا ہو، مگر اس نقصان سے عام معاشر
ہ ہو تو اس خاص نقصان کو برداشت کرنا پڑے گا، فقہا نے لکھا ہے کہ اگر کسی محاذ
پر کفار مسلمان بچوں کو بطور ڈھال استعمال کریں، اور مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ ان کی
وں اور تیروں کا نشانہ مسلمان بچے بن رہے ہیں، تب بھی ان کو نشانہ سے باز نہ آنا چاہیے
ں سے ہر مسلمان کو تکلیف ہوگی، مگر یہ تکلیف اس لیے برداشت کرنی پڑے گی کہ چند بچوں
نقصان پوری اسلامی فوج کو ہلاکت سے بچانے کے لیے ضروری ہے، تو یہ ضرر خاص
ام سے بچنے کے لیے برداشت کیا جائے گا۔

اسی طرح اگر کسی شاہراہ عام پر کوئی ایسا مخدوش مکان ہو جس کے گر جانے کی
ن میں لوگوں کے مالی یا جسمانی نقصان کا اندیشہ ہو تو اسلامی حکومت اس کو گرا
ہے، حالانکہ اس کو کسی کی ملکیت پر دست اندازی کا حق حاصل نہیں ہے، لیکن اس خاص
ن کو اس لیے برداشت کیا جائے گا کہ اس سے عام نقصان اور تکلیف
یشہ ہے۔

سی طرح اگر کوئی معلم بچوں کے اخلاق کو بگاڑتا ہے، کوئی جاہل ڈاکٹر مریضوں کی جان
تا ہے، چند تاجر سٹہ بازی اور ذخیرہ اندوزی کرکے ملک میں گرانی پیدا کرتے ہیں تو
اشخاص پر اسلامی حکومت یہ پابندی عائد کر سکتی ہے کہ وہ اپنے پیشے اور کاروبار
یں۔

۴) الاصل فی الشئ الاباحۃ — ہر چیز میں اصلاً اباحت ہے

نہا کے اس اصول سے یہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ دنیا میں کوئی چیز بھی
ستعمال میں اباحت ہے، اس لیے اگر ہر حرام چیز کو اس کی اصل پر باقی رکھتے ہوئے

مباح سمجھا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن ہمارے جدید فقہاء نے اس اصول کے سمجھنے میں بھی غلطی کی ہے۔

یہ اصول اصل میں اس حقیقت کے اظہار کے لیے وضع کیا گیا ہے کہ دنیا کی تمام اشیا خالق کائنات نے انسان کے فائدے کے لیے پیدا کی ہیں اگر ان کو ان کے فطری حدود کے اندر استعمال کیا جائے تو کائنات کی ہر چیز مباح و مفید ہے لیکن انسان خود ان کو بگاڑ کر اپنے لیے مضر بنا لیتا ہے، مثال کے طور پر انگور کو لیجئے، اس کے اندر خدا نے کتنی لذت و لطافت رکھی ہے، اس کے حلال و مباح ہونے میں کس کو شبہہ ہو سکتا ہے، مگر جب اس انگور کو انسان نے بگاڑ کر شراب بنالی تو خدا نے اس کو حرام کر دیا، مگر اس شراب کی اصل یعنی انگور کے بارے میں شریعت نے یہ وضاحت کر دی کہ وہ اپنی جگہ پر اسی طرح مباح ہے، اس کی اصلیت میں کوئی فرق نہیں آیا، فرق جو کچھ آیا ہے اس کے نشہ آور ہو جانے کی وجہ سے۔

اسی طرح مٹی پوری انسانی آبادی کا مشترک سرمایہ ہے، لیکن اگر کوئی احمق اس سے دانہ اگانے کے بجائے اسے کھانا شروع کر دے تو اسلام اس کے کھانے کو حرام قرار دیگا۔ ایٹمک انرجی کی دریافت خدا کا ایک عطیہ ہے، لیکن اگر اس کو پر امن طور پر استعمال کرنے کے بجائے ... انسانیت کی ہلاکت کے لیے استعمال کیا جائے تو یہ مباح چیز حرام ہو جائے گی۔

غرض یہ کہ حقیقت میں ہر چیز مباح ہے، انسان خود اپنے استعمال سے اسے حرام اور مضر بنا لیتا ہے۔

لیکن اگر کسی چیز کے اندر اباحت کے ساتھ خطر (ممنوع) کا پہلو بھی جمع ہو جائے تو حظر کو ترجیح ہوگی، اور اباحت کو نظر انداز کر دیا جائے گا۔ ابوبکر جصاص نے اپنی اصول فقہ

ہیں بار بار لکھا ہے کہ

اذا اجتمع سبب الحظر والاباحۃ	جب اباحت اور حظر (ممنوع) دونوں کے اسباب
کان الحکم للحظر دون الاباحۃ	جمع ہو جائیں تو حظر کو ترجیح ہوگی اباحت کو نہیں،

مذکورہ اصولوں کے ساتھ فقہا کے ان اصولوں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے،

درء المفاسد اولیٰ من جلب	مفاسد کا دور کرنا فوائد کے سمیٹنے سے
المصالح	زیادہ بہتر ہے۔
اذا اجتمع الحلال والحرام	جب حلال و حرام ہونے کے دونوں پہلو جمع
غلب الحرام	ہو جائیں تو حرام ہی پہلو کو اختیار کیا جائیگا،

یعنی اگر ایک چیز کے استعمال میں فائدہ بھی ہو اور نقصان بھی تو فائدہ کو نظر انداز کر کے اس کے نقصان وہ مفسد اور مضرت رساں پہلو کو سامنے رکھا جائے گا، اور اس کو ممنوع قرار دیا جائے گا، شراب، جوا اور سود فوائد سے خالی نہیں ہیں، مگر چونکہ ان میں فوائد کے مقابلہ میں مفاسد اور مضرتیں زیادہ ہیں، اس لیے خدا نے ان کو حرام قرار دیا۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ	آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے
قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ	ہیں، کہدیجئے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے
لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا	اور لوگوں کے لیے کچھ فوائد بھی ہیں، مگر انکا
	گناہ ان کے نفع سے زیادہ ہے،

اسی طرح اگر کسی چیز کے حلال و حرام ہونے میں شبہہ پیدا ہو جائے تو اس کو حرام ہی سمجھنا چاہیے، کیونکہ حلال امر ہے اور حرام نہی، اور شریعت میں امر کی تعمیل سے بڑا درجہ یہ ہے کہ جس چیز کے ارتکاب سے منع کیا گیا ہے، اس سے رک جایا جائے، صاحب الاشباہ لکھتے ہیں:

لان اعتناء الشرع بالمنہیات   شریعت نے ماموراتے مقابلہ میں منہیات

اشد من اعتنائہ بالمامورات   کا زیادہ لحاظ واعتبار کیا ہے،

اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مشتبہات تک سے بھی بچنے کی تاکید فرمائی ہے، کیونکہ یہ حرام کے قریب کر دینے کا سبب ہے، آپنے فرمایا کہ خدا نے جس بات سے روکا ہے اس سے رک جانا جن وانس کی عبادت سے زیادہ افضل ہے،

حضرت عثمانؓ سے کسی نے پوچھا کہ دو ایسی لونڈیوں کو جو آپس میں سگی بہنیں ہوں، ساتھ رکھنا جائز ہے یا نہیں، فرمایا کہ ایک آیت سے حرمت ثابت ہوتی ہے، اور دوسری آیت سے حلت، مگر فالتحریم احب الینا۔ تحریم والی آیت ہمیں زیادہ پسند ہے،

فقہا کے مذکورہ اصولوں کی ان ہی کی زبان سے جو مختصرؔ وضاحت کی گئی ہے، کیا اس کے بعد بھی یہ کہنے کی گنجایش باقی رہ جاتی ہے کہ یہ اصول ضرورت و مصلحت، دقت و تکلیف کے وقت حرام کو حلال اور حلال کو حرام یا ممنوع کو مباح اور مباح کو ممنوع قرار دینے کیلیے وضع کیے گئے ہیں،   (باقی)

یونانی منطق کے قدیم عربی تراجم

(از جناب شبیر احمد خانصاحب غوری ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی)

(۳)

منطق کے قدیم ترین ترجمہ کا مصدر

یہ بات بہر صورت پایۂ تحقیق کو پہونچ گئی ہے کہ منطق کی کتابوں کا عربی میں سب سے پہلے عبداللہ بن المقفع نے ترجمہ کیا۔

اس سلسلے میں قدرتی طور پر دوسرا سوال جو ہمارے سامنے آتا ہے، وہ یہ ہے کہ ابن المقفع نے یہ ترجمہ کس زبان سے کیا، یونانی یا سریانی سے یا پہلوی سے؟ اس کی صراحت نہ تو قاضی صاعد نے طبقات الامم میں کی ہے اور نہ بیروت کے مخطوطے ہی میں اس کی تصریح ہے۔ باایں ہمہ پروفیسر پول کراؤس کو اصرار ہے کہ یہ ترجمہ (یا تلخیص) یونانی اصل سے ماخوذ ہے۔ حالانکہ خود فرلانی (Furlani) جس نے مخطوطہ بیروت کا مطالعہ کیا ہے، کہتا ہے کہ یہ پہلوی (وسطی فارسی) سے ماخوذ ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے:-

"رہی یہ بات کہ جن کتابوں کو ہم نے حل کیا ہے ان کا فارس سے کچھ نہ کچھ تعلق ہے تو یہ بہت جلد واضح ہو جاتی ہے کیونکہ نہ فلسفی اصطلاحات جن سے ہمیں سابقہ پڑتا ہے، آپ ہی نظیر اور ان اصطلاحات سے مختلف ہیں جنھیں ہم عرب مشائین (پیروان ارسطو) کی کتابوں میں پاتے ہیں۔ پس اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جن کتابوں کو ہم نے حل کیا ہے، ان کا مزعوم مترجم صاحب کلیلہ و دمنہ کے مترجم کا بیٹا تھا[1] اس صورت میں ضرور ہے کہ ترجمہ وسطی فارسی

[1] چونکہ فرلانی نے توضیح کی عبارت پر غیر مشروط اعتماد کر لیا تھا، اسی بنا پر وہ اس مخطوطہ کے مترجم کو کلیلہ و دمنہ کے مترجم کا بیٹا سمجھتا، حالانکہ ہم ثابت کرینگے کہ یہ مخطوطہ خود کلیلہ و دمنہ کے مترجم کا ترجمہ کیا ہوا ہے۔

لان اعتناء الشرع بالمنھیات — شریعت نے مامورات کے مقابلہ میں منہیات

اشد من اعتنائه بالمامورات — کا زیادہ لحاظ و اعتبار کیا ہے۔

اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مشتبہات تک سے بھی بچنے کی تاکید فرمائی ہے، کیونکہ یہ حرام کے قریب کر دینے کا سبب ہے، آپ نے فرمایا کہ خدا نے جس بات سے روکا ہے اس سے رک جانا جن و انس کی عبادت سے زیادہ افضل ہے،

حضرت عثمانؓ سے کسی نے پوچھا کہ دو ایسی لونڈیوں کو جو آپس میں سگی بہنیں ہوں، ساتھ رکھنا جائز ہے یا نہیں، فرمایا کہ ایک آیت سے حرمت ثابت ہوتی ہے، اور دوسری آیت سے حلت، مگر فالتحریم احب الینا - تحریم والی آیت ہمیں زیادہ پسند ہے،

فقہا کے مذکورہ اصولوں کی ان ہی کی زبان سے جو مختصر وضاحت کی گئی ہے، کیا اس کے بعد بھی یہ کہنے کی گنجایش باقی رہ جاتی ہے کہ یہ اصول ضرورت و مصلحت، دقت و تکلیف کے وقت حرام کو حلال اور حلال کو حرام یا ممنوع کو مباح اور مباح کو ممنوع قرار دینے کیلئے وضع کیے گئے ہیں،

(باقی)

اہل کتاب صحابہ و تابعین

تفسیر کی کتابوں میں عموماً دو چار یہودی یا نصرانی صحابہ کا نام آتا ہے، اس سے آج تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ اہل کتاب کی کوئی بڑی تعداد حلقہ بگوش اسلام نہیں ہوئی، اس کتاب میں اس قسم کے اوہام کا ازالہ کیا گیا ہے، اور دکھایا گیا ہے کہ دو چار افراد ہی نے نہیں بلکہ ایک بڑی تعداد نے اسلام قبول کیا، اس میں اسی طرح کے ۳۰ بزرگوں کے حالات و سوانح ہیں، قیمت للعہ

(مرتبہ مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دار المصنفین)

منیجر

یونانی منطق کے قدیم عربی تراجم

از جناب شبیر احمد خان صاحب غوری ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی

(۳)

منطق کے قدیم ترین ترجمہ کا مصدر

یہ بات بہرصورت پایۂ تحقیق کو پہونچ گئی ہے کہ منطق کی کتابون کا عربی مین سب سے پہلے عبداللہ بن المقفع نے ترجمہ کیا۔

اس سلسلے مین قدرتی طور پر دوسرا سوال جو ہمارے سامنے آتا ہے، وہ یہ ہے کہ ابن المقفع نے یہ ترجمہ کس زبان سے کیا، یونانی سے یا سریانی سے یا پہلوی سے؟ اس کی صراحت نہ تو قاضی صاعد نے طبقات الامم مین کی ہے اور نہ بیروت کے مخطوطے ہی مین اس کی تصریح ہے۔ باایں ہمہ پروفیسر پول کراؤس کو اصرار ہے کہ یہ ترجمہ (یا تلخیص) یونانی اصل سے ماخوذ ہے۔ حالانکہ خود فرلانی (Furlani) جس نے مخطوطہ بیروت کا مطالعہ کیا ہے، کہتا ہے کہ یہ پہلوی (وسطی فارسی) سے ماخوذ ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے:-

"رہی یہ بات کہ جن کتابون کو ہم نے حل کیا ہے ان کا فارس سے کچھ نہ کچھ تعلق ہے تو یہ بہت جلد واضح ہو جاتی ہے کیونکہ وہ فلسفی اصطلاحات جن سے ہمین سابقہ پڑتا ہے، آپ اپنی نظیر اور ان اصطلاحات سے مختلف ہین جنھین ہم عجب مشائین (پیروان ارسطو) کی کتابون مین پاتے ہین۔ پس اس سے انکار نہین کیا جاسکتا کہ جن کتابون کو ہم نے حل کیا ہے، ان کا مزعوم مترجم جو کلیلہ و دمنہ کے مترجم کا بیٹا تھا؎۔ اس صورت مین ضرور ہے کہ ترجمہ وسطی فارسی

؎ چونکہ فرلانی نے توجیہ کی عبارت پر غیر مشروط اعتماد کر لیا تھا، اسی لیے وہ اس مخطوطے کے مترجم کو کلیلہ و دمنہ کے مترجم کا بیٹا سمجھتا تھا، اگر ہم یہ سمجھین کہ مخطوطہ خود کلیلہ و دمنہ کے مترجم کا ترجمہ کیا ہوا ہے۔

(پہلوی) سے کیا گیا ہوگا اور غالباً وہ ایسی اصل پر موقوف ہو، جو جدید فارسی میں لکھی ہوئی تھی، اور
جس شخص نے یہ ترجمہ کیا وہ عربی سے زیادہ فارسی جانتا تھا۔[۱]

لیکن ہمارے سامنے نہ بیروت کا مخطوطہ ہے اور نہ فرلانی کی کتاب۔ اس لئے پول کراوس اور فرلانی کے
درمیان ہم کو محاکمہ کا کوئی حق نہیں ہے۔ البتہ پروفیسر پول کراوس کے اس دعویٰ سے کہ

"یہ حقیقت ثابت شدہ ہے کہ یونانی فلاسفہ کی کتابوں میں سے کوئی بھی کتاب فارسی زبان سے
عربی میں ترجمہ نہیں کی گئی"

کسی طرح اتفاق نہیں کیا جا سکتا کیونکہ

"یہ ممکن ہے کہ ارسطو اور افلاطون کی تصانیف نوشیروان کے لئے فارسی زبان میں ترجمہ
ہوئی ہوں جیسا کہ اجثیاس کا بیان ہے گو یہ روایت اس کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے ثابت
نہیں ہوتی۔ البتہ یہ ثابت ہے کہ اسلام سے قبل جندی سابور اور ایران کے دوسرے شہروں
میں طب کے اعلیٰ مدارس میں فارسی زبان میں فلسفہ کی تعلیم ہوتی تھی۔ ممکن ہے فلسفیانہ
اصطلاحات مثلاً یونانی لفظ "اوسیا" کے لئے "جوہر" کا لفظ ان ہی مدارس نے وضع کیا ہو۔

مگر یہ حقیقت ثابت شدہ ہے کہ یونانی فلاسفہ کی کتابوں میں سے کوئی بھی کتاب فارسی زبان سے
عربی میں ترجمہ نہیں کی گئی۔[۲]

ممکن ہے کلیسائی تواریخ اور اسی قسم کے دیگر مآخذ سے اجثیاس (Agathias) کی روایت کی
تائید نہ ہو سکتی ہو لیکن قرائن اس کے مقتضی اور عربی مآخذ اس کے مؤید ہیں۔ جس کی وضاحت سطور ذیل
میں کی گئی ہے۔

---

[۱] فرلانی کی کتاب Divina presente versione arabi di alcuni Scritti di Porfirio di Aristotele
[۲] [illegible]

ساسانی سلطنت ۲۲۶ء مین قائم ہوئی اور ۶۵۱ء تک سوا چار سو سال تک قائم رہی، اس سلطنت کا بانی اردشیر بابکان (۲۲۶-۲۴۱) تھا۔ استحکام سلطنت سے فارغ ہوتے ہی اس نے اس کی توسیع کی کوشش شروع کی اور ۲۳۲ء مین قیصر سویرس اسکندر (Severus Alexander) سے ایشیائے کوچک کے صوبون کی واپسی کا مطالبہ کیا اور عراق (میسوپوٹامیہ) پر حملہ کرکے شام تک بڑھتا چلا گیا۔[1] ۲۴۱ء مین اردشیر نے وفات پائی اور اس کا بیٹا شاپور اول اس کا جانشین ہوا۔ شاپور نے بھی اپنے باپ کی توسیعی پالیسی کو برقرار رکھا اور ۲۵۰ء مین فرات کو دوبارہ عبور کرکے رومی مقبوضات پر حملہ کیا۔ اسی زمانہ مین خود قوم گاتھ کے پیہم حملون سے رومن سلطنت کمزور ہو رہی تھی۔ ۲۶۰ء مین قیصر ویلیرین (Valerian) ایرانی فتوحات کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لئے میدان مین آیا مگر شاپور کے ہاتھون گرفتار ہوا۔[2] ایرانی فتح کے شادیانے بجاتے ہوئے شام مین داخل ہوئے اور آگے بڑھ کر شہر انطاکیہ پر قبضہ کر لیا،[3] لیکن ان ساسانی حکمرانون کی مساعی توسیع سلطنت اور کشورکشائی ہی تک محدود نہین رہین، عام نظم مملکت کے علاوہ انھون نے علم و فن کی سرپرستی پر بھی توجہ کی۔ اردشیر نے دوسری زبانون سے فارسی مین ترجمے کرائے اور ہندوستان، روم اور چین سے کتابین منگائین۔ یہی کیفیت اس کے بیٹے شاپور اول کی تھی۔ ابن الندیم الفہرست مین لکھتا ہے:

ملك اردشير بن بابك ... فبعث الى بلاد الهند والصين فى الكتب التى كانت قبلهم والى الروم ... وفعل ذلك من بعده ابنه سابور حتى نسخت تلك الكتب كلها بالفارسية[4]	اردشیر بن بابک بادشاہ ہوا ... تو اس نے ہندوستان، چین اور روم سے جو کتابین ان کے یہان تھین منگائین ... اس کے بعد اس کے بیٹے شاپور نے بھی اس علمی سرپرستی کو جاری رکھا، اس طرح یہ تمام کتابین فارسی زبان مین نقل ہو

---

[1] گبن - Decline and Fall of Roman Empire vol. I p. 208
[2] ایضاً ۲۷۹۔ [3] تاریخ روم مصنفہ بلیم ص ۵۲۵-۵۲۶۔ [4] الفہرست ص ۳۳۳-۳۳۴۔

اسی طرح انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا ایک مقالہ نویس "فارس" کے زیرِ عنوان لکھتا ہے:۔

شاپور اول نے جو زیادہ وسیع النظر معلوم ہوتا ہے۔ مذہبی تصانیف مین طب، ہیئت، ریاضی، فلسفہ، حیوانیات وغیرہ کے موضوعون پر علمی کتابون کا اضافہ کیا جو کچھ ہندوستانی اور کچھ یونانی مصادر سے ماخوذ تھین۔" (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ہفدہم)

اسی طرح "ایران بعہد ساسانیان" کا مصنف آرتھر کرسٹن مین لکھتا ہے۔

بعد مین اردشیر کے بیٹے اور جانشین شاپور اول نے کتب مقدسہ کے اندر غیر مذہبی تصانیف کو جن کا موضوع علم طب اور نجوم اور فلسفہ تھا۔ اور جو ہندوستان اور یونان اور دوسرے ملکون مین دستیاب ہوئین داخل کر دیا۔"[۱]

شاپور کی سیاسی جنگون ہی کے نتیجے مین شہر جندی سابور کی بنیاد پڑی جو آگے چل کر ایران مین فلسفہ وحکمت کا مرکز بنا[۲] چنانچہ پروفیسر براؤن کر اؤس بھی کہتے ہین:۔

"یہ ثابت ہے کہ اسلام سے قبل جندی سابور اور ایران کے دوسرے شہرون مین طب کے اعلیٰ مدارس مین فارسی زبان مین فلسفہ کی تعلیم ہوتی تھی"[۳]

شاپور ہی کے زمانہ مین ایران مین مانی کا ظہور ہوا، اس کا باپ ہمدان کا رہنے والا تھا مگر بعد مین بابل مین جاکر آباد ہوگیا تھا، جہان فرقہ مغتسلہ کے عیسائیون سے اس کا میل جول تھا، یہین ۲۱۵ء مین مانی پیدا ہوا، اور اس کی پرورش فرقہ مغتسلہ ہی مین ہوئی[۴] جو اس زمانہ کا ایک عرفانی (gnostic) فرقہ تھا، مانی نے ایک نیا مذہب جاری کیا، جس پر عیسائی عقائد کا بھی بہت گہرا اثر پڑا ہے[۵]۔ مانوی عقائد کا خلاصہ جو سکندر لیکوپولیسی (Alexander of Lycopolis) نے کیا ہے اس کو دیکھ کر شیڈر نے یہ رائے قائم کی ہے کہ مانی نے اپنے مذہب کی تعمیر فلسفہ یونان کی بنیاد پر کی ہے[۶]۔

۱؎ ایران بعہد ساسانیاں ص ۱۴۳۔۱۴۴، ۲؎ اخبار العلماء باخبار الحکماء ص ۹۳ ۳؎ التراث الیونانی ص ۱۱۵ ۴؎ ایران بعہد ساسانیاں ص ۲۳۳ ۵؎ ایضاً ص ۲۵۰ ۶؎ ایضاً ص ۲۴۷

اس طرح ابتدا ہی سے ایرانی فکر یونانی فلسفہ سے متاثر تھی اور یونانی حکمت و فلسفہ کی کتابوں کے تراجم سے ایرانی ادب آشنا تھا۔ اس فکری و ادبی تحریک کا عہد زرین خسرو انوشیروان (۵۳۱ - ۵۷۹ء) کا عہد حکومت ہے مگر اس کی تفصیل سے پہلے ان مذہبی و معاشرتی عوامل پر ایک نظر ڈال لینا مناسب ہوگا جو اسکے محرک بنے

۳۲۳ء میں قسطنطین اعظم مملکت روم کا بادشاہ ہوا۔ اس نے مسیحی مذہب اختیار کیا جس کی وجہ سے مسیحیت مملکتی مذہب قرار پائی۔ اب مسیحیت اور وثنیت کی کشمکش خود مسیحیت کے مختلف العقائد فرقوں کی باہمی نزاع میں تبدیل ہوگئی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد شہر اسکندریہ میں خدا کے پدر (نعوذ باللہ منہا) اور مسیح پسر کے باہمی تعلق کا مسئلہ پیدا ہوگیا۔ مصر و اسکندریہ قیاصرۂ روم کی بالادستی سے یونہیں متنفر تھے۔ اس مذہبی اختلاف نے مخالفت کی خلیج کو (اور اسی طرح سیاسی نفرت نے مذہبی اختلاف کو) اور بھی وسیع کردیا۔ اور اس مسئلہ کے تصفیہ کے لئے مختلف مقامات میں اساقفہ کی مذہبی کونسلیں منعقد ہوئیں مگر مسئلہ سلجھنے کے بجائے الجھتا ہی گیا۔ چوتھی صدی کے اختتام پر ایک اور مسئلہ پیدا ہوا کہ اگر مسیح علیہ السلام میں لاہوتیت اور ناسوتیت دونوں بدرجۂ کمال موجود ہیں تو پھر شخص واحد میں ان کا اتحاد آج کس طرح ممکن ہے؟

ان موشگافیوں کی تفصیل و تدقیق اور ان کا تاریخی ارتقا مسیحی کلیسا کے مورخ کا منصب ہے، لیکن جہاں تک ایران قدیم کی ثقافت خصوصاً ایرانی ادب میں یونانی فلاسفہ کی کتابوں کے نقل و ترجمہ کا تعلق ہے، ان مذہبی موشگافیوں نے فرقہ نسطوریہ کو پیدا کیا جس نے ایران کی مذہبی و ثقافتی ہیئت کو دو حیثیتوں سے متاثر کیا۔

ا- ایران میں مسیحیت کو غیر معمولی فروغ ہونے لگا۔

ب- مسیحیت کی اشاعت کی وجہ سے ایرانی یونانی فلاسفہ خصوصاً ارسطاطالیس کی تصانیف سے زیادہ آشنا ہونے لگے

نسطوری فرقہ کے ظہور نے ان دونوں تحریکوں میں سرگرمی پیدا کردی ورنہ ایران میں یہ دونوں تحریکیں بہت عرصے سے چل رہی تھیں۔

(۱) مسیحیت پہلی صدی عیسوی ہی مین شام اور ایشیائے کوچک مین پھیل چکی تھی اور سنہ ۱۰۰ء کے قریب عیسائیون کی جماعتین دریائے دجلہ کے پار شہر اربل مین موجود تھین۔ اربل کے بعد مشرقی عیسائیت کا محکم ترین ملجا و ماوی کرکوک (کرخائے بیت سلوخ) تھا[۴] جس زمانہ مین کہ ساسانی خاندان نے اشکانیون کی جگہ لی عیسائیون کا ایک بہت بڑا تبلیغی مرکز شہر الرہا (Edessa) مین تھا اور وہ ایران کے مغربی صوبون مین بڑے امن و امان سے زندگی بسر کرتے تھے لیکن جب قسطنطین اعظم نے عیسائی مذہب اختیار کیا اور قیاصرۂ روم نے صلیب کو جہاد کی علامت قرار دیا تو عیسائیون کی ہمدردیان رومن سلطنت کے ساتھ ہوگئین۔ آرتھر کرسٹن سین کہتا ہے۔

"جب تک دولت روم لامذہب رہی ایران کے عیسائی امن مین رہے لیکن جونہین قیصر قسطنطین نے عیسائی مذہب اختیار کیا صورت حال بدل گئی۔ اس وقت سے ایران کے عیسائی جن کی تعداد اُن سرحدی صوبون مین زیادہ تھی جو روم کے متصل تھے ایک طاقتور سلطنت کے گرویدہ ہوگئے جہان ان کا مذہب سرکاری مذہب قرار پاگیا تھا"[۵]

اس طرح سیاسی مصالح کی بنا پر شاپور نے عیسائیون کو مورد آزار بنایا۔ روم کے ساتھ لڑائیون کے دوران مین جو قیدی گرفتار کئے گئے ان کو سلطنت ایران کے دور دراز علاقون مین آباد کیا گیا چونکہ ان قیدیون مین بیشتر عیسائی ہوا کرتے تھے اس لئے مسیحیت ایران مین تقریبا ہر جگہ پھیل گئی۔ چوتھی صدی کے آغاز مین پاپا بار عکائی نے جو سلوکیہ طیسفون کا بشپ تھا ایران کے تمام عیسائیون کو طیسفون کے کلیسائی مرکز کے ماتحت متحد و منظم کرنے کی کوشش کی مگر وہ معزول کر دیا گیا۔ غرض ۳۳۹ء سے عیسائیون پر جور و تعدی کا آغاز ہوا جو شاپور کے جانشین اردشیر دوم کے زمانہ مین بھی جاری رہا، البتہ یزدجرد اول (۳۹۹-۴۲۱) کے زمانہ مین عیسائیون کو مذہبی آزادی دی گئی اور سلوکیہ کا

---

[۴] التراث الیونانی ص ۱۴ [۵] ایضاً ص ۳۴۹

بشپ ایران کے عیسائیون کا جاثلیق مقرر ہوا۔ اس زمانہ مین عیسائیت ایران کے اعلیٰ طبقات مین داخل ہو گئی جیسا کہ پادریون کے ایرانی نامون (مثلاً نرسی وغیرہ) سے ظاہر ہے۔ ان مین سے داد بشوع زیادہ مشہور ہے جو ۴۲۱ء کے قریب جاثلیق مقرر ہوا اور جس نے بہرام کے زمانہ مین اعلان کرا دیا کہ کلیسائے ایران آئندہ آزاد ہوگا اور مغربی کلیسا کے ماتحت نہین سمجھا جائیگا۔ اس طرح نسطوری کلیسا کے قیام کے لئے زمین ہموار ہو گئی۔ غرض کبھی تعصب اور کبھی بے تعصبی و مذہبی آزادی، ایران مین عیسائیون کی یہ مذہبی حالت شاہ فیروز (۴۵۹-۴۸۴) کے زمانہ تک رہی تا آنکہ بارسوما (Barsauma المتوفی ۴۹۵ء) نے جو ایک نسطوری مبلغ تھا شاہ فیروز کو یقین دلایا کہ نسا طرہ ہمیشہ ایران کے وفادار رہینگے[1] اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

(ب) اسی طرح نسطوریت کے ظہور سے بہت پہلے سے ایران یونانی ثقافت سے آشنا تھا: سکندر اعظم نہ صرف مشرقی ممالک کی تسخیر کے ارادے سے چلا تھا بلکہ بقول دوران

> اس نے یونان کی بلند شائستگی کا ادب کرنا سیکھ لیا تھا، اور اس کا خیال تھا کہ اس تہذیب اور شائستگی کو اپنی فتح مند فوجون کے ذریعے سے مشرق مین پھیلائے ۔ ۔ ۔ ۔ اور سکندر کو امید تھی کہ ان معروف مقامات سے یونانی فکر اور یونانی اشیائے تجارت دنیا مین پھیلین گے۔[2]

اور غالباً سکندر اپنے اس منصوبے مین کامیاب بھی ہوا کیونکہ شاہان اشکانی (Arsacides) یونانی زبان اور اس کی ادبیات کا احترام اس حد تک کرتے تھے کہ اس مین پرستش کا شائبہ پایا جاتا تھا، "مشتاق یونان" (Phil-Hellenes) کا لقب جسے بادشاہ مہرداد (Mithridate) اول نے اختیار کیا تھا اس کے تمام جانشینون نے برقرار رکھا۔ شاہ ارد (Orodes) اول نے

---

[1] ایران بعہد ساسانیان ص ۲ حکایت فلسفہ از دوران (Durant) ص ۱۰۰-۱۰۱

جب رومن سپہ سالار کراسوس پر فتح پائی تو حکم دیا کہ یوری پائڈیز (Euripides) کا یونانی ڈرامہ بیکائی (Bacchae) اس کے سامنے دکھایا جائے۔ بعض اشکانی بادشاہون کے کتبے یونانی زبان مین لکھے ہوئے اب تک باقی ہین۔ یونانی زبان سلطنت کے بعض علاقون مین بولی جاتی تھی اور ساسانی خاندان کے ابتدائی بادشاہون نے پہلوی کے ساتھ ساتھ اپنے کتبون مین یونانی زبان کو بھی استعمال کیا ہے[1]، غرض یونانی زبان اور یونانی ثقافت کو ایران مین قدیم الایام سے مقبولیت حاصل تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ شاپور نے یونان سے فلسفہ وحکمت کی کتابین منگا کر فارسی مین ترجمہ کرائین اور مانی نے اپنے مذہب کی تعمیر یونانی فلسفہ پر استوار کی۔

لیکن رفتہ رفتہ یونانیت کا رواج کم ہونے لگا مگر یونان پسندی ایران کے ادبی مزاج سے بالکلیہ فنا نہین ہوئی۔ پانچوین صدی مین امتداد زمانہ سے اس کا اثر بہت زیادہ مضمحل ہو گیا تھا کہ شاہ فیروز کے عہد مین ایران کے اندر نسطوریت کے فروغ نے اس مین از سر نو جان ڈالدی اس طرح یہ تحریک ساسانی حکومت کے زوال تک قائم رہی۔ شاہ فیروز کے زمانہ سے خسرو انوشیروان کے عہد حکومت تک اس کا اجمالی خاکہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ ایران مین مسیحیت کا فروغ | نسطوری مذہب کی پیدائش اور اسکی کلامی موشگافیان ہمارے موضوع سے خارج ہین۔ البتہ تاریخی تسلسل کے لئے یہ بتانا ضروری ہے کہ انطاکیہ کے معلمین بالخصوص ڈائیوڈورس طرسوسی (Diodorus of Tarsus) اور تھیوڈور مصیصی (Theodore of Mopsuestia) حضرت عیسی کی ناسوتیت کے شدت سے قائل تھے۔ انھین متشددین کا شاگرد نسطوریوس (Nestorius) تھا جو سنہ ۴۲۸ء مین قسطنطنیہ کا بشپ مقرر ہوا مگر اس کے وہان پہونچتے ہی ایک نئی مذہبی نزاع پیدا ہو گئی۔ قسطنطنیہ کے عوام "مادر خدا" Theotokos کے عقیدے کے قائل تھے۔ نسطوریوس نے

[1] ایران بعہد ساسانیان ص ۵۰

اس کے خلاف شدت سے اعتراض کئے اور اسکندریہ کے بشپ سائرل (Cyril) نے ان اعتراضات کی اسی شدت سے مخالفت کی۔ ان اختلافات کی تہ میں ذاتی عناد بھی مضمر تھا۔ اسکندریہ کے علما انطاکیون سے نفرت رکھتے تھے، اور نسطوریوس اپنے منصب عالی کی بنا پر بھی اپنے حریفوں میں محسود تھا۔ اس نئی نزاع کے تصفیہ کے لئے ۴۳۱ء میں قیصر تاؤ ذوسیوس (Theodosius) دوم نے شہر افیسس (Ephesus) میں مذہبی کونسل منعقد کرائی مگر ابھی انطاکی علما و آنے بھی نہ پائے تھے کہ سائرل نے بادشاہ کے کمشنر کے احتجاج کے باوجود نسطوریوس کو اس کے مذہبی عہدے سے معزول کرا دیا۔ جب انطاکی جماعت آئی تو اس نے جوابی کارروائی کے طور پر یوحنا بطریق انطاکیہ کی زیر سرکردگی سائرل کو معزول کر دیا۔ مگر سائرل بڑے جوڑ توڑ کا آدمی تھا۔ اس نے قیصر کے درباریوں کو رشوت دیکر خود کو بحال کرا لیا، اور بعد میں کلیسائی اتحاد کے نام پر ۴۳۳ء میں نسطوریوس کو ملعون اور خارج از کلیسا قرار دلوا دیا اور نسطوریوس ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگا پھرا تا آنکہ ۴۴۰ء میں مر گیا۔[1]

لیکن نسطوریوس نے اپنی آتش نوائی سے بہت سے ہمنوا پیدا کر لئے تھے۔ مگر پھر بھی رومن سلطنت کے مغربی صوبوں میں نسطوریت کو مقبولیت حاصل نہیں ہوئی البتہ انھوں نے الرہا (Edessa) کے مکتب کو جہاں ایران کے عیسائی تعلیم پاتے تھے اپنی تعلیمات کی اشاعت کا مرکز بنانا چاہا، اس دوران میں یعقوبی فرقہ (Monophysites) بھی ظہور میں آ چکا تھا۔ جو حضرت مسیح میں صرف فطرت واحدہ کا قائل تھا۔ وہ بھی نساطرہ کی طرح الرہا کے تبلیغی مدرسہ کی سیادت کا مدعی تھا اور یہ سیادت عرصہ تک مابہ النزاع رہی۔ جب تک ربولا (Rabbula) جو سائرل کا دوست اور نسطوریوس کا شدید مخالف تھا زندہ رہا۔ نساطرہ الرہا میں کامیاب نہ ہو سکے لیکن ۴۳۵ء میں

---

[1] History Christian Doctrine by G. P. Fisher P. 154

اس کی وفات کے بعد ایباس (Ibas) اس کا جانشین ہوا جو ایک پرجوش نسطوری تھا، اپنے شاگردون مین تھیوڈور مپسیصی کی تعلیمات کو جو نسطوری عقائد کی اصل ہین مقبول بنانے مین کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا مگر نسطوریت کی مخالفت بڑی شدید تھی اس لئے سنہ ۴۵۷ء مین ایباس کی وفات پر یعقوبیون کو پھر غلبہ ہوگیا اور نسطوری علما و الرہا سے نکالدیئے گئے[1]

غرض جب نساطرہ رومن سلطنت مین ملجا و ماوی حاصل کرنے سے مایوس ہوگئے تو بارصوما (Barsauma) کی قیادت مین ایران کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے جہان بارصوما نے شاہ فیروز کی پناہ ڈھونڈھی اور اُسے یقین دلایا کہ نساطرہ ہمیشہ ایران کے وفادار رہین گے۔ بارصوما بظاہر ایک جاہ طلب اور سازشی آدمی تھا لیکن ایک ممتاز شخصیت رکھتا تھا۔ اس کو ایک حد تک شاہ فیروز کی حمایت حاصل کرنے مین کامیابی ہوئی اگرچہ فیروز کو ان جھگڑالو پادریون سے کوئی اُنس نہ تھا۔ لیکن وہ دیکھ رہا تھا کہ نسطوری فرقے سے یہ سیاسی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے کہ ان کی وجہ سے ایران کے عیسائیون کو اپنے ان ہم مذہبون کے ساتھ جو مغربی سرحد کے پار رہتے تھے تنافر پیدا ہوسکتا ہے۔ اس لئے بارصوما کو نصیبین (Nisibis) کا بشپ اور سرحدی فوجون کا انسپکٹر بنادیا گیا۔ نصیبین کا شہر سنہ ۳۶۳ء سے ایران کی قلمرو مین داخل تھا۔ نسطوریون نے یہان الرہا کے ایرانی مکتب کے مدمقابل اپنا مذہبی مدرسہ قائم کیا۔ ادھر الرہا کا مدرسہ بھی یعاقبہ اور نساطرہ کی کشمکش کا مرکز بنا رہا یہان تک کہ سنہ ۴۸۹ء مین قیصر زینون (Zeno) نے اسے نسطوری بدعات کا مرکز قرار دیکر بند کرادیا۔ اس طرح مشرقی ممالک کے عیسائیون کا مرکز نصیبین کا نسطوری مدرسہ بن گیا۔

سنہ ۴۸۴ء مین شاہ فیروز ہیاطلہ (Huns) کے ساتھ لڑائی مین مارا گیا۔ بلاش اس کا جانشین ہوا اس کے عہد مین بھی بارصوما کو دربار شاہی مین رسوخ حاصل رہا۔ بلاش کے زمانے مین بارصوما کے

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد بست و دوم ص ۲۰۰، [2] ایران بعہد ساسانیان ص ۳۸۲،

دست راست جاثلیق اکاس نے سلوقیہ مین ایرانی اساقفہ کی ایک کونسل منعقد کرائی۔ اسی مین بہت سے پادری بہت دور سے چل کر آئے تھے، مثلاً گبرئیل جو ہرات کا بشپ تھا۔ اس جلسہ مین سب سے اہم جو قانون جو طے ہوا یہ تھا کہ نسطوری مذہب ایران کے عیسائیون کا واحد مذہب قرار پایا۔[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا ایک مقالہ نویس لکھتا ہے۔

"بارصوما کی کوششون سے جو نصیبین کا بشپ تھا، عملی طور پر پورا ایرانی کلیسا نسطوری عقائد کے ماتحت ہوگیا"[2]

نسطوریون کی کوشش سے مملکت ایران مین مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت کس حد تک ہوئی، اس کے بارے مین دوسرا مقالہ نویس لکھتا ہے۔

"نسطوریون نے اہل ملک کو عیسائی بنانے مین بڑی سرگرمی کا اظہار کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا اثر پورے ایران مین قائم ہوگیا۔ اس کا ثبوت ان مذہبی مراکز کے قیام سے ملتا ہے جو نہ صرف عرب، آرمینیہ اور شام مین قائم ہوے بلکہ حلوان، مرو، ہرات، تاشکند، سمرقند، بلوک، کاشغر حتیٰ کہ بیکن تک مین قائم ہوئے"[3]

اس طرح ایران مین مسیحیت کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا، سنحاؤ کہتا ہے کہ سلطنت ساسانی مین عیسائیت کے ساتھ ہمیشہ رواداری کا سلوک ہوتا رہا،[4] اور یہ تبلیغ و اشاعت صرف عوام ہی تک محدود نہ تھی بلکہ ملک کے اعلیٰ طبقے بھی تبدیل مذہب کر کے عیسائی ہو جاتے تھے۔ مثلاً پیرگشنسپ جو شاپور دوم کا بھتیجا تھا۔ اور جس نے عیسائی ہو کر سریانی نام "مار سابہا" اختیار کر لیا تھا۔[5]

ب۔ ایران مین ارسطاطالیسی فلسفہ کا آغاز

چونکہ نسطوری تعلیمات دوسرے مسیحی فرقون کے برخلاف زیادہ قرین عقل تھین اس لئے ان کی تائید و تشیید کے لئے نساطرہ یونانی فلسفے کی

---

[1] ایران بعہد ساسانیان ص ۔ ۳۰۹ [2] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد بست و یکم ص ۲۲، [3] ایضاً جلد شانزدہم ص ۲۴۴ [4] ایران بعہد ساسانیان ص ۳۰۱ [5] ایضاً ص ۳۱۲۔

مدد لیتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر نسطوری مبلغ جس طرح مسیحیت کا مبشر تھا۔ اسی طرح یونانی فلسفہ کا معلم بھی تھا۔ اور جس طرح انھوں نے اپنے زعمائے مذہب بالخصوص تھیوڈوزمصیصی کی تصانیف کو سریانی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ اس طرح ارسطاطالیس کی بہت سی کتابیں اور ان پر بعد کے مفسرین نے جو تعلیقات لکھی تھیں انھیں بھی سریانی زبان میں منتقل کیا۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا ایک آرٹیکل نویس "ایباس" (Ibas) کے بارے میں لکھتا ہے:

"الرہا کا اگلا بشپ "ایباس" تھا جو ۴۳۵ء میں "ربولا" کے مرنے پر اس کا جانشین ہوا۔ وہ نسطوری المذہب تھا۔ الرہا کے ایرانی مدرسے کے معلم کی حیثیت سے اس نے غالباً اپنے شاگردوں کی مدد سے تھیوڈور مصیصی الملقب بترجمان کی مخصوص تصانیف کو ترجمہ کیا، شاید اس نے ارسطو کی کسی تصنیف کا بھی ترجمہ کیا۔"

بومشترک (Baumstrach) کی "تاریخ ادب سریانی" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرق قریب (میسوپوٹامیہ سیریا اور مغربی ایران میں) طب کی تعلیم کا رواج نہ تھا اس کی تعلیم صرف مدرسہ اسکندریہ کے ساتھ مخصوص تھی جہاں یعاقبہ کا غلبہ تھا۔ نسطوری علما علی العموم علوم فلسفیہ کے ساتھ اعتنا برتتے تھے۔ وہ یونانی فلاسفہ کی کتابوں کا سریانی میں ترجمہ کرتے تھے اور خصوصیت سے ارسطاطالیسی منطق اور اس کی شرح کو یونانی سے سریانی میں منتقل کیا کرتے تھے[۱]۔

غرض نسطوری تحریک ترجمہ کا آغاز "ایباس" سے ہوا جس نے سب سے پہلے فرفوریوس کی ایساغوجی کا سریانی میں ترجمہ کیا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نسطوری مدارس میں منطق کو کس درجہ اہمیت حاصل تھی۔ "ایباس" کا شاگرد "بروبا" (Probo) تھا جس نے ایساغوجی نیز باری ارمینیاس (Peri Hermeni-cae) سوفسطیقا اور انالوطیقا اولی پر تعلیقات لکھیں جن میں کہ

---

[۱] التراث الیونانی ص ۵۴۔

بعض شائع ہو چکی ہیں۔

چھٹی صدی کا مشہور نسطوری عالم ابی القشقری تھا جسے خسرو دوم (۵۹۰-۶۲۸) کے دربار میں بڑا رسوخ حاصل تھا۔ اسی صدی کے یعقوبی مترجمین میں سرجیوس الرسعینی، یونانی الابامی، اصطفن بار صدیلہ، اخودیمہ (Ahudemmeh) اور ارسطو کی جانب غلط طور پر منسوب اثولوجیا (The Logia) کے مجہول مترجم تھے[۱]۔ ان میں سے سرجیوس الراس عینی زیادہ مشہور رہے جس کے بعض تراجم برٹش میوزیم میں ابھی تک محفوظ ہیں، اور بعض کو سخاؤ (Sachau) نے شائع کر دیا ہے لیکن ایرانی ثقافت کے سلسلے میں ان میں سے جو شخص سب سے زیادہ مشہور ہے وہ نسطوری مترجم بولس الفارسی (Paul The Persian) ہے جس نے منطق پر ایک رسالہ لکھ کر خسرو انوشروان پیش کیا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا ایک آرٹیکل نویس سریانی ادب کے ضمن میں لکھتا ہے

بولس الفارسی نے جو خسرو انوشروان کا درباری تھا۔ منطق پر ایک رسالہ لکھ کر بادشاہ کے نام معنون کیا، اس رسالہ کو لانڈ نے لندن کے ایک مخطوطہ کی مدد سے اپنی کتاب انیکڈوٹا کی چوتھی جلد میں شائع کر دیا ہے۔

ظاہر ہے یہ علمی و ادبی تحریک ملک کے عام ثقافتی ذوق کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی خصوصاً جب کہ ایران کی ثقافتی اساس میں یونانی ثقافت نے قدیم الایام سے ایک اہم حصہ لیا تھا۔ تمام ملک میں مسیحیت پھیل چکی تھی اور وہ محض ایک مذہب ہی کا نام نہ تھی بلکہ ایک ثقافت کا نام بھی تھی، اس لئے ملک کی عام تثقیف میں نساطرہ کی مساعی کا اثر کرنا ضروری تھا۔ اس تاثیر کا نتیجہ خسرو انوشروان کی شخصیت تھی۔

خسرو انوشروان اور فلسفہ و حکمت کی سرپرستی خسرو انوشروان نہ صرف ساسانی عظمت، و عدل و انصاف

---

[۱] التراث الیونانی ص ۵۴۰۔

ہی کا مظہر ہے بلکہ اس کی ذات مین ایرانی ثقافت اپنی بلندترین شکل مین متشکل تھی، فیروز ۴۸۴ء مین بیاطلہ کی لڑائی مین مارا گیا اور بلاش اس کا جانشین ہوا جو ۴۸۸ء مین معزول کر دیا گیا اور فیروز کا بیٹا قباد تخت نشین ہوا جس نے ۵۳۱ء مین وفات پائی۔ اس کے مرنے پر خسرو انوشروان سریر آرائے سلطنت ہوا اور کم و بیش چالیس سال حکومت کی۔ وہ خود یقیناً زرتشتی تھا، لیکن شاہان ساسانی مین وہ اس بات مین ممتاز ہے کہ مذہب کے معاملے مین نہایت فراخ دل تھا اور مختلف مذہبی اور فلسفیانہ عقائد کو بے تعصبی کی نظر سے دیکھتا تھا۔ رفاہ عام کے کامون مین اسے عیسائیون سے مدد لینے مین کوئی دریغ نہ تھا۔ اس کا ابتدائی عہد حکومت روم کے ساتھ جنگون مین گزرا جس کے نتیجے مین عیسائیون پر جور و تعدی کا ہونا ناگزیر تھا لیکن ۵۶۲ء مین ایران و روم کے درمیان صلح ہو گئی اور عیسائیون کو دوبارہ مذہبی آزادی ملی، خسرو ہی کے زمانہ مین تورات کا پہلوی زبان مین ترجمہ ہوا۔

اس بادشاہ کو فلسفیانہ خیالات سے ایسی دلچسپی تھی جو موبدون کے مذاق کے مطابق نہ تھی (اگرچہ ایران بعہد ساسانیان کے مصنف کو اس مین شک ہے) چنانچہ پولس الفارسی نے جس کا اوپر ذکر آچکا ہے) اس کے لئے ارسطو کی منطق کا جو ترجمہ کیا تھا اس مین خدا اور کائنات کے متعلق فلسفیانہ انداز مین بحث کی تھی،[۱] فلسفہ کے ساتھ نوشیروان کے شغف کی داستانین اسی زمانہ مین یونان اور روم مین شہرت پا گئی تھین اور جب ۵۲۹ء مین قیصر یوسطیانوس (Justinian) نے ایتھنز کے مدرسۂ فلسفہ کو بند کر دیا[۲] تو اس مدرسہ کے آخری اساتذہ دمسقیوس اور اس کے رفقاء نوشیروان ہی کے دربار مین پناہ لینے پر مجبور ہوئے، کیونکہ انھون نے سنا تھا اور انھین یقین تھا کہ افلاطون کی "جمہوریت" ایران کی استبدادی

---

[۱] ایران بعہد ساسانیان ص ۵۰۳، [۲] مختصر تاریخ فلسفہ یونان ص ۲۹۳۔

حکومت مین تشکیل ہو گئی ہے۔ اور ایک وطن دوست بادشاہ سب سے زیادہ نیکوکار اور بابرکت قوم پر حکومت کرتا ہے[1]

نوشیروان نے ان مہاجرین فلاسفہ کا بڑی فیاضی سے خیر مقدم کیا اور بڑی عزت و تکریم کے ساتھ اپنے یہان مہمان رکھا اور حکم دیا کہ وہ فلسفہ پر کتابین تصنیف کرین اور مصنفین یونان کی کتابون کا فارسی مین ترجمہ کرین۔ چنانچہ انھون نے منطق اور طب کی بعض کتابون کا ترجمہ بھی کیا جس سے لوگون مین فلسفہ کی رغبت بڑھی مگر ان مہاجرین کو وطن کی یاد نے جلد ہی ستانا شروع کیا اور انھون نے واپس جانے کی خواہش ظاہر کی تو نوشیروان نے قیصر سے صلحنامے مین انکی حفاظت کا وعدہ لیا اور

بر مطالبہ کیا کہ وہ سات عقلا جو دربار ایران مین پناہ گزین ہوئے تھے، انھین ان تعزیری قوانین سے مستثنیٰ کیا جائے جو یوسطیانوس نے اپنی کافر رعایا کے واسطے بنائے تھے۔ اور ایک صاحب اقتدار سفارش کرنے والا (نوشیروان) بڑی بیدار مغزی کے ساتھ اس شرط کی نگرانی کرتا تھا جو بالتصریح صلحنامے مین مذکور تھی[2]

نوشیروان نے بحث و مناظرے کے لئے ایک مجلس بھی قائم کی تھی جس سے اسکے بعض یونانی جلساء کو خیال ہونے لگا تھا کہ وہ افلاطون کا شاگرد ہے[3] مورخ اجتیاس (Agathias) کو جس کا پروفیسر براؤن نے حوالہ دیا ہے، بنداروتومی اس روایت کے باور کرنے سے مانع تھا۔ اس کے قول کے مطابق لوگ یہ سمجھتے تھے کہ خسرو انوشیروان کو ارسطو اور افلاطون کی تصانیف سے بڑا شغف ہے[4] مگر اسے (اگاتھیاس کو) سپاہیانہ خوبیون کے سوا نوشیروان کی اور کوئی بات

---

[1] سلطنت روم کا زوال وسقوط از گبن جلد چہارم ص ۲۶۶ [2] ایضاً جلد چہارم ص ۲۰۰ [3] ایضاً جلد ۳ ص ۲۹۰ [4] ایران بعہد ساسانیان ص ۵۰۷ حاشیہ نمبر (۱)

پسند نہ تھی۔ اس کے نزدیک یہ ممکن نہیں تھا کہ ایک بادشاہ جو سیاسی اور جنگی معاملات میں اس طرح مصروف ہو وہ یونانی اور رومی ادبیات کی لفظی اور لغوی خوبیوں کو بنظر غائر دیکھ سکے خصوصاً جبکہ اس کے پیش نظر یونانی کتابوں کے صرف وہ ترجمے ہوں جو بقول اس کے ایک اکھڑ اور بدرجۂ غایت ناشایستہ زبان میں کئے گئے ہوں[1]۔ یورنیس جو فلسفی اور طبیب تھا۔ اور قوم کا سریانی تھا۔ خسرو (انوشروان) کو فلسفہ پڑھاتا تھا۔ اگرچہ اگاتھیاس کے نزدیک وہ ایک جاہل او فریبی شخص تھا[2]، غرض اگاتھیاس کی اس روایت سے جسے وہ اپنے عناد اور پندار قومی کے باوجود نظر انداز نہ کرسکا اتنا ثابت ہوتا ہے کہ ارسطو اور افلاطون کی کتابوں کے پہلوی (اکھڑ اور بدرجۂ غایت ناشایستہ زبان) میں ترجمے خسرو کے زمانہ میں ہو چکے تھے۔ مشہور مورخ فلسفہ ڈاکٹر ڈی ولف بھی لکھتا ہے:-

> فارس میں خسرو انوشروان کے مہمان نواز دربار نے یونانی فلسفہ کے آخری علمبرداروں دمسقیوس سریانی، سنبلیقدس اور دیگر نو فلاطونیوں کو ان کے ایتھنز سے جلا وطن کئے جانے پر خوش آمدید کہا۔ ایرانی دربار میں ان پناہگزین فلاسفہ کی آمد سے نصیبین اور جندی سابور کے مدارس میں ایک فلسفیانہ تحریک کا افتتاح ہوا۔ خسرو کے دربار میں یورنیس (Uranius) نے ارسطو اور افلاطون کی مصنفات کا فارسی (پہلوی) میں ترجمہ کیا[3]"

اس طرح خسرو انوشروان کی علم دوستی سے ایران میں یونانیت کا احیا ہوا، ہمیں اجتناب اس (Agathias) کی اس روایت سے انکار نہیں ہے کہ ایک بادشاہ جو سیاسی اور جنگی معاملات میں اس طرح مصروف ہو، یونانی اور رومی ادبیات کی لفظی اور معنوی خوبیوں

---

[1] ایران بعہد ساسانیاں ص ۴۷۰، ۵ حاشیہ نمبر ۱ [2] ایضاً [3] تاریخ فلسفہ در قرون وسطی ص ۲۲۵ - ۲۲۶

کس طرح بنظر غائر دیکھ سکتا ہے۔ مگر بقول گبن۔

"خسرو انوشیروان کا علم نمائشی اور سطحی تھا لیکن جو مثال اس نے قائم کی اس سے ایک ذہین اور طباع قوم کا جذبۂ تلاش و تجسس بیدار ہوگیا، اور علم و حکمت کی روشنی مملکت ایران کے طول و عرض مین پھیل گئی" [۱]

یہ ایک مختصر داستان ہے یونانی فلسفہ بالخصوص افلاطون و ارسطو کی تصانیف سے پہلوی ادب مین از دیاد ثروت کی۔ اب تک علم و تعلیم کے امین و محافظ موبد لوگ سمجھے جاتے تھے جن کے یہان علم و حکمت صرف مذہبی تعلیمات کا نام تھا مگر خسرو انوشروان کی علم دوستی اور حریت فکر کی پالیسی نے عیسائیون کے مدارس (نصیبین اور الرہا) کے انداز پر جندی سابور مین ایک مدرسہ قائم کیا۔ چنانچہ گبن کہتا ہے

"جندی سابور مین جو دار السلطنت کے مضافات مین ہے علوم طبعیات کا ایک بیت الحکمت (اکیڈیمی) قائم کیا گیا جو بتدریج شاعری، فلسفہ اور خطابت کا ایک مدرسہ بنگیا" [۲]

طبقہ کتاب رو بیران (اور فلسفہ و منطق) مدرسہ جندی سابور اور اس کے مروجہ نصاب فلسفہ و حکمت سے جو طبقہ مستفید ہوا وہ کتاب یا دبیران (بہیران) کا تھا۔ موبد یا علماء مذہب تو اس قسم کی تعلیمات کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے لیکن طبقہ کتاب کو اپنے پیشہ کے مقتضیات سے عہدہ برآ ہونے کیلئے خطابت کے ساتھ ساتھ مروجہ علوم حکمت سے واقفیت بہم پہونچانا ضروری تھا۔ چنانچہ نظامی عروضی سمرقندی کہتا ہے :-

"پیش ازین درمیان ملوک عصر و جبابرۂ روزگار پیشین چون پیشدادیان و کیانیان واکاسرہ و خلفاء رسمی بودہ است کہ مفاخرت و مبارزت بعدل و فضل کردندے و ہر رسولے کہ فرستادندے از حکم و رموز و لغز و مسائل با او ہمراہ کردندے و درین حالت پادشاہ

---

[۱] سلطنت روم کا زوال و سقوط جلد چہارم ص ۳۶۱ [۲] ایضاً جلد چہارم

محتاج شدے بارباب عقل وتمیز واصحاب رائے وتدبیر....... پس ازیں مقدمات نتیجہ آں ہمی آید کہ دبیرعاقل ہمین جمالے است از تجمل پادشاہ وہمین رفعتے است از ترفع پادشاہی۔"[1]

ان علوم وحکمت میں سے منطق کے ساتھ شناسائی خاص طور سے "صنعت دبیری" کے لیے ناگزیر تھی، نظامی عروضی آگے چل کر لکھتا ہے۔

دبیری صناعتے است مشتمل بر قیاسات خطابی وبلاغی منتفع در مخاطباتے کہ درمیان مردم است... پس دبیر باید کہ کریم الاصل شریف العرض دقیق النظر عمیق الفکر ثاقب الرائے باشد واز ادب وثمرات آں قسم اکبر وحظ اوفر نصیب ورسیدہ باشد واز قیاسات منطقی بعید وبیگانہ نباشد"[2]

اس طرح یونانی منطق وفلسفہ کو ایران کے کتاب (دبیران) میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی اور چونکہ پہلوی زبان کا مروجہ رسم الخط یونانی علوم فلسفہ ومنطق کے نقل وترجمہ کے باب میں قاصر تھا۔ اس لئے ضرورت نے ایک نیا رسم الخط "گشتگ" صرف ان ہی علوم کی کتابت کے لئے وضع کرایا۔ چنانچہ یاقوت، حمزہ اصفہانی کے حوالے سے شہر "ریشہر" کے ذکر میں کہتا ہے:۔

قال حمزة هو مختصر من ريوارد شير وهي ناحية من كورة ارجان كان ينزل بها في الفرس كتبة دفتران وهم كتاب الجستق وهي الكتابة التي كان يكتب بها كتب الطب والنجوم والفلسفة[3]	حمزہ کا کہنا ہے وہ ریواردشیر کا مختصر ہے یہ ضلع ارجان میں ایک چھوٹی سی بستی تھی جہاں ساسانیوں کے زمانہ میں کشتہ وفتران کاتبوں کی ایک جماعت رہتی تھی جو ایک مخصوص رسم الخط گشتگ میں لکھا کرتے تھے، گشتگ ایک رسم الخط تھا جس میں

اسی طرح ابن الندیم "الکلام علی قلم الفارسی" کے زیر عنوان لکھتا ہے،

وكتابة اخرى لهم يقال لها نيم كستج وهي ثمانية وعشرون حرفا	اور اہل ایران کا ایک دوسرا رسم الخط بھی تھا جسے نیم گشتگ کہا جاتا ہے وہ اٹھائیس حرفوں پر تھا، اس

[1] چہار مقالہ نظامی عروضی سمرقندی ص ۲۳ [2] ایضاً ص ۲۵ [3] معجم البلدان جلد چہارم ص ۲۴۹

یکتب بھا الطب والفلسفۃ[1] — رسم الخط میں طب اور فلسفہ لکھا جاتا تھا

نیم گشتگ کے علاوہ ایک اور رسم الخط "راس سہریہ" بھی منطق و فلسفہ کی کتابت کے لیے مستعمل تھا، ابن الندیم آگے چل کر لکھتا ہے:

ولھم کتابۃ اخری یقال لھا راس سھریہ یکتب بھا المنطق والفلسفۃ وھی اربعۃ وعشرون حرفا وفیھا نقط ولم تقع الینا[2]	اور ان میں ایک اور رسم الخط بھی مستعمل ہے جسے راس سہریہ کہا جاتا ہے، اسی رسم الخط میں منطق اور فلسفہ کی کتابیں لکھی جاتی ہیں جو چوبیس حروف پر مشتمل ہے اور اس میں نقطے بھی ہوتے ہیں یہ رسم الخط ہم تک نہیں پہنچا

ظاہر ہے ایک چھوڑ دو دو رسم الخط کا علوم و فلسفہ و منطق کی کتابوں کے لیے مخصوص ہونا دو ایک کتابوں کے لیے تو نہیں ہو سکتا، یقیناً ایران میں بالخصوص نوشیروان کی علمی سرپرستی کے بعد منطق و فلسفہ کا عام رواج تھا اور یہ کسی طرح فرض نہیں کیا جاسکتا کہ یہ منطق و فلسفہ ایران کی دیسی پیداوار تھا، کیونکہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ایران کے مقامی علوم زردشتی مذہبیات میں محدود تھے، اور قرائن اس بات کے مقتضی ہیں کہ انوشروان کی علم دوستی اور اس سے پہلے نسطوری مبلغین کے تبلیغی مساعی نے ارسطاطالیسی منطق و فلسفہ کو پہلوی زبان میں منتقل کر دیا تھا۔ بےشک نساطرہ کی علمی زبان سریانی تھی مگر وہ سریانی کے عقیدت مند نہیں تھے بلکہ تبلیغی ضرورتوں کی وجہ سے انھوں نے یونانی سے سریانی میں تراجم کئے تھے، جب تک ان کی تبلیغی مساعی سریانی بولنے والے خطوں تک محدود رہیں، مگر جب ان کا دائرۂ عمل بڑھا اور ایران کے عوام و خواص میں جن کی زبان پہلوی تھی، انھیں مسیحی تعلیمات پھیلانے کا موقع ملا تو انھوں نے پہلوی زبان میں یہ تراجم کئے، اس طرح بکثرت یونانی فلسفہ اور ارسطاطالیسی منطق کی کتابیں پہلوی زبان میں ترجمہ ہوئیں، منطق و فلسفہ کے ان ہی

---

[1] الفہرست لابن الندیم ص ۲۰ [2] ایضاً ص ۲۱

پہلوی تراجم کو پڑھ کر عباسی دور کا طبقۂ کتاب منطق و فلسفہ میں کتابیں تصنیف کیا کرتا تھا مثلاً منصور بن طلحہ بن طاہر، سعید بن ہارون، ابوالقاسم عیسیٰ بن علی، قدامہ بن جعفر وغیرہ جن کی فلسفہ دانی کا تذکرہ پہلی قسط میں آچکا ہے، ان کے علاوہ متعدد کتاب منطق و فلسفہ سے واقف تھے مثلاً ابو سعید القطربلی صاحب کتاب المنطق[1]، یزدجرد بن مہندار الکسروی صاحب کتاب الدلائل علی التوحید من کلام الفلاسفہ[2]، ابو عون احمد بن المنجم الکاتب صاحب کتاب التوحید و تاویل الفلاسفہ[3]

غرض علوم فلسفیہ کے عربی ترجمے کے ابتدائی دور میں ان علوم کی کتابیں پہلوی تراجم سے عربی میں منتقل کی گئیں۔ ان مترجمین میں گل سرسبد عبداللہ بن المقفع ہے، اس نے منطق کے ارسطاطالیسی فنون کو پہلوی ترجمے سے عربی میں ترجمہ کیا۔ اس باب میں غالباً ابن الندیم سے زیادہ قابل اعتماد شہادت نہیں مل سکتی اور وہ اس کی تصریح کرتا ہے۔

وقد كان الفرس نقلت في القديم شيئاً من كتب المنطق والطب الى اللغة الفارسية فنقل ذالك الى العربي عبد الله بن المقفع وغيره	اور ایرانیوں نے قدیم زمانہ میں منطق اور طب کی بعض کتابوں کا فارسی (پہلوی) زبان میں ترجمہ کیا تھا، ان مترجمہ کتابوں کو عبداللہ بن المقفع وغیرہ نے عربی میں ترجمہ کیا،

ان تفصیلات و توضیحات کے بعد اس باب میں کوئی شک نہیں رہتا کہ ابن المقفع نے ارسطو کی کتب منطقیہ ثلاثہ کا عربی ترجمہ ان کے پہلوی ترجمے سے کیا تھا،

(باقی)

---

[1] الفہرست ص ۱۸۰ [2] ایضاً ص ۱۸۵ [3] معجم الادباء ج اول ص ۲۱۱ [4] الفہرست لابن الندیم

مولانا خرم علی بلہوری اور انکی علمی خدمات کا تفصیلی جائزہ

از مولانا محمد عبد الحلیم صاحب چشتی، فاضل دیوبند

(۲)

(۲) تحفۃ الاخیار ترجمہ مشارق الانوار :- یہ امام حسن صغانی لاہوری المتوفی ۶۵۰ھ کی سب سے مشہور کتاب مشارق الانوار کا اردو ترجمہ اور شرح ہے، جو ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء میں تکمیل کو پہنچا تھا، ہندوستان اور پاکستان میں اردو زبان کے حدیث کے تراجم میں[1] اسی کتاب تحفۃ الاخیار

---

[1] متاخرین علماء میں مشارق الانوار کا ترجمہ میر قدرت اللہ قاسم مولف مجموعہ نغز کے استاد محمدی عرف میاں صاحب (جو اپنے نام سے زیادہ اپنے عرف اور تخلص بسمل سے مشہور ہیں) نے بھی کیا تھا، لیکن ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ فارسی میں ہوگا، جیسا کہ اس دور میں عام رواج تھا، ورنہ میر قدرت اللہ قاسم اس امر کی صراحت ضرور کرتے کہ موصوف کا ترجمہ اردو، ہندی یا ریختہ میں تھا جس کا کہیں ذکر نہیں، ورنہ اولیت کا شرف اسی ترجمہ کو حاصل ہوتا، میر قدرت اللہ قاسم (مجموعۂ نغز طبع پنجاب یونیورسٹی ص ۱۰۴ و یادگار شعرا ترجمہ فہرست اسپرنگر طبع الہ آباد، ص ۳۸) میں لکھتے ہیں:

"مولوی محمدی صاحب ملقب بہ میاں صاحب عفی اللہ عنہ، حضرت ایشان حبرے بودند، محقق و فاضلے بودند مدقق، از علوم عربیہ بہرۂ وافی داشتند و از فنون شرعیہ نصیبے کافی ....

باقی ......

کو اولیت کا شرف حاصل ہے، یہ کتاب سب سے پہلے ۱۲۵۲ھ میں یعنی سنہ تالیف کے تین سال بعد مطبع محمدی میں محمد حسین کے اہتمام سے چھپی تھی، اور ایسی خوبصورت چھپی تھی کہ اس زمانہ میں پندرہ روپے اس کی قیمت تھی۔[۱]

ہندوستان میں اس سے پہلے نہ اردو میں کوئی کتاب چھپی تھی اور نہ عوام میں حدیث کا کچھ چرچا تھا، موصوف نے سب سے پہلے مسلمانوں کو تعلیمات نبوی سے باخبر کرنے کیلئے اس کتاب کا ترجمہ کیا جو بے حد مقبول ہوا، مولانا خرم علیؒ نے آغاز کتاب میں حدیث کی اہمیت اور ہندوستان میں اس سے بے اعتنائی کو بیان کیا ہے، اور ترجمہ کے لیے اس کتاب کے انتخاب کی وجہ یہ لکھی ہے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۴۰۵) ... ہمیشہ درس شرح وقایہ و ہدایہ و مشکوٰۃ شریف و صحیح بخاری وغیرہ صحاح می دادند ...... از یاران خاص حضرت قدوۃ السالکین مولانا فخر الدین قدس سرہ العزیز اند و چند کتب مستطاب چوں ترجمۂ مشارق الانوار و حبل المتین کہ متنے است بے متین در اخبار سید المرسلین در دوے احادیث متمسکہ حنفیہ رضوان اللہ علیہم اجمعین است تالیف یافتہ"

مشارق الانوار کے ترجمہ تحفۃ الاخیار کے بعد مولانا محمد احسن نانوتویؒ نے مشارق الانوار کا اردو میں ترجمہ کیا تھا لیکن نہ وہ چھپا اور نہ اس کے مخطوط کا کچھ پتہ چل سکا، بلکہ اس کا تذکرہ بھی صرف ایک ہی جگہ ضمناً نظر سے گزرا ہے، محمد عبد الباقی سہسوانی، حیوۃ العلماء (طبع نولکشور لکھنؤ ۱۹۱۲ء ص ۱۱۰) میں حافظ سید غلام جیلانی کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

"موصوف نے درسیہ معقول و منقول حاصل کیے مولوی ہدایت علی تلمیذ مولانا فضل حق خیرآبادی سے منطق و فلسفہ وغیرہ پڑھے، اور مولانا محمد احسن نانوتوی مترجم درمختار، و مشارق الانوار سے دینیات کی تکمیل فرمائی"

[۱] تحفۃ الاخیار مع فہرست تبصرۃ الابصار مطبع نظامی ۱۲۹۰ھ) کا سرورق۔

"حمد و نعت کے بعد دریافت کیا چاہیے کہ علم حدیث اشرف العلوم ہے اس واسطے کہ اشرف الناس کا کلام ہے مثل مشہور ہے کہ کلام الملوک ملوک الکلام اور سب علوم دینی اس کے محتاج ہیں، علم تفسیر بدون حدیث کے معتبر نہیں اور علم عقائد اور علم فقہ اور علم سلوک اور علم تاریخ بدون اس کے کچھ سند نہیں لیکن باوجود اس کے ہندوستان میں اس علم شریف کا چرچا نہیں، عوام کا تو کیا ذکر ہے، اکثر علما کو خبر نہیں، اس واسطے نہایت مناسب معلوم ہوا کہ کسی حدیث کی کتاب کا ترجمہ عوام فہم اردو زبان میں کیجئے، سو سب کتابوں سے مشارق الانوار حسن صغانی کی بہت پسند آئی، اس واسطے کہ مختصر کتاب ہے، اور اس کی احادیث کی صحت پر اتفاق ہے، کوئی اس کی ایسی حدیث نہیں جو غیر معتبر ہو، بخلاف مشکوٰۃ کے کہ اس میں ہر جنس کی روایت ہے، صحیح بھی اور ضعیف بھی، بارے الحمد للہ کہ بارہ سو انچاس ۱۲۴۹ ہجری میں حسب دلخواہ ترجمہ تمام ہوا، اور "تحفۃ الاخیار ترجمہ مشارق الانوار" اس کا نام مقرر کیا، حق تعالیٰ اپنے کرم سے اس کتاب کو مقبول کرے، اور اہل اسلام کو فائدہ عام بخشے اور بھول چوک کو معاف فرمائے" آمین[1]

اس کے بعد کتاب کا مقدمہ ہے جس میں احادیث کے اقسام اور ان کی تعریف ہے، اس کے بعد امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ کے حالات اور کمالات کا تذکرہ ہے، اور پھر حسن صغانی کے حالات اور تالیفات کا ذکر ہے، پھر اپنے ترجمہ کی بابت کچھ ضروری باتیں لکھی ہیں، اصل کتاب کے آغاز سے پہلے حدیث کی اہمیت پر نہایت بصیرت افروز نظم ہے، پھر اصل کتاب کا مع متن ترجمہ ہے، اس کے بعد فوائد کے تحت حدیث کا پورا واقعہ اور اہم امور کی وضاحت ہے، فوائد اگرچہ مختصر ہیں، لیکن بڑے کام کے ہیں، موصوف نے کتاب کی خصوصیت اور ترجمہ کی اہمیت کو ان الفاظ میں

---

[1] تحفۃ الاخیار طبع نولکشور کانپور ۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۴ء ص ۲

بیان کیا ہے،

"معلوم کیا چاہیے کہ اس کتاب کے ترجمہ میں چند امور کی رعایت کی ہے، اول یہ کہ مصنف نے اختصار کے واسطے احادیث کے اسناد یعنی راویوں کے نام کو حذف کیا، فقط صحابی کا نام جو اس حدیث کا اول راوی ہے، مذکور کیا، اس طرح ہر حدیث میں اول کتاب کا اشارہ کیا، پھر صحابی کا نام لیا، پھر حدیث کو بیان کیا، اور اختصار کے واسطے ہر حدیث پر قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں کہا، لیکن مترجم نے ہر حدیث کے ترجمہ میں کہدیا ہے کہ حضرت نے یوں فرمایا اور کتاب کا نام ہر حدیث میں پہلے دیا ہے، تاکہ عوام کو شبہ نہ پڑے، دوسرے یہ کہ حدیث کا ترجمہ تحت لفظ ترجمہ نہیں کیا، اس واسطے کہ عرب کا محاورہ ہند کے محاورے سے اکثر مطابق نہیں، بلکہ محاورہ مقدم رکھا ہے، مرادی مطلب جابجا لکھا، اور باوجود اس کے حتی المقدور تحت لفظ ترجمے کی بھی رعایت کی ہے، تیسرے یہ کہ اصل غرض اس سے یہ ہے کہ اہل اسلام کو فائدہ عام ہو، یہانتک کہ حرف شناس عوام بھی محروم نہ رہیں، اس واسطے نہایت مشکل مسائل نہیں لکھے، چوتھے یہ کہ اس کتاب کے خطبے کا ترجمہ نہیں کیا، عوام کو اس سے کچھ فائدہ نہ تھا............ مصنفؒ نے کمال اختصار سے ہر جگہ قصہ حدیث کا نہیں بیان کیا کہ حضرت نے یہ حدیث کس وقت کس تقریب سے فرمائی تو اس کا مطلب بخوبی نہیں معلوم ہوتا، اس واسطے حدیث کے ترجمہ کے بعد فائدہ میں اس کا پورا قصہ لکھ دیا، اور جہاں مطلب مجمل اور مشکل تھا اس کو مفصل کر دیا، اور چاروں اماموں کے مذہب جابجا مناسب مقاموں میں بے تعصب لکھے، شیعہ اور اہل بدعت کے شبہات جابجا مجملاً دفع کیے، غرض کہ بحمد اللہ یہ کتاب اہل اسلام کے واسطے عجیب تحفہ ہے، اکثر مطالب دینی کو شامل ہے، جس کے دریافت سے جاہل

عالم بنے اور عالم تازہ لطف اٹھائے۔ حضرت مولانا عبد القادر دہلویؒ کی ہندی تفسیر اور یہ کتاب طالب خدا کے واسطے کافی ہیں۔ دیندار کے حق میں یہ دونوں کتابیں گویا دو آنکھیں ہیں جن سے دو جہاں کا انجام نظر پڑے یا دو پر ہیں جن سے عرش تک اڑ سکے۔"

اس کے بعد حدیث کی اہمیت پر ایک مختصر سی نظم ہے، جو نہایت دلچسپ اور بہت دل پسند ہے، ہم بھی اس کے کچھ اشعار یہاں نقل کرتے ہیں جو ناظرین کی پرانی یاد تازہ کریں گے۔

کیا تجھ سے کہوں حدیث کیا ہے　　　　دردانۂ درجِ مصطفیٰؐ ہے
صوفی عالم حکیم دینی　　　　کرتے رہے اس کی خوشہ چینی
بابا کے یہاں سے کون لایا　　　　جس نے پایا یہیں سے پایا
یہ شاہراہ محمدی ہے　　　　گنجینۂ راز احمدی ہے
ہوتے ہوئے مصطفیٰؐ کی گفتار　　　　مت دیکھ کسی کا قول و کردار
جب اصل ملے تو نقل کیا ہے　　　　یاں وہم و خطا کا دخل کیا ہے
اب زیادہ تو مجھ سے کر نہ کل کل　　　　خورشید کے آگے کیا ہے مشعل
ناحق تجھے اور کچھ ہوس ہے　　　　قرآن و حدیث تجھ کو بس ہے
حق ہو گا حدیث خواں سے خرم　　　　ارشادِ رسولؐ فخرِ عالم
تھا علم حدیث سخت مشکل　　　　اور ہند کے لوگ اس سے غافل
چاہا کہ رہیں نہ یہ بھی محروم　　　　ہوا ترجمہ اس سبب سے مرقوم
مقبول ہو یہ کتاب یارب　　　　مشتاق ہوں اسکے اہل دیں سب[۱]

ترجمہ اور فوائد کی زبان اگرچہ سادہ اور عام فہم ہے لیکن طرز بیان اور انداز ترتیب میں قدامت ہے،

---

۱ تحفۃ الاخیار، ص ۲

ترجمہ اور شرح کا نمونہ درج ذیل ہے۔

م سمرۃ بن جندب والمغيرة	مسلم میں روایت ہے، سمرہ بن جندبؓ اور مغیرہ
بن شعبة من حدث عنى بحديث	ابن شعبہؓ سے کہ حضرتؐ نے فرمایا کہ جو میری طرف سے
وهو يرى انه كذب فهو احد	روایت کرے اور وہ جانتا ہو کہ وہ جھوٹی
الكاذبين	حدیث ہے تو وہ دو جھوٹوں میں سے ایک جھوٹا ہے،

ف، دو جھوٹے یعنی مسیلمہ کذاب اور مختار یا اسود عنسی جنھوں نے پیغمبری کا دعویٰ کیا تھا، یا یہ مطلب کہ ایک جھوٹا وہ جس ناپاک نے حضرت پر جھوٹ باندھا، دوسرا جھوٹا یہ کہ اس جھوٹی حدیث کو روایت کرتا ہے، جان بوجھ کے اکثر لوگ جو علم حدیث سے ناواقف ہیں، واہی تباہی حدیثیں نقل کیا کرتے ہیں، جن کی کچھ اصل نہیں، مسلمان کو لازم ہے کہ حدیث میں بہت احتیاط کیا کرے، ہر ایک کتاب کی حدیث کو سچا نہ جانے جو حدیث کی معتبر کتابوں میں ہو اس کو مانے، جیسے کہ یہ کتاب مشارق الانوار ہے کہ سب علمائے اہل سنت اس کو بہت صحیح جانتے ہیں[1]۔"

جب موصوف نے مشارق الانوار کا ترجمہ اور شرح مکمل کر لی تو پھر اس کے حسن قبول کے لیے ایک نہایت پر درد نظم لکھی ہے، جو پڑھنے کے قابل ہے، اس کے چند شعر درج ذیل ہیں،

شکر کر انجام کو پہنچی کتاب	علم احادیث کی لب لباب
جو کہ مطالب تھے بہ اوج ذکا	ترجمہ سے آئے اتر ارض تک
یعنی کے اردو کی پہن کر قبا	شاہد تازی ہوا جلوہ نما
دوستو اب اس کا ادا حق کرو	خلق کو سمجھاؤ خود اسکو پڑھو

---

[1] مشارق الانوار ترتیب فقہی والا ایڈیشن، مرتبہ راقم السطور، نور محمد اصح المطابع کارخانہ تجارت کتب کراچی ص ۱

یا رب ان اوراق کو مقبول کر — ہند کو اس فیض سے کر بہرہ ور
خرم افسردہ کو پر ورد کر — الفت دنیا سے اُسے سرد کر
تیری ہی دھن روح کو ہر دم رہے — تیرے غم عشق میں خرّم رہے
یا رب اس عاجز کی دعا کر قبول — خاتمہ با لخیر بحق رسول

یہاں یہ بتا دینا بھی فائدہ سے خالی نہیں کہ "تحفۃ الاخیار" میں احادیث پر جو عام فہم اور مفید فوائد لکھے ہیں، وہ ان ہی متداول کتابوں کے مرہون منت ہیں، آپ کا یہی بڑا کمال ہے کہ جو موتی ان متداول کتابوں میں جگہ جگہ بکھرے پڑے تھے، ان کو ایک ایک کرکے چنا اور نہایت سلیقہ سے ان کو ایک لڑی میں پرو دیا، وہ متداول کتابیں یہ ہیں:

(۱) احیاء علوم الدین، از امام غزالی (۲) استفتائے حرمت نان پاؤ، از عبد العلی بحر العلوم (۳) جامع الاصول از علامہ ابی السعادات ابن الاثیر الجزری (۴) رسالہ شق القمر، از شاہ رفیع الدین دہلوی (۵) شرح البخاری، از جلال الدین عبد الرحمٰن السیوطی (۶) شرح سفر السعادت، از شیخ عبد الحق محدث دہلوی (۷) شرح المشارق، از علامہ گاذرونی (۸) شرح معانی الآثار، از امام ابو جعفر الطحاوی (۹) الشفا، از قاضی عیاض، (۱۰) عینی شرح الہدایہ، از بدر الدین عینی (۱۱) قوت القلوب، از ابو طالب مکی، (۱۲) کیمیائے سعادت، از امام غزالی۔

ان کتابوں میں سب سے زیادہ فائدہ موصوف نے علامہ گاذرونی کی شرح المشارق اور علامہ ابی السعادات کی شہرۂ آفاق کتاب جامع الاصول سے اٹھایا ہے، اور ان ہی دونوں کتابوں کی مدد سے حدیثوں کا پورا پورا ترجمہ فوائد میں نقل کر دیا ہے، اور پڑھنے والے کے اس طرح ذہن نشین کرا دیا ہے کہ وہ اس کو پوری طرح قبول ہی نہیں کرتا بلکہ یاد بھی

کر لیتا ہے،

بعض مقامات پر علامہ ابو السادات یا شارح گازرونی نے کسی حدیث کے متعلق جس پر (ق) کی علامت بنی ہوئی تھی یعنی یہ حدیث صحیحین میں مروی ہے، کسی حدیث پر خ کی علامت تھی، کسی پر م کی یعنی یہ حدیث بخاری کی ہے، یہ حدیث مسلم کی ہے، اس کے بارے میں یہ لکھا کہ یہ حدیث مسلم کی ہے، بخاری کی نہیں، یا بخاری کی ہے مسلم کی نہیں، گو ان بزرگوں کا کہنا تحقیق ہی پر مبنی تھا، مگر مولانا نے خود بھی اس کو صحیحین میں تلاش کیا، اور اگر وہ حدیث نہ مل سکی تو بلا تکلف لکھ دیا ہے کہ یہ حدیث مجھے نہیں ملی، چنانچہ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

اکثر مشارق کی حدیثوں میں اس حدیث پر قاف کی علامت ہے یعنی بخاری اور مسلم دونوں میں یہ حدیث بالاتفاق ہے، حالانکہ یہ صاف خطا ہے، اس واسطے کہ صاحب جامع الاصول اور شارح گازرونی نے لکھا ہے کہ حدیث صرف مسلم میں ہے، بخاری میں نہیں، اور اس عاجز نے بھی صحیح بخاری میں دیکھا، زید بن خالدؓ سے اُس میں اس مضمون کی حدیث نہیں پائی، معلوم ہوا کہ کاتب کی غلطی ہے[1]۔

حدیث کی بہت سی کتابوں کے ترجمے شائع ہوئے، لیکن جو قبولیت مشارق الانوار کے ترجمہ تحفۃ الاخیار کو ہوئی، وہ کسی اور کو نہیں، چنانچہ یہ ترجمہ ابتک کم و بیش بیش مرتبہ چھپ کر شائع ہو چکا ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے،

(۱) تحفۃ الاخیار سب سے پہلے ۱۲۵۲ھ / ۱۸۳۶ء میں یعنی سنہ تالیف ۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۳ء کے ٹھیک تین سال بعد مطبع محمدی لکھنؤ میں محمد حسین کے اہتمام سے نہایت دیدہ زیب چھپی تھی، اس زمانہ میں اس کی قیمت پندرہ روپے تھی، پھر بھی لوگوں کی طلب باقی رہی، محمد عبد الرحمٰن بن حاجی

---

[1] تحفۃ الاخیار طبع نولکشور ص ۸۱۲

محمد روشن خاں (صاحب مطبع نظامی کانپور) کا بیان ہے۔

"پہلے یہ کتاب ہدایت نصاب ۱۲۵۵ھ میں باہتمام حاجی محمد حسین مرحوم کے ایسی خوب چھپی کہ فی جلد پندرہ روپے کو بکی"[1]

(۲) ۱۲۶۳ھ میں عبد الملک بن محمد صادق نے مطبع محمدی بمبئی میں چھاپ کر شائع کی، اس کی تقطیع خورد اور صفحات ۱۴۴ ہیں، آخر میں صحتنامہ ہے اور خاتمۃ الکتاب پر یہ عبارت ہے:

"الحمد للہ کہ کتاب مستطاب تحفۃ الاخیار ترجمہ مشارق الانوار جو تالیف کی ہوئی واقف دقائق خفی وجلی مولوی خرم علی صاحب دامت فیوضہ کی ہے، تاریخ بست وہفتم شہر رمضان المبارک ۱۲۶۳ ہجریہ مقدسہ کو جزیرۂ معمورۂ بمبئی میں عاصی عبد الملک بن مولوی محمد صادق مرحوم نے مطبع محمدی میں حلہ اختتام کا پہنایا"[2]

عبد الملک نے یہ کتاب بمبئی میں تین مرتبہ طبع کرائی تھی، چنانچہ ان کا بیان ہے:

"لکھنؤ میں تو صاحب فیض زمان...... نواب ذو الفقار علی خاں بہادر دام اقبالہ نے چھپوا کر مستحقوں کو للّٰہ تقسیم کیا تھا، لیکن کتاب مذکور پھر نایاب ہوگئی لہذا عاجز نے جناب ناخدا محمد علی صاحب بن ناخدا محمد حسین روگھے کی تائید اور اعانت سے تیسری مرتبہ معمورۂ بمبئی کے مطبع محمدی میں حلہ طبع پہنایا"۔

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۵۵ھ میں جو نسخے حاجی محمد حسین نے چھپوائے تھے، جب وہ سب فروخت ہوگئے اور نادار لوگ نہ خرید سکے تو نواب ذو الفقار علیؒ نے جو مولانا خرم علیؒ کے قدر شناسوں اور عقیدتمندوں میں تھے، اس کو چھپوا کر مستحقوں میں مفت تقسیم کرایا۔

[1] تحفۃ الاخیار مع بصرۃ الابصار، مطبع نظامی کانپور ۱۲۹۱ھ سرورق [2] تحفۃ الاخیار، مطبع محمدی بمبئی ۱۲۶۳ھ، یہ نسخہ کتب خانہ خاص انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی میں ہماری نظر سے گزرا ہے، لیکن یہ نسخہ آخر سے ناقص ہے، چنانچہ بعد کی عبارت ہم نے اپنے ایک دوست کے نسخہ سے نقل کی ہے۔

(۳) ۱۲۶۶ھ/۱۸۵۰ء میں محمد روشن خاں کے بڑے بھائی محمد مصطفیٰ خاں المتوفی ۱۲۶۹ھ نے اپنے مطبع مصطفائی کانپور سے متوسط تقطیع پر دو جلدوں میں چھاپی اور سات روپے قیمت رکھی، اس کے خاتمہ پر یہ عبارت ہے،

"کتاب مستطاب تحفۃ الاخیار ترجمہ مشارق الانوار بہ تصحیح بسیار و اہتمام فروان مقدار در مطبع مصطفائی بندہ امید وار مغفرت ایزد منان محمد مصطفیٰ خاں خلف حاجی محمد روشن خاں مرحوم واقع دار السرور کانپور محلہ ٹپکاپور بتاریخ پانزدہم شہر رمضان المبارک ۱۲۶۶ھ نور بخش طبع گردید دو ظلمت آباد جہاں آفتاب عالمتاب درخشید"[۱]

(۴) ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۲ء میں پھر مطبع مصطفائی سے دو جلدوں میں چھپ کر شائع ہوئی، پہلی جلد ۴۱۲ صفحات اور دوسری جلد ۴۰۵ صفحات پر مشتمل ہے،[۲]

(۵) ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء میں مشکوٰۃ المصابیح کے ترجمہ کے حاشیہ پر مطبع محمدی مدراس سے چھپی،[۳]

(۶) ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ء مطبع مخدومی بمبئی سے چھپکر شائع ہوئی،[۴]

(۷) ۱۳۸۲ھ/۱۸۶۶ء میں محمد عبد الرحمٰن خاں نے اپنے مطبع نظامی کانپور سے بڑے سائز پر چھاپی جس کے آخر میں فہرست فوائد اور صحت نامہ دونوں موجود ہیں، یہ نسخہ چار روپئے فی جلد بکا اور ہاتھوں ہاتھ نکل گیا،[۵]

---

[۱] یہ نسخہ کتب خانہ خاص انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی میں ہماری نظر سے گزرا ہے [۲] یہ نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور میں ہماری نظر سے گزرا ہے [۳] یہ نسخہ انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی کی پنجاہ سالہ جوبلی پر کتابوں کی نمایش ہماری نظر سے گزرا ہے، اور اب یہ نسخہ خیر پور پبلک لائبریری میں محفوظ ہے [۴] یہ نسخہ سعیدیہ لائبریری ٹونک میں ہے [۵] مطبع نظامی کانپور ۱۲۹۱ھ کا سرورق ۲، یہ نسخہ کتب خانہ خاص انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی میں ہماری نظر سے گزرا ہے،

(۸) ۱۲۸۶ھ / ۱۸۶۹ء میں یہ چھپی ہے۔

(۹) ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء میں مطبع حیدری سے چھپ کر شائع ہوئی۔ اس کی تقطیع متوسط اور ۷۴ صفحات ہیں۔ ابتدا میں آٹھ صفحوں کی فہرست مضامین بھی ملحق ہے۔

(۱۰) ۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۴ء میں مطبع نظامی کانپور سے بڑے سائز پر چھپی، یہ نسخہ ۴۳۵ صفحات پر مشتمل ہے، اس نسخہ کے ساتھ ابتدا میں فہرست تبصرۃ الابصار بھی چھپی ہے۔[۱]

(۱۱) ۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۴ء میں مطبع نولکشور کانپور سے چھپی، سائز کلاں اور صفحات ۴۱۵ ہیں۔[۲]

(۱۲) ۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۲ء میں محمد تیغ بہادر کے زیر اہتمام مطبع انوار محمدی لکھنؤ سے کلاں سائز پر چھپی اور ۴۹۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس نسخہ کی ابتدا میں نہ فہرست ابواب ہے، اور نہ زوائد کی فہرست فارسی میں ہے۔

(۱۳) ۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۹ء میں مطبع نولکشور سے پھر چھپی۔[۳]

(۱۴) ۱۳۲۱ھ / ۱۹۰۳ء میں مطبع فخر المطابع لکھنؤ سے کلاں سائز پر چھپی، یہ مع فہرست ۴۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

(۱۵) ۱۳۳۸ھ / ۱۹۲۰ء میں مطبع نولکشور سے کلاں سائز پر چھپی اور ۴۳۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ نور محمد اصح المطابع کارخانہ تجارت کتب کراچی نے متوسط التقطیع کے [illegible] صفحات پر شائع کی ہے۔

(۳) **رسالہ جہادیہ**: مولانا کی ۷۵ اشعار کی اردو میں ایک رزمیہ نظم ہے، پہلے ہی شعر میں فرماتے ہیں،

۱۔ نظامی کانپور ۱۲۹۱ھ کا مطبوعہ یہ نسخہ کتب خانہ خاص انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی میں ہماری نظر سے گذرا ہے۔

۲۔ تحفۃ الاخیار کا یہ نسخہ میرے والد منشی عبدالرحیم خان خورجوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تھا، مشارق الانوار ترتیب فقہی کے زمانہ میں شروع سے آخر تک بس یہی ایک نسخہ میرے پیش نظر رہا ہے اور آج بھی یہ نسخہ میرے پاس ہے۔

۳۔ فہرست سبحان اللہ اورینٹل لائبریری، مطبوعہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۳۵۱ھ، ج ۲ ص ۴۹

بعد تحمید خدا ، نعت رسول اکرم یہ رسالہ ہے جہادیہ کو لکھتا ہے قلم

اس میں پہلے جہاد کی تعریف اور اس کے فضائل بیان کیے ہیں ، اور اس میں شرکت کی دعوت دی ہے ، پھر اپنے زمانہ کے نام نہاد مولویوں کو جو جہاد سے گریزاں تھے ، لتاڑا ہے ؛ اس کے بعد فقہا ، علما ، اور صوفیا سے درخواست کی ہے کہ یہ کام تمھارے کرنے کا ہے ، اٹھو اور جہاد میں شرکت کرو ، اس نظم میں اگرچہ چنداں شعریت نہیں ہے ، مگر نظم نہایت موثر اور بڑی ہمت آفریں ہے ، اس نے سوتوں کو جگایا اور مردہ دلوں کو گرمایا ہے ، اس نظم نے سید صاحبؒ کی تحریک میں وہی کام کیا جو آگ پر تیل کرتا ہے ،

جہاد کے زمانہ میں اس کا بڑا چرچا تھا ، اور ہر طرف یہی نظم پڑھی جاتی تھی ، ہنٹر (Hunter) ہندوستانی مسلمانوں (The Indian Musalmans) میں لکھتا ہے ،

" اور ان کا سب سے ہر دلعزیز گیت (نظم) جس میں مذہبی جہاد ، اسلامی کی روح کار فرما تھی ، یہ باغی اور مجاہدین ، ہماری سرحدی چھاؤنیوں سے صبح وشام پریڈ کرتے اور اسی گیت اور نظم کو اک آواز ہو کر بڑے زور سے گاتے اور پڑھتے جاتے تھے ، اور ان رنگ روٹوں (نو آموز مجاہدوں) کی جماعتیں جو ہمارے علاقہ کے شمالی حصہ سے گزرتیں ، وہ اس نظم کے بندوں کو برطانوی شاہراہوں سے پڑھتے ہوئے گزرتی تھیں "[1]

یہ نظم بنگال تک کے مجاہدین اپنی روانگی کے وقت بڑے جوش و خروش سے پڑھتے تھے ، چنانچہ مولانا محمد اکرم خاں اپنے " خطبۂ صدارت " میں لکھتے ہیں :۔

" میں اس موقعہ پر رسالہ جہادیہ سے ایک شعر نقل کرتا ہوں ۔۔۔۔۔۔۔

یہ شعر میں نے اپنی ہفتاد سالہ نانی کی زبان سے سنا تھا ،

---

[1] " ہندوستانی مسلمانوں " بار سوم طبع جدید کلکتہ ۱۹۴۵ء ، ص ۵۹

واسطے دین کے لڑنا نہ پئے طمع بلاد — اہل اسلام اسے شرع میں کہتے ہیں جہاد

یہ مجاہدین، بنگال کے مختلف گوشے سے جوق در جوق میری سابق بستی حکیم پور میں جمع ہوتے تھے، اور وہاں سے رجزیہ اشعار پڑھتے ہوئے راج محل اور بھاگلپور کی راہ سے عظیم آباد اور پھر وہاں سے سرحد روانہ ہو جاتے تھے۔[1]

یہ نظم سید صاحبؒ کی موجودگی میں بھی متعدد بار پڑھی گئی، اور آپ نے بڑے شوق سے اس کو سنا، چنانچہ جس وقت آپ نے تورو سے پشاور کا قصد فرمایا، اس وقت یہ نظم پڑھی جا رہی تھی، اس موضوع پر اور بزرگوں نے بھی نظمیں اور مثنویاں کہیں، مگر جو قبولیت اس نظم کو حاصل ہوئی، وہ کسی اور کو نہیں ہوئی،

یہ رسالہ غدر سے پیشتر مولانا شیخ مسیح الزماں المتوفی ۱۲۹۵ھ نے اپنے مطبع مسیحائی کانپور سے قصہ اصحاب کہف کے ساتھ شائع کیا تھا، برطانوی حکومت نے بعد میں اسکو باغیانہ قرار دیکر اس کی طباعت ممنوع قرار دیدی،[2] مگر اس کے باوجود یہ نظم لوگوں کے حافظوں میں برابر محفوظ رہی، پھر مجاہدین چمرقند نے ۱۹۳۶ء میں چھاپ کر شائع کی اور مولانا غلام رسول مہر نے اپنی کتاب "سید احمد شہید" میں اس کو نقل کیا ہے، تاہم اس کے کچھ اشعار ہدیہ ناظرین ہیں،

بعد تحمید خدا و نعت رسول اکرمؐ	یہ رسالہ ہے جہادیہ کہ لکھتا ہے قلم
واسطے دین کے لڑنا نہ پئے طمع بلاد	اہل اسلام اسے شرع میں کہتے ہیں جہاد
ہے جو قرآن واحادیث میں خوبی جہاد	ہم بیان کرتے ہیں تھوڑا سا سو کر لو یاد

---

[1] خطبۂ صدارت شعبۂ تاریخ اسلام پاکستان ہسٹری کانفرنس اجلاس چہارم مطبوعہ کراچی ۱۹۵۴ء۔ [2] "ہنٹر" نے اپنی کتاب "ہندوستانی مسلمان" (ص ۹۰) میں اس کے بیشتر اشعار کا ترجمہ بھی کر دیا ہے لیکن آپ کا نام کرم علی (Karam Ali) کانپوری لکھا ہے، جو صحیح نہیں، آپ کا نام خرم علی ہے،

"جماعت مجاہدین" (ص ۲۹۰) میں تردد کا اظہار کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں،

"ایک جہادیہ کسی صاحب نے فارسی میں بھی نظم کر دیا تھا، اس میں ناظم کا نام یا تخلص حسن بتایا گیا ہے، بعض اصحاب کے نزدیک یہ جہادیہ بھی مولوی خرم علی کا ہے، لیکن انھوں نے حسن تخلص کبھی استعمال نہ کیا، ممکن ہے یہ جہادیہ اس بزرگ نے مرتب کیا ہو جس نے ایک قصیدہ سفر حج سے مراجعت کے موقع پر پیش کیا تھا، اس کے منتخب اشعار "سید احمد شہید" میں درج ہو چکے ہیں،

ہمارا خیال ہے کہ یہ مثنوی مولانا اولاد حسن قنوجی کی ہے، جو سید احمد شہید کے خلفاء میں سے تھے، اور فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے، ان ہی کا نام اور تخلص حسن تھا، چنانچہ آپ کے نامور فرزند نواب صدیق حسن خاں قنوجی اتحاف النبلاء ص ۲۳۷ میں آپ کے متعلق لکھتے ہیں:

"نام خود در اوائل تصانیف و مکاتیب بر طریقہ نسب حسن می نوشتند؛ ولادت حسن"

یہی وجہ ہے کہ بیشتر اہل قلم نے آپ کا نام [illegible] ہی حسن لکھا ہے، اور انھوں نے اولاد حسن اور حسن قنوجی کو دو جداگانہ شخصیتیں سمجھا ہے،

سید اولاد حسن قنوجی نے مولانا خرم علی کی پیروی کی [illegible] میں [illegible] ایک نظم [illegible] جو ہو بہو مولانا کا [illegible] ہے، اگر تخلص کو بدل دیا جائے تو تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے، چنانچہ نصیحۃ المسلمین کے سال بھر بعد سید اولاد حسن قنوجی نے "ہدایۃ المومنین" لکھی جس میں نصیحۃ المسلمین ہی کا انداز اختیار کیا ہے، اور اس کا اعتراف بھی کیا ہے کہ ہم نے نصیحۃ المسلمین دیکھی، اس میں چونکہ تعزیے وغیرہ کی قباحت کو تفصیل سے نہیں بیان کیا گیا، اس لیے ہم نے ہدایت المومنین لکھی اور جس طرح "نصیحۃ المسلمین" کا خاتمہ نظم پر ہے،

اسی طرح اس کا خاتمہ بھی نظم پر ہے، مضمون بھی واحد ہے، اور مقطع بھی دونوں کا یکساں ہے، صرف بحر اور قافیہ کا فرق ہے۔ دونوں کے مقطعے درج ذیل ہیں،

مولانا سید اولاد حسن قنوجی	مولانا خرم علی بلہوری
حسن خاموش ہو اتنا بہت ہے	تو اپنے حال میں کچھ سوچ خرم
جسے چاہے خدا دیوے سجھائی	زباں اب بند کر واللہ اعلم

چونکہ دونوں بزرگوں کے پیش نظر محض شاعری نہ تھی، بلکہ حقایق کو دلنشین اور سادہ الفاظ میں اس غرض سے نظم کرنا تھا کہ اشعار آسانی سے یاد بھی رہ سکیں، اور ان کے ذریعہ جہاد کی حقیقت اور اس کا مقصد بھی ذہن نشین ہو جائے، اس لیے ان دونوں کتابوں کے مضامین میں تنوع نہ پیدا ہو سکا اور بعض لوگوں کو اشتباہ ہو گیا اور انھوں نے اختلاف تخلص کے باوجود اس کا انتساب مولانا خرم علی بلہوری کی طرف کیا جو بداہتہً غلط ہے،

رسالہ جہادیہ پر غور کیجئے، اس میں بھی مشابہت کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کا مضمون ایک مقصد اور جذبہ بھی ایک ہی تھا، پھر مولانا خرم علی کا جہادیہ پہلے سے مشہور ہو چکا تھا، اس کے مضامین مولانا اولاد حسن قنوجی کے ذہن میں تھے، چنانچہ انھوں نے جو مثنوی لکھی اس میں اس رسالہ جہادیہ کا چربہ اتارا، یہی وجہ ہے کہ فارسی مثنوی اردو مثنوی سے دگنی ہو گئی، اردو کی مثنوی ۷۵ شعروں پر مشتمل ہے اور فارسی مثنوی میں ۱۸۱ شعر ہیں،

اسی جہاد کے موضوع پر حکیم مومن خان مومن المتوفی ۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۱ء نے فارسی اور اردو میں متعدد مثنویاں لکھیں جو ان کے فارسی اور اردو دیوانوں میں پائی جاتی ہیں، اور مولانا غلام رسول مہر نے بھی "جماعت مجاہدین" میں ان کو نقل کر دیا ہے، مگر جو شہرت اور مقبولیت مولانا خرم علی بلہوری کے "رسالہ جہادیہ" کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کو نہیں ہو سکی

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

(باقی)

اقبال کا پیغام عمل

از جناب مرزا صفدر علی ایم اے، لکچرار ورنگل کالج جامعہ عثمانیہ

وجود انسانی لامحدود قوائے ذہنی و روحانی کا حامل ہے۔ اگر اس کی حقیقت تک پہنچیں تو جیلی کے نظرین وہ بجائے خود ایک کائنات ہے۔ پر اسرار خدائی قوتین اس کو تسخیر عالم رنگ و بو کے لئے عطا کی ہین۔ اور اس کے آگے سر تسلیم خم کرنا کائنات کے مقدر مین لکھدیا گیا ہے۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ	(کیا تم لوگون نے اس پر غور نہین کیا کہ جو کچھ
مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ	آسمانون مین ہے اور جو کچھ زمینون مین ہے
وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً	خدا ہی نے یقیناً تمہارا تابع کر دیا ہے اور تم پر
وَّبَاطِنَةً (۱۹ : ۳۱)	اپنی ظاہری و باطنی نعمتین پوری کر دین۔
وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ	اسی نے رات کو اور دن کو اور سورج اور
وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمُ	چاند کو تمہارا تابع بنا دیا ہے اور ستارے بھی
مُسَخَّرٰتٌ بِاَمْرِهٖ اِنَّ فِيْ	اسی کے حکم سے تمہارے زمانبردار ہین۔ کچھ
ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ	شک ہی نہین کہ اس مین سمجھدار لوگون کے
يَّعْقِلُوْنَ۔	واسطے یقیناً قدرتِ خدا کی بہت سی نشانیان
(۱۶ - ۱۲)	ہین۔

اقبال کا خیال ہے کہ زمان و مکان کی یہ لامحدودیت انسان کے ہاتھون مسخر ہونے کا یقین

ں ہے اور انسان کا فرض ہے کہ وہ ایزدی اشاروں پر غور کر کے تسخیر کائنات کے طریقوں
ری طرح سمجھے، کائناتِ فطرت کے رموز کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے دیکھنا یہ ہے کہ انسان جو اس میں مقید ہے
کی کیا فطرت ہے۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو زندگی کی پست سطح پر چاروں طرف سے مخالف قوتوں میں
اتھ محسوس کرتا ہے، اقبال کہتے ہیں کہ انسان ایک مضطرب وجود ہے جو حصولِ نصب العین کے لیے
ن ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسری چیزوں کو طاقت کے حوالہ کر دیتا ہے۔ اپنے لئے ہر طرح کی اذیت
اکرنے کے درپے اور اظہارِ خودی کے نت نئے ذرائع کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے، اور اپنی
کمزوریوں کے باوجود کائناتِ فطرت پر فضیلت رکھتا ہے۔ دوسری لامحدود قوتیں جب اس کو
طرف راغب کرتی ہیں تو وہ اندرونی قوتوں سے کام لیکر انھیں اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیتا ہے،
ان سے استفادہ حاصل کرتا ہے۔ اگرچہ اس کا مقدر نازک اور تنِ نازک پھول کی پتی کی طرح
ہے پھر بھی کوئی دوسرا اس کے مقابلہ میں اس قدر طاقتور، پرعظمت اور خوبصورت نہیں ہے،
کا "انا" جو ہر لمحہ بلندی کی طرف گامزن اور ارتقاء کے منازل طے کرتا چلا جاتا ہے حیات کی بلند
نیت سے دوسری نوعیت کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اس کے مقسوم میں یہ ہے کہ کائنات کو اس کے حصول
مقصد میں مدد دے اور خود اپنے مقدر کی تعمیر کے ساتھ ساتھ کائنات کے مقدر کی تعمیر کرے۔ وہ
طرح کہ کبھی وہ اپنے آپ کو اس کی قوتوں کے مطابق اور کبھی انکو اپنے مقاصد کے مطابق ڈھالنے
کے لئے ساری توانائیاں صرف کرے۔ اس تعمیر و تغیر میں خدا اس کا معاون و مددگار بنجاتا ہے بشرطیکہ
ابتدا انسان کی جانب سے ہو لیکن اگر وہ اقدام نہ کرے، اور اپنے وجود کی اندرونی عظمت کو ترقی
دے، تو اس کی روح پتھر کی طرح جامد ہو جاتی ہے اور وہ جمادات کی سطح پر پہنچ جاتا ہے۔

وہ نائبِ حق ہے اور عالم پر حکمرانی کے لئے بھیجا گیا ہے۔ نزولِ آدم سے پہلے ہر ذرہ کائنات
اپنے مقصود کے لیے فضائے بسیط میں سرگرداں تھا۔ جونہی حیات ایک فاتح عنصر کی صورت میں

بیقرار تھی۔ روحِ ارضی اپنے محبوب سے ہم آغوشی کے لئے مضطرب تھی اور سازِ کائنات مضرابِ خودی کی تلاش میں گم تھا۔ کہ دفعۃً کسی نے صورِ اسرافیل پھونکا اور خوابیدہ ذروں کا بختِ خفتہ جاگ اٹھا۔ "یکایک دہرِ تیرہ بخت کی قسمت بدلتی ہے" اور آسمان کا شعلہ زمین کی گود میں گر گیا۔ سینۂ زمین سوئے ہوئے راگ جاگ اٹھے۔ سرودِ سرمدی چھڑ گیا۔ نغمۂ جانفزا میں کائنات مستی گم ہو کر رہ گئی اور بربطِ بزمِ امکان سے یہ دل افروز نوائیں بلند ہوئیں:-

کھول آنکھ زمین دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ — مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں — یہ گنبدِ افلاک، یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں — تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں — آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں — جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گِل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

لیکن کائنات کی جو قوتیں آدم کا استقبال کرنے اور ان کے قدم چومنے کے لئے آگے بڑھی تھیں وہ رفتہ رفتہ اس کی ترقی کی راہ میں حائل ہونے لگیں۔ ایسی حالت میں کیا آدم ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے؟ اقبال کہتے ہیں کہ مخالف قوتوں کا وجود ضروری ہے۔ ان سے نبرد آزمائی ہی میں نئی قوتیں اور صلاحیتیں ان کو زیر کرنے کیلئے ابھرتی ہیں، جو کشمکش کے بغیر ناممکن ہے۔ انہی کے بقول ذہنی کاوش جو ان مزاحمتوں پر غالب آنے کیلئے کیجاتی ہے وہ نہ صرف زندگی کو گرانقدر بناتی اور بصیرت کو چمکاتی ہے، بلکہ حیاتِ انسانی کے تجربات کے نازک اور پراسرار پہلوؤں تک ماہرانہ رسائی کیلئے تیار کرتی ہے۔ مادی اشیاء کے تسلسل تغیر سے ہمارا تخیلی ارتباط ہمیں غیر مادی اشیاء کے متعلق ذہنی خاکہ بنا سکتا ہے۔ حقیقت اپنی

خاص شکلوں میں ہستی ہے، اور انسان کی ذات جس کو مخالف ماحول میں زندگی گذارنا ہے، ظاہر کو نظر انداز نہیں کر سکتی،

تو اسے ذہنی و روحانی کے ذریعے تمام قوتوں پر تصرف حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جس سے نہ صرف علم بلکہ انسانی اقتدار مکمل ہوتا ہے ورنہ قواے مادی وجود انسانی پر حاوی ہو کر اس کو نیست و نابود کر دینگے، اس کے لئے ہر کوہ گران سے ٹکرانا ضروری ہے :-

بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر طلسم زمان و مکاں توڑ کر
خودی شیرِ مولیٰ جہاں اسکا صید زمیں اسکی صید آسماں اسکا صید
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود کہ خالی نہیں ہے ضمیر وجود
ہر اک منتظر تیرے یلغار کا تری شوخی فکر و کردار کا
تو ہے فاتح عالم خوب و زشت تجھے کیا بتاؤں تری سرنوشت

اس سلسلہ میں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان کو اپنے ارادے کے مطابق عمل کرنے کا پورا اختیار حاصل ہے یا اس کے ہاتھ مقدر کی زنجیروں میں اس طرح جکڑ دیئے گئے ہیں جن کا توڑنا اس کے بس کی بات نہیں۔ اقبال کہتے ہیں :-

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں نادان جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی

"اسلامی الٰہیات کی جدید تشکیل" (Reconstruction of Religious Thought in Islam) میں وہ تقدیر کے متعلق اس طرح بحث کرتے ہیں کہ[1]

زمانے کو جب ایک عضوی کل کی حیثیت سے دیکھا جائے تو قرآن کی زبان میں اس کو تقدیر کہتے ہیں .... تقدیر زمانے ہی کی ایک شکل ہے جب کہ اس کے امکانات کے ظہور سے قبل اس پر نظر ڈالی جائے۔ تقدیر وہ زمانہ ہے جو سلسلۂ اسباب کے پھندے سے

---

[1] روح اقبال،

آزاد ہو چکا ہے، فہم منطقی اس پر اپنے مخصوص اشکال عاید کر دیتی ہے۔ مختصراً یون کہہ سکتے ہین کہ تقدیر وہ زمانہ ہے جسے ہم محسوس کرتے ہین نہ کہ وہ جس کا ہم تفکر کرتے ہین یا جس کے متعلق حساب لگاتے ہین ۔۔۔۔۔۔ زمانے کو جب تقدیر خیال کیا جاتا ہے تو وہ ماہیتِ اشیا بن جاتا ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔ غرضکہ کسی شئے کی تقدیر نہ ٹلنے والی مقسوم نہین ہے، جو خارج سے جبریہ طور پر عاید کی گئی ہو بلکہ وہ خود شئے کی اندرونی رسائی اور اس کے قابلِ تحقق امکانات ہین جو اس کی فطرت مین پوشیدہ تھے۔ ان امکانات کا ظہور متواتر طور پر بلا کسی خارجی جبر کے عمل مین آتا ہے۔"

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اقبال کے نزدیک کسی شئے کا مقدر خارج سے متعین نہین کیا گیا ہے، کیونکہ اس صورت مین کائنات کو پابند کر دیتا ہے کہ وہ ایک بنے بنائے دائمی منصوبے یا ڈھنچے کو (جس مین ہر واقعہ فی نفسہ اپنے ایک معینہ مقام پر موجود ہے اور تاریخ کے مادی ارتقا کے دوران مین وقت معینہ پر منکشف ہوتا ہے) مادی شکل دیتی رہے۔ اس صورت مین کہ تقدیر ایک سخت خارجی جبر بن جاتی ہے جس سے نہ صرف انسان بلکہ خدا کی آزادی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اور اعمالِ انسانی کا بدلہ بے معنی ہو جاتا ہے اور نیک و بد کا سوال نہین پیدا ہوتا۔

صرف آزادی ہی خیر و شر کو پیدا کر سکتی ہے۔ اقبال کہتے ہین کہ وہ انسان جس کے افعال مشین کی طرح سراسر جبری ہین وہ خیر پیدا نہین کر سکتا۔ اس کی تخلیق کے لئے پہلی شرط آزادی اور دوسری شرط کسی شئے یا فعل یا حرکت کے متعلق صحیح اور مکمل علم ہے۔

قَدْ فَصَّلْنَا الْآيٰتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُوْنَ	جو لوگ علم رکھتے ہین ہم نے انکے لئے نشانیان تفصیل سے بیان کر دی ہین،
قَدْ فَصَّلْنَا الْآيٰتِ لِقَوْمٍ يَفْقَهُوْنَ (۶ : ۹۵)	ہم نے عارفون کیلئے نشانیان تفصیل سے بیان کر دی ہین۔

لیکن حصولِ علم کی ذمہ داری تمام تر انسان پر عاید ہوتی ہے۔ ہر انسان کو یہ علم براہ راست قدرت کی طرف سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ پیغمبروں، اماموں اور اوتار کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ	کسی آدمی کے لئے یہ ممکن نہیں کہ خدا اس سے
اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ	بات کرے مگر وحی کے ذریعے سے یا پردے
يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ	کے پیچھے سے یا کوئی رسول بھیج دے،
بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ	غرض وہ اپنے اختیار سے جو چاہتا ہے
(۴۲ : ۵۰)	پیغام بھیج دیتا ہے۔

پھر خیر کی تخلیق کے لئے صرف علم کافی نہیں بلکہ عمل پیہم اور حیات کے ماحول سے نبرد آزمائی بھی ضروری ہے، اس نبرد آزمائی میں دل میں چھپے ہوئے ابلیس سے بھی برسرپیکار رہنا پڑتا ہے۔

مرد مومن زندہ و باخود بجنگ　　بر خود افتد ہمچو بر آہو پلنگ

اس اندرونی ابلیس کے خاتمے، صفاتِ الٰہیہ کی تخلیق اور احکام الٰہی کی سختی سے پابندی سے انسانی خودی مکمل اور مستحکم ہوتی ہے۔ اور یقینِ محکم اور عشق و ایمان کی جہدِ مسلسل اس میں انقلاب پیدا کر دیتی ہے۔ اور اس انقلاب سے انسان کا مقدر خود بخود بدل جاتا ہے۔

تری خودی میں اگر انقلاب ہو جائے	عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے،
اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى	جو لوگ خود اپنی نفسی حالت میں تبدیلی
يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ	نہیں کرتے خدا ان کی حالت میں ہرگز تبدیلی
(۱۳ : ۱۲)	نہیں کرتا،

نفس کی تبدیلی سے مقدر بدلنے میں نہ صرف خدا معاون ہوتا ہے بلکہ تقدیر کو انسانی مرضی کے تابع کر دیتا ہے اور خود اس کے مطابق عمل کرتا ہے، اسی کو رضائے الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے ۔

اگر ایک تقدیر سے دل بھر جائے تو خدا سے دوسری تقدیر مانگی جا سکتی ہے کیونکہ تقدیر بدلنا اسکی قدرت میں ہے ۔

گر زیک تقدیر خون گردد جگر خواہ از حق حکم تقدیر دگر

تو اگر تقدیر نو خواہی رواست زانکہ تقدیرات حق لا انتہاست

حضرت یسوع مسیح کا ارشاد ہے "مانگو اور تم کو دیا جائیگا ۔ ڈھونڈو اور تم پاؤ گے، دروازہ کھٹکھٹاؤ اور کھل جائے گا ۔ جو نہیں مانگتا اس کو نہیں ملتا ۔ جو نہیں ڈھونڈتا وہ نہیں پاتا اور جو نہیں کھٹکھٹاتا اس کے لئے دروازہ نہیں کھلتا ۔"

اگر مسلسل مانگتے پر بھی نہیں ملتا تو بقول شکسپیر " ہم نادانی کی وجہ بعض وقت اپنے لئے نقصان رساں چیزیں مانگتے ہیں جو دانا قوتیں ہماری ہی بہتری کے لئے ہمیں دینے سے انکار کرتی ہیں'

دکھوں اور مصیبتوں سے انسان کا دل ٹوٹ جاتا ہے لیکن قرآن مجید کے مطابق سچی مردانگی سختیوں اور صعوبتوں میں صبر کرنے پر منحصر ہے ۔ ایسے لمحوں کے لئے خدا کہتا ہے' "مجھے پکارو میں جواب دونگا ۔ میں اس کی فریاد کا جواب دیتا ہوں جو مجھ سے فریاد کرتا ہے"۔

حادثات اور روح فرسا واقعات سے گھبرا کر انسان اکثر زندگی کو آلام اور کائنات کو ماتم کدہ سے تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "ہمارے شیریں نغمات بھی صرف غمگین تخیلات کی پیداوار ہیں"۔ بائرن کے نزدیک زندگی دروغ محض، گناہ عظیم اور زہر ہلاہل ہے اور آسمان بنی نوع انسان پر دبائیں، موت اور آلام شبنم کی طرح برساتا رہتا ہے چنانچہ کہتا ہے :-

جتنے لمحے تو نے خوشیاں دیکھی ہیں ان کو گن لے

ان دنوں کو بھی گن جن میں تو مصیبتوں سے بچا رہا

اور جان لے کہ تو جو کچھ بھی رہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس سے بہتر تھا کہ تو نہ رہتا! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"شوپنہار کے نزدیک تمام کشمکش، جد وجہد، رنج وغم، حادثات اور جرائم کی اصل وجہ خواہش زیست ہے۔ زندگی کی ہر چیز بتلاتی ہے کہ دنیوی خوشی محض فریب ہے۔ زندگی ہر چھوٹی بڑی چیز میں مسلسل دھوکہ دیتی ہے۔ اس کے وعدے وفا نہیں ہوتے، وہ جو کچھ دیتی ہے چھین لینے کے لئے دیتی ہے، انسان کی زندگی ایک ہزیمت پیہم ہے، تباہی و بربادی قدم قدم پر اس کو آنکھیں دکھاتی ہے۔ کوئی شئے اس قابل نہیں کہ اس کے حصول کے لئے جد وجہد کی جائے، تمام اچھی چیزیں صرف فریب نظر ہیں، وہ کہتا ہے کہ لوگ زندگی کو عطیہ کہتے ہیں لیکن اگر کوئی شخص پہلے سے اس کی حقیقت سے آگاہ ہو جائے تو اس عطیہ کو لینے سے انکار کر دے۔ اگر ہماری زندگی کے ہر لمحے کے متعلق بازپرس ہوگی تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ہم بھی یہ پوچھ سکیں کہ ہمیں خواب راحت سے جگا کر زندگی کا تاریک، بھیانک اور پرہول منظر کیوں دکھایا گیا۔ وہ حیات انسانی کو سزائے پیہم سمجھتا ہے اور لیبنز (Leibn iz) کے اس خیال کی کہ "یہ ممکن الوجود تمام دنیاؤں میں بہترین دنیا ہے۔ اس طرح تردید کرتا ہے کہ "یہ ممکن الوجود تمام دنیاؤں میں بدترین دنیا ہے"

شاید ایسے ہی تصورات کے پیش نظر تھراشین (Thracians) کے ہاں یہ رواج تھا کہ طفلِ نووارد کا استقبال گریہ وزاری اور نالہ و فریاد کے ساتھ کیا جاتا تھا اور اس کی آیندہ زندگی کے تمام مصائب گنائے جاتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں مرنے والوں کو اس خیال سے خوشی اور مسرت کے ساتھ دفن کیا جاتا تھا کہ اب وہ آلام حیات سے نجات پا گئے، اسی طرح میکسیکن طفل نووارد کو ان الفاظ سے خوش آمدید کہتے تھے کہ "میرے بچے تو برداشت کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے، اس لئے مصائب جھیل، برداشت کر اور خاموش رہ"، اسی جذبہ کے تحت جوناتھن سوفٹ (Jonathan Swift جیسا کہ

مرواسکاٹ کا بیان ہے وہ ابتدا ہی سے اپنی سالگرہ کے دن بجائے خوشی کے غم منایا کرتا تھا۔
زندگی کے آلام اور کشمکش حیات سے تنگ آکر غالب پکار اٹھتے ہیں۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

فانی موت کو پکارتے ہیں:

آ اب اے مرگِ ناگہانی آ سخت مضطر ہیں تیرے شیدائی
چارۂ دردِ زندگی تو ہے کر اگر ہو سکے مسیحائی
فانیِ نا امید کی امید تو اگر آ گئی تو بر آئی

یہ قنوطی اور یاس انگیز خیالات اسلامی تصورِ حیات کے خلاف ہیں، اس سے اقبال نے انکی
ت مخالفت کی ہے اور اسکے مقابل میں "اگر خواہی حیات اندر خطر زی" کی حیات بخش تعلیم دی ہے۔ وہ
ت سے بھی نہیں ڈرتے بلکہ مردِ مومن کی طرح موت کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتے ہیں،
رگی ان کے نزدیک پھولوں کی سیج۔ صدائے بربط و چنگ، نشۂ مے اور رقصِ بتانِ آذری نہیں
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں کا نام ہے

ور دستِ ضربتِ کاری کا ہے مقام میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ
نا دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جل ترنگ

مغربی مفکر آلیور لاج (Oliver Lodge) کہتا ہے کہ

"عزلت گزین خطرات سے گریزاں ہے۔ آگ روشن نہیں کرتا۔ ساحلِ دریا پر [خوف؟]
میں بھی نہیں اتار، پہاڑوں کی ہیبت سے تھراتا ہے۔ نقصان سے ہراساں رہتا ہے اور
افلاس میں زندگی بسر کرتا ہے۔ حالانکہ ہمارا مقصدِ حیات اپنے وجود کے اندرونی قوائے
لامحدود سے استفادہ کرنا اور حیات کی قوتِ نمو کا اندازہ کرنا ہے، اس لئے ہمارا فرض ہے
کہ ہم خود اپنی قوتوں اور کائنات کی تمام قوتوں پر تصرف حاصل کرکے ان کی رہنمائی اور

سرپرستی کرین؛ ایسے ہی خیالات ٹینیز، شاؔ برنارڈ شا، بالنگبروک اور پوپ نے بھی ظاہر کئے ہین

عرب جاہلی کے ایک بڑے شاعر امرؤالقیس کے بارے مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ اشعر الشعرا وقائدھم الی النار (وہ شاعرون کا سرتاج ہے لیکن جہنم کی راہ مین ان کا رہنما بھی ہے) اب سوال یہ ہے کہ امرؤالقیس کی شاعری مین وہ کونسی بات تھی جس کی بناپر حضور سرور کائنات صؐ نے یہ رائے ظاہر فرمائی امرؤالقیس کے دیوان پر جب ہم نظر ڈالتے ہین تو ہمین شرابِ رغوانی کے دور عشق و حسن کی دل آویز داستانون اس کے جانگداز جذبون، آندھیون سے اڑی ہوئی پرانی بستیون کے کھنڈرون کے مرثیے اور سنسان رتیلے ویرعون کے مناظر کی تصویرین نظر آتی ہین ...... یعنی امرؤالقیس اپنے سامعین کی قوتِ ارادی کو حرکت مین لانے کے بجائے ان کے تخیل پر جادو کرتا ہے، اور ان مین بجائے ہوشیاری کے بے خودی کی کیفیت پیدا کرتا ہے'

اسی طرح ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلۂ بنو عبس کے مشہور شاعر عنترہ کا ایک شعر جو حقیقت پر مشتمل تھا، سنکر فرمایا تھا، اس کے کہنے والے کو دیکھنے کو میرا دل چاہتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ انسانی زندگی کو شاندار بنائین اور اسکی آزمایشون اور سختیون کو مطبوع کر کے دکھائین .... خواجۂ دوجہان صلعم نے اس شعر کی جو اتنی قدر فرمائی اس سے اس صنعت کے ایک دوسرے بڑے اصول کی شرح ہوتی ہے کہ صنعت حیاتِ انسانی کے تابع ہے، اس پر فوقیت نہین رکھتی "۔

جرمنی کا مشہور رجائی فلسفی نٹشے قنوطیت کو بنی نوع انسان کے لئے زہر ہلاہل اور سم قاتل سمجھتا تھا۔ ایک نظم "شو پنہار و نیٹشے" مین اقبال نے دونون کا موازنہ اس طرح کیا ہے کہ ایک پرندہ چمن کی سیر کے لئے آشیانے سے اڑا اور کسی پھول کی ڈالی پر بیٹھا چہچہا رہا تھا کہ اتفاقاً ایک

لہ مضامین اقبال،

کانٹا اس کے تنِ نازک مین چبھ گیا۔ اس نے کہا چمنِ روزگار کی فطرت ہی بد ہے، وہ نہ صرف اپنے بلکہ دوسرون کے غم سے بھی تڑپ اٹھا اور کہنے لگا کہ اس سرزمین مین جس کی بنا ہی کج ہے ایسی صبح کہان ہے جس کی کوئی شام نہین۔ وہ درد بھرے سر مین نالہ و فریاد کر رہا تھا۔ اس کی فریاد سن کر ایک ہدہد نے اس کے جسم سے کانٹا نکالا اور کہنے لگا کہ ہر نقصان سے فائدہ حاصل کرو۔

در مان ز درد ساز اگر خستہ تن شوی   خوگر بہ خار شو کہ سراپا چمن شوی

نطشے آفت پر آفت اور ستم پر ستم سہنے کا پیغام دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اس قدر درد و غم برداشت کرو کہ بالآخر اسکا احساس باقی نہ رہے اور درد حد سے گزر کر دوا بن جائے جیسا کہ غالب نے کہا ہو

رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج   مشکلین اتنی پڑین مجھ پر کہ آسان ہو گئین

وہ کہتا ہے کہ انسان مسلسل سختیان برداشت کرتے کرتے ہیرے کی طرح سخت اور گرانقدر ہو جاتا ہے جس طرح ہیرا زمین کی تہون مین مسلسل رہنے سے سخت اور قیمتی ہو جاتا ہے اور کوئلہ انہی اجزا سے مرکب ہونے کے باوجود سختی نہ سہنے کی وجہ سے نرم اور حقیر رہتا ہے۔ وہ میدانِ جنگ کی موت کو سراہتا ہے اور کہتا ہے کہ اس صلح سے محبت کرو جس مین نئی جنگون کی تیاریان ہون اور وہ بھی مختصر ہو۔

نطشے کا خیال ہے کہ انسانی خودی اپنے ارتقاء کے دوران مین تین مراحل سے گزرتی ہے، پہلا مرحلہ شتری، دوسرا شیری اور تیسرا طفلی۔ مرحلۂ شتری کو وہ اس طرح سمجھاتا ہے کہ روحِ آدم بہت قوی ہے۔ وہ بھاری وزن برداشت کر سکتی ہے جو اس کو اٹھاتا ہے، اس مین تسلیم کی صفت ہے۔ وہ اونٹ کی طرح جھک جاتی ہے تاکہ اس پر پورا بوجھ لاد دیا جائے، ہمت سے سارا بوجھ اٹھا لیتی ہے اور اپنی طاقت پر خوش ہوتی ہے۔ وہ ہر تکلیف کو برداشت کرتی ہے۔ ہر آندھی سے ٹکر لیتی ہے اور حقیقت کی تلاش مین بھوک اور پیاس سہتی ہوئی بڑھتی چلی جاتی ہے، بیماری

ہین وہ تیمار وار نہین چاہتی اور اپنے ساتھ صرف ان لوگون کو رکھتی ہے جو بہرے ہون؛
فریاد نہ سن سکین۔ وہ ان بھوتون کے ہاتھ مین ہاتھ دیتی ہے جو اس کو ٹھکرا دیتے ہین۔ اس
اس مین قلب ماہیت ہوتی ہے۔ وہ شیر ہو جاتی ہے اور مرحلۂ شیری سے گزرتی ہے۔ ا
مین اس کا پہلا اقدام آزادی حاصل کرنا اور دوسرا اطراف واکناف کی دنیا پر حاکم ہو جا
تیسرے مرحلے مین وہ معصوم ہو جاتی ہے اور اس کے ہان خیر و شر کا تصور نہین رہتا۔
کو ایک معصوم کھیل سمجھتی ہے۔

اقبال نے نٹشے سے صرف مرحلۂ شتری لیا ہے اور بقیہ دو مرحلون کے وہ قائل نہیر
فنون لطیفہ مین بھی اقبال زندگی کی گھن گرج دیکھنا چاہتے ہین، چنانچہ کہتے ہین
سارے فنون لطیفہ کو زندگی اور خودی کے تابع سمجھتا ہون۔ انکا خیال ہے کہ[1]

"کسی قوم کی معنوی صحت اس روح کی نوعیت پر ہے جو اس کے اندر اس کے
شعرا اور صاحبان فن پیدا کرتے ہین۔ .... اس معنوی روح کی حیات
بخش قوت اور اس کی حامل شخصیت نوع انسانی کے لئے نہایت اہمیت رکھتی ہے
کسی اہل ہنر کا مائل بہ انحطاط ضمیر اور تصور ایک قوم کے لئے اٹیلا اور چنگیز کے لشکرون
سے زیادہ تباہ کن ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس کی تصویرین یا اس کے نغمے جذب و کشش کی
طاقت بھی رکھتے ہون .. .. وہ فن، وہ ہنر جس کا مطمح نظر اخلاق الٰہی کو
اپنے اندر جذب کرنا (تخلقوا باخلاق اللہ) ہے دراصل انسان کے
اندر ایک غیر محدود طلب (اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْن) پیدا کرتا ہے اور انجام کار
اسے زمین پر خلافت کا مستحق ٹھیراتا ہے۔"

---

[1] مضامین اقبال۔

وہ آرٹ کو زندگی کا خادم تصور کرتے ہیں۔ اس میں انسانی عظمت و برتری کا مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں اور قوم کے لئے کوئی نہ کوئی پیغام حیات ڈھونڈتے ہیں۔ ان کے نزدیک سچا آرٹ وہ ہے جو ایک اعلیٰ نصب العین پیش کرتا اور افراد و اقوام میں قوتِ عمل پیدا کر سکتا ہو۔ اس آرٹ کو جو یاسیت، فراریت یا عریانیت پر مبنی ہو وہ نہ صرف تخریبی بلکہ موت کا پیغام سمجھتے ہیں، آرٹ کو وہ تخلیق کہتے ہیں نہ کہ تقلید، خود اپنی شاعری کے نقادوں سے اس طرح شکایت کرتے ہیں

آشنائے من ز من بیگانہ رفت — از خمستانم تہی پیمانہ رفت
من شکوہِ خسروی او را دہم — تاجِ کسریٰ زیر پائے او نہم
او حدیثِ دلبری خواہد ز من — رنگ و آبِ شاعری خواہد ز من
کم نظر بیتابیٔ جانم ندید — آشکارم دید و پنہانم ندید

الفرقان گیلانی نمبر

علامہ گیلانی رحمہ اللہ علیہ وسعتِ نظر، وسعتِ علمی، جامعیت اور ذہانت میں اپنی مثال آپ تھے، ان کی ژرف نگاہی نے سرمایۂ علم و فن پر نکات و تحقیقات کے وہ گل کھلائے ہیں، جو سدا بہار ہیں، انھوں نے تنہا تحقیق و تصنیف کا اتنا کام کیا جتنا یورپ میں ادارے اور انجمن کرتی ہیں، غرض وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے، انکی وفات کے ٹھیک ایک سال کے بعد ان کی یادگار میں الفرقان کا گیلانی نمبر افاداتِ گیلانی کے نام سے جون میں پیش کیا جا رہا ہے جو الفرقان میں شائع شدہ علامہ مرحوم کے ان اہم علمی و تحقیقی مضامین پر مشتمل ہے جو مستقل کتابی شکل میں شائع نہیں ہوئے ہیں، ضخامت کم و بیش ۲۰۰ صفحات قیمت عہ علاوہ محصول ڈاک، ۸ر آنے، الفرقان کی خریداری قبول کرنے والے حضرات سے سالانہ چندہ پانچ روپیہ کے علاوہ اس نمبر کی کوئی قیمت نہیں لیجائیگی البتہ رجسٹری فیس ۶ر چندہ کے علاوہ لازمی طور پر آنے چاہییں، پاکستانی حضرات سکریٹری ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کے پتہ پر منی آرڈر کر کے رسید کیساتھ ہمیں اطلاع دیں۔ — ناظم رسالہ الفرقان لکھنؤ

آثارِ علمیہ

مکاتیب مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

بنام

شاہ معین الدین احمد ندوی

(۲۶)

بھوپال

برادر عزیز ادام اللہ توفیقکم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ، مصروفیتوں اور اضمحلال طبع کے سبب سے جواب اور کام میں تاخیر ہوتی ہے، اس لفافہ کے ساتھ مجلس انتظامیہ کے فیصلوں کا نتیجہ مرسل ہے، اسکو رجسٹر کارروائی میں چسپاں کرادیجئے،

(۲) ترمیم شدہ دستور العمل کی کاپیاں مرسل ہیں، ان کو بحفاظت مع آراے ارکان دفتر میں رکھوا دیجئے،

(۳) اس دستور العمل کی کاپی اسی تقطیع پر لکھوا کر جلد اس کے پانچ سو نسخے چھپنے کیلئے دیدیجئے، جس کاپی کے ٹائٹل پیج پر میں نے کچھ عبارت لکھی ہے۔ اسی کے مطابق ٹائٹل لکھوا دیجئے،

(۴) افغانستان والا مضمون جلد از جلد ٹائپ کرا کر سکریٹری ہسٹاریکل کانگریس الہ آباد یونیورسٹی ہسٹری ڈیپارٹمنٹ میں اس کے پروفیسر ڈاکٹر بشیشور پرشاد کے نام رجسٹرڈ بھجوا دیجئے

بے شبہ میں نے آپ کو غلط پتہ لکھدیا تھا جس کے باعث یہ صورت پیش آئی،

فہرست اغلاط سیرۃ عبد الباری صاحب کو دیدیجئے۔ والسلام

سید سلیمان، ۳۰ر اپریل ۱۹۴۷ء

(۲۷)

بھوپال

برادر عزیز زاد قدرکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ ڈاکٹر ناظر یار جنگ کا نام حیدرآباد سے نواب مہدی یار جنگ کی جگہ رکھدیجئے، اور نئے ارکان کے نام پروفیسر سید نواب علی کی تحریک اور میری تائید سے پرانے ارکان کے نام بھیجکر منظوری جلد سے جلد لیجئے، اس کی عبارت الگ لکھتا ہوں،

ابھی امین زبیری سے بہت کچھ امیدیں ہیں، ذکر شبلی انھوں نے شائع کر دی، میرے نام نہیں، بلکہ عاصم سلمہ کے پاس میرے مکان پر گویا میرے جانے کے لیے اس کا نسخہ ہدیۃً بھیجا ہے،

یہ انگریزی قواعد بالکل ابتدائی ہیں، اور اردو نسخہ اس کے بعد کا ہے، اب اس نسخہ کو انگریزی کرتا ہوں، مگر اس کی اجرت لگے گی، ترجمہ کی، ٹائپ کی، کاغذ کی، پھر اسکی چھپائی،

قواعد کی کاپی جلد چھاپنے کو دیدیجئے، ارکان وعہدہ داران کی فہرست ابھی چھوڑ دیجئے، اور مہربانی کرکے سب ارکان کے نام لکھکر میرے پاس بھیجدیجئے،

مسودہ افغانستان کا انگریزی ترجمہ اگر تھوڑا اردو ہی الہ آباد کے پتہ پر بھیجدیجئے، اور میرا نام لکھدیجئے، اور خط لکھدیجئے کہ مضمون جاتا ہے، رسید بھیجیں۔ والسلام

سید سلیمان، ۲ر مئی ۱۹۴۷ء

(۲۸)

بھوپال

برادر عزیز السلام علیکم ورحمۃ اللہ

جسٹرڈ خط ملا، ملا کی وڈ مسجد تک ایک مولوی صاحب کو لکھا گیا ہے، خدا کرے نتیجہ خیز ہو،

آپ کوئی دوسری سلسلہ جنبانی بھی کر سکیں تو کر لیں،

ماجد میاں اور ڈاکٹر محمود کی منظوری ڈاکٹر ناظر یار جنگ کے متعلق میرے پاس آئی ہے، برادرم اسلم پرسوں شام کو سہارنپور گئے، عزیزی سہیل کا خط بہت دنوں سے نہیں آیا، مذاکرہ رفقا کو سلام کہدیجئے،

وحید احمد صاحب سے کہدیجئے کہ وہ الضیاء سے جغرافیہ والے مضمون کی تکمیل کر لیں،

مولوی ابو الجلال صاحب اعلام القرآن کے نام سے ایک کتاب شروع کریں، اللہ تعالےٰ اور آدم سے لیکر یاجوج ماجوج تک سب اعلام قرآن جمع کریں، اور انکی لغوی و تاریخی تحقیق کریں، سارے انبیاء، ملائکہ، اصنام، کفار، صحابہ، مقامات، کتب، غرض سب اعلام آجائیں، پھر کبھی تفصیلی لکھوں گا، بہت مصروف رہتا ہوں،		والسلام

سید سلیمان، ۲۸ رمئی ۱۹۴۷ء

(۳۰)

بھوپال

برادرم		السلام علیکم

خط ملا، ارکان دار المصنفین میں سے کم از کم آپ نے تو میری آنکھوں کی خیریت دریافت کی، یہ وہی بیماری ہے، جو ایک دفعہ پہلے بھی دہلی میں ہوئی تھی، اور وہیں اس کا علاج ہوا تھا، ڈیڑھ ماہ ہو گئے، دیدہ کا زخم اب اچھے ہونے کے قریب ہے، مگر ابھی سرخی قائم ہے، گو اب چند روز سے کم ہوتی جا رہی ہے، لکھنے پڑھنے کا کام اب کچھ کچھ شروع کر دیا ہے، ہم لوگ تو آنکھوں ہی سے جیتے ہیں، الحمد للہ تعالیٰ،

وددو دسلمہٗ کی کامیابی سے خوشی ہوئی، اللہ تعالیٰ آپ کے لیے مبارک کرے، کیا اب ایم اے کا ارادہ ہے، گو اب آرٹ کسی کام کے قابل نہیں،

تاریخ سندھ پر آپ دیباچہ لکھکر مجھے بھیجدیں، اور کتاب کا ایک نسخہ بھی بھیجدیں، اور واپسی کے ٹکٹ بھی،

مولوی ابوالجلال صاحب نے کام شروع کر دیا ہوگا تفصیل لکھیے،

میری روانگی حج کی تاریخ آغاز اکتوبر ہے، تین ماہ کی رخصت کی درخواست دی ہے،

اکتوبر، نومبر، دسمبر، اس کے بعد اللہ تعالیٰ جانتا ہے کیا ہوگا،

کیا ریاست علی صاحب ابھی تک مکان سے واپس نہیں آئے،

مولوی عبد السلام آجکل کس عالم میں ہیں؟

یہاں برسات کا خوشگوار موسم شروع ہوگیا ہے، اکثر ہوا کے سرد جھونکے چلتے رہتے ہیں،

والدہ سلمان ابھی تک دیسنہ سے واپس نہیں آئی ہیں،

نیاز صاحب، بشیر صاحب، حکیم صاحب، ڈاکٹر صاحب کو سلام کہدیجئے، آجکل آپ کیا کام کر رہے ہیں،

والسلام

سید سلیمان ۱۰ جولائی ۴۷ء

۳۱

بھوپال

عزیز مکرم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

الحمد للہ خیریت ہے، آنکھوں کی تکلیف میں تخفیف ہے مگر ابھی باقی ہے اور علاج جاری ہے،

آجکل ہمارا سارا گھر مع خادموں کے تپ میں مبتلا ہے، یہاں تک کہ سید حسین مع اہل و عیال آئے تھے وہ بھی اس کے حملہ سے نہ بچ سکے، کسی کا ڈاکٹری اور کسی طبی علاج ہے، کسی کو افاقہ ہے کسی کو افاقہ ہو رہا ہے، کوئی نیا پڑ رہا ہے،

دیباچہ تاریخ سندھ مرسل ہے، لکھنے کو جی چاہتا تھا، مگر نہ ہو سکا، واپس ہے فرصت

لگا دیجئے، مفصل پھر لکھوں گا،

والسلام

سید سلیمان، ۱۱؍ رمضان ۱۳۶۶ھ
۵؍ اگست ۱۹۴۷ء

(۳۲)

بھوپال

برادرم عزیز وفقکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، آپ کا کارڈ ملا، رمضان کے سبب سے خط نہ لکھ سکا، نقوش سلیمانی کے لیے دار المصنفین تو کوئی انتظام نہ کر سکا، اس لیے آپ کی جیسی تجویز ہے مبارک علی صاحب ہی کو اس کے چھپوانے کا انتظام دیدیا جائے، آپ مبارک علی کا پتہ لکھ کر بھیجدیں،

شذرات کے صفحے بھیجتا ہوں، آپ بھی جو کچھ لکھیں اس میں خیال رکھیں کہ سختی نہ آنے پائے، گڑ سے مرے تو زہر کیوں دیجئے،

ہندوستانی پر ایک ناتمام مضمون اسلم صاحب کو دیکر آیا ہوں، اس کی پہلی سطر کے کچھ الفاظ ذرا بدل کر مضمون مکمل کرکے معارف میں دیدیجئے اور کچھ تمہید لکھ دیجئے،

پٹنہ میں سنا کہ ریاست صاحب بہار اسمبلی کی رکنیت کے لیے کوشاں ہیں، اور بہار سے کوئی اخبار نکالیں گے،

برادرم اسلم کو سلام کہہ دیجئے، خیریت ہے، ان کو بھی خط [illegible]

[illegible]

ایم اے کا ارادہ ہے، گو اب آرٹ [illegible]

مطبوعات جدیدہ

مضامین ڈار شائع کردہ "لیٹ پروفیسر ڈار پبلیکیشن کمیٹی" تقطیع متوسط ضخامت ۴۵۲ صفحات کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت تحریر نہیں، پتہ کرنٹ بک ہاؤس بازار لین رگھوناتھ دادجی اسٹریٹ ہارنبی روڈ بمبئی نمبر (۱)

پروفیسر ابراہیم ڈار مرحوم اس دور کے ان ممتاز اصحاب علم و قلم میں تھے، جن کا علمی مذاق بلند تھا، مگر افسوس ہے کہ موت نے ان کے جوہروں کو پوری طرح چمکنے کا موقع نہیں دیا تاہم انھوں نے جس قدر مضامین بھی لکھے وہ تحقیقی حیثیت سے بلند پایہ ہیں، ان کی یادگار کمیٹی نے ان کے مضامین کا یہ پہلا مجموعہ شائع کیا ہے، اس میں نو مضامین ہیں، (۱) جہاں آرا بیگم کی ایک غیر معروف تصنیف صاحبیہ (۲) دیوان خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ (۳) شیخ فرید الدین عطار کے حالات و تصانیف کے متعلق ہند و ایران کے علماء کی تحقیقات (۴) ہندوستان میں مغلوں سے قبل فارسی ادب شمس العلماء عبد الغنی کا تازہ علمی کارنامہ (۵) اقبال کی وطن دوستی (۶) حیات شبلی پر ایک نظر (۷) اقبال اور عربی شعراء (۸) اسپین کی اسلامی تاریخ کا ایک ورق اشبیلیہ کا نامور تاجدار المعتمد علی اللہ (۹) باقر علی ترمذی مرحوم، ان میں سے اکثر مضامین محققانہ اور مصنف مرحوم کے سنجیدہ علمی ذوق کے شاہد ہیں، دوسرے تیسرے اور چوتھے مضامین خاص طور سے زیادہ اہم ہیں، دوسرے مضمون میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ حضرت خواجہ رحمہ اللہ کی جانب جو دیوان منسوب ہے وہ ان کا نہیں ایک ایرانی [illegible] دوسرے مضمون میں [illegible]

یہ واضح کیا گیا ہے کہ خواجہ فرید الدین عطار کی جانب جو کتابیں منسوب ہیں ان میں کئی کتابیں جعلی عطاروں کی ہیں۔ تیسرے مضمون میں پروفیسر عبد الغنی کی کتاب "ہندوستان میں مغلوں سے پہلے کے فارسی ادب" پر پروفیسر شیرانی مرحوم کی تنقید اور پروفیسر عبد الغنی کے جواب کا جائزہ لیا گیا ہے، ان مضامین میں شیرانی مرحوم کی تحقیق کا رنگ نمایاں ہے، حیات شبلی کے جن پہلوؤں پر تنقید کی گئی ہے اگرچہ اس کے جواب میں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے مگر اب جبکہ مصنف اور ناقد دونوں اس دنیا سے گذر چکے ہیں، اس بحث کو بڑھانا مناسب نہیں ہے لیکن ناقد کا لب و لہجہ سنجیدہ ہے، باقی مضامین بھی مفید اور معیاری ذوق کے مطالعہ کے لائق ہیں، ہم کو توقع ہے کہ مصنف مرحوم کے دوسرے مضامین بھی کمیٹی شائع کرے گی۔

سانت رس المعروف بہ نغمات الاسرار

حصہ اول حضرت شاہ محمد کاظم قلندر، تقطیع بڑی ضخامت ۲۲۲ صفحات کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت صہ

پتہ کتب خانہ انوریہ کاکوری ضلع لکھنؤ۔

یہ کتاب سلسلہ قلندریہ کے مشہور بزرگ حضرت شاہ محمد کاظم قلندر قدس سرہٗ کاکوری کے عارفانہ ہندی کلام کا مجموعہ ہے، ہندی زبان جذبات عشق و محبت کے اظہار کے لئے بہت موزون ہے اور عوام بھی اس کو سمجھتے ہیں، اس لئے بعض قدیم صوفیائے کرام نے اس کو ارشاد و ہدایت کا ذریعہ بنایا اور اسمیں وہ شاعری بھی کرتے تھے حضرت شاہ محمد کاظم قلندر پر عشق و محبت کا بڑا غلبہ تھا اس لئے انھوں نے اسکے اظہار اور صوفیانہ معارف وحقایق کی تعبیر کے لئے ہندی زبان کو وسیلہ بنایا، چنانچہ سانت رس یا نغمات الاسرار کے نام سے ان کا ضخیم مجموعۂ کلام موجود ہے، یہ مجموعہ ٹھمری، دادرہ، کہردہ، نٹ راگ، گوری، دھناسری، بھاگ، ملار، کنڈرسور، برج سوہنی، دیس، سورٹھ اور جاجونتی وغیرہ مختلف راگ راگنیوں پر مشتمل ہے۔ جس سے ہندی زبان پر مصنف کی قدرت کے ساتھ ہندوستانی موسیقی میں بھی انکی مہارت کا

ہوتا ہے غالباً اس سے پہلے بھی یہ مجموعہ چھپ چکا ہے اب اسی خاندان کے ایک صاحب مذاق نوجوان تمنا حیدر صاحب نے اسکو مع اردو شرح کے شایع کیا ہے، اور مختلف عنوانوں کے ماتحت ہندی اشعار ح کی ہے، پورا کلام اخلاقی و روحانی حقائق، عارفانہ اسرار و حکم، اور حقیقی عشق و محبت کے جذبات ور ہے اس کا پورا لطف وہی لوگ اٹھا سکتے ہین جو اس بادہ کے لذت آشنا اور ہندی زبان سے بھی ہین گو اس کی زبان اتنی آسان ہے کہ اشعار کا بڑا حصہ آسانی سے سمجھ مین آجاتا ہے صرف کہین کہین الفاظ آئے ہین اگر یہی میٹھی اور رس بھری زبان آج بھی باقی رکھی جاتی تو خود بخود مقبول ہوتی اردو ہندی کا تصفیہ اتنا نہ بڑھتا مگر اس کو تو سنسکرت کے روڑون سے اتنا سنگلاخ کیا جا رہا ہے کہ ہر لفظ پر ٹھوکر کھائیے، یہ کتاب اس کا ثبوت ہے کہ ہندی زبان کی صحیح خدمت مسلمانون ہی نے ور ایک معمولی بولی کو شعر و ادب کی ایک مستقل اور میٹھی زبان بنا دیا کتاب کے شروع مین ت شاہ محمد کاظم قلندر کے مختصر حالات اور ان کے کلام پر تبصرہ ہے اور آخر مین مشکل ہندی کا فرہنگ اور حروف تہجی کے اعتبار سے اشعار کا انڈکس دیدیا گیا ہے جس سے اس کتاب کے دہ مین بڑی سہولت پیدا ہو گئی ہے جن لوگون کو اس قسم کے کلام کا ذوق ہو ان کو اس سے اندوز ہونا چاہیئے۔

گلہاے داغ

از ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۴ صفحات کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ پتہ مکتبۂ عارفین نمبر ۵ ۱۳۸ نیو مارکٹ ڈھاکہ

داغ اردو کے ان مظلوم شاعرون مین ہین جو ایک مبالغہ شہرت کی بنا پر ضرورت سے بدنام ہین اور سنجیدہ طبقہ عام طور سے ان کی شاعری کو بازاری سمجھتا ہے اس مین شبہ کہ انھون نے شباب کے جذبات و معاملات کی بڑی بے باکانہ مصوری کی ہے اور اس مین و ا جا د ہ اعتدال سے بہت آگے بڑھ گئے ہین، مگر اس مین ان کی تخصیص نہین، اس زمانہ مین

عام مذاق یہی تھا، پھر ان کی شاعری کو محض شبابیات کی تفسیر ہی تک محدود سمجھنا صحیح نہیں ہے، اس میں قلبی واردات، بلند خیالات اور مختلف قسم کے ستھرے جذبات و تاثرات کے نمونے بھی پائے جاتے ہیں، اور ان کے اس قسم کے بہت سے اشعار ایسے برجستہ اور ڈھلے ہوئے ہیں کہ ضرب المثل بن گئے ہیں ان کی شاعری کا یہ حصہ کسی حیثیت سے نظر انداز کرنے کے لائق نہیں ہے، لیکن داغ کی شہرت عام نے ان کی شاعری کے اس رخ کو بالکل چھپا دیا ہے، ڈاکٹر آفتاب احمد نے اس کتابچہ میں اس غلط شہرت کی تردید کی ہے اور داغ کی شاعری کے مختلف رخوں پر بحث کرکے اس کے ستھرے پہلوؤں کو دکھایا ہے، جس سے اس کی صحیح حیثیت واضح ہو جاتی ہے، اور داغ کے مختلف رنگ کے پسندیدہ اشعار کا انتخاب بھی دیا ہے، جو لوگ داغ کی صحیح حیثیت کو سمجھنا اور ان کے کلام سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں، ان کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے اس سے داغ کے متعلق بہت سی بدگمانیاں دور ہو جائیں گی۔

امین الصیغہ مترجمہ جناب مولوی ابو عبیدہ صاحب، تقطیع بڑی، ضخامت ۱۰۰ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت: ۱۲، پتہ حافظ عبید الرحمن صاحب مجید منزل، امیا منڈی، بنارس (۲) قاضی محمد مصطفیٰ مدرس دار العلوم مئو ناتھ بھنجن ضلع اعظم گڈھ (۳) کتب خانہ رحیمیہ دیو بند

علم الصیغہ صرف کی مشہور اور متداول درسی کتاب ہے، جو تمام عربی مدارس کے نصاب میں داخل ہے، یہ کتاب فارسی میں ہے، اور اب فارسی کا مذاق اٹھتا جاتا ہے، اس لئے لائق مترجم نے طلبہ کی سہولت کے لئے اردو میں اس کا سلیس ترجمہ کر دیا ہے، کتاب کے شروع میں اس کے مصنف مفتی عنایت احمد صاحب کے مختصر حالات ہیں،

"م"

ت سے فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ... /
اخلاق و عادات کا مفصل بیان ... /
حقیقت اور قرآن مجید کی روشنی میں بحث و تبصرہ ... /
گئی ہو عقائد اسلام پر مفصل حکیمانہ بحث ... /
پر مفصل و سیر حاصل بحث ... /
اخلاقی تعلیمات اسلامی فضائل و آداب ... /

ل

(سلسلہ سیر الصحابہؓ)

خلفائے راشدینؓ کے ذاتی حالات و فضائل ... /
: حضرات عشرہ مبشرہ اور بقیہ صحابہؓ کے حالات و فضائل ... /
: فتح مکہ سے پہلے کے صحابہ کرام کے حالات ... /
: انصار کرام کے فضائل و کمالات ... /
بقیہ انصار کرام کے حالات زندگی ... /
حضرات حسنینؓ، امیر معاویہؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ کے مفصل حالات ... /
فتح مکہ کے بعد صحابہ کرام کے سوانح و حالات ... /

سیر الصحابیات: ازواج مطہرات، بنات طاہرات اور عام صحابیات کے حالات ... /
اسوۂ صحابہؓ اول: صحابہ کرام کے عقائد، عبادات و اخلاق کی تفصیل ... /
〃 دوم: صحابہ کرام کے سیاسی و انتظامی کارناموں کی تفصیل ... /
اسوۂ صحابیات: صحابیات کے مذہبی، اخلاقی اور علمی و عملی کارناموں کا مرقع ... /
اہل کتاب صحابہؓ و تابعینؒ: یہودی و نصرانی صحابہؓ کے حالات ... /
الفاروق: حضرت فاروق اعظمؓ کی لائف اور عراق و شام، مصر اور ایران کی فتح کے تفصیلی حالات ... /
سیرت عائشہؓ: حضرت عائشہؓ کے حالات زندگی ... /
سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ: عمر ثانی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے سوانح حیات اور انکے مجددانہ کارنامے ... /

(سلسلہ تاریخ اسلام)

تاریخ اسلام حصہ اول: (عہد رسالت و خلافت راشدہ) ... /
〃 دوم: بنی امیہ دمشق کی صد سالہ تاریخ ... /
〃 سوم: ابوالعباس سفاح سے متقی اللہ ۳۳۲ھ / ۹۴۴ء تک خلافت عباسیہ کی تاریخ ... /
〃 چہارم: خلیفہ مستعصم باللہ تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی تاریخ اور عباسیوں کے تمدنی کارناموں کی تفصیل ... /